39

علمی مجلس دِلی کا تماہی رسالہ

(۳۹)

مرتّب مالک رام

جلد ۱۱   جنوری/مارچ ۱۹۷۷ء   شمارہ ۱

چندہ سالانہ : ہندستان : پندرہ روپے   یہ شمارہ
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ۸ ڈالر (امریکی)   ۵ روپے

پرنٹر و پبلشر ظلّ عباس عبّاسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپواکر علمی مجلس، ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا۔

ملاحظات

اس شمارے کے ساتھ ہم 'تحریر' کی زندگی کے گیارھویں سال کا آغاز کر رہے ہیں، فالحمدللہ۔ ہم پوری کوشش کرینگے کہ سالِ رواں میں بھی رسالے کا معیار برقرار رہے؛ اور ہم نے آج تک اردو علم و ادب کی جو بھلی بری خدمت کی ہے، اس میں کمی نہ آنے پائے۔

البتہ پرچے کی اشاعت میں تھوڑی بہت تاخیر سے احباب بددل نہ ہوں۔ انھیں میری مجبوریوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسی باعث بعض اوقات اشاعت میں تعویق ہو جاتی ہے۔ اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ پرچہ شائع ضرور ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز

مالک رام

سید لطیف حسین ادیب

للتا پرشاد لیق

دیوان لیق و واسوخت غمنامۂ لیق

للتا پرشاد لیق کے حالات

تذکرۂ نادر، تذکرۂ بہار سخن اور تذکرۂ شعور سخن سے مستفاد ہوا کہ وہ قوم کے کائستھ اور قدیمی ساکن قصبہ سندیلہ (ضلع ہردوئی) کے تھے۔ ان کے والد کا نام موتی لال تھا۔ ان کے والد اور والدہ کا انتقال کانپور میں ہوا، اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ انھوں نے والدین کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعہ لکھا:

مری والدہ اور والد بہم — گئے اس جہاں سے بدار البقا
دریغا کہ یہ حادثہ ایک روز — ہوا کانپور میں بروز جمعہ
میں تھا یازدہ سالہ اس وقت میں — کہ والد نے فرمائی دل سے دعا
"جہاں میں نہ محتاج ہوگا کبھی — رہیگا خوشی تو بفضل خدا"
بیان غم و رنج و ماتم فضول — کہ عشرت کدہ، غمکدہ تھا بنا
بجز صبر دیکھا نہ چارہ دگر — قبول اس کو دل نے بجلست کیا
لیق اس کا سمبت ملک نے بغم — کہا ہائے ایسا کیا غضب ہوگیا
(۱۸۹۵)

(کلیات لیق (قلمی) ورق ۲۲۴)

للتا پرشاد لئیق

اس قطعہ سے لئیق کی تاریخ پیدائش بھی برآمد ہو جاتی ہے، یعنی (۱۸۹۵) سے گیا
کم کرنے کے بعد ۱۸۸۴ اور ۵ جاتے ہیں اور ۱۸۸۴ء سمبت ۱۸۲۷ عیسوی کے
مطابق ہیں۔ اس طرح لئیق کی ولادت سنہ ۱۸۸۴ سمبت یا ۱۸۲۷ عیسوی میں
ہوئی۔ نیاز علی پریشان نے شعر و سخن (۱۸۶۹ء) میں ان کی عمر ۴۳ برس لکھی ہے
جس سے سالِ پیدائش ۱۸۲۶ عیسوی قرار پاتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں لئیق
کا صحیح سالِ پیدائش ۱۸۲۷ء ہوگا، جو خود ان کا تحریر کردہ ہے۔
ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ان کی پرورش ان کے نانا منشی ایشری پرشاد
نے کی جو کانپور میں مقیم تھے۔ ان کی عمر ۱۷ برس کی تھی کہ ان کے نانا بھی وفات
پا گئے (۱۸۴۴ء)۔ انھوں نے اپنے نانا کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعہ لکھا ہے۔ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب لئیق و سخندان تھے، ان کی بدولت للتا پرشاد
کو تعلیم میسر ہوئی۔ انھوں نے للتا پرشاد کو اپنی جائداد کا وارث بھی بنایا:

مرے جدِ فاسد کی کیا ہو ثنا لئیق و سخندان و منشی بڑے

مری پرورش میں تھے مصروف سب مجھے علم ان کی بدولت ملے

میں نورِ نظر ان کا تھا بیگماں کیا مال کا اپنے مالک مجھے

لئی جان ان کی اجل نے خود آکے[۲] مرے دل میں کیا کیا بھرے غم رہے

سرہانے کر دو اٹھ کے سال اب "قضا آئی خلد بریں وہ گئے"[۳]

(۱۸۴۴ء)

(کلیاتِ لئیق (قلمی) ورق

مؤلف تذکرہ شعر و سخن نے تحریر کیا ہے کہ لئیق نے فارسی کتب درسیہ بالاستیعاب
پڑھی تھیں، اور وہ عربی و سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ وہ کمسریٹ میں سررشتہ دار
تھے اور ملازمت کے سلسلے میں بریلی، آگرہ، لکھنؤ اور انبالہ میں رہے۔

۲۔ یعنی، اجل نے ان کی جان خود آکے لی

۳۔ مصرعِ ثانی سے ۱۸۴۹ء برآمد ہوتے ہیں۔ اسے ہوز کے ۵ عدد کم کرنے سے ۱۸۴۴
رہ جاتے ہیں، جو منشی ایشری پرشاد کی تاریخِ وفات ہے۔

ملتا پرشاد لیقؔ

ان کے قیام بریلی کے متعلق چند شواہد فراہم ہو جاتے ہیں:

(۱) کلیاتِ لیقؔ (قلمی) ورق ۲۳۴ پر بابو بہاری لال بشاش فرزند ملتا پرشاد کی شادی کے سلسلے میں ایک قطعۂ تاریخ ملتا ہے، جس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

کروں بزمِ شادی کی کیا میں رقم	بریلی میں ہر ایک ہے جانتا
بفرقِ برات اس کی تاریخ ہے	ہوا خطِ شادیِ بشاش کا
	(۱۸۶۰ء)

گویا بشاش کی شادی ۱۸۶۰ء کو بریلی میں ہوئی۔

(۲) انیسویں صدی عیسوی میں بریلی کے نامور شاعر نواب عبدالعزیز خاں عزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۴ تا ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱/۹۲) کے کلیات (مطبوعہ شوکت اسلام لکھنؤ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲/۹۳) میں ایک قطعہ غسلِ شفا بعنوان "تاریخِ غسلِ شفا لالہ ملتا پرشاد لیقؔ صاحب بریلوی" ہے:

از شکر بدرگاہِ مالکِ ایجاد	لیقؔ گشت ز بندِ مرض کنوں آزاد
ہر سالِ مسیحی عزیز بادلِ شاد	بگو بیافت شفا زود لالتا پرشاد
	(۱۸۶۱ء)

گویا لیقؔ ۱۸۶۱ء میں بھی بریلی میں تھے۔ عزیز نے ان کو بریلوی لکھا ہے، حالانکہ وہ سنبھل کے قدیمی ساکن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بریلی میں لمبی مدت مقیم تھے جس کی وجہ سے لوگ انھیں بریلوی سمجھتے تھے۔

(۳) کلیاتِ لیقؔ (قلمی) ۳۴۲ پر والدۂ بہاری لال بشاش کی وفات کا تاریخی قطعہ ملتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ زوجۂ ملتا پرشاد کا ۱۸۶۴ء میں بریلی میں انتقال ہوا۔ گویا ۱۸۶۴ء میں بھی ملتا پرشاد اپنے خاندان کے ساتھ بریلی میں موجود تھے۔

(۴) ملتا پرشاد کی صاحبزادی منشی ہزاری لال بیشکار ساکن بریلی کو منسوب تھیں۔ ہزاری لال کے پوتے منشی جہیش پرشاد قرار (متوفی ۱۹۷۱ء) باشندۂ بریلی سے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ للتا پرشاد نے بریلی میں اپنا مکان خرید کر یہیں رہائش اختیار کر لی تھی۔

تاہم یہ امر بالکل واضح ہے کہ وہ اصلاً بریلوی نہیں تھے۔ وہ سندیلہ کے قدیمی ساکن تھے۔ ان کی پرورش کانپور میں ہوئی، اور انھیں سلسلۂ ملازمت بریلی، لکھنو، آگرہ اور اناؤ رہنا پڑا۔ البتہ ان کا تعلق بریلی سے زیادہ قریب کا تھا کیونکہ یہیں انھوں نے رہائش کے لیے مکان خریدا، اپنے صاحبزادے اور صاحبزادی کی شادی بریلی میں کی اور ان کی زوجہ کا انتقال بھی بریلی میں ہوا۔

نیاز علی پریشاںؔ اکبرآبادی کے بیان کے مطابق للتا پرشاد بیسقؔ نے ۱۸۴۹ء میں بعمر ۲۳ سال[۴] شعر کہنا شروع کیا اور مولوی خدا بخش خان فردؔ[۵] سے اشعار پر اصلاح لی۔

مولوی فرد کانپور میں مقیم تھے۔ زودگو اور کامل شاعر تھے۔ میں نے ان کی ایک فارسی غزل جو حضرت بدیع الدین مدارؒ کی منقبت میں ہے اور جس پر گزشتہ صدی کے ایک نامور بریلوی شاعر نواب نیاز احمد خان ہوشؔ نے تضمین لکھی ہے، کلیات ہوشؔ (۱۳۱۲ھ / ۹۵-۱۸۹۴ء، مطبع گلشن فیض لکھنو) میں دیکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے ساختہ اور پُراثر اشعار کہنے پر قادر تھے۔

للتا پرشاد بیسقؔ نے مندرجہ ذیل شعر میں اپنے استاد کی تعریف کی ہے ؎

استاد تیرا فرد ہے پڑھ دوسری غزل　　تجھ کو بیسقؔ صاحب دیوان بنا دیا

تصنیفات: نیاز علی پریشاںؔ کی اطلاع کے بموجب بیسقؔ مندرجۂ ذیل تصنیفات کے مالک تھے:

(۱) مثنوی ہیچ قصہ

(۲) دیوانِ فارسی

(۳) دیوانِ اردو

---

۴ - بعمر ۲۲ سال ہونا چاہیے۔　　۵ - دیکھیے ص ۲

پریشان نے بتایا کہ لیق کو نثر میں بھی عبور حاصل تھا مگر اس نے ان کی کسی نثری کتاب کا نام نہیں لکھا۔

مجھے دیوانِ اردو کے علاوہ لیق کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔ مثنوی پنج قصہ کا حوالہ نواب عبدالعزیز خان عزیز بریلوی کے کلیات میں ملتا ہے۔ عزیز بریلوی کے قطعاتِ تاریخ بعنوان "تاریخِ مثنویِ لیق صاحب" مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) لیق سخندانِ عالیمقام — زمانے میں ہے جس کا مشہور نام
جو کی نظم اردو میں اس نے رقم — مری کشن کے رس کی دھوم دھام
لکھا سالِ اتمام میں نے عزیز — ہوا شکر یہ پنج قصہ تمام

(۲) کیا ہی قصہ لیق نے لکھا — خوب ہیں لفظ، خوب معنی ہے
سوچ رہا تھا عزیز حرفِ عدد — کہ مصنف کا یار قلبی ہے
میں نے پوچھا کہ کیا کیا مرقوم — کہا تاریخ مثنوی کی ہے

(۱۸۶۲ء)

لہذا مثنوی پنج قصہ کے متعلق معلوم ہوا کہ:

(۱) یہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں تمام ہوئی۔
(۲) اردو زبان میں ہے۔
(۳) اس کے لفظ و معنی خوب ہیں۔
(۴) اس میں سری کشن کے رس کی دھوم دھام بیان ہوئی ہے۔

۵۔ وحید الدین خان عرف خدا بخش خان قوم یوسف زئی باشندۂ دربھنگہ شاگردِ مصحفی، صاحبِ دیوان اور رضا حسین تلامذہ تھے (تاریخ شعرائے بہار: ۱۳۸ از سید عزیز الدین احمد بلخی)
ریاض الفصحا، ۲۰۹ میں مصحفی نے فردؔ کو غازی پور کا ساکن تحریر کیا ہے۔
مصحفی نے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ اپنے فارسی کلام پر مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔

ملا پرشاد لئیق

بصورت موجودہ ہمارے مطالعہ کے لیے صرف دیوان اردو رہ جاتا ہے ، جس کو میں نے گزشتہ سطور میں کلیات سے تعبیر کیا ہے ، کیونکہ وہ کئی دواوین اور ایک سوختت کا مجموعہ ہے ۔

اب میں مختصراً دیوان اردو کا تعارف پیش کرونگا۔

مخطوطہ مجلد ہے ۔ سائز : لمبائی ۲۱ سینٹی میٹر x چوڑائی ۱۴½ سینٹی میٹر۔ مسطر ۱۵ سطری کاغذ ولائتی ، چکنا اور کم دبیز ۔ روشنائی سیاہ ہلکی ۔ تخلص اور عنوان سرخ روشنائی سے ۔ تعداد اوراق ۲۴۳ ، ناقص الاول و ناقص الآخر ۔ ابتدا ورق ۲ سے ہوتی ہے ، جس پر دیوان اردو لکھا ہے ۔ انتہا ورق ۲۴۳ پر ہوتی ہے جس پر یہ عنوان قطعۂ تاریخ درج ہے :

" تاریخ رہائی میر مظہر حسین صاحب کوتوال چھاؤنی صدر بازار جلندھر از اپیل "

مصرع تاریخ سے ۱۲۸۸ ہجری کے اعداد برآمد ہوتے ہیں (مطابق ۱۸۷۱ / ۱۸۷۲ عیسوی) ایک ورق یعنی ۲۴۷ واں ورق ضائع ہوا ، جس کا نشان جلد میں موجود ہے ۔

کتابت معمولی مگر صاف ، اغلاط بھی ملتی ہیں ۔ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ کار کتابت خود لئیق نے انجام دیا یا کسی پیشہ ور کاتب نے ، کیونکہ اس میں کوئی داخلی شہادت موجود نہیں ہے ۔ دیوان اردو کے اختتام پر (ورق ۱۲۳) یہ تحریر ملتی ہے : تمام شد ۸ مارچ ۱۸۷۶ عیسوی ۔ مقام انبالہ چھاؤنی ۔ اس سے اتمام کار کتابت کی تاریخ تو معلوم ہوتی ہے ، مگر کاتب کی ذات کا علم نہیں ہوتا ۔ پورا نسخہ ایک ہی کاتب نے لکھا ہے ۔ دیوان غزلیات کے علاوہ مخطوطے میں جتنا بھی دیگر کلام ہے ، وہ ۱۸۷۶ء سے پہلے کا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کلام اقسام نظم و شعر کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ نقل کیا گیا ہے ، اس کے بعد جملہ اجزا اس ترتیب سے مجلد کرائے کہ دیوان غزلیات اردو ورق ۲۱ سے شروع ہوا اور دیوان قطعہائے تاریخ سب سے

للتاپرشاد لیئق

آخر میں ورق ۲۳۷ تک ترتیب کلیات یہ ہے!

ورق ۱ تا ۲۰ : مخطوطے میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اوراق فارسی کلام پر مشتمل تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اوراق میں کلام اردو حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل ہو۔

ورق ۲۱ تا ۱۲۳ : مجموعۂ غزلیات اُردو۔ تعداد ۲۴۸

ورق ۱۲۳ تا ۱۲۵ : (ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۵ : رباعیات اردو۔ تعداد ۲۵

ورق ۱۲۶ تا ۱۷۹ : دیوان خمسیات اردو۔ تعداد ۴۴

دراصل ورق ۱۶۹ پر خمسے ختم ہو جاتے ہیں۔ آخری خمسے کے بعد تمام شد بھی لکھا ہے "تمام شد" کے فوراً بعد ہی مسمط شروع ہو جاتے ہیں، جن کا سلسلہ ورق ۱۷۹ تک چلتا ہے۔ میرے خیال میں عنوان "دیوان خمسیات" غلط ہے، صحیح عنوان "دیوان مسمط" ہے کیونکہ خمسہ خود مسمط کی ایک قسم ہے۔ خیر، مسمط کی تعداد ۸ ہے، یعنی مثلث سے معشر تک مرقوم ہوئے

ورق ۱۸۰ تا ۲۲۷ : غمنامۂ لیئق ۱۲۷۶ فصلی۔ یہ واسوخت ہے، مسدس کی شکل میں۔ اس میں بندوں کی تعداد ۱۵۳ ہے آخر میں دو تاریخی قطعے ہیں۔ پہلا قطعہ خود مؤلف کا سن عیسوی ہیں: واسوخت دل لیئق ہے خوب (۱۸۷۰ء) دوسرا امداد علی تپش اکبر آبادی کا۔ انھوں نے ایک قطعے میں کئی تاریخیں نکالی ہیں: "زیبا ہے لیئق کا یہ واسوخت" (۱۲۸۶ھ) ؛ تاریخ عیسوی ہوئی مرغوب شاعراں" (۱۸۷۰ء) "ہے خوب لیئق کا یہ واسوخت" (۱۸۷۰ء) مصرع اول کے مطابق ۳ کا تعمیہ) ؛ تپش سے دو درد دل مرغوب دلہا ہم تو کہتے ہیں" (۱۲۸۶ھ) ؛ (۲ کا تعمیہ)۔

ورق ۲۲۸ تا ۲۳۴ : قصائد اُردو (تعداد ۳)

ورق ۲۳۴ تا ۲۳۶ : قطعات تاریخی (تعداد ۱۴)

کلیات کی اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ لیئق نہایت زود گو اور قادر الکلام

للتا پرشاد لیئق

شاعر تھے۔ انھوں نے نظم و شعر کی ہر قسم میں طبع آزمائی کی۔ اور ایک ضخیم کلیات اپنی یادگار چھوڑا۔ فارسی کلام اس کے علاوہ ہوگا، جو فراہم نہیں ہوا۔

دیوان غزلیات اردو | للتا پرشاد لیئق اپنی خوش بیانی کے متعلق کہتے ہیں:

مرے اشعار سُن ناسخ نے دی داد   "لیئق خوش بیان ہے اور میں ہوں"

گویا لیئق کی خوش بیانی کی داد ناسخ نے بھی دی، اور ناسخ علامت تھے ایک تہذیب کی جس کو تہذیب لکھنؤ کہتے ہیں، ایک اسلوب غزل کی جو اس تہذیب کی عطا تھا۔ ـــــــ ایک ادبی تحریک کی جس نے فارسی اور عربی لغات کو مروّج کیا اور زبان میں ہندوی الفاظ کی تنسیخ کی ـــــــ یہی لیئق نے اپنایا، یہی لیئق نے تمام عمر کیا۔ انھوں نے تہذیب لکھنؤ کی عکاسی کی، انھوں نے اپنی قوت متخیلہ کو تہذیب لکھنؤ کی عکاسی کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے عصری حالات کے زیر اثر شاعری کو صرف صناعی سمجھا، ایسی صناعی جس کی سجاوٹ فارسی اور عربی الفاظ سے کی، جس میں ہیرے کا وزن تھا، آب و تاب تھی، مگر پھول کی پتی کی تیزی، شبنم کی گداز قلبی، اور نزاکت و غنائیت نہیں تھی۔ آج وہ تہذیب اور اس تہذیب کا ادیب ہمارا تاریخی ورثہ ہے، ناسخ اور ان کے متبعین کی شاعری بھی ہمارا ادبی ورثہ ہے۔ ہم اپنے عصری رجحانات کے پیش نظر لاکھ اس دور کی صناعی کو پسند نہ کریں، مگر اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

میرے خیال میں لیئق کی عظمت شاعری کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ وہ دیگر اساتذۂ فن کی طرح تہذیب لکھنؤ کے نمائندے ہیں اور وہ تمام خصوصیات شاعری جو اس دبستان میں ملتی ہیں، ان کے دیوان میں بھی بافراط موجود ہیں:

بلبلو! گل جو ہوا خندہ دہن پانی میں   پھول جھڑ جھڑ کے بنا صاف چمن پانی میں

غرق ہے اب تو زمیں اور زمیں پانی میں — اشک سے ڈوب گیا چرخ کہن پانی میں
بعد مرنے کے بہا سے جو رہے اشک رواں — قبر کے بیچ لگا تر سے کفن پانی میں
غسل میں رخ پہ پڑی آکے جو منہ کی کاکل — عکس سے دیکھ پڑا صاف گہن پانی میں
یہ تماشا ہے عجب رونے میں میرے دیکھو — صاف مردم نے کیا اپنا وطن پانی میں
روتے روتے جو بندھا زلف کا کا فرکی خیال — کیا کہوں ڈوب گیا ملک ختن پانی میں
اشک کے یم میں سمندر جو پڑا سوخت ہوا — آہ سے خضر کہیں کیا ہے جلن پانی میں
پان کھا کر جو ذرا تھوک دے دریا میں صنم — صاف بن جائے ابھی لعل یمن پانی میں
چن کے افشاں کو نہانے جو گیا دریا پر — آگئے چرخ سے نسرین و پرن پانی میں
میری وحشت سے ہے سر مست گریزاں وحشی — مچھلیاں دشت میں پھرتی ہیں ہرن پانی میں

شعر تر سن کے ترے کہتے ہیں احباب لیئق!
آبداری سے لکھے، خوب سخن پانی میں

لیئق کا یہ استادانہ اندازِ غزلگوئی تمام غزلیات میں ملتا ہے کہیں صاف اور کہیں ادق و مغلق زبان میں۔ اس وقت کے حالات میں یہ اسلوب کمال شاعری سے عبارت تھا اور مشاعروں میں ایسی غزلوں پر ہٹس پڑ جاتی تھی لہٰذا لیئق کے کمال فن میں شبہہ کی گنجایش نہیں ہے۔

رباعیات | لیئق جیسے زود گو اور قادر الکلام شاعر کے کلیات میں رباعیات کا اتنا کم سرمایہ باعث تعجب ہے۔ مزید براں رباعیات میں کوئی خاص کشش و جاذبیت بھی نہیں ہے۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ لیئق کو فن رباعی سے فطری مناسبت نہیں تھی۔ ۲۵ رباعیات میں صرف ایک رباعی قدرے بہتر معلوم ہوئی، جو مندرجۂ ذیل ہے:

عاشق کو چشم و لب کا کہیں آگیا خیال — آئی اجل تو پہنچے مسیحائے خوش مقال
دونوں میں ہے نفاق، نہ ہو زندگی نہ موت — اس عاشقی کا دیکھیے ہوتا ہے کیا مآل!

دیوانِ مخمسات | تضمین بہرحال تضمین ہے، وہ شعر کی کسی بھی قسم میں

ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تضمین ہمیشہ خمسے میں ہو یا کسی شاعر کے مصرعے یا غزل کی تضمین کی گئی ہو۔ خمسہ و تضمین لازم و ملزوم بھی نہیں۔ کلیات بیتق میں دیوان خمسات سے مراد وہ مجموعۂ مخمسات ہے، جن میں دیگر شعرا کی غزلیات کی تضمین کی گئی ہے۔ غزلیات کا انتخاب حروف تہجی کے اعتبار سے ردیف وار کیا گیا ہے، اس طرح مجموعہ مخمسات میں دیوان کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے:

آتش (۵)؛ ناسخ (۶)؛ نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی (۲)؛ ظفر (۲)؛ وزیر (۴)؛ برغزل آباد[۶] (۲)؛ جوش[۷] (۱)، رند (۸)؛ برغزل انشا (۲)؛ غالب (۱)؛ مہر[۸] (۱)؛ قبول[۹] (۵)؛ رشک (۲)؛ اختر (۱)؛ برغزل نصیر (۱)؛ منیر (۱)

متذکرہ بالا شعرا میں غالب اکثریت شعرائے لکھنؤ کی ہے۔ جن غزلیات کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ اس عہد کے لکھنوی طرز کی نمایندہ ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیتق کو اساتذۂ لکھنؤ سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ ان کے طرزِ غزلگوئی کے دلدادہ تھے

۶۔ آباد۔ مہدی حسن خان فرزند غلام جعفر خان لکھنوی۔ بر ناسخ می گزرانید۔ در ۱۲۲۸ھ سرانجام وجود در بر کشید۔ دیوانے گزاشتہ" (تذکرۂ بزم سخن: ۴)

۷۔ جوش۔ نواب احمد حسن خان بریلوی شاگرد ظفریاب خان راسخ اور نواب عاشور علی خان عاشور آخیر عمر میں آسیر لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ دو دیوان مسمی بہ گلدستۂ سخن معروف بہ بہارستان جوش اور چمنستان جوش اور قصۂ فسانۂ جوش یادگار ہیں۔ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں فوت ہوئے (یادگار ضیغم: ۲۸۶)

۸۔ مہر۔ مرزا حاتم علی لکھنوی خلف مرزا فیض علی از مشاہیر تلامذۂ ناسخ است۔ در ۱۲۹۷ھ راہ عدم پیمود۔ دیوانے گزاشتہ" (تذکرۂ طور کلیم، ۱۰۲)

۹۔ کپتان محمد مہدی معاصر نواب واجد علی شاہ اختر اس عہد کے ایک مشہور شاعر تھے تاریخ ادب اردو: ۳۰۲ از سکینہ

للتا پرشاد لیئق

ہمارے اساتذۂ سلف خمسہ بالالتزام لکھتے تھے۔ لیئق نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہاں، یہ ضرور ہے، کہ ایسی کثرت سے خمسے بہت کم اردو شاعروں نے لکھے ہیں۔ قصیدہ نگاری کی طرح خمسہ نویسی بھی مشکل فن ہے، جو اساتذہ تک محدود رہا۔ قصیدے کی طرح خمسہ بھی اس صدی میں رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔ کسی مشہور شاعر کی مشہور غزل کے اشعار کو اس طرح تضمین کرنا کہ ظاہری و باطنی ہم آہنگی قائم رہے، آسان کام نہیں ہے۔ خمسہ نویسی عمل پیوندکاری نہیں بلکہ تخلیق غیر کو اپنانے کا فن ہے۔ معلوم ہوتا ہے، کہ لیئق کو خمسہ نویسی سے فطری مناسبت تھی اور وہ بآسانی خمسہ کہہ لیا کرتے تھے۔ لیئق نے ردیف زائے معجمہ کے لیے غالب کی غزل کا انتخاب کیا:

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

میں اس خمسے کے چند بند بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔ لیئق کی غیر معمولی مہارت فن کہ وہ غالب کا رنگ غزل بھی نباہ گئے:-

دیکھ میں نے لیا نشیب و فراز ہے زمانے کا کچھ عجب انداز
منکشف مجھ پہ ہو گیا یہ راز نے گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ناز تیرا بلائے رستا خیز بو ستی خلق ہے۔ بریز، بریز
اے ترا لطف کل ستم آمیز لے ترا غمزہ ایک قلم، انگیز
اے ترا ظلم، سر بسر انداز

تیرے رخ پر نظر مبارک ہو عید ہر ایک گھر مبارک ہو
یہ خوشی سر بسر مبارک ہو تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزش سجدۂ جبین نیاز

اے لیئق! اس کا خوب نام ہوا عشق میں پورا اس کا کام ہوا
رنج کا دل میں اب مقام ہوا اسد اللہ خان تمام ہوا
اے دریغا، وہ رند شاہد باز

ملا پرشاد لیئق

مخمسات کے فوراً بعد مسمط کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بھی بطور تضمین لکھے گئے ہیں تفصیل مندرجۂ ذیل ہے:-

مثلث برغزلِ جرأت :	کوئی مرجا دیگا صاحب! آپ کا کیا جائیگا!
مربع برغزلِ اعظم[10] :	پھر کیا زلف پریشاں نے پریشاں ہم کو
مخمس برغزلِ معروف[11] :	دل نہ پر عاشقی سے دل گیر رہا
مسدس برغزلِ ذوق :	سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد
مسبع برغزلِ مسکین[12] :	تیغ زن چشم ابرو ہے خدا خیر کرے!
مثمن برغزلِ آتش :	آکے اس بازار میں یوسف کا سودا ہوگیا
متسع برغزلِ آباد :	جوش پرستی کو لاتی ہے گھٹا برسات کی
معشر برغزلِ ناسخ :	اشک سے مہندی کی ٹٹی کو جلایا چاہیے

یہ مسمط لیئق کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ وہ اُردو کے ان چند اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے مسمط پر محنت کی اور فن کو زندہ رکھا۔ جدید نسل کو اور آئندہ دور کے طلباء کو لیئق جیسے استادِ فن کا مطالعہ کیے بغیر مسمط سے آگاہی نہیں ہوسکیگی۔

قصائدِ اُردو مسمط کے بعد غمنامۂ لیئق ہے مگر میں اس کا ذکر آخر میں کرونگا کیونکہ مجھے اس پر تفصیلی گفتگو کرنا ہے۔ غمنامۂ لیئق کے بعد تین قصائد ہیں:

(۱) درمدح راجہ گوالیار : کی پشت رنج و غم نے مرے دل کے سامنے (۳۴ اشعار)

۱۰۔ مرزا اعظم علی رئیس خلد آباد عرف محلات الہ آباد شاگردِ رشید حضرت آتش۔ (تذکرہ نادر ۲۸)

۱۱۔ نواب الٰہی بخش خان بن مرزا عارف جان برادر زادہ شرف الدولہ قاسم جان دہلوی، بانصیر دہلوی نسبت تلمذ درست کردہ، در پایان عمر از دنیا و مافیہا گسستہ بخدا پیوست۔ در ۱۲۴۲ ہجری ازیں خاکدان زحمت برست دیوانے گذاشتہ (تذکرۂ بزم سخن : ۱۰۶)

۱۲۔ میر عبداللہ مسکین لکھنؤ کے مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ نگار کی حیثیت سے ہی ممتاز ہیں۔ حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ (تاریخِ ادبِ اردو: ۱۳۱۴ از سکسینہ)

(۲) قصیدہ در بیان حال اقبال و ادبار : خواب ہیں کیا نئے جلد ہو بیدار (۱۰۰ اشعار)
(۳) قصیدہ در شان معشوق : لکھ اوصاف جاناں کے کچھ زود تم (۴۴ اشعار)
یہی کہنا پڑتا ہے کہ لیئق کی طبیعت قصیدہ نگاری کی طرف مائل نہیں تھی۔ وہ بنیادی طور پر عشق و محبت کے آدمی تھے، اور ہر وہ صنف سخن جس میں عشق صنم کو دخل نہ ہو، ان کے قلم کے جوش سے محروم رہی۔ ان کے قصائد میں پختگی نہیں ہے۔ بہر نوع قسم کھانے کی گنجایش تو ہے کہ لیئق قصیدہ نگار بھی تھے۔

قطعات تاریخی کلیات کے بالکل آخر میں قطعات تاریخی ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۱۴ ہے۔ چونکہ ایک ورق ضائع ہو گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس پر تین چار قطعات مزید ہوں۔

شعرائے سلف کے کلیات میں قطعات تاریخی سے اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں، جن سے تحقیقی کام کو سہارا ملتا ہے۔ مثلاً مثنوی پنج قصہ کی اطلاع عزیز بریلوی کے قطعۂ تاریخی سے دستیاب ہوئی، جو ان کے دیوان میں شامل ہے۔ لیئق کے قطعات تاریخی سے جو مواد فراہم ہوتا ہے، اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) لیئق کے والدین، نانا، زوجہ، صاحبزادے اور برادر کا حال معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے اور برادر دونوں شاعر تھے؛ ان کے تخلص علی الترتیب بشاش و کوکب تھے
(۲) منشی رام سہائے کوکب کی طرح، سخاوت علی ضیا کا نام معلوم ہوا، جو جناب حاتم علی مہر اکبرآبادی کے صاحبزادے تھے۔

قطعات تاریخی کی جان مصرعۂ تاریخی میں ہوتی ہے۔ ہمارے اساتذہ نے نہایت موزوں اور برجستہ مصرعہائے تاریخ قلمبند کیے ہیں، جن کی دلچسپی میں آج بھی کمی نہیں ہوئی۔ دراصل تاریخ گوئی کا ملکہ بھی شعر گوئی کی طرح، خداداد ہوتا ہے۔ بعض شعرا تو بات کرنے میں مصرع تاریخی نظم کر دیتے ہیں۔

۱۷-۱۸ قطعات تاریخی کلیات میں شامل کیے، ۱۴ کلیات میں موجود ہیں۔ ان میں موزوں تو سب ہی ہیں مگر برجستہ بس ایک دو۔ مثلاً

ملتا پرشاد لئیق

(۱) لئیق: از سر انبساط این بگوی زبرج حمل مہر گشتہ ہویدا (۱۲۸۷ ہجری)

یہ مصرع مرزا قاسم علی کی ولادت کے سلسلے میں ہے، جو مرزا سخاوت علی ضیا کے پسر اور مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی کے نبیرہ تھے۔

(۲) قضا آئی، خلد بریں وہ گئے (۱۸۴۴ء)

یہ مصرع شاعر کے نانا منشی البیشری پرشاد کی وفات کے سلسلے میں ہے۔

غمنامہ لئیق ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے واسوخت کی تعریف و تاریخ کے بیان میں لکھتے ہیں[۱۳]:

> شعرا کی زبان میں ایسی نظم کو جس میں عاشق اپنے روٹھ جانے کا اعلان کرے یا دھمکی دے، واسوخت کہتے ہیں۔

واسوخت کے معنی اور تعریف کے لیے ہمیں لغت کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ بہار عجم میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "واسوختن اعراض کردن و رو برتافتن از چیزے و ترک عشق گفتن"۔ غیاث اللغات میں چراغ ہدایت کے حوالے سے یہ عبارت درج ہے: "باصطلاح شعرائے ایران بیزار شدن و اعراض و رو گردانی کردن از معشوق۔ ظاہرا واسوخت شعرا از ینجاست" یہ ہندستانی فضلا کی تحقیق تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی لغت نگار بھی اس کے مؤید ہیں چنانچہ آقا سید محمد علی لاری جانی نے اپنی مشہور اور جامع لغت (فرہنگ نظام) میں بہار عجم اور غیاث اللغات کی عبارت مع امثال بعینہ نقل کر دی ہے۔ اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے کہ واسوختن فارسی میں معشوق سے بیزاری کے معنی میں آتا ہے اور واسوخت وہ نظم ہے، جس میں شاعر معشوق سے بیزاری کا اظہار کرے۔

۱۳۔ خلاصہ مقدمہ کتاب مسمی "جذبات رضی" (واسوخت) ___ (ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - ۱۹۶۲ء)

منا پرشاد شفق

یہ صنف دوسری اصناف سخن کے ساتھ فارسی سے اردو میں آئی۔ اردو واسوخت سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے فارسی واسوخت کا وجود ملتا ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء) کے سر ہے۔ وحشی کا نام شمس الدین محمد تھا اور وہ بافق (مضافات یزد) کا رہنے والا تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو کا پہلا واسوخت نگار کون تھا۔ آزاد نے میر کو مانا ہے۔ مگر ہماری زبان کے نامور محقق قاضی عبدالودود نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اردو میں پہلا واسوخت آبرو (متوفی ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء) نے لکھا۔ پھر حاتم، حشمت، تاباں، سودا اور میر نے اس پر قلم اٹھایا۔

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ واسوخت کا موجودہ ڈھانچہ میر صاحب کے قلم کا رہین منت ہے۔ اس دور کے بعد بہت واسوخت نگار شعرا میدان میں آئے۔ مطبع نول کشور نے عرصہ ہوا، ایک ضخیم مجموعہ واسوخت "شعلۂ جوالہ" کے نام سے شائع کیا تھا، جس کا حجم ۹۱۰ صفحات تھا، اور جس میں چند فارسی کے اور بیشتر اردو کے واسوخت شامل تھے۔ ان واسوخت شعرا میں امانت، امیر، بحر، برق، جان صاحب، جرأت، حشمت، رند، سحر، سودا، شوق، صفیر، عرش (میر کلو) قلق، مرزا مظہر، مومن، میر کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان ناموں سے اس صنف خاص کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ واسوخت کا شمار کس صنف میں کیا جائے، ہمارے خیال میں شعرا نے اس کے لیے کوئی قید نہیں رکھی۔ خود وحشی نے اس کے لیے مسدس اور مثمن کا قالب پسند کیا ہے۔ اساتذۂ اردو کے یہاں بھی مسدس اور مثمن دونوں ملتے ہیں؛ بلکہ آتش اور مومن نے تو غزلوں میں بھی یہی رنگ برتا ہے۔ تاہم مسمط (مسدس و مثمن) کی صنف

داسوخت کے لیے تقریباً مخصوص ہو گئی ہے کہ اس میں وسعت زیادہ ہے۔
داسوخت کے مضامین اس کے ہوتے ہیں شاعر (یا عاشق) معشوق سے مخاطب ہو کر اس کے جور و ستم، بے نیازی، اور رقیب نوازی کی شکایات کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ تم وہ دن بھول گئے، جب تمھارے حسن کا اس قدر شہرہ نہ تھا، نہ حسن کی یہ زیبائش تھی، نہ اس درجہ آرائش؛ ہمارے ہی عشق نے تمھارے حسن کو چمکا دیا اور آفتِ روزگار بنایا۔ اب تم ہو کہ سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور غیروں کا دم بھرتے ہو۔ خیر، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے؛ بہتر ہے کہ راہ پر آجاؤ اور تلافی مافات کرو، یاد رکھو جیسا تم نے ہمیں ستایا ہے، ہم بھی نہ ستائیں تو نام نہیں۔ تمھاری اس بے مہری کا بدلہ یہ ہوگا کہ ہم بھی کسی دوسرے معشوق سے ربط بڑھائینگے اور تمھیں عمر بھر جلائینگے۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ مضامین اگر روایتی انداز میں ہوں گے تو کیف سے خالی اور بے مزہ ہونگے۔ ہاں، اگر ان کا تعلق واقعیت سے ہے، اور آپ بیتی کا انداز رکھتے ہوں، تو تاثیر میں کلام نہیں۔

میں نے گزشتہ سطور میں بتایا کہ "غمنامۂ شفق" ۳۵۱ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۷۰ء ہے، اور یہ مسدس کی شکل میں ہے۔ غالباً یہ طویل ترین داسوخت ہے، شاید ہی کسی نے اس سے طویل تر داسوخت لکھا ہو۔ غور کیا، تو اس کی طوالت کا باعث مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

(۱) سراپا کی تعداد ۶ ہے، جو ۱۲۵ بندوں پر مشتمل ہیں۔ اگر ان میں وہ بند بھی شامل کر لیے جائیں، جو سراپا کے آغاز، وصلت اور اختتام کے طور پر لکھے گئے ہیں، یا جن میں ضمنی اور اضافی طور پر زیور اور لباس کی خوبی بیان کی گئی ہے تو نصف داسوخت صرف سراپا پر مشتمل ہوگا۔

(۲) ہر بات تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ وہ جذبات کی تصویر کشی ہو، یا بستر وصل پر

گزرنے والے معاملات کا مذکور ہو، ہر امر جزئیاتی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
منظر نگاری اس پر مستزاد ہے۔

(۳) "خواب پریشان" کا بیان (بند ۱۲۱ سے) اور درویش فرشتہ صورت کا آنا اور خواب کی تعبیر بتانا (بند ۱۹۸ سے) واسوخت کی طوالت کا باعث بن گئے۔
اس کے باوجود چونکہ پورے واسوخت میں دلچسپی باقی رہتی ہے، لہٰذا طوالت عیب نہیں معلوم ہوتی۔

قصّہ جب واسوخت نگاری کا منشا صرف اتنا ہے کہ "بیزار شدن و اعراض و رُوگردانی کردن از معشوق" تو کسی مربوط واقعے کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ فی الواقع ہوا بھی ایسا ہی ہے کیونکہ واسوخت میں مثنوی کی طرح مفصّل کہانی نظم نہیں کی گئی۔ چنانچہ واسوخت میں قصّے کا شعور نہیں ملتا۔ ایسا در دبست کہ پلاٹ ہو، قصّے میں قصّہ ہو، کردار نویسی ہو،، واسوخت میں اجنبی باتیں ہیں۔
مثلاً واسوخت امانت میں واقعۂ عشق یوں ہے:

> شاعر ایک کم عمر حسین پر عاشق ہوا۔ اس نے معشوق سے تعلّق پیدا کیا اور اس کو حسن آرائی کے ڈھنگ بتائے۔ معشوق مشہور ہوا۔ وہ نوچندی کے میلے میں جانے لگا۔ اس میں غرور پیدا ہوا۔ اس کے نظّارے کے لیے رقیب بھی تہِ بام آنے لگا۔ شاعر نے محسوس کیا کہ رنگِ محبت بگڑ چکا ہے۔ اس نے معشوق سے بیزاری اختیار کی اور اس کو خار دینے کے لیے نیا پری زاد تلاش کر لیا۔ معشوق کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ اس کے سینے میں آتشِ رشک بھڑک اٹھی۔ شاعر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور معشوق کو راضی کر لیا۔ یوں دونوں میں رشتۂ عشق استوار ہو گیا۔

درحقیقت یہ کوئی قصّہ نہیں ہے۔ معشوق سے تعلق، بیزاری اور دوبارہ مل بیٹھنے کا واقعہ ہے، جو واسوخت کی تعریف کے عین مطابق ہے۔
للتا پرشاد شفق نے مضمونِ واسوخت ہی نظم کیا، مگر انھوں نے یہ نیا کام کیا کہ مضمون

کو قصہ بنا دیا:

شاعر رمزِ عشق سے ناواقف تھا۔ وہ عاشقوں کی دیوانگی پر ہنستا تھا۔ اس کی طبیعت ہمیشہ شاد رہتی اور وہ آزارِ عشق سے دور رہتا۔ ایک روز وہ بازار سے گزرا۔ اس نے ناگاہ ایک پری وش کو دیکھا۔ وہ اثرِ حسن سے بیہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ جب پری وش نے زیرِ بام ایک شخص کو بیہوش دیکھا تو ازراہِ ہمدردی اس کو کوٹھے پر بلوایا اور اس کی دیکھ بھال کی۔ جب شاعر کو ہوش آیا تو اس نے پری وش سے اظہارِ عشق کیا اور رحم کی درخواست کی۔ پری وش نے رحم کھا کر شاعر کی درخواست قبول کر لی، اور پایان کار دورِ عیش و طرب شروع ہو گیا۔ مگر فلکِ کج رفتار کو یہ صحبت پسند نہ آئی۔ شاعر کو کاروسرکار کی بجا آوری کے سلسلے میں سفر در پیش ہوا، اور وہ معشوق کو گریاں چھوڑ کر عازمِ سفر ہوا۔ رقیب موقع کی تاک میں تھے۔ شاعر کی عدم موجودگی میں وہ معشوق کے کان بھرنے لگے اور اس کو بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ جب شاعر سفر سے واپس آیا، تو معشوق نے اس کو خوش آمدید کہا، مگر ہفتے عشرے میں اس پر یہ کھلا کہ اس کی عنایات میں پہلی سی گرمی نہیں رہی۔ جب شاعر کو معلوم ہوا کہ رقیبوں نے معشوق کو ورغلایا ہے، تو اسے رنج ہوا اور وہ معشوق سے حیلہ کر کے اپنے گھر چلا گیا، اور کئی دن مفقود الخبر رہا۔ جب اس کی معشوق سے بارِ دگر ملاقات ہوئی، تو اس نے شاعر سے گرانی کا سبب دریافت کیا۔ شاعر نے صاف صاف وجہِ ملال بیان کی اور کنایۃً اطلاع بھی دی کہ اس نے ایک نئے معشوق سے دل لگایا ہے، جو کشورِ حسن کا بادشاہ ہے اور جس کے مقابلے میں وہ بندہ ہے۔ معشوق نے یہ سن کر آہِ سرد کھینچی اور بیہوش ہو گیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اظہارِ تلطف کیا۔ اس پر عاشق

ملا پرشاد لیئق

دل لیسپی اور خوف خدا دامنگیر ہوا۔ اس نے دل سے ملال دور کیا شکوے دور ہوے اور عاشق و معشوق بہم ہو گئے۔ پہلا سا دورِ عیش و طرب شروع ہو گیا۔ مگر چرخ دوّار ایک شکل پر نہیں رہتا۔ معشوق عارضۂ ہیضہ میں مبتلا ہو کر داغ مفارقت دے گیا۔ جس معشوق کے تن پر گل بار تھا، اس پر مٹی انبار ہوئی۔ شاعر کو جنون ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی چشم بصیرت وا ہوئی اور اس پر روشن ہوا کہ

یہ جو معشوق جہاں کے ہیں وہ سب فانی ہیں

ظاہر ادوست ہیں یہ پر دشمن جانی ہیں

اس کے بعد شاعر نے عشق مجازی کے بجاے عشق حقیقی سے اپنے قلب کو منور کیا اور اب وہ خدا کی محبت میں سرشار رہنے لگا:

اس طرح غمنامۂ لیئق میں قصّے کی ابتدا، ارتقا اور انتہا کا شعور ملتا ہے، جو سادہ سے پلاٹ میں مربوط ہے۔ قصّے میں خوق فطرت کا عنصر یعنی درویش فرشتہ صورت کا آنا اور خواب کی تعبیر بتانا بھی پرانے قصّوں کے مطابق ہے۔ "غمنامۂ لیئق" کا اخلاقی انجام بھی پرانے قصّوں سے مستعار ہے۔ کردار نویسی کا شعور بھی ملتا ہے۔ شاعر جو مکتبِ عشق کا ناخواندہ تھا، اولاً عیش کوش عاشق بنا اور بالآخر اس نے درویشی اختیار کر لی۔ اس کا کردار واضح ہے۔ معشوق کو نبھے دار پابند طوائف معلوم ہوتا ہے۔

کیا غمنامۂ لیئق شاعر کی آپ بیتی ہے؟ اس سلسلے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کیونکہ واسوخت میں زود اثری کے لیے آپ بیتی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ مزید برآں لیئق کی حیات کے بیشتر پہلو پنہاں ہیں، جن کے بغیر صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے لیئق نے لکھا ہے:

حسنِ دلبر لکھوں، عشقِ دلِ دیوانہ لکھوں — جلوۂ شمع لکھوں، جوششِ پروانہ لکھوں

داستاں وصل کی، اور ہجر کا افسانہ لکھوں — صبر عاشق کا، دل آزاری جانانہ لکھوں

یعنی گزرا ہے جو مجھ پر، وہ بیاں کرتا ہوں

راز اپنا تھا نہاں، اس کو عیاں کرتا ہوں

وہ لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت رہے۔ اس وقت جوان العمر تھے۔ ممکن ہے ان پر کوئی واقعہ گزرا ہو، جس کو انھوں نے زبان شعر میں بیان کر دیا۔
تاہم یہ امر بالکل واضح ہے، بلکہ یہ "غمنامۂ لیتق" کی خصوصیت ہے کہ اس کے قصے میں آپ بیتی کا رنگ بہت چوکھا ہے، جس کی وجہ سے اس کے اثر میں اضافہ ہوا ہے اور وہ قارئین کے لیے بجد پُرکشش بن گیا ہے۔

سماجی پس منظر

ڈاکٹر سلیمان حسین نے لکھا ہے[14]:
اودھ کا صوبیدار سعادت خان صاحب شمشیر تھا۔ اس کا بھانجا اور داماد مرزا محمد مقیم صفدر جنگ (متوفی ۱۷۵۲ء) بھی صاحب السیف تھا۔ اس کا بیٹا جلال الدین محمد مرزا شجاع الدولہ (متوفی ۱۷۷۵ء) فطرتاً عیش پرست تھا، حال آنکہ اس کا بیشتر وقت میدان کارزار میں گزرا۔ اس کے زمانے میں اودھ کو تہذیبی مرکزیت اور سیاسی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے زمانے میں دربار اور شہر میں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ گلی گلی حسن اور علم کا چرچا تھا۔ اس کے زمانے میں دلی کے مہاجرین شعرا کے قافلے آنا شروع ہو گئے تھے۔ اودھ میں تعیش پسندی کا رجحان شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ موصوف کا طبعی میلان مہ جبین عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا، جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والی طوائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی کہ کوئی گلی کوچہ اس سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر دولتمند ہو گئیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرے دار تھیں۔ نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے، تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر ان طوائفوں کے خیمے بھی لدلد کر روانہ ہوتے اور

14۔ خلاصۂ مضمون "لکھنؤ کا تاریخی، سماجی اور معاشرتی پس منظر" (قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۶۷ء)

ان کے گرد تلنگوں کا پہرہ رہتا ۔ جب حکمران کی یہ وضع تھی، تو عام امرا اور سرداروں نے بھی تکلف یہی وضع اختیار کرلی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں ۔ آصف الدولہ (متوفی ۱۷۹۷ء) میں سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی تھی ۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنا دار الخلوت بنایا ۔ اپنے والد کا جمع کیا ہوا خزانہ ان کے ہاتھ لگا ۔ لہٰذا انھوں نے داد و دہش اور رعایا پروری کا وہ بازار گرم کیا کہ لکھنؤ میں یہ مثل مشہور ہوگئی: "جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ" ۔ لوگ اٹھتے بیٹھتے عزت و محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے، اور ان کے ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کر نظروں سے غائب ہو گئے ۔ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست اور عشرت طلب بنا دیا تھا اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی ۔ اس عہد کا ایک اور کارنامہ بھی قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ نواب آصف الدولہ نے مذہب تشیع کی اشاعت میں انتہائی کوشش کی ۔ تعزیہ داری کا طریقہ بھی عام مسلمانوں سے علیحدہ قائم کیا ۔ تعزیوں کی شکلیں بدلیں ۔ براق کی جگہ ذوالجناح، ماہی مراتب کے عوض علم اور پنجے، بانک پٹے کا فن دکھانے کے بدلے نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کو رواج دیا اور شیعوں کو ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک مستقل قوم بنا دیا ۔ غازی الدین حیدر (متوفی ۱۸۲۷ء) منشیات سے مست رہتے تھے ۔ انھوں نے سعادت علی خان کی گاڑھی کمائی کا روپیہ ارباب نشاط کے لیے وقف کر دیا ۔ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں مینا بازار لگ گیا ۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے دلی سے خود مختاری اختیار کی ۔ بادشاہت کے اس اعلان کے بعد لکھنؤ والوں کا احساس تفوق اور تیز ہوگیا، اور انھوں

ادبی خود مختاری کا بھی اعلان کر دیا۔ اگرچہ علم و فضل کی نمایش یہاں سعادت علی خان کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی، لیکن جدید اسکول کی قد و ترویج کا باقاعدہ غلغلہ اس دور سے بلند ہوا۔ ناسخ نے اپنی زبان کو ٹکسالی زبان قرار دیا، جس کے بعد ایک نئے دبستان شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی نظر ڈالی جائے، تو انقلاب و تجدید کی اس تحریک کے نقوش صاف طور پر نظر آئینگے۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ یہ بادشاہ ہوتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ رجب علی بیگ سرور نے اپنی مشہور تصنیف "فسانۂ عبرت" میں انکی عیش پسندی کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس دور کے لکھنؤ میں عوام کو ہر طرح کا سکون میسر تھا، اس لیے ان کی زندگی بھی بڑی متنوع ہو کر رنگا رنگ دلچسپیوں میں گھر کر رہ گئی تھی اور تہذیب کی نفاست و پاکیزگی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرکے نوک پلک سے درست کر دیا تھا، جس کے بعد ہر طرف تکلف و شایستگی کا دور دورہ ہوا۔ چونکہ دولت کی فراوانی تھی، اس لیے عوام عیش پسند ہو گئے تھے۔ انھیں آرایش و نفاست، رکھ رکھاؤ کا شدید تر احساس تھا۔ تکلف اور تصنع فطرت کا جزو اعظم بن چکے تھے۔ وہ شرافت و رواداری کا ایک بلند تصور رکھتے تھے۔ حکومت شیعہ تھی، اس لیے ایرانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ لکھنؤ اپنی مخصوص وضع قطع، لب و لہجہ، انداز گفتگو، ادب اور سلیقہ، نشست و برخاست سے ہندستان کے تمام دوسر باشندوں کی نسبت بلند و ممتاز ہو گیا تھا۔ سلاطین کی تعیش پسندی اور پست مذاقی کی بدولت لکھنؤ کی معاشرت میں طوائف اور بازاری ادنی درجے کی عورتوں کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ امیروں کی وضع میں یہ داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے، یا
اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور
تعلق رکھتے تھے اور اس لیے کہا جاتا تھا کہ جب تک رنڈی کی صحبت
نصیب نہ ہو، آدمی نہیں بنتا۔ لکھنؤ میں طوائفوں کے مکان شرفا کے کلب
تھے۔ اس کے علاوہ ہر خاص و عام کی تفریح کا مرکز میلے ٹھیلے اور
مقدس مقامات بھی تھے۔ چوسر، شطرنج، پچیسی، پتنگ بازی اور جانوروں
کی پالی سے دل بہلایا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں سے لکھنؤ والوں کی بے فکری،
حسن پرستی، فارغ البالی اور رومانی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ وہ اس
احساس سے بیگانہ ہو گئے کہ وہ زندگی کے زوال آمادہ دور سے گزر
رہے ہیں۔

اس پس منظر میں "غنائم لیق" کی تخلیق ہوئی۔ واسوخت میں میدان وسیع تھا۔ خود یہ واسوخت
طویل ترین تھا۔ لہٰذا عشق و وصل، سراپائے محبوب اور جاگیردارانہ نظام معاشرت
کی جھلکیاں مفصل پیش ہوئیں۔ کسی حقیقت کا اظہار باختصار یا زیر لب نہیں ہوا۔ جزئیات
نگاری میں بخل نہیں برتا گیا۔ جس طرح عیش عام تھا، اسی طرح اظہار تفوق بھی فطرت
میں داخل تھا۔ شاعر نے ایک طوائف کو پابند کیا، جو تہذیبی ماحول کے مطابق تھا،
اس کے بعد اس نے ہجر و وصل کی تصویر کشی کی جس میں شاعرانہ تفوق پنہاں تھا۔
شاعر کا کمال فن کہ اس نے ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس نے ہر چند وہ
تصویر بنائی جس سے گریز لازم تھا مگر اس نے تصویر کو تشبیہ، استعارہ اور کنایہ
کا لباس پہنایا جس سے ادبی بھرم قائم رہا۔ اسی واسطے یہ واسوخت ایک تہذیب
کا نمائندہ ہے، ایک ادبی کارنامہ ہے، اور ایک دور کے مخصوص حالات کی ادبی
علامت ہے۔

لکھنوی تہذیب کی طرح واسوخت لیق کی فضا لذت خواب شیریں کی طرح پر اثر
اور ہیجانی سکون سے بھری پڑی ہے۔ اگر اس فضا سے بے نیاز ہو کر "واسوخت لیق"

میں رسوم و معاشرت کی تلاش کی جائے، تو مایوسی نہیں ہوگی۔ لباس، زیور، طرزِ گفتگو، طعام، آدابِ مجلس وغیرہ لکھنوی معاشرت کے مطابق ہیں۔ مثلاً موتی بھری مانگ، افشاں، بالی پتے، بجلیاں، سرمہ، مسّی، پان، حمایل، موتی مالا، نورتن، پہنچی، چھا چلے، آرسی، انگوٹھی، پازیب، کڑے، چھڑے، آبِ رواں کا مصالحہ، کا دھانی دوپٹا، جالی کا محرم، گاج کی کرتی، کرتی میں بیٹی، اطلس کا پاجامہ وغیرہ اس عہد کا سامانِ زیبائش ہیں، جن کا اظہار اس واسوخت میں ہوا۔ اس واسوخت کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنے ماحول کا نقشہ وفاداری سے پیش کرتا ہے۔

منظر نگاری واسوخت میں منظر نگاری کا محل کم ہوتا ہے، کیونکہ وہ بنیادی طور پر عشقیہ نظم ہوتی ہے۔ تاہم واسوخت میں منظر نگاری کا اہتمام کیا گیا جو عموماً خانۂ محبوب یا باغ کی آرایش وغیرہ کو محیط ہوتی تھی۔ "غمنامۂ لیئق" میں ایک باغ کا منظر دس بندوں میں نظم کیا گیا ہے، جو اپنے گرانمایہ اسلوبِ نگارش کی وجہ سے واسوخت میں پیوست ہو گیا ہے۔ یہاں میں تین بند بطور نمونہ نقل کر رہا ہوں:

کھلکھلائی جو چنبیلی ہوئی شبّو بیزار   آنکھ سوسن سے لڑی، ہو گئی نرگس بیمار
دل میں خوش چنپا سے ریحاں، تو سمن سے گلنار   فاختہ سرو پہ، تو گل پہ فدا بلبلِ زار
پیچ سنبل نے وہ نتھے زلفِ سیاہ کے کھولے
رائے بانس نے بھی پاتال میں موتی رولے

نکہتِ جعدِ بنفشہ سے ہوا میں مائل   عشق پیچاں کے تھا پنجوں سے نکلنا مشکل
تازگیِ گلِ لالہ سے ہوا داغی دل   اور گلِ مہندی سے یاقوت سراسر بسمل
یکقلم بختِ چمن کا تھا شہنشاہ گلاب
بلبلِ مضطرب الحال کو تھا ماہ گلاب

مرتفع کوٹھی تھی اک اس میں نہایت زیبا   چھت منقش تھی، ہر اک کمرہ مصفّا اس کا
صاف شفّاف نیا فرش تھا موقع سے سجا   اس کی مسند پہ لگا یا تھا مغرق تکیہ

ملّا پرشاد لئیق

شبنمی اور چھپر کھٹ پہ جو دل مائل تھا
بخت بیدار کو آرام وہاں حاصل تھا

جذبات نگاری

چونکہ واسوخت میں ایک واقعۂ عشق نظم ہوا، لہٰذا اس میں عشقیہ جذبات کی حرارت ملتی ہے۔ یک نظری عشق، ملاقات، اقرار، وصل، فراق اور بالآخر معشوق کی موت تک گزرنے والے حالات اور ان کا جذباتی اظہار واسوخت میں رچا ہوا ہے۔ خود معشوق کی ناراضی، شکوہ شکایت اور وصل و مہجوری پر مشتمل جذباتی گفتگو واسوخت میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں جذبات کی تحلیل بھی ملتی ہے۔ واسوخت میں جذبات نگاری کی کافی گنجایش تھی اور شاعر نے اس کا بخوبی فائدہ اٹھایا ہے۔ سردست صرف دو مقامات سے چند بند بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

آخر اس کمرہ میں، میں غنچہ دہن کو لایا
چمن طبع میں گل عیش و طرب کا پھولا
دل میں بیتابی ہوئی، خوف گھٹا، شوق بڑھا
ڈورے آنکھوں میں پڑے، سر میں سمایا سودا
آتش خواہش دل تن میں جو یکسر بھڑکی
شادیٔ وصل میں بیساختہ چھاتی دھڑکی

ہاتھ جاناں کا پکڑ کر سوئے مسند کھینچا
وصل کا ڈھنگ ہر اک طرح سے ہم نے ڈالا
دیکھ کر شکل رکھائی سے ستمگر بولا
ہوش میں آئیے اپنے میں ذرا رہیے گا
چھایا جو وصل کی لذت کا مزا آنکھوں میں
بیدماغی کا نہ کچھ پاس رہا آنکھوں میں

اس کے بعد جو کچھ گزرا وہ واسوخت ہی میں پڑھنا چاہیے۔

مندرجۂ ذیل بندوں میں معشوق کی طرف سے جذبات رقابت کا اظہار ہوتا ہے:

گر مٹانا ہے تمھیں اس کو، مٹاؤ جا کر
شمع جس کو بنایا ہے، بجھاؤ جا کر
آگ تن میں تو ذرا اس کے لگاؤ جا کر
دل مرا ٹھنڈا ہو، گر اس کو جلاؤ جا کر
اس کی صورت جو کبھی دیکھے، تو اندھا ہووے

للتا پرشاد لیقؔ

اس کے کوچہ میں اگر جائے، تو لنگڑا ہووے

اس کے ملنے سے لگایا ہے یہ مجھ پر بہتان ثامت آئی ہے تری صدقہ کروں اسکی جاں

بیٹھا تو نے قیامت کا کیا ہے ساماں اس کی تعزیر تجھے دیگا خدائے دوجہاں

کوسوں کیا تجھ کو کہ مجبورِ محبت سے ہوں

پاس تیرا ہے نہیں، دُور محبت سے ہوں

کھاتا ہوں اب قسم ذاتِ خدائے قادر میں جو کہتا ہوں، کروں گا وہی، صاحبِ آخر

خوب احوال سے واللہ مرے ہو ماہر ملنے اپنے کرتا ہوں میں جو کچھ ظاہر

ورنہ کل حشر کے دن تم ہو، خدا ہے اور میں

آج فریاد ہے، زاری ہے، بُکا ہے، اور میں

سراپا نگاری

غمنامۂ لیقؔ میں چھ سراپا ہیں، جن سے واسوخت کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیقؔ کو سراپا نگاری سے زیادہ دلچسپی تھی؛ اس لیے جب بھی انھیں محبوب کے جسمانی اعضا کی قلمی تصویر کھینچنے کا موقع ملا، انھوں نے سراپا پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تمام سراپا نہ صرف دلچسپ ہیں، بلکہ انداز میں بھی۔ سراپا یہ چھ ہیں:

(۱) سراپا اصلی (۲) سراپا در خواب (۳) سراپا در تصوّر (۴) سراپا مصنوعی (۵) سراپا بہ طرزِ نو (۶) سراپا تسمیہ۔ ان میں سراپا اصلی، سراپا در خواب اور سراپا مصنوعی تو اس روش کے مطابق ہیں، جو واسوخت میں ملتی ہے؛ یعنی محبوب کے جسمانی اعضا کو تشبیہ اور استعارے میں بیان کرنا۔ چنانچہ آنکھ کو ساغرِ بادہ سے، ناک کو حاشیۂ مصحف سے اور کان کو گل سے تشبیہ دی گئی۔ مگر سراپا در تصوّر میں سراپا نگاری کا انداز ذرا مختلف ہے۔ شاعر کے عالمِ تصوّر میں جب چاند ابھرتا ہے، تو وہ محبوب کی لوحِ جبیں کا گمان کرتا ہے۔ اس کو جب سیاروں کا تصور بندھتا ہے، تو وہ محبوب کی افشاں یاد کرتا ہے۔ اسی طرح اس کو کیلے کے پھل کے ساتھ ابروے جاناں اور غنچۂ زنبق کے ساتھ بینیِ معشوق کا گمان ہوتا ہے۔ عام سراپا میں جبیں کو چاند سے، افشاں کو سیاروں سے،

لطائف شاد عشق

ابرو کو کیلے کی پھلی سے اور بینی کو غنچۂ زنبق سے تشبیہ دی جاتی، مگر شاعر نے عالم تصور کی رعایت سے دلآویز کیفیت پیدا کر دی، جو اُردو میں نئی نہ ہوتے ہوئے بھی نئی معلوم ہوتی ہے۔

دیکھ کر غنچۂ زنبق کو ہوئی بینی یاد ناک میں دم ہوا میرا، تو ہوا دل ناشاد
ہائے اس ہجر نے کیا مجھکو کیا ہے برباد دیکھیے وصل کی ملتی ہے صنم سے کب داد

یادِ عارض میں نظر آئے جو گلہائے چمن
خار لگنے لگا لطفِ رُخِ زیبائے چمن

سروِ آزاد جو گلشن میں مجھے آیا نظر قدِ موزوں کے تصور نے کیا دل مضطر
بڑھ کے میں اس سے ہم آغوش ہوا اور رو کر ہجرِ گلرد میں ہوا حال نہایت ابتر

لختِ دل کھاتا تھا اور خونِ جگر پیتا تھا
سختِ جانی سے نہ مرتا تھا، نہ میں جیتا تھا

سراپا بہ طرزِ نو میں معشوق شاعر کو اپنی پارسائی کا یقین دلاتا ہے، اور وہ اس طور پر کہ غیر نے اس کے بال چھوئے ہوں، تو اس کو سانپ کاٹے اور سر پر بلا چڑھے۔ اس طرح معشوق اپنے اعضا کا بیان کرکے کوستا ہے، جس میں یہ رعایت ملحوظ رکھی ہے کہ جو الفاظ کوسنے کے لیے استعمال کیے ہیں، وہ اعضا سے تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ سراپا ہے۔ ایک طرف شاعر کی یہ طرزِ نو سراپا نگاری لطف دیتی ہے، دوسری طرف معشوق کے جذبات کی بھڑک اس کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔

غیر نے بال اگر میرے چھوئے تیرے سوا سانپ کاٹے مجھے، اور سر پہ پڑے کالی بلا
لال ہو وے یہ زباں، بات جو کی ہو اصلا چھالے ہاتھوں میں پڑیں، پاؤں بیگر رکھا ہو چونا

جسم کو ہاتھ لگایا ہو تو مٹی ہو جائے
جیتے جی دم میں مری خاک اکٹھی ہو جائے

سر پہ گر ہاتھ رکھا غیر نے ہو، کٹ جاوے طالبِ زلف جو ہو اس پہ بلا گھر آوے
جعد کو جس نے چھوا ہو، اسے اژدر کھاوے جو ڑے کا باندھنے والا ابھی پھانسی پاوے

ملا پرشاد لئیق

ہاتھ رکھا ہو جبیں پر، تو خدا سے وہ پائے
دیکھا انشاں کو ہو جس نے تو طمانچے وہ کھائے

شاعر کو معشوق کی پارسائی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ قسمیں کھا کر معشوق سے کہتا ہے: صاف ہو جاؤ زیادہ نہ ستاؤ دل کو۔ وہ قسمیں معشوق کے اوصاف اعضا کی کھاتا ہے۔ کبھی اس طور پر کہ معشوق کے اعضا کا بیان اس کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اس طرح کہ اعضا کا بیان اول ہوتا ہے اور اس کے بعد صنعتِ لف و نشر مرتب میں ان کے اوصاف کا استعارۃً اظہار۔ یہ سراپا بھی دلچسپ ہے کیونکہ استاد از سراپا نگاری کے ساتھ جذبات کی حرارت شامل ہو گئی ہے:

کھاتا ہوں سر کی قسم، گنبدِ گردوں کی قسم   فرقِ پُر نور کی اور خطِ درخشاں کی قسم
جعدِ کافر کی قسم، سنبلِ پیچاں کی قسم   کالے ناگوں کی قسم، موئے پریشاں کی قسم

مشک عنبر کی قسم، طرّہ و کاکل کی قسم
گل و گلشن کی قسم، شورشِ بلبل کی قسم

سینہ و دل کی قسم، نورِ تجلّی کی قسم   نافہ چیں کی قسم، نافِ دلآرا کی قسم
مرآتِ صاف کی اور بطنِ مصفّا کی قسم   کمر و پشت کی اور لوحِ مطلا کی قسم

حسن و عفت کی قسم اور قسم عصمت کی
شرم و غیرت کی قسم اور قسم حرمت کی

رانِ بلّور کی قسم، ساقِ منوّر کی قسم   شمعِ روشن کی قسم، مرآتِ انور کی قسم
ایڑی تلوے کی قسم، ماہ کی اختر کی قسم   ناخنِ پا کی قسم اور دمِ خنجر کی قسم

چال کی اپنی قسم، فتنۂ محشر کی قسم
خیر ساقی کی قسم، بادۂ بے شر کی قسم

سراپا نگاری کا یہ عام دستور رہا ہے کہ شعرا معشوق کے قد و رخ سے ایڑی تلوے تک کی تعریف تشبیہات و استعارات کے پیرایے میں کرتے آئے ہیں اور ایسے اعضائے نسوانی جن کا ذکر کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، وہ بھی سراپا نگاری کے زد میں زیرِ قلم آ گئے ہیں۔

لطائف ارشاد لئیق

واسوخت میں سراپا پیش کرتے وقت لباس و زیور کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔ امانت کے یہاں یہی مروجہ انداز سراپا نگاری ملتا ہے۔ لئیق نے بھی ابتدا میں مروجہ روش پر عمل کیا، مگر بعد کو ان کی جودت طبع، مصورانہ صلاحیت اور قادرالکلامی نے سراپا کو صد رنگ بنا دیا، جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

واسوخت نے کبھی آبرو مندی کا دعویٰ نہیں کیا۔ واسوخت نے کبھی رمز و تصوف کا سہارا نہیں لیا۔ اس کے برخلاف جذبات و واقعات کا برملا اظہار کیا۔ سراپا لکھتے وقت ہر عضو نسوانی کی تعریف کی اور اشاروں اشاروں میں وہ سب کچھ کہہ دیا، جس کا کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا سراپا پر سرقیت و پست اخلاقی کا لیبل لگانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہماری نظر اعضائے نسوانی کی بجائے ان تشبیہات، استعارات، کنایات و اشارات پر پڑنی چاہیے، جو وسیلۂ شاعری ہیں اور جن کے معیار سے ادب کا معیار متعین ہوا ہے۔ ادب میں معشوق کے شانے اتنے اہم نہیں ہیں، جتنا ان کو "شان ملائک" کہنا یا اندام نہانی کو "چراغ کافور روشن بر طاق حسن" کہنا۔ اس کے علاوہ ایک ایسے سماجی پس منظر میں جس میں عورت کی معشوقیت جزو تہذیب بن گئی تھی اس عہد کے ادب کو معشوقیت سے علیحدہ کر کے دیکھنا ازلی ناانصافی کی بات ہے۔

اسلوب اردو شاعروں نے واسوخت سادہ و سلیس زبان میں لکھے۔ امانت جیسے شاعر نے اپنا واسوخت سادہ و سلیس زبان میں لکھا، حال آنکہ اُن کی غزل کا اسلوب پُرتصنع تھا۔ لئیق نے غزل و واسوخت میں پُرتصنع اسلوب اختیار کیا اور اس طرح واسوخت نگاری کی عام روش سے گریز کیا۔ میرے خیال میں لئیق نے پُرتکلف اسلوب بیان بالقصد اختیار کیا کیونکہ ان کا واسوخت امانت کے واسوخت کی شہرت کے زمانے میں لکھا گیا تھا اور اس کو مشہور و مقبول بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ واسوخت امانت کے اسلوب سے گریز کر کے پُرتصنع اسلوب اختیار کیا جائے۔

غمنامۂ لئیق میں اسلوب کو مندرجۂ ذیل ذرائع سے رنگ آمیز کیا گیا ہے:

لغات رشاد لیق

(۱) لغات کا استعمال جیسے گلرک، ارفن، غنچہ، زنبق، عقیقِ شجری، غلطاں وغیرہ

(۲) تراکیب کا استعمال جیسے بلبل مضطرب الحال، معدن بوئے خوش، دائرۂ عینِ کمال، کمندِ دلِ شیدا، خانۂ فکرِ قضا، صورتِ شیشۂ عینک، نافِ دل آرا، بادۂ بے سر چشمۂ بحرِ ذخار وغیرہ

(۳) صنعتوں کا استعمال مثلاً

م ہ رُخ سے ترے صاف خجل ماہ لقا | ل ب سے ہو ترے لعلِ یمن دل میں خفا
خ ال نے نقطے کیے دل میں پیدا | ج ان پہ ہے آہ قیامت برپا

از ازل دار دے دردِ دل تو ارم داری
آہ از دردِ دل زار کہ زارم زاری

(دو بند صنعتِ تجنیس درتیپ منفصل الحروف)

(۴) مضمون طرازی جیسے،

نفی اثبات کا دیتا تھا دہن اس کا نشاں | لب اعجاز نما پر تھا مسیحا قرباں
ہو سکے اس کی حلاوت کا قلم سے بیاں | قندِ مصری نے بھلا پائی مٹھائی یہ کہاں

جاں بلب لعل یمن ہوتا تھا لب کے غم میں
خوں بدخشاں کا بھی کرتا تھا وہ گلرد دم میں

مانگ موتی کی بھری ہے تری اے ماہ لقا! | نکلا وہ کوہ کو ہے چیر کے گویا دریا
سرِ عشاق جو اس مانگ نے ہے مانگ لیا | جاں نثاری میں رہا فرق نہ ان کے اصلا

کہکشاں سوئے ذنب باندھ کے دل آیا ہو
چڑھ کے کوکب پہ دیں پہ زحل آیا ہو

اسلوب کو رنگ آمیز کرنے کے لیے ناسخ اور ان کے متبعین نے بھی یہی ذرائع استعمال کیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لیتق کو واسوخت کی صنفی خصوصیت کے پیش نظر اپنے جذبات کی حرارت کو برتنے کا ولانا پڑا جس سے لغات و تراکیب، صنائع و مضامین بگھل سے گئے اور واسوخت میں مجموعی فضا عیش و غنائیت کی قائم ہو گئی۔

اگر داسوخت لئیق کے اسلوب پر مزید گفتگو کی جائے تو کئی حقائق کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) ناسخ کا دور ہندی الفاظ کے اردو شاعری میں استعمال ہونے کا ناسخ تھا۔ یہ اثرات اس دور کی شاعری پر مرتسم ہوئے اور ہر صنف سخن سے ہندی الفاظ کو خارج کر دیا گیا۔ لئیق نے غزل و قصیدہ وغیرہ میں عصری حالات کو قبول کرتے ہوئے فارسی زبان اور ایرانی مذاق کا تتبع کیا، مگر داسوخت میں ہندی الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کیا۔ بعض خالص ہندی افعال تک کا استعمال کیا جیسے ترنا بمعنی اچھلنا، نکلنا، پار لگنا۔

(۲) فارسی اور عربی لغات کا استعمال دو طرح پر ہوا:

(الف) ایسے فارسی و عربی الفاظ جو اردو میں مروّج نہیں تھے، یا اتنی قلت سے مروّج تھے کہ عوام ان سے نامانوس تھے۔ مثلاً قبچاق، خلطا، عقیق شجری وغیرہ

(ب) ایسے فارسی و عربی الفاظ جن کے کئی معنی تھے، مگر مشہو العوام معنی کو ترک کر کے نامانوس معنی میں استعمال کیے گئے۔ مثلاً مشتری بمعنی خریدار، فرہنگ بمعنی عقل، ادب، دانائی، دار بمعنی طرز و روزش مستعمل ہوئے۔

(۳) خارجی حسن کی تعریف میں ایسی تلمیحات کا استعمال کرنا جو مذہبی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً معشوق کی انگلیوں کے لیے یہ کہنا: طور کے نخل میں ہیں نور کی زیبندہ پھلی - یا شکم کی تعریف اس طرح کرنا: لوح محفوظ کی تحریر ہے اس سے پیدا۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سبھی وہ ذرائع تھے، جن سے مصنف کی قدرت بیان اور اسلوب کی گل افشانی کا اظہار ہوا۔ گمان ہے کہ لئیق نے کلیات ولی دکنی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا کیونکہ یہ خصوصیات ولی دکنی کے کلیات میں ملتی ہیں۔ دیگر دکنی شعراء کی طرح ولی نے بھی ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ عربی و فارسی لغات بھی استعمال کیے، ایسے بھی جو مروّج نہیں تھے اور ایسے بھی جن کے معنی عوام میں مروّج نہیں تھے۔ مثلاً الیماں، خنیاگر، دانہ اخردل، عبہری، بہر طلا اور رحیل و دغل وغیرہ۔ اسی طرح اس شعر میں:

ملا ارشاد لیئق

ستہ نگہ سوں بہ شکل رشانِ عسل دل ہوا گھر ہزار روزن کا
شان (عربی) بمعنی رعب و دبدبہ کے بجائے شان (فارسی) بمعنی بھڑوں کا چھتہ

یا اس شعر میں:
پری رویاں کے کوچے میں خبرداری سوں جانا دل کہ اطراف حرم میں ڈر ہمیشہ ہے حرامی
یہاں حرامی (عربی) قزاق اور لٹیرا کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔
ولی دکنی نے خارجی حسن کی تعریف میں مذہبی نوعیت کی تلمیحات کا استعمال کیا مثلاً،
جو تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا

مرادل چاند اور تیری نگہ اعجاز کی انگلی
کہ جس کی یک اشارت میں مجھے شق القمر دستا
"غمنامہ لیئق" کے اسلوب کی کلیاتِ ولی کے اسلوب سے اس مماثلت کے علاوہ واسوخت
لیئق میں توارد کی ایک ایسی واضح مثال ملتی ہے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے
کہ لیئق نے کلیاتِ ولی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ ولی دکنی کا مصرع ہے: تجھ مہر کا
ہوا ہے دل و جاں سے مشتری۔ لیئق نے لکھا: مشتری جس کا بصد مہر ہر اک شخص ہوا۔
"تا ہم الفاظ کا طلسم، ان کے معنی کی فسوں گری، حسنِ اسلوب کی تشکیل میں مدد کرتے ہیں۔ ولی
دکنی ہوں یا لیئق، علم و فضل کا تاج ان کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ الفاظ کے جوہری
تھے۔ انھوں نے کلامِ شعری میں الفاظ کو صنعت کارانہ طور پر استعمال کیا جس سے
ان کے اسلوب میں وہ وزن و وقار پیدا ہوا، جو کلاسیکل ادب کی جان ہے۔
لیئق کو بالخصوص اپنے واسوخت کے ذریعہ اپنی منجمد شخصیت کے خول سے باہر نکلنے کا
موقع ملا۔ واسوخت میں انھیں دل کی بات جذب واثر کے ساتھ کہنے کی آزادی تھی،
جس سے ان کے اسلوب میں نقش گری کے باوصف روانی پیدا ہوئی اور سنگلاخ ثقالت
کی بجائے معشوقیت و دلربائی نے راہ پائی۔ میرے خیال میں اپنے اسلوب کی وجہ سے
بھی لیئق کا واسوخت، اردو واسوخت کی تاریخ میں منفرد ہے۔

زبان واملا : واسوخت لیق میں بعض الفاظ کی ساخت اس طور پر ہے:

پانوں	بجائے	پاؤں	کوے۔کوا	بجائے	کنویں، کنواں
تجھے	بجائے	تمہیں (تمھیں)	مجکو	بجائے	مجھکو
اوس	بجائے	اس	کولوں	بجائے	کولھوں
جھونٹ جھوٹھ	بجائے	جھوٹ	ہونٹھ	بجائے	ہونٹ
اُنچے	بجائے	اونچے	ٹھنڈھا	بجائے	ٹھنڈا
جھوٹھا	بجائے	جھوٹا	میہمان	بجائے	مہمان
سات	بجائے	ساتھ	میٹھائی	بجائے	مٹھائی

(وغیرہ)

ان الفاظ کی موجودگی کے باوجود واسوخت کو کسی لسانی تقسیم میں نہیں رکھا جا سکتا، حال آنکہ اُس وقت (یعنی ۱۸۷۰ء میں) جب یہ واسوخت ضبطِ تحریر میں آیا، شمالی ہند میں یہ الفاظ اس طور پر مستعمل نہیں تھے۔ تاہم واسوخت کی زبان اس عہد کی مروّجہ معیاری وادبی اردو ہے۔

الفاظ کے املا میں بھی قدامت زیادہ ہے۔ واسوخت میں املا کی یہ خصوصیات ملتی ہیں:

(۱) ھ اور ہ، ی اور ے، ں اور ن میں امتیاز نہ کرنا (۲) الفاظ ملا کر لکھنا (۳) بدونِ اضافت و نقطہ لکھنا (۴) دو نقطوں کی بجائے ایک نقطہ لگانا اور ش کے تین نقطوں کی بجائے الٹا داؤ بنانا۔ (۵) الف ممدودہ کی بجائے الف مقصورہ لکھنا (۶) ئی اور ئے کی بجائے صرف ی، ے پر اکتفا کرنا (۷) یہہ بجائے یہ، اہل بجائے اہل، پادے بجائے پائے اور جایں بجائے جائیں لکھنا۔

متذکرہ بالا الفاظ کی ساخت اور املا کو دیکھ کر بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نسخہ کم سواد تھا (اگر نسخہ کاتب نے نقل کیا) ورنہ خود لیق نے زبان و املا پر توجہ نہیں دی، یا انھیں نظرِ ثانی کا موقعہ نہیں ملا۔

واسوخت میں زبان ومحاورہ، معانی الفاظ اور تراکیب کی تصرف کی مثالیں بھی

ملتا پرشاد لیق

واسوخت میں زبان و محاورہ، معانی الفاظ اور تراکیب کی وضع میں تصرف کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ زورِ بیان کی خاطر یا صنعت گری کی خاطر الفاظ کے زائد اور غیر ضروری استعمال کو بھی گوارا کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں مضامین خلافِ واقعہ ہیں' یا تلمیح کا استعمال صحیح نہیں ہوا ہے۔ یہاں مثالیں اس وجہ سے نہیں دی ہیں کہ اب نہ اُن سے لیق کو فائدہ پہنچیگا، نہ واسوخت میں اصلاح ممکن ہو گی۔ اس کے باوجود ان باتوں سے واسوخت کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہ واسوخت اردو واسوخت کی تاریخ میں منفرد اور یکتا ادب پارہ ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

واسوخت لیق سے ایک سال قبل (۱۸۶۹ء) منشی فدا علی نے ایک مجموعۂ واسوخت مسمیٰ "بہ شعلۂ جوالہ" نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع کرایا تھا۔ اردو واسوخت پر یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ واسوخت لیق کے بعد ایک اہم واسوخت "جذباتِ رضیؔ" ہے جس کے مصنف مولوی رضی احمد صدیقی بدایونی (متوفی ۱۹۳۹ء) ہیں۔ جذباتِ رضی بہ شکلِ مسدس ۲۶۷ بندوں پر مشتمل ہے، اور اس کو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے ستمبر ۱۹۶۳ء میں طبع کرادیا ہے۔ دراصل واسوخت جس تہذیب میں پیدا ہوا، اور جوان ہوا، وہ ختم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی واسوخت نگاری بھی معدوم ہو گئی۔ ہمارے کلاسیکی ادب کے گنجِ بے بہا میں واسوخت ایک تابندہ نگینہ ہے، جس کی دریافتِ نو ضروری معلوم ہوتی ہے۔

محمد منصور عالم

اُردو شعرا کے سنینِ وفات

(۱۳۰۰ھ تک)

شعرائے ریختہ کے تذکروں میں میر کے نکات الشعرا کو اول سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس موضوع پر محققین نے کافی بحث کی ہے۔ بحث میں الجھاؤ اس لیے پیدا ہوا کہ میر نے خود اپنے تذکرہ میں کہیں سال تصنیف نہیں لکھا ہے۔ انند رام مخلص کے ترجمے میں صرف ایک جملہ ملتا ہے: "تقریب یک سال است کہ در گزشت" اسی جملے سے مولوی عبدالحق نے نکات الشعرا کا سالِ تصنیف ۱۱۶۵ھ متعین کیا ہے کیونکہ مخلص کا سال وفات بقول اشپرنگر ۱۱۶۴ھ ہے۔

قدیم اُردو شعرا کے احوال میں ماہ و سال کی نشاندہی ملتی تو شاید اسی قسم کی بحثیں پیچیدہ نہ ہوتیں۔ شعرائے ریختہ کے چند ہی تذکرے ہیں، جن میں شعرا کے حالات میں ماہ و سال کا التزام کیا گیا ہے۔ تاریخ ولادت تو تذکروں میں شاذونادر ہی ملتی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سال وفات بتلانے کی کوشش کی ہے۔ اگر شعرا کے کم از کم سال وفات ہی یکجا کر دیے جائیں تو مفید ہوگا۔ تعیّن زمانہ سے ادب و تاریخ کے بیشتر مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

اسی مقصد سے میں نے تذکروں کی ورق گردانی شروع کی۔ جو کچھ ملا، جمع کیا لیکن وہ ناکافی تھا۔ اسی اثنا میں پروفیسر سید شاہ عطاالرحمٰن عطاؔ کاکوی کے تلخیص تذ

تذکرے نظر سے گزرے۔ پروفیسر موصوف نے کئی تذکروں کی تلخیص مع ترجمہ پیش کی ہے، اور آخر میں "تعلیقات" کے عنوان سے بعض شعرا کے سال وفات بھی دیے ہیں۔ میں نے ان سے استفادہ کیا۔ پھر، معاصر کی فائلیں پروفیسر کلیم الدین احمد کی عنایت سے دیکھنے میں آئیں۔ ان میں جناب قاضی عبدالودود نے "تعیّن زمانہ" کے زیر عنوان کئی شعرا کے سال ولادت و وفات کے بارے میں تفصیلی تحقیقی بحث کی ہے۔ اس کام میں مجھے "تعیّن زمانہ" سے کافی مدد ملی۔ میں اپنے ان بزرگ کرمفرماؤں کا شکر گزار ہوں۔

اس مضمون میں صرف ۱۳۰۰ھ تک کے شعرائے اردو دیے گئے ہیں۔ وہ بھی سب کے سب اس مضمون میں شامل نہیں۔ جو کچھ حاصل ہو سکا دی ہے۔ میری تلاش جاری ہے انشاء اللہ آیندہ بقیہ شعرا اور ۱۳۰۰ھ کے بعد کے شعرا بھی شامل فہرست ہونگے۔

بعض شعرا کے سال وفات سے متعلق تذکرہ نگاروں میں کافی اختلاف ہے۔ ایسی صورت میں وہی سال لکھا گیا ہے جو دوسرے شواہد سے ٹھیک ثابت ہوا ہے۔ مثلاً نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر کی تاریخ وفات ۲۸ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ ہے، لیکن "صبحِ گلشن" میں ۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ میں نے "صبحِ گلشن" کی تاریخ نقل نہیں کی ہے۔

بعض اوقات ایسی صورت بھی پیش آئی کہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس صورت میں جتنی تاریخیں ملی ہیں، میں نے وہ سب پیش کر دی ہیں، تاکہ محققین میری رہنمائی کر سکیں۔

ترتیب یوں ہے: نمبر شمار، تخلّص، نام، تاریخ وفات اور اس کے بعد بریکٹ کے اندر ماخذ۔ جہاں کہیں کسی کی کہی ہوئی تاریخ یا کوئی اور اطلاع ملی، وہ بھی درج کر دی گئی ہے۔

اردو شعرا کے سنین وفات

۱۔ آبرو ، شاہ نجم الدین ۔ ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ (سفینۂ خوشگو)
۲۔ آتش ، خواجہ حیدر علی ۔ ۱۲۶۳ھ (بزم سخن ، طور کلیم ، سخن شعرا)
۳۔ آرزو ، سراج الدین علی خاں ۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ میر غلام علی آزاد نے تاریخ وفات کہی :
"رحمت کامل بروح آرزو" (مسرت افزا)
۱۱۶۹ھ میر غلام علی آزاد نے تاریخ کہی :
بگو : "آں جان معنی آرزو رفت" (چمنستان شعرا)
(گلزار ابراہیم ۔ سخن شعرا)
۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (تعلیقات ، تین تذکرے ، مرتبہ مترجمہ عطا کاکوی)
۴۔ آزاد ، فقیر اللہ (یا محمد فاضل) ۔ ۱۱۴۸ھ "باغ معانی" سے تاریخ نکلتی ہے ۔ (تعلیقات ، چمنستان شعرا ۔ مرتبہ عطا کاکوی)
۵۔ آزاد ، میر غلام علی آزاد بلگرامی ۱۲۰۰ھ (نتائج الافکار)
۶۔ آزردہ ، مفتی صدر الدین (خان) ۲۵ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (سخن شعرا ، تذکرۂ علمائے ہند)
۷۔ آصف نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خان بہادر ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ (گلشن ہند)
۸۔ آفتاب ، ۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ ایک جنگ میں تیر سے گھائل ہو کر مرے ۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی :

نواب عدل گستر عالی جناب رفت
فرصت نداد تیغ حوادث شتاب رفت
در ہفدہم ز ماہ محرم شہید شد
تاریخ گفت نوحہ گری آفتاب رفت
(۱۱۶۴ھ) (نتائج الافکار)

۹۔ آفتاب، شاہ عالم ۱۲۲۱ھ (سخن شعرا۔ تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا۔ مرتبہ عطا کاکوی)

۱۰۔ آگاہ، سید علی رضا بلگرامی ۱۱۸۹ھ (نتائج الافکار)

۱۱۔ آگاہ، مولوی محمد باقر ۱۲۳۰ھ (نتائج الافکار)

۱۲۔ ابوالحسن، مرزا ابوالحسن ۱۲۰۰ھ (نتائج الافکار)

۱۳۔ اثر، میر محمد اثر ۱۲۰۹ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا۔ مرتبہ عطا کاکوی)

۱۴۔ اجمل، شاہ محمد اجمل الہ آبادی ۱۲۳۶ھ (سخن شعرا)۔

۱۵۔ احسان، حافظ عبدالرحمان خان ۱۲۶۷ھ (سخن شعرا۔ طور کلیم)

۱۶۔ احسن اللہ، احسن اللہ "سالے چند زیں پیش چشم از نظارۂ دنیا پوشیدہ و سر در نقاب خاک کشیدہ" (ریختہ گویاں) "۱۱۶۵ھ سے قبل وفات ہوئی ہوگی" (تعلیقات چمنستان شعرا، مرتبہ عطا کاکوی)

۱۷۔ اختر، قاضی محمد صادق خان ۱۲۷۰ھ (حواشی تذکرۂ ابن طوفان)

۱۸۔ اسیر، میر مظفر علی ۱۲۹۹ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا۔ مرتبہ عطا کاکوی)

۱۹۔ اشتیاق، شاہ ولی اللہ "سالے چند ازیں پیش راہ جادۂ مرگ پیمودہ" (ریختہ گویاں)۔ "مدت ہفت سال شد کہ ازیں دار البقا انتقال نمود" (مخزن نکات) ۱۱۵۰ھ (صبح گلشن)

۲۰۔ اشک، مولوی ہادی علی ۱۲۸۱ھ (صبح گلشن)

۲۱۔ اصغر، نواب علی اصغر خان ۱۲۷۶ھ (بزم سخن) ۱۱ ذیقعدہ عبدالغفور نساخ نے تاریخ وفات کہی: "شنبہ و ذیقعدہ ۱۱" "آہ دردا وہائے غم" ۱۲۷۶ھ، "علی اصغر موئے افسوس صد حیف آہ" ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء)

۲۲۔ اظہر، میر غلام علی، ۱۱۹۲ھ (گلزار ابراہیم۔ مسرت افزا)

۲۳۔ افسوس، میر شیر علی ۱۲۲۴ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا)

۲۴۔ افصح، شاہ فصیح۔ ۱۱۹۲ھ گلزار ابراہیم۔ تذکرۂ عشقی۔ تذکرۂ میر حسن)

۲۵۔ افضل، محمد افضل جھنجھانوی۔ ۱۰۳۵ھ (تعلیقات تین تذکرے)

۲۶۔ امامی، خواجہ امامی۔ ۱۱۷۷ھ (بزم سخن۔ سخن شعرا: مرشد آباد میں مجلس ۱۰ میں شدت گریہ سے انتقال کر گئے)

۲۷۔ امان، نواب محمد امان اللہ خان بہادر رئیس اعظم قصبہ پانی پت۔ ۱۳۰۶ھ شاد عظیم آبادی نے تاریخ وفات لکھی:

آں کہ مخدوم بود ما نایش / خان و نواب با امان اللہ
نتواں گفت مدح والایش / یادگارے ز خان صادق ما
در جہاں نیست مثل ہمتایش / حاجی و متقی و روشن دل
نائب شاہ جابر اعلایش / افتخار زمان و اہل زمیں
بہ بہشت برین بود جایش / از سرور سال فوتش بگو

(۱۳۰۲ - ۱۳۰۶)

منظومات شاد (قلمی، مکتوبہ نقی احمد ارشاد) مملوکہ کلیم الدین احمد)

۲۸۔ امانت، سید آغا حسن ۱۲۷۵ھ (سخن شعرا)

۲۹۔ امانی، میر امانی۔ محرم ۱۱۸۷ھ (گلزار ابراہیم۔ طبقات الشعرائے ہند، طبقہ اول) محرم کی راتوں میں تعزیہ داری میں بیہوش ہو کر انتقال کیا۔

۳۰۔ امتیاز، میر محسن [illegible]ھ (نتائج الافکار)

۳۱۔ امداد، شیخ غلام [illegible] (نتائج الافکار)

۳۲۔ امید، قزلباش خان ۱۱۵۹ھ گلزار ابراہیم۔ سخن شعرا)

اردو شعرا کے سنین وفات

تاریخ وفات میر نے کہی جس کا مادہ ہے:
"جان دادہ قزلباش خان" (چمنستان شعرا)
۹ جمادی الاول ۱۱۵۹ھ (تعلیقات، گلشن سخن، مرتبہ عطا کاکوی)

۳۳۔ امین، خواجہ امین الدین ۱۱۹۹ھ (بیاض محمد علی تمنا۔ بحوالہ تعیین زمانہ از قاضی عبدالودود۔ معاصر حصہ ۸)

۳۴۔ انجام، امیر خان (اصل نام محمد اسحاق) ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۶ھ لوگ کہتے ہیں ابراہیم۔ نواب آصف جاہ کے قصر کے دروازے پر غلام نے کٹاری مار کر مجروح کر دیا جس سے جانبر نہ ہو سکے اور انتقال کیا)
تاریخ وفات: "جان دادا میر خان انجام" (چمنستان شعرا)؛ (تعلیقات، چمنستان شعرا۔ مرتبہ عطا کاکوی؛ تعیین زمانہ از قاضی عبدالودود۔ معاصر ۸۔)

۳۵۔ انسان، اسد یار خان "سالے چند زیں پیش رخت از سرائے حدوث کشیدہ بجہان قدیم مائل گردیدہ"۔ (ریختہ گویاں) ۱۱۵۸ھ (سخن شعرا؛ تاریخ محمدی) ربیع الاول ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۵ اپریل۔ (تعیین زمانہ۔ معاصر حصہ ۸، تعلیقات تین تذکرے)

۳۶۔ انصاف، محمد یحییٰ۔ ۱۱۹۰ھ/۷۵-۱۷۷۶ء (سفینۂ ہندی)

۳۷۔ انشا، میر انشاء اللہ خان۔ ۱۲۳۲ھ معاصر، حصہ ۹)

۳۸۔ انصاف، شاہ غلام یحییٰ ۱۱۸۷ھ (مسرت افزا)

۳۹۔ انصاف، مرزا علی نقی خاں ۱۱۹۵ھ (نتائج الافکار، صبح گلشن)

۴۰۔ انیس، میر ببر علی۔ ۱۲۹۱ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا۔ مرتبہ عطا کاکوی)

۴۱۔ امجاد، سید امیر حسن۔ ۱۳۱۹ھ شاد عظیم آبادی نے تاریخ وفات کہی:

سالِ فوت حضرتِ ایجاد را "داخلِ خلد آمدہ" کردم رقم (۱۳۱۹ھ)
(منظوماتِ شاد (قلمی۔ مکتوبہ نقی احمد ارشاد) مملوکہ کلیم الدین احمد)

۴۲۔ ایجاد، مرزا علی نقی خان۔ ۱۱۸۹ھ (نتائج الافکار)
۴۳۔ بحر، شیخ امداد علی۔ ۱۳۰۰ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا)
۴۴۔ برق، مرزا محمد رضا۔ ۱۲۷۳ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا) ۱۸۵۷ء
(طور کلیم؛ بزم سخن)
۴۵۔ بقا، محمد بقا ۱۲۰۹ھ (گلشن ہند)
۴۶۔ بہار، لالہ ٹیک چند ۱۱۸۰ھ (تعلیقات، تین تذکرے)
۴۷۔ بھوپت رائے، بھوپت رائے۔ ۱۱۳۲ھ (نتائج الافکار)
۴۸۔ بیان، خواجہ احسن اللہ۔ ۱۲۱۳ھ (تعلیقات، تین تذکرے)
۴۹۔ بیتاب، شاہ علیم اللہ۔ ۱۲۲۳ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا، اردو زبان شناس)
۵۰۔ بیخبر، میر عظمت اللہ۔ ۱۱۴۲ھ (نتائج الافکار)
۵۱۔ بیدار، میر محمدی۔ ۱۲۰۹۔ (تعلیقات، تین تذکرے)
۵۲۔ بیدل، مرزا عبدالقادر۔ ۴ صفر ۱۱۳۳ھ" روز پنجشنبہ ۶ بجے دن
خوشگو نے تاریخ نکالی۔ "یوم پنج شنبہ چہارم ماہ صفر"
(تحقیقی مقالے: ۱۳۷۔ از پروفیسر عطا کاکوی)
۵۳۔ بیرنگ، دلاور خان۔ قیاساً ۱۱۶۴ھ (تعلیقات، تین تذکرے)
۵۴۔ بیکل، سید عبدالوہاب۔ ۱۱۹۰ھ (محبوب الزمن، بحوالہ تعلیقات، تین تذکرے)
۵۵۔ بیگ، حکیم بیگ خاں۔ ۱۱۸۲ھ (نتائج الافکار)
۵۶۔ پروانہ، راجا جسونت سنگھ عرف کاکا جی۔ ۱۲۲۸ھ (سخن شعرا: تاریخ
کاکا جی کے مرنے کی ناسخ نے یہ کہی: "پروانہ بمرد و شمع ہم دا برد"؛
خوش معرکۂ زیبا؛ تعین زمانہ، معاصر حصہ ۲)

۵۷۔ پیام ، شرف الدین علی خاں ۔ ۲ محرم ۱۱۵۷ھ (تعلیقات، چمنستانِ شعرا) مرتبہ عطا کاکوی ۔

۵۸۔ تاباں ۔ میر عبدالحیٔ ۱۱۶۳ھ کے لگ بھگ ۔ "در عینِ عنفوانِ جوانی خاک مال فلک خورد ، بساطِ حیاتِ مستعار برچیدہ داعیٔ اجل را اجابت کرد" (ریختہ گویاں) "ان کی وفات ۱۱۶۲ھ کے بعد اور ۱۱۶۵ھ کے قبل ہوئی ہوگی" (تعلیقات تین تذکرے) "وفات ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ میں ہوئی ہوگی" (تعلیقات چمنستان شعرا) (تعلیقات ، خوش معرکۂ زیبا) "تاباں کی وفات کثرتِ شراب نوشی کے سبب ہوئی ۔

۵۹۔ تراب ، شاہ تراب علی ۔ ۱۲۷۵ھ (سخن شعرا)

۶۰۔ تحقیق ، محمد علیم ۔ ۱۱۶۲ھ "تحقیق شدہ واصل حق" (سفینۂ خوشگو بحوالۂ تعین زمانۂ معاصر حصہ ۸)

۶۱۔ تسکین ، میر حسین ۔ ۱۲۶۸ھ (سخنِ شعرا ؛ بزم سخن ؛ طور کلیم)

۶۲۔ تمکین ، غلام بتول خاں ۔ ۱۲۸۸ھ (سخن شعرا)

۶۳۔ تمکین ، مولوی رحمت اللہ ۔ ۱۲۰۰ھ (تاریخ الافکار)

۶۴۔ تمنا ، خواجہ محمد علی ۔ ۱۱۳۲ھ (صبح گلشن ، نشترِ عشق)

۶۵۔ تنہا ، محمد عیسیٰ ۔ ۱۲۲۲ھ (تعلیقات ، خوش معرکۂ زیبا) "تاریخ اس کے مرنے کی جو ناسخ نے کہی ، وہ یہ ہے :
آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا" (خوش معرکۂ زیبا)

۶۶۔ ثاقب ، شہاب الدین ۔ ۱۱۸۵ھ (تعلیقات ، تین تذکرے) مرتبہ عطا کاکوی ۔

۶۷۔ ثاقب ، نجم الدین خاں ۔ ۱۲۲۹ھ (صبح گلشن)

۶۸ ۔ جرأت ، یحییٰ امان قلندر بخش ۔ ۱۲۲۵ھ (بزم سخن ؛ سخن شعرا ؛ طور کلیم)

(تاریخ کہی ہوئی یہ شیخ ناسخ کی ہے :

جب میاں ناسخ کا باغ دہر سے گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا ہائے ہندستان کا شاعر مُوا

(خوش معرکۂ زیبا)

۱۲۲۴ھ، "ناسخ کے قطعہ میں" ہندوستان" بغیر واو چاہیے
جس سے ۱۲۲۵ھ نکلتی ہے۔ صحیح تاریخ وفات ۱۲۲۴ھ ہے۔
(تعلیقات خوش معرکۂ زیبا) ۔ میاں مصحفی نے تاریخ اس
کی وفات کی کہی، وہ یہ ہے :

جب قلندر بخش جرأت مرگیا ریختہ کے دل میں خوں نے کھایا جوش
مصحفی نے یہ کہا سالِ وفات "ہو گئی گویا بلبل نالاں خموش"

(خوش معرکۂ زیبا)

۱۲۲۴ھ (طبقات الشعرائے ہند (دوم) تاریخ وفات
از راجا جسونت سنگھ پروانہ :

جو کہ کرتا ہے فکر شعر و سخن اس زمانے میں وہ غنیمت ہے
کہ نہ اگلے سے لوگ باقی ہیں نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے
اک سخن گو جو تھا قلندر بخش نام جرأت سے جس کی شہرت ہے
کر گیا کوچ اس مقام سے حیف آج منزل نشین حسرت ہے
ہے یہ تاریخ اول اور ثانی کہو "جنت نصیب جرأت ہے"

۶۹۔ جرأت ، محمد ہاشم موسوی خان ۔ ۱۱۷۵ھ (تتائج الافکار) ۱۲۲۴ھ

۷۰۔ جعفر ، میر جعفر۔ پروفیسر عطاء الرحمان عطا کاکوی نے اپنے کتب خانے
کے "مخزن نکات" میں حاشیے پر لکھا ہے : "روایت ہے کہ ایک
ہجو لکھنے کے جرم میں فرخ سیر کے حکم سے ۱۱۲۴ھ کے لگ بھگ
انھیں قتل کیا گیا"۔

اردو شعرا کے سنین وفات

۷۱۔ جہاندار، مرزا جوان بخت۔ ۱۲۰۱ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا، گلشن ہند؛ گلشن بہار) ۱۲۰۲ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا) مگر یہ تاریخ صحیح نہیں ہے۔ "معاصر شاہ آبرو و مرزا محمد رفیع سودا بود" (گلزار ابراہیم) تعینِ زمانہ معاصر حصہ ۲ میں تفصیلی بحث ہے۔

۷۲۔ حاتم، ظہور الدین۔ ۱۱۹۷ھ (تعلیقات، نیز تا تذکرے)

۷۳۔ حزیں، شیخ محمد علی۔ ۱۱۰۴ھ (نتائج الافکار)

۷۴۔ حزیں، میر محمد باقر۔ ایک خوبرو نوجوان کے عشق میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ مسرت افزا میں تفصیل ہے۔ "پورنیہ میں انتقال ہوا" (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا۔ عطا کاکوی)

۷۵۔ حسرت، مرزا جعفر علی۔ ۱۲۰۰ھ (بزم سخن، طور کلیم؛ سخن شعرا) ۱۲۰۶ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا؛ تعینِ زمانہ از معاصر حصہ ۱) ۱۲۱۰ھ (گلشن ہند) ۱۲۰۶ھ صحیح ہے۔ قاضی عبدالودود نے تعین زمانہ رسالۂ مذکور میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۷۶۔ حسرت، ہیبت قلی خان محمد حیات۔ ۱۲۱۰ھ (گلشن ہند)

۷۷۔ حسن، خواجہ حسن۔ ۱۲۴۱ھ (تعلیقات، خوش معرکۂ زیبا)

۷۸۔ حسن، مولوی محمد حسن۔ ۱۲۸۸ھ (سخن شعرا)

۷۹۔ حسن، شیخ محمد حسن علی۔ ۱۲۸۲ھ (تعین زمانہ معاصر حصہ ۱)

۸۰۔ حسن، میر حسن۔ ۱۲۰۱ھ (بزم سخن۔ طور کلیم، سخن شعرا) "شاعرِ شیریں زباں" وفات کی تاریخ ہے۔ (بزم سخن) ۱۲۰۱ھ عشرۂ محرم (تعلیقات، گلشن ہند) "میاں مصحفی صاحب نے تاریخ ان کے انتقال کی یہ کہی:

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں

رو ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود طبعش مصحفی
"شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت
(خوش معرکۂ زیبا) "۱۲۰۵ھ میں سیر روضۂ رضواں کی کی ہے" (گلشن ہند) مگر یہ تاریخ غلط ہے۔

۸۱۔ حشمت، محمد علی حشمت۔ ۱۱۶۱ھ دیوانِ تاباں میں ایک مرثیہ ہے جس کا آخری بند ہے:

تیرا تاباں غریب و خستہ جگر — فکر تاریخ میں تھا جو مضطر
مصرعِ آخری پہ کی جو نظر — "کہ اسے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر
"ہائے حشمت شہید دا دیلا"

بحوالہ تعین زمانہ معاصر حصہ ۸۔ قطب الدین خان کی طرف سے علی محمد خان روہیلہ کی فوج کے ساتھ لڑائی میں مرادآباد میں کام آگئے۔ محمد انصار اللہ نظر۔ "ہفتہ وار" ہماری زبان" علی گڑھ۔ ۲۲ جون ۱۹۶۹ء

۸۲۔ حشمت، مرزا غلام فخر الدین۔ ۱۲۶۷ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا)

۸۳۔ حشمت، میر محتشم علی خان۔ ۱۱۶۳ھ "ارتحالش در زمان محمد شاہ فردوس آرامگاہ است" (گلزار ابراہیم) "و آں مرد (میر محتشم علی خان) از نامردی روزگار ناہنجار فوراً فوت شد" (نکات الشعرا) "درد دلی وفات یافتہ" (گلشن گفتار) "قبل ازیں ہفت سال بمرگ دفعتاً از جہاں رفت" (مخزن نکات) (نتائج الافکار؛ طبقات الشعرائے ہند؛ صبح گلشن)

۸۴۔ حقیقت، میر شاہ حسین۔ ۱۲۴۹ھ (معارف، جولائی ۱۹۶۸ء)

۸۵۔ حیا، لالہ شیو رام داس۔ ۱۱۴۴ھ (نتائج الافکار)

۸۶۔ حیدر، سید حیدر علی شاہ۔ عمرش قریب بصد سال رسیدہ در عہد احمد شاہ

ابن محمد شاہ فردوس آرامگاہ در صوبۂ بنگال ارتحال نمود
(گلزارِ ابراہیم)

۸۷۔ حیرت، پنڈت اجودھیا پرشاد۔ ۱۲۳۵ھ (سخن شعرا۔
۸۸۔ خانِ دوراں، امیر الامرا صمصام الدولہ۔ ۱۱۵۱ھ (تاریخ الافکار، صبحِ گلشن)
۸۹۔ خبیر، سید مہدی بلگرامی۔ "چالیس سال کی عمر میں رحلت کی"
(بزمِ سخن)
۹۰۔ خسرو، حضرت امیر خسرو۔ ۷۲۵ھ شبِ جمعہ۔ ایک تاریخ گو نے
تاریخِ وفات کہی:

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او
دیگرے شد "طوطیِ شکر مقال" (؟)

۹۱۔ خلیق، میر مستحسن۔ ۱۲۰۰ھ میر مستحسن خلیق نے انتقال کی۔ اس نے
(خواجہ صاحب علی راوی) یہ تاریخ کہی:

میر خلیق نکتہ سنج دارِ فنا کو چھوڑ کر
خلق کے دل پہ کوہِ غم اپنے الم کا دھر گئے
راویِ خستہ حال نے فکر جو فرطِ غم سے کی
ہاتفِ غیب نے کہا: "میر خلیق مر گئے"

تعینِ زمانہ معاصر حصہ ۱)

۹۲۔ خلیق، مرزا ظہور علی۔ ۱۱۹۹ھ تک زندہ تھے (بحوالۂ گلزارِ ابراہیم)
۹۳۔ خلیل، نواب علی ابراہیم خان۔ ۲۳ محرم ۱۲۰۸ھ (تذکرۂ عشقی)
شیخ وجیہ الدین عشقی نے تاریخِ وفات کہی:

خانِ ذی قدر، صاحبِ دانش کرد رحلت چو در ریاضِ نعیم
گفت سالِ وفات او رضواں شد بہ جنت مقیم ابراہیم

(تذکرۂ عشقی)

۹۴۔ خواجہ، مولوی عبدالعزیز۔ ۱۲۸۸ھ (سخن شعرا)
۹۵۔ خورشید، میر خورشید علی بلگرامی "او آخر آیۂ ثانی عشرہ رہ نورد آخرت گردید (نتائج الافکار)
۹۶۔ خوشدل، مصطفیٰ علی خاں۔ ۱۲۳۴ (نتائج الافکار)
۹۷۔ خیالی، منشی خیالی رام۔ ۱۲۸۹ھ (صبح گلشن)
۹۸۔ داغ، مولوی وجہ اللہ۔ ۱۱۸۸ھ (سخن شعرا)
۹۹۔ داغ، میر مہدی۔ "بیس سال کی عمر میں ایک حسین عورت کو دل دے بیٹھے ... پھر اس کے فراق میں جان دے دی" (بزم سخن)
۱۰۰۔ داؤد، مرزا داؤد اورنگ آبادی۔ ۱۱۵۷ھ (چمنستان شعرا) لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ کہی:
"برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں"
۱۰۱۔ دبیر، مرزا سلامت علی دبیر ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ (صبح گلشن)
۱۰۲۔ درد، خواجہ میر درد ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز جمعہ (بزم سخن)
۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز آدینہ (سخن شعرا) ۱۱۹۹ھ
(طبقات الشعرائے ہند اول، نتائج الافکار) ۱۲۰۲ھ
(گلشن ہند) گلشن ہند کی تاریخ غلط ہے۔
۱۰۳۔ درد، میر کریم اللہ خاں "بعہد احمد شاہ بن محمد شاہ فردوس آرامگاہ ہمراہ میر علی اصغر کبری در معرکۂ مرہٹہ شہید گردید" (گلزار ابراہیم)
۱۰۴۔ دردمند، محمد فقیہہ صاحب۔ ۱۱۷۶ھ (گلزار ابراہیم) ۱۱۷۳ھ
(صحف ابراہیم) ۱۱۶۷ھ (سخن شعرا) ۱۲۰۰ھ (نتائج الافکار) ۱۰۵
۱۰۵۔ دیوانہ، سرب سنگھ۔ ۱۲۰۳ھ (تعلیقات گلشن ہند و خوش معرکۂ زیبا)
۱۲۰۴ھ (گلشن ہند) صحیح ۱۲۰۳ھ ہے۔ (تذکرۂ ہندی بحوالۂ تعیین زمانۂ معاصر حصہ ۸)

۱۰۶۔ ذکار، لالہ خوب چند۔ ۱۲۶۳ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)
۱۰۷۔ ذوق، شیخ محمد ابراہیم۔ ۱۲۷۱ھ (سخن شعرا) عبدالغفور نساخ نے تاریخ کہی: "انتقال شاعر کامل ہوا" (سخن شعرا)
۱۰۸۔ ذوقی، میر عبدالواحد بلگرامی۔ ۱۱۳۴ھ (تذکرۂ الافکار)
۱۰۹۔ راسخ، غلام علی۔ ۱۲۳۸ھ (طور کلیم؛ سخن شعرا)
۱۱۰۔ راغب، جعفر راغب پانی پتی۔ بارھویں صدی کے آخر میں رحلت کی۔ (تذکرۂ الافکار)
۱۱۱۔ رحیم، عبدالرحیم۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۰ھ (گلشن گفتار)
۱۱۲۔ رسا، مرزا محمد تقی۔ ۱۲۲۳ھ (صبح گلشن) ۱۲۳۳ھ (تذکرۂ الافکار)
۱۱۳۔ رسوا، آفتاب رائے، "مدت چند ماہ است کہ بہمیں احوال از جہاں رفت" (مخزن نکات) "۱۱۶۸ھ کے لگ بھگ مرے ہونگے" (تعلیقات چمنستان شعرا)
۱۱۴۔ رسوا، جتاب رائے۔ "گویند، در ایام سلطنت محمد شاہ فردوس آرامگاہ اسلام اختیار کردہ .... و آخر کار در دہلی بہمان عہد ازیں جہاں درگذشت" (گلزار ابراہیم)
۱۱۵۔ رشک، میر علی اوسط۔ ۱۲۸۴ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)
۱۱۶۔ رنج، میر محمد نصیر محمدی۔ ۱۲۶۱ھ (سخن شعرا)
۱۱۷۔ رند، سید محمد خان۔ ۱۲۷۰ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)
۱۱۸۔ رنگین، سعادت یار خان۔ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ (بزم سخن سخن شعرا؛ طور کلیم)
۱۱۹۔ رنگین، نورالدین حسین خان اورنگ آبادی ۱۱۷۲ھ "عین جوانی میں رحلت کر گئے۔ مہربان نے ان کی تاریخ وفات کہی: باجل رفت از جہاں رنگین"

۲۴ جمادی الثانی ۱۱۷۰ھ "روز جمعہ ایک گھڑی دن ہونے کے بعد شہر ایلیچپور میں رنگین کی اچانک موت ہوئی۔ فقیر مؤلف نے بھی تاریخ کہی: بمرگ مفاجات او شد ز دنیا

۱۲۰۔ رونق، منشی رام سہائے ۱۲۹۰ھ (صبح گلشن)

۱۲۱۔ زائر، محمد فاخر ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ (تعیین زمانہ معاصر حصہ)

۱۲۱۔ زخمی، مہاراجا رتن سنگھ ۱۲۶۷ھ (صبح گلشن)

۱۲۱۔ سامان، میر ناصر ۱۱۴۷ھ "سالے چند از یں پیش امانت جان بمقتضائے اجل تسلیم نمود و مراحل مرگ پیمود" (ریختہ گویاں) "میں شہید ہو گئے" (صبح گلشن)

۱۲۱۔ سبقت، مرزا مغل "شیخ امام ناسخ کو اس سے محبت بلکہ عقیدت تھی۔ تاریخ اس کی وفات کی ناسخ نے کہی ہے:

مرزا مغل کہ بود ز اُستاد ما | امروز رفت سوے جناں وامصیبتا!
کردیم بہر سال وفاتش چنیں رقم | شد میرزاے ما زجہاں وامصیبتا!

(خوش معرکۂ زیبا) ۱۲۳۵ھ (سخن شعرا)

۱۲۱۔ سحر، سید ناصر علی ۱۲۴۹ھ "دل احباب اس کے مرگ سے ناخوش ہے۔ تاریخ اس کے فوت کی شیخ نے کہی ہے۔ اس کی بیت آخر یہ ہے:

سید عالی نسب ناصر علی | پنجشنبہ زیں جہاں رحلت نمود

(خوش معرکۂ زیبا) ۱۲۴۹ھ (بزم سخن، سخن شعرا)

۱۲۔ سراج، سراج الدین ۱۱۷۷ھ "میر اولاد محمد ذکا بلگرامی نے تاریخ وفات کہی: "سراج بزم ارم را نمودہ نورانی"

(صبح گلشن)

۱۔ سرشار، ہیرا لال معروف بہ شیام سندر ۱۲۸۴ھ (صبح گلشن)

۱۔ سرور، اعظم الدولہ ۱۲۵۰ھ (طور کلیم، سخن شعرا)

۱۲۹۔ سرور، رجب علی بیگ۔ ۱۲۸۶ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا) از عطا کاکوی

۱۳۰۔ سعادت، میر سعادت علی "ہنوز بیش بعہد رسیدہ بود کہ بہ آزار تپ محرقہ از جہان رفت۔ (مخزن نکات) ۱۱۶۸ھ کے لگ بھگ (تعلیقات، تین تذکرے)

۱۳۱۔ سعدی، سعدی کاکوروی (عہد اکبر کے شیخ کمال الدین مخدوم سعدی) ۹۸۲ھ (تاریخ بدایونی بحوالۂ، تعلیقات تین تذکرے)

۱۳۲۔ سعید، قاضی محمد سعید الدین۔ ۱۲۶۲ (صبح گلشن)

۱۳۳ سلام، نجم الدین "ہمراہ لشکر نواب صفدر جنگ پورب رفتہ ودیعت حیات سپرد" (مخزن نکات)

۱۳۴۔ سلطان، خواجہ سلطان جان، ۱۲۷۱ھ (بزم سخن) ۱۲۷۲ھ (... راقم نے تاریخ ان کی وفات کی کہی:

سال مرگ او چو جستم از سروش

"خواجہ سلطان جان بمرد افسوس" گفت

(سخن شعرا)

۱۳۵۔ سلطان مرزا، سید تجمل حسین خان۔ ۱۸۹۹ء شاد عظیم آبادی نے تاریخ کہی

پے سال رحیلش بے سراغ برگفتم

"زوال سلطان من باصد تجمل کرے جنت"

(۱- ۱۹۰۰ = ۱۸۹۹)

(منظومات شاد (قلمی، مکتوبہ نقی احمد ارشاد) جلوۂ کلیم الدین)

۱۳۶۔ سلیم، میر محمد سلیم۔ ۱۱۹۵ھ (گلزار ابراہیم۔ مرشد آباد میں انتقال اور دفن ہوئے)

۱۳۷۔ سلیمان، مرزا سلیمان شکوہ۔ ۱۲۵۳ھ "رحمت خدا" تاریخ ہے۔ (

سخن شعرا)

۱۳۸۔ سودا، مرزا محمد رفیع ۱۱۹۵ھ (گلزار ابراہیم) میر قمر الدین منت
نے تاریخ وفات اس طرح کہی:
رفیع مرتبت ملک شاعری سودا + کہ او بہار سخن بود و فاسرانش دے
چو کردہ سال وفاتش ز دل طلب منت + بگفت: گوہر معنی یتیم شد ہے ہے!
(گلزار ابراہیم) "آغا باقر کے امام باڑے میں مدفون ہوئے۔
(خوش معرکۂ زیبا) خوش معرکۂ زیبا میں یہ تاریخیں لکھی ہیں:

(۱) خلد کو جب حضرت سودا گئے فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منفعت دو رکیا ئے غا "شاعران ہند کا سرور گیا"
(میر فخر الدین ماہر)

(۲) مرزا رفیع آنکہ اشعار ہندیش
ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان علو
ناگہ چو در نوشت بساط حیات را
گردید مدفنش ز قضا خاک لکھنو
تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی
"سودا کجا و آں سخن دلفریب کو"
(مصحفی)

(۳) مضمون تازہ جستن، شعر لطیف گفتن
با خویش بردا ایوا مرزا رفیع سودا
تاریخ رحلت او گفتم بر تربت او
"امروز مرد ایوا، مرزا رفیع سودا"
(ناسخ)

۱۳۹۔ سوز، محمد میر ۔ ۱۲۱۲ھ (گلشن ہند) ۱۲۱۳ھ (تعلیقات گلشن ہند)

نیز تعلیقات تین تذکرے، مرتبہ عطا کاکوی) "شیخ امام بخش
ناسخ نے تاریخ جوان کی وفات کی کہی" وہ یہ ہے!
اٹھ گیا میر سوز دنیا سے ہائے صاحب کمال وا ویلا!
سال تاریخ ہے یہی ناسخ! "شاعر بے مثال وا ویلا!
(خوش معرکہ زیبا)

۱۴۰۔ سید، میر غالب علی خان ۱۲۱۸ھ (سخن شعرا) پہلے غالب اور
آشنا تخلص کرتے تھے

۱۴۱۔ شاعر، میر سید محمد ۱۱۵۰ھ (نتائج الافکار) (نشتر عشق: ۲۸ شعبان
۱۱۸۵ھ۔ لیکن یہ غلط ہے) ۸ شعبان بشب شنبہ ۱۱۸۵ھ۔
(تذکرۂ علمائے ہند۔ بحوالہ تعیین زمانہ۔ معاصر ۸)
آزاد نے تاریخ وفات کہی:
"رفت قدسی زماں سید محمد از جہاں"

۱۴۲۔ شعاع، محمد اکبر شاہ ثانی (خلف شاہ عالم آفتاب) ۱۲۵۳ھ (تذکرہ)

۱۴۳۔ شورش، مرزا منم، ۱۱۷۲ھ (چمنستان شعرا) لچھمی نرائن شفیق
تاریخ وفات کہی: "مرگیا آہ شورش ہمدم"

۱۴۴۔ شورش، میر غلام حسین۔ ۱۱۹۵ھ (گلزار ابراہیم، گلشن ہند،
سخن شعرا)

۱۴۵۔ شوق، تصدق حسین خان۔ ۱۲۸۸ھ (مثنوی زہر عشق، مرتبہ
عطیہ نشاط)

۱۴۶۔ شوق، شیخ الٰہی بخش۔ ۱۲۴۱ھ (بزم سخن، سخن شعرا)

۱۴۷۔ شوق، قدرت اللہ ۱۲۲۴ھ (تعلیقات، خوش معرکہ زیبا)

۱۴۸۔ شہید، مولوی محمد باقر۔ ۱۱۷۸ھ (نتائج الافکار)

۱۴۹۔ شہید، میر رستم علی۔ ۱۱۵۵ھ شاد عظیم آبادی نے تاریخ کہی

میر رستم علی عالی جاہ — مادر دہر کہ نزاد چوں او
از سر گریہ سال فوتش را — "آں رستم علی شہید" ، بگو
(منظومات شاد قلمی)

۱۵۰۔ شہیدی ، منشی کرامت علی ۔ ۴ صفر ۱۲۵۶ھ "روضۂ اطہر پر نظر پڑتے ہی جان بحق تسلیم ہو گئے" (طور کلیم ، سخن شعرا)

۱۵۱۔ شیفتہ ، نواب مصطفےٰ خاں ۔ ۱۲۸۶ھ (طور کلیم ؛ بزم سخن ، سخن شعرا ؛ صبح گلشن)

۱۵۲۔ صاحب ، صاحب عالم مارہروی ۔ ۲ محرم ۱۲۸۸ھ (تواریخ آل محمد ، بحوالہ التعیین زمانہ معاصر حصہ ۸)

۱۵۳۔ صانع ، نظام الدین احمد ۔ ۱۱۷۸ھ (نتائج الافکار) ۱۱۹۵ھ "سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتہ میں ایام زندگی بسر کرتے تھے ۔ آخر سنہ ہجری میں ملک وجود سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے" (گلشن ہند) بقول صاحب مسرت افزا شاہ عالم بادشاہ کا جلوس تخت نشینی ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو وقوع پذیر ہوا ۔ اس حساب سے سنہ بائیسویں جو صانع کا سال مرگ ہے ، ۱۱۹۵ھ قرار پاتا ہے ۔

۱۵۴۔ صبا ، خواجہ عبدالرحیم ۱۲۸۸ھ (سخن شعرا)

۱۵۵ صبا ، میر وزیر علی ۔ ۱۲۷۱ھ (بزم سخن ، سخن شعرا ، طور کلیم) گھوڑے سے گر کر انتقال ہوا ۔

۱۵۶۔ صبائی ، (؟) ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (تعلیقات ، تین تذکرے) حملۂ نادری میں ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ کو زخمی ہوئے اور ۱۹ ذی الحجہ سال رواں کو ۶۸ سال کی عمر میں وفات پائی ۔

اردو شعرا کے سنین وفات

۱۵۷۔ صید ، مولوی عبدالباری ۔ ۱۲۷۴ھ (سخن شعرا۔ نساخ نے تاریخ وفات کہی: "دل یہ بولا کہ "قضا کی ہے میرے بھائی نے") عین عالم شباب میں اپنے وطن فرید پور میں انتقال کیا۔

۱۵۸۔ ضمیر ، میر مظفر حسین ۔ ۱۲۷۲ھ (تمابی تحویر' دہلی ۔ لا)

۱۵۹۔ ضمیر ، سید ہدایت علی خان۔ "اوائل سلطنت شاہ عالم بادشاہ باز بعظیم آباد آمدہ رحل اقامت انداخت و در حسین آباد برحمت الہی پیوست ۔ (گلزار ابراہیم)

۱۶۰۔ ضیا ، میر ضیاء الدین ۔ ۱۱۹۴ھ (بزم سخن ؛ سخن شعرا؛ طور کلیم)

۱۶۱۔ ضیغم ، حافظ اکرام احمد ۔ ۱۲۸۶ھ (بزم سخن ؛ سخن شعرا)

۱۶۲۔ طالب ، طالب علی ۔ ۱۲۰۶ھ تذکرۂ عشقی" طالب علی در قرب احمد یاف جا

۱۶۳۔ طالع ، میر شمس الدین ۔" در عین عنفوان جوانی مرغ روحش بسر پنجۂ شاہین اجل گرفتار گردید" (ریختۂ گویاں)

۱۶۴۔ طپاں ، مرزا احمد بیگ خان ۱۸۳۴ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا)

۱۶۵۔ طپش ، محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان ۱۲۲۹ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)

۱۶۶۔ ظاہر ، خواجہ محمد جان ...... در زمان محمد شاہ فردوس آرامگاہ انتقال نمود (گلزار ابراہیم) "میرزا مظہر بگفتار آمدہ بود: ظاہر ا بعد دو روز نادر شاہ راہِ مراحل مرگ پیمود" (ریختۂ گویاں)

۱۶۷۔ ظفر ، بہادر شاہ ۔ ۱۲۷۹ھ (بزم سخن ؛ سخن شعرا) ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی ۔

۱۶۸۔ ظل اللہ ، محمد قلی قطب شاہ ۔ ۱۰۲۰ھ (صبح گلشن)

۱۶۹۔ ظہور ، ظہور علی ۔ ۱۲۸۶ھ (تعین زمانۂ معاصر حصہ ۱)

۱۷۰۔ عابد ، خواجہ عبدالرحیم نقشبندی ۔ ۲ ذی قعدہ ۱۲۲۵ھ (تعین

معاصر حصہ ۸) ۔

۱۷۱۔ عاجز، عارف الدین خان ۔ ۱۱۷۸ھ (نتائج الافکار)

۱۷۲۔ عارف، سیّد محمد عارف ۱۱۸۷ھ ـــــ (نتائج افکار)

۱۷۳ عارف، نواب زین العابدین خان ۔ ۱۲۶۸ھ (بزمِ سخن؛ سخنِ شعرا؛ طورِ کلیم)

۱۷۴۔ عاشق، علی اعظم خان "چند سال است کہ وفات یافت" (گلزارِ ابراہیم)

۱۷۵۔ عاشق، میر قاسم خان ۔ ۱۲۰۰ھ "اوا خر زمانۂ ثانی عشر درگزشت" (نتائج الافکار)

۱۷۶۔ عاصم، صمصام الدولہ خان دوران خواجہ عاصم، ۱۱۸۰ھ (سخنِ شعرا) ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (تعیّنِ زمانہ معاصر حصہ ۸)

۱۷۷۔ عاصی، خواجہ برہان الدّین ۔ "سابق بریں دو سال از جہان رفت" (مخزنِ نکات) غالباً ۱۱۶۶ھ (تعلیقات، چمنستانِ شعرا) مرتبہ عطا کاکوی ۔

۱۷۸۔ عاصی، نور الدین محمد خان ۔ ۱۲۰۰ھ اوا خر مآئہ ثانی عشر درگزشت (نتائج الافکار)

۱۷۹۔ عباس (مرزا) سیّد اظہار حسین ۔ ۴ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ ۔ شاد عظیم آبادی کے والد تھے ۔ خود شاد نے تاریخ وفات کہی :

میر عباس رئیس نامی ‏ رفت ازیں عالمِ پرشور و شین

گفت یحییٰ من تو تش اے شاد ‏ باد حشرش بہ علمدارِ حسین"

(منظوماتِ شاد ۔ قلمی)

۱۸۰۔ عرشی، میر احمد حسین ۔ ۱۲۷۷ھ (بزمِ سخن)

۱۸۱۔ عزّت، شیخ فقیہہ الدّین ۔ ۱۲۰۰ھ "اوا خر زمانۂ ثانی عشرہ دارِ فانی واگذاشت" (نتائج الافکار)

۱۸۲۔ عزلت، سید عبدالولی۔ ۱۱۸۹ھ (نتائج الافکار) ۱۶ رجب ۱۱۸۵ھ (تعلیقات گلشن ہند)

۱۸۳۔ عشق، شاہ رکن الدین گھیٹا۔ ۱۲۰۳ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)

۱۸۴۔ عظیم، مرزا عظیم بیگ۔ ۱۲۲۱ھ (سخن شعرا)

۱۸۵۔ علوی، محمد عبداللہ خان۔ ۱۲۶۳ھ (سخن شعرا)

۱۸۶۔ عیش، طالب علی خان۔ ۱۲۴۰ھ (صبح گلشن) ہیضہ سے مرے۔ تاریخ اس کی وفات کی شیخ ناسخ نے یہ کہی ہے:

گفت سال وفات او ناسخ "ہائے افسوس، اے سخنور من!"

دیگر "بگو ہائے ہیہات طالب علی خان" (خوش معرکۂ زیبا)

۱۸۷۔ غالب، مرزا اسداللہ خان۔ ۱۲۸۵ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا؛ طور کلیم)

۱۸۸۔ غالب، بہادر بیگ خان۔ ۱۲۱۸ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا)

۱۸۹۔ غلام، میر غلام نبی۔ ۱۲۶۳ھ (نتائج الافکار) آخر عمر میں نواب صفدر جنگ وزیر کے رفقا کے ساتھ پٹھانوں سے جنگ میں لڑتے ہوئے ایسا غائب ہوئے کہ کچھ بھی سراغ نہ مل سکا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۳ھ میں رونما ہوا۔

۱۹۰۔ غوّاصی، ۱۰۰۰ھ "وسط مائۃ عاشر بسفر آخرت پرداخت (نتائج الافکار)

۱۹۱۔ فاطمہ، فاطمہ بیگم۔ ۴ ربیع الثانی۔ ۱۳۰۰ھ، شاد عظیم آبادی نے تاریخ کہی:

آں عمۂ شاد، فاطمہ بیگم اہلیۂ میر محسن پاک شمیم

چوں شد بجناں، سنین رحلت از من خود گفت بگو: "بخدمت زہرا"

(منظومات شاد، قلمی)

۱۹۲۔ فائز، صدرالدین محمد خان۔ صفر ۱۱۵۷ھ (گلشن سخن)

۱۹۳۔ فدوی۔ مرزا محمد علی۔ ۱۲۱۰ھ (مرزا محمد علی فدوی، ان کا عصر، حیات، شاعری اور کلام" از ڈاکٹر سید محمد حسنین)

۱۹۴۔ فراق، مرتضیٰ قلی خان۔ سرکاری خراج کے بقایے کی وجہ سے راجا شتاب رائے کی قید میں انتقال ہوا (گلزار ابراہیم، سخن شعرا)

۱۹۵۔ فرحت، شیخ فرحت اللہ۔ ۱۱۹۱ھ (گلزار ابراہیم، سخن شعرا، گلشن ہند) وفات مرشد آباد میں ہوئی۔

۱۹۶۔ فطرت، موسوی خان، ۱۱۰۱ھ (نتائج الافکار، چمنستان شعرا) لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ وفات کہی:

موسوی خاں یگانۂ عالم رخت ہستی بسوئے عقبیٰ برد
سال فوتش ز ہاتف غیبی شد ندا: "آں معز فطرت مرد"

۱۹۷۔ فغان، اشرف علی خان۔ ۱۱۸۶ھ۔ گلزار ابراہیم۔ سخن شعرا منظومات شاد (قلمی)، بزم سخن و طور کلیم، مرتبہ و مترجمہ عطا کاکوی میں ۱۲۸۶ھ سہو کتابت ہے۔ طبقات الشعرائے ہند اول میں درمیان ۱۱۶۶ھ کے فوت ہوا" بھی صحیح نہیں۔
حکیم ابوالحسن مفتوں کی کہی ہوئی تاریخ رحلت نواب اشرف علی خان فغان کے لوح مزار پر نصب ہے۔

کوکہ خاں آں بہار باغ سخن سوئے خلد بریں ز دنیا رفت
کرد مفتوں چو فکر تاریخش گفت ہاتف بمرد و دل ہا رفت"
(منظومات شاد، قلمی)

۱۹۸۔ فقیر، میر شمس الدین " بعہد شاہ عالم بادشاہ بزیارت عتبات عالیات شتافتہ؛ ہنگام مراجعت بدریائے مسقط غریق بحر مغفرت گردید" (گلزار ابراہیم) " ۱۱۷۰ھ میں فراغت حج کے بعد واپسی راہ میں انتقال ہوا" (بزم سخن، سخن شعرا)

"۱۱۱۷ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے اور بعد حصول سعادت زیارت کے جب کہ پھرے، تو کشتی حیات اس آشنائے بحر معنی کی گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی۔" (گلشن ہند) ۱۱۸۳ھ (نتائج الافکار) گلشن ہند کی تاریخ کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ گلزار ابراہیم کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فقیر عہد شاہ عالم بادشاہ میں مرے۔ شاہ عالم کا عہد ۱۱۷۳ھ (تخت نشینی) تا ۱۲۲۱ھ ہے۔ نتائج الافکار کی تاریخ صحیح ہے۔ پروفیسر سید عطاء الرحمان عطا کاکوی نے تین تذکرے (مرتبہ و مترجمہ) کے تعلیقات میں لکھا ہے کہ غریق دریا ہوئے؛ گلزار ابراہیم نے بھی یہی کہا ہے۔ گلشن ہند کی عبارت سے غریق دریا ہونا واضح نہیں ہوتا۔ ۱۱۸۳ھ حج سے واپس ہوتے ہوئے کشتی ڈوب گئی۔ تاریخ وفات آزاد بلگرامی نے لکھی "کو آہ فقیر شمس الدین ہائے"

(بحوالہ تعیین زمانہ معاصر حصہ ۸)

۱۹۹۔ قاسم، حکیم قدرت اللہ خان۔ ۱۲۳۶ھ (بزم سخن، سخن شعرا، طور کلیم)

۲۰۰۔ قائم قیام الدین۔ ۱۲۱۰ھ (بزم سخن، سخن شعرا، طور کلیم، گلشن ہند، طبقات الشعرائے ہند، دوم) ۱۲۰۸ھ (تعلیقات تین تذکرے)

۲۰۱۔ قبول، عبد الغنی بیگ۔ ۱۱۳۹ھ (عطاء الرحمان عطا کاکوی)

۲۰۲۔ قبول، مرزا مہدی علی خان، ۱۲۲۷ھ انتقال کی تاریخ یہ ہے
"وائے ہے ہے مر گیا مہدی علی خاں قبول" (خوش معرکۂ زیبا)

۲۰۳۔ قتیل، مرزا محمد حسن، ۱۲۳۳ھ قطعہ۔ تاریخ یہ ہے؛

خود آں کافر بگفت از سر کفر قتیل کافر ایمانے نہ دارد
(حافظ شیخ محمد)

بحوالہ تعیین زمانہ معاصرہ)

۲۰۴۔ قدر ، غلام حسنین قدر بلگرامی ۔ ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ (جلوۂ خضر)

۲۰۵۔ قدرت ، شاہ قدرت اللہ ۔ ۱۲۰۵ھ (بزم سخن ، سخن شعرا ، طور کلیم ، گلشن ہند ، طبقات الشعرائے ہند)

۲۰۶۔ قطب ، عبداللہ قطب شاہ ۔ ۳ محرم ۱۰۸۳ھ (عطاء الرحمان عطا کاکوی)

۲۰۷۔ قمر ، حیدری بیگم ، عرف ماہ طلعت بیگم ۔ ۱۲۸۱ھ (سخن شعرا) واجد علی شاہ اختر کی زوجہ تھیں ، کلکتہ میں انتقال کیا ۔

۲۰۸۔ قمر ، قمرالدین احمد خان ۔ ۱۲۷۵ھ (تذکرۂ ابن طوفان)

۲۰۹۔ کرم ۔ منشی غلام ضامن ۔ ۱۲۶۵ھ (صبح گلشن) بھوپال میں فوت ہوئے ۔

۲۱۰۔ کوثر ، آغا غلام علی معروف بہ آغا جان ۱۲۸۹ھ (سخن شعرا)

۲۱۱۔ گرامی ، مرزا گرامی ۔ ۱۱۵۶ھ (نتائج الافکار ، چمنستان شعرا) "تاریخ وفات ہے : "رندے عجبے ازیں جہاں رفت (چمنستان شعرا)

۲۱۲۔ گلشن ، شیخ گلشن علی" اواخر مائۃ ثانی عشر رخت از دار فانی بربست (نتائج الافکار)

۲۱۳۔ گوہر ، محمد باقر خان ۔ اواخر مائۃ ثانی عشر گوہر ہستی را بسلک عدم کشید" (نتائج الافکار)

۲۱۴۔ گویا ، فقیر محمد خان ۔ ۱۲۶۶ھ (تعلیقات خوش معرکہ زیبا) مرتبہ عطا کاکوی ۔

۲۱۵۔ لسان ، میر کلیم اللہ ۔" بعہد احمد شاہ بادشاہ ارتحال نمود" (گلزار ابراہیم) " در عین عنفوان جوانی ..... رخت بسرائے عدم کشید" (ریختہ گویاں)

٢١٦ - ماہر، مرزا محمد علی - ١٠٨٩ھ (نتائج الافکار)

٢١٧ - مائل، میر ہدایت علی - ١٢٠٨ھ (سخن شعرا)

٢١٨ - مبتلا، مردان علی خان - ١٢٠٠ھ (نتائج الافکار)

٢١٩ - محبت، میر غلام نبی بلگرامی - ١١٧٥ھ (نتائج الافکار)

٢٢٠ - محبت، نواب محبت خان - ١٢٢٢ھ (طور کلیم؛ بزم سخن، سخن شعرا)

٢٢١ - محرور، خواجہ نبی بخش، ١٨٦١ھ (سخن شعرا) ناسخ نے تاریخ کہی: "جواں ماتم سخت"

٢٢٢ - محزوں، غلام حسین - ١٩ محرم ١١٨٥ھ (مسرت افزا) احمل الہ آبادی نے تاریخ وفات کہی: "وائے غم حسین" قاضی

٢٢٣ - عبدالودود نے معاصر ٨ میں نام سید محمد حسین لکھا ہے اور تاریخ ١٩ ذی الحجہ لکھی ہے (بحوالہ مسرت افزا و تذکرہ شورش)

٢٢٤ - محسن، محسن علی - ١٢٨٧ھ (صحیفہ، لاہور) ص ٤٢

٢٢٥ - محسن، سید غلام نقی عرف سید محمد محسن - جمادی الثانی ١٢٨٩ھ شاد عظیم آبادی نے تاریخ وفات کہی:

سرورِ من، عمِ من، محسن بنام   سوے جنت رفت آں عرش مکاں
در متانت ہم باخلاق و کرم   گوے سبقت بردہ ز ابنائے جہاں
شہرہ نامش بہ ایران و عرب   خانہ اش مہماں سرائے دوستاں
عاشقِ نامِ حسین ابن علی   نہر جنت چشم پاکش جاوداں
سالِ فوتش را بپرسیدم ز عقل   "داخلِ فردوس شد" گفتا بخواں

(تذکرہ اسلاف)

٢٢٦ - محمد شاہ، محمد شاہ بادشاہ (رنگیلا) ٢٨ ربیع الآخر ١١٦١ھ آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی:

گشت تاریخ چوں کشیدم آہ   "موت شاہ و وزیر آصف جاہ"

(اس میں محمد شاہ بادشاہ، ان کے وزیر اور نواب آصف جاہ تینوں کی وفات کی تاریخ ہے) (چمنستان شعرا) "قریب یک سال است کہ در گزشت" (نکات الشعرا)

۲۲۷۔ مخلص، رائے آنند رام۔ ۱۱۶۴ھ (فہرست اشپرنگر) بسکنہ احمد شاہی، (مقالات الشعرا) سکنہ احمد شاہی: ربیع الثانی ۱۱۶۴ھ تا ربیع الثانی ۱۱۶۵ھ معاصر پٹنہ حصہ ۱۴ (جولائی ۱۹۵۹ء) مضمون عبد الحق بحیثیت محقق؛ از قاضی عبد الودود) ۱۱۶۰ھ (نتائج الافکار)

۲۲۸۔ مخلص، مخلص علی۔ ۱۲۰۷ھ (گلشن ہند)

۲۲۹۔ مخمور، مرزا لطف اللہ مرشد قلی خان۔ ۱۱۶۴ھ (نتائج الافکار)

۲۳۰۔ مخمور، مولوی واجد علی۔ ۱۲۷۹ (سخن شعرا) نساخ نے تاریخ کہی: "داخل جنت نعیم ہوئے" در عشرۂ ثامنہ بعد مائتین والف بمنزل اصلی شتافت" (نتائج الافکار)

۲۳۱۔ مسرور، سید محمد علی، ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ (سخن شعرا) مسرور میر شیر علی افسوس کے نواسے تھے۔

۲۳۲۔ مسکین، شیخ عبد الواحد۔ ۱۲۷۱ھ (صبح گلشن)

۲۳۳۔ مسلم، سید فرزند علی، ۱۲۷۶ (سخن شعرا) نساخ نے تاریخ کہی: "مسلم ہے اب داخل جنت"

۲۳۴۔ مسیحا، (؟) ۱۲۹۳ھ (تعین زمانہ معاصر حصہ ۱)

۲۳۵۔ مشتاق، محمد قلی خان ۱۲۱۶ھ (دیوان جوشش) جوشش عظیم آبادی نے تاریخ کہی:

ہمارا خان عالی شان جوشش! گیا اٹھ اس جہاں سے ایک دم میں
غم اس کا دوستوں ہی کو نہیں ہے فلک بھی ہو سیہ پوش اس کے غم میں
کہاں تک سنیئے ماتم میں اس کے نہیں باقی رہا نم چشم نم میں

۲۳۹۔ جو تاریخ وفات خان مرحوم　یہ چاہا کہیے، اس دردِ الم میں
گریباں پھاڑ اپنا ہاتف غیب　یہ بولا: "اب گیا مشتاق ام میں"
(دیوان جوشش عظیم آبادی) ۱۲۱۷ھ (سخن شعرا)

۲۴۰۔ مصحفی، شیخ غلام ہمدانی۔ ۱۲۴۰ھ (خوش معرکۂ زیبا) مصحفی کے ایک شاگرد نے تاریخ کہی: "کہ آتش بہ مصحف حرام آمدہ"

۲۴۱۔ مصیب، شاہ غلام قطب الدین۔ یکم ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ (مسرت افزا) شاہ اجمل جو مصیب کے چچیرے بھائی تھے، انھوں نے تاریخ وفات کہی: "قطب زماں وفات یافتہ" ۱۱۸۷ھ (نتائج الافکار؛ سخن شعرا) "مدت دہ سال است کہ بجالِ طبعی در گزشت" (مخزن نکات)

۲۴۲۔ مضمون، میاں شرف الدین۔ ۱۱۴۷ھ (حواشی، مخزن نکات طبع دوم) ۱۱۵۷ھ (حواشی گلشن ہند، از حیدر بخش حیدری؛ تعلیقات چمنستان شعرا)

۲۴۳۔ مظہر، مرزا مظہر جان جاں۔ ۱۱۹۵ھ (طور کلیم، سخن شعرا) میر قمرالدین منت نے "عاش حمیداً مات شہیداً" سے تاریخ شہادت نکالی۔ "چونکہ مرزا صاحب موصوف تعزیہ داری کو بہ سبب تصوف کے بدعت جانتے تھے، ہفتم ماہ محرم کو کسی نے ایک قرابین سر کی، وہ بہانہ ان کی موت کا ہوا۔" تاریخ وفات کی سودا نے یہ کہی:

مظہر کا ہوا جو قاتل اک مرتد شوم　اور اس کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات اس کی لکھی از رہِ درد　سودا نے کہا ہائے جانِ جاناں مظلوم

(خوش معرکۂ زیبا) "امسال کہ ۱۱۹۵ھ ہے، دلی کے کسی بدمعاش نے ان کو، ۹ محرم کو پستول کی گولی سے شہید کر دیا" (مسرت افزا)

"چوں شبے بہ تہیۂ نماز تہجد برخاست، از دستِ نا ہنجارے تیر تفنگ بسینۂ معرفت گنجینہ اش رسید، سہ روز بہاں جراحت روز عاشورہ ۱۱۹۵ھ .... گلگونۂ شہادت بر چہرۂ ہستی مالید" (نتائج الافکار)

۲۴۴۔ معجز، غلام محی الدین۔ ۱۲۲۹ھ (نتائج الافکار)

۲۴۵ معروف، الٰہی بخش خاں۔ ۱۲۴۲ھ (طورِ کلیم، بزم سخن، سخن شعرا)

۲۴۶۔ معین، معین الدین خان۔ ۱۲۲۶ھ (صبح گلشن)

۲۴۷۔ مکین، مرزا محمد فاخر۔ ۲۱ محرم ۱۲۲۱ھ روز جمعہ (انیس الاحبا)

۲۴۸۔ ممنون، نظام الدین، ۱۲۶۰ھ (بزم سخن؛ سخن شعرا؛ طورِ کلیم) "شاعر شیریں زبانِ ہند" تاریخ وفات ہے۔

۲۴۹۔ منت، میر قمر الدین۔ ۱۲۰۸ھ (طورِ کلیم؛ سخن شعرا؛ نتائج الافکار) مصحفی نے تاریخ کہی ہے

منت کہ ہیچ گہ بفنون کمال شعر از ہمسراں نکردہ کسے ہمسری او
واحسرتا کہ سال وفاتش نوشتہ شد "منت کجا و زمزمہ شاعری او"
(خوش معرکۂ زیبا)

۲۵۰۔ منتظر، ۱۲۱۷ھ۔ (تعین زمانہ معاصر حصہ ۸)

۲۵۱۔ منشا، مرزا احمد۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ (ریاض الافکار) دیوان یا اس میں تاریخ وفات: "آرمید بہ منشا بمیان جنت" (بحوالہ تعین زمانہ معاصرہ)

۲۵۲۔ منیر، سید اسمٰعیل حسین۔ ۱۲۹۷ھ (بزم سخن)

۲۵۳۔ موزوں، مہاراجا رام نرائن، ۱۱۸۷ھ "بعہد دولت نواب عالی جاہ میر محمد قاسم مرحوم بود و تقصیر شدہ معزول و در گنگا مغرق گردید" (گلزار ابراہیم)

"نواب قاسم علی خان عالی جاہ نے انگریزی حکّام سے ہزیمت کے وقت ۱۱۸۷ھ موزوں کو قید سے رہا کیا، اور دریا میں غرق کر دیا"۔ (صبح گلشن)

۲۵۴۔ موزوں، سید فرزند علی۔ ۱۲۲۹ھ (سخن شعرا)

۲۵۵۔ مومن، حکیم مومن خان۔ ۱۲۶۸ھ۔ (طور کلیم) "مومن خاں سے قرابت بھی تھی اور نسبتِ دامادی بھی، ان کی وفات پہ ایک قطعہ کہا جس کا آخری شعر یہ ہے:

گفت بہ مومن ملک، خواجہ محمد نصیر!

در قدم ناصر در رو نکو جا گرفت

(طور کلیم، بدر بیانِ محمد نصیر رنج) (سخن شعرا) ماتم مومن خاں سال رحلت ہے" (بزم سخن)

۲۵۶۔ مونس، میر مونس۔ ۱۲۹۲ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)

۲۵۷۔ مہجور، حکیم شیخ محمد بخش۔ ۱۲۴۰ھ (سخن شعرا)

۲۵۸۔ مہدی، میر محمد مہدی مخاطب بہ میر خان (تعین زمانہ معاصرا)

۲۵۹۔ مہر، مرزا حاتم علی۔ ۱۲۹۷ھ (طور کلیم)

۲۶۰۔ مہربان، میر عبدالقادر۔ ۱۲۰۴ھ (تعلیقات چمنستان شعرا)

۲۶۱۔ میر، محمد تقی۔ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ روز جمعہ وقت شام (تعلیقات تین تذکرے) "میاں مصحفی نے تاریخ ان کے مرنے کی "موا شاعروں کا سرتاج" کہی ہے اور ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ یہ ہے:

شد زجہاں میر محمد تقی — داغ ز بیمہری اہل جہاں

ناسخ تاریخ وفاتش نوشت — "وا ویلا مرد شہ شاعراں"

(خوش معرکۂ زیبا)

۲۶۲۔ میر بخشی، سید لطف علی۔ ۱۲۶۹ھ۔ شاد عظیم آبادی نے تاریخ کہی:

آں رئیسے کہ زابنائے زماں برتر بود
داں کریمے کہ شدہ مشتہر اسمش بصفات
میر بخش لقب و لطف علی نامش بود
مجلسش مایۂ صد فیض و محلِ برکات
شاد! او رفت ازیں دارِ محن سوے عدم
"داخلِ خلد" بخواں مادّہ سالِ وفات

(تذکرۂ اسلاف)

۲۶۳۔ میرن صاحب، سید تفضّل علی۔ ۱۲۶۴ھ شاد عظیم آبادی نے تاریخِ وفات لکھی:

تفضّل علی جدِّ مغفورِ من | جہازش چو بر داشت طوفانِ شدید
شکستہ و غریقِ فنا گشتہ، آہ! | تو گوئی فلک ہم نشانش ندید
چنیں گفت رضوانِ سالِ فوت | کہ "حالا ز دریا بکوثر رسید"

(تذکرۂ اسلاف)

۲۶۴۔ ناجی، محمد شاکر۔ ۱۱۶۸ھ (طورِ کلیم، سخن شعرا) عطا کاکوی صاحب نے تین تذکرے کے تعلیقات میں ناجی کا سالِ وفات قیاساً ۱۲۵۳ھ لکھا ہے۔

۲۶۵۔ نادر، کلب حسین خان۔ ۱۲۹۵ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)

۲۶۶۔ ناسخ، شیخ امام بخش۔ ۱۲۵۴ھ (سخن شعرا، گلشنِ ہند، خوش معرکۂ زیبا)

(۱)۔ سفر ناگاہ ناسخ از جہاں کرد | محمدؐ یا الٰہی! باد حامی
چو از پیرِ خرد تاریخ جستم | بگفتا "شاعرِ بے مثل نامی"

(میر محمد شائق)

(۲) مقتدائے من و استادِ من و قبلۂ من
حیف گردید تہِ خاک نہاں وا ویلا

رشک تاریخ پے لوحِ مزارش بنوشت
"مرقدِ ناسخ اعجاز بیاں، واویلا!"
(میر اوسط علی رشک)

(۳) اٹھا مرگ ناسخ کا غل چار سو سے
گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے
کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت
"دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے"
(میر اوسط علی رشک)

۲۶۷۔ ناصر۔ نواب نظام الدولہ بہادر ناصر جنگ (پسر آصف جاہ اوّل) ۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ (چمنستانِ شعرا) سروِ آزاد میں تاریخ شہادت اس طرح ہے:

نوابِ عدل گستر عالی جناب رفت
فرصت نداد تیغِ حوادث، شتاب رفت
در سنہ ہم ز ۱۵ محرم شہید شد
تاریخ گفت نوحہ گرے: "آفتاب رفت"

۲۶۸۔ ناصر۔ ناصر جنگ خلف منظفر جنگ منگش ۱۲۲۸ھ (سخن شعرا)

۲۶۹۔ نالاں۔ میر وارث علی عظیم آبادی۔ ۱۱۹۹ھ جوشش عظیم آبادی نے تاریخ وفات کہی:

مر گیا جب سے مرا سیدِ پاک	چشم گریاں ہے، سینہ بریاں ہے
شام تا صبح، صبح سے تا شام	ہاتھ میرا ہے، اور گریباں ہے
اٹھ گیا شعر و شاعری کا لطف	اس کے غم میں ہے، جو سخنداں ہے
نہ قصیدہ پڑھے کوئی نہ قطعہ	نہ کوئی دہر میں غزل خواں ہے
نام کو اس کے اور تخلص کو	جمع کر دیکھ فہم گر ہیاں ہے

جوشش: اس کی وفات کی تاریخ "میر وارث علی نالاں" ہے
(دیوانِ جوشش)

۲۷۰۔ نجات، شیخ حسن رضا دہلوی۔ ۱۲۰۷ھ (سخنِ شعرا)

۲۷۱۔ نجات مرزا عتیق اللہ۔ ۱۰ شوال ۱۱۷۵ھ چمنستانِ شعرا۔ لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ کہی: "نجات یافتہ زیں بے وفا جہاں"
میر اولاد محمد کامیاب نے بھی کہی: "نجات یافت ز دامِ زمانۂ صیاد"

۲۷۲۔ نسیم، پنڈت دیا شنکر۔ ۱۲۶۱ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا) از عطا کاکوی۔

۲۷۳۔ نسیم، مرزا اصغر علی خاں۔ ۱۲۸۲ھ (بزمِ سخن؛ سخنِ شعرا؛ طورِ کلیم)

۲۷۴۔ نظام، (عماد الملک) غازی الدین خان۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۱۵ھ (تعلیقات، تین تذکرے)

۲۷۵۔ نظیر، شیخ ولی محمد اکبرآبادی۔ ۱۲۴۶ھ (تعلیقات خوش معرکۂ زیبا)

۲۷۶۔ نوروز، سید نوروز حسین۔ ۱۲۹۶ھ شاد نے تاریخِ وفات کہی:

برادر جانِ من، از من بگو آیا بہ این زودی
چہ شد آخر کہ زیں عالمِ گسستی و، جہاں رفتی
مرا بگذاشتی تا در غمت بنشینم و گریم
نہ دیدی در قضائے خویشتن دامن کشاں رفتی
منِ شاد حزیں از بہر تاریخ چنیں ماتم
ندا کردم: "ز دنیا اے برادر، نوجواں رفتی"

(منظومات شاد۔ قلمی) نوروز، سید نصیر حسین خیال کے والد تھے۔

۲۷۷۔ نیاز: شاہ نیاز احمد بریلوی۔ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ (سخنِ شعرا)

۲۷۸۔ واقف، میاں نور العین۔ ۱۱۹۵ھ (تعلیقات، چمنستانِ شعرا)

۲۷۹۔ وحشت، حافظ رشید النبی ۱۲۷۴ھ (طورِ کلیم؛ سخنِ شعرا) نساخ

نے یہ تاریخیں کہیں:

(۱) "مر گئے آہ ایسے فاضل، آہ"

(۲) "وحشتِ جادو بیاں مر گئے، افسوس، آہ"

(۳) "خسروِ اقلیم معانی موئے" (وحشت ناسخ کے استاد تھے)

۲۸۰۔ وزیر، خواجہ وزیر۔ ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ (طور کلیم، سخنِ شعرا)

۲۸۱۔ وزیر، نواب وزیر علی خاں۔ ۱۲۳۲ھ (سخنِ شعرا)

۲۸۲۔ وفا، لالہ نول رائے۔ ۱۱۹۲ھ (تعلیقات تین تذکرے)

۲۸۳۔ ولی، شاہ ولی اللہ گجراتی۔ ۴ شعبان ۱۱۱۹ھ بوقتِ عصر (تعلیقات، چمنستانِ شعرا)

۲۸۴۔ ہاتف، مرزا حیدر علی۔ ۱۲۳۴ھ (خوش معرکۂ زیبا) ناسخ نے تاریخ کہی: "ہاتف ز جہاں برفت"

۲۸۵۔ ہادی، میر جواد علی خاں۔ ۱۲۱۵ھ (سخنِ شعرا)

۲۸۶۔ ہدایت، ہدایت اللہ خاں۔ ۱۲۱۵ھ (بزم سخن، سخنِ شعرا، طور کلیم)

۲۸۷۔ ہدایت، ہدایت علی۔ ۱۲۱۵ھ (شیفتہ) ۱۲۱۹ھ (عمدۂ منتخبہ بحوالۂ تعلیقات چمنستانِ شعرا و تین تذکرے)

۲۸۸۔ ہوس، مرزا محمد تقی خاں ۱۲۶۰ھ (نگار پاکستان۔ اگست ۱۹۶۲ء)

۲۸۹۔ یار، نواب منور الدولہ احمد یار خان بہادر ۱۱۸۳ھ (صبح گلشن)

۲۹۰۔ یٰسین، شاہ یٰسین نذر بادی (چمنستانِ شعرا) میر غلام علی آزاد نے تاریخ لکھی: "شاہ یٰسین یگانہ فوت کرد"

عبدالقادر مہربان نے بھی تاریخ کہی:

ہاتفے از چشم خود ستیا رہا افشاند و گفت

سالِ تاریخ آیۂ یٰسین را تا مرسلین"

(چمنستانِ شعرا، در بیانِ حاجی مہر علی اکبر حاجی)

۲۹۱ - یقین ، انعام اللہ خان ، ۱۱۶۹ھ (طور کلیم ؛ چمنستانِ شعرا)
لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ کہی :
شاعرِ نازک سخن و خوش خیال
کرد سفر جانبِ ملکِ عدم
سالِ وفاتش خردِ نکتہ سنج
گفت : "یقیں رفت بسوے ارم"
صاحبِ طور کلیم نے لکھا ہے کہ تہمت زنا پر اپنے والد کے
ہاتھ سے شہید ہوئے ۔ لیکن صاحبِ گلزار ابراہیم نے اس
کے علاوہ ایک اور روایت بیان کی ہے ۔ لکھتے ہیں :
"گویند بعہدِ احمد شاہ بادشاہ بنا بر امرِ نا ملائمی کہ از یقین
صادر شد ، اور اپدرش کشتہ بدریا انداخت و بعضے
گویند پدرش از ارتکاب امرے داشت کہ ممنوعِ جمیع ادیان
بود ، او منع می نمود ۔ پدرش آشفتہ خونش ریخت "
الفاظِ خط کردہ پر غور کیجیے ۔

سماجی ترقی

گزشتہ 18 مہینوں میں ملک میں ایک پُرامن معاشی و سماجی انقلاب رونما ہوا ہے:۔

* نومبر 1976 کے آخر تک تقریباً 71 لاکھ کنبوں کو مکان بنانے کی جگہیں مہیا کی گئیں (اس کے لیے کل مستحق کنبوں کی تعداد 133.6 لاکھ ہے)
* تمام ریاستوں میں زمین کی ملکیت کی حد کے تقرر کو عمل میں لانے کے لیے قوانین منظور کیے گئے ہیں ۔
* گیارہ ریاستوں اور چار مرکزی علاقوں میں دیہی قرضوں کو ختم کرنے کی قانونی کارروائی کی گئی ۔ (اس میں قرضوں کی وصولیابی پر روک لگانے کی کارروائی بھی شامل ہے)
* 198ر89 بندھوا مزدوروں کا پتہ لگا کر انھیں آزاد کرا دیا گیا ہے ۔

davp 76/885

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ادارہ ہے، جس کی بنیاد بھارت سرکار نے ۱۹۵۴ء میں رکھی تھی۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کا اہم مقصد ہے ہندستانی زبانوں کی ادبی ہلچل میں تال میل اور ترقی کرنا، اور ترجموں کے ذریعہ کئی ہندستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساہتیہ اکاڈمی نے ایک لمبی چوڑی پبلکیشن اسکیم ہاتھ میں لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کی اہم اُردو مطبوعات:

۱۔ ترجمان القرآن ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ (چار جلدیں) فی جلد 22.00
۲۔ خطبات آزاد " 18-00
۳۔ غبار خاطر " 15-00
۴۔ ہیملٹ (ڈراما) شکسپیر مترجم فراق گورکھپوری 10-00
۵۔ پریم چند پرکاش چندر گپت مترجم ل احمد اکبرآبادی 2-50
۶۔ تاریخ بنگلہ ادب سوکمار سین مترجم انتی رنجن بھٹاچاریہ 25/00
۷۔ آدم خور (ناول) نانک سنگھ، مترجم پرکاش پنڈت 15.00
۸۔ گورا (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم سجاد ظہیر 10-00
۹۔ کلموہی (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور۔ مترجم عابد حسین 7-50
۱۰۔ اپنی کہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ مترجم گوپی ناتھ امن 12-00

ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱

davP 76/248

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے

قانون اِس کی مُمانعت کرتا ہے۔

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے

روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رُخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

- اناج کی 11 کروڑ 80 لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔
- مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی، جبکہ پچھلے سال کی اس مدت میں یہ صرف تین فیصد تھی۔ 77-1976 میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔
- اپریل سے ستمبر 1976 تک کے عرصے میں 1975 کی اس مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار 16.4 فیصد بڑھی ہے۔
- اپریل سے اکتوبر 1976 تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں 33.9 فیصد کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اور اس مدت میں درآمدات میں 9 فیصد تک کمی ہوئی ہے
- بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکّے کا ریزرو حصولِ آزادی کے بعد پہلی بار 2500 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔
- بینک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے
- روپے کی قوتِ خرید میں 17 سے 21 فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لیے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

davp 76/886

مالک رام

وفیات

ملا واحدی، سیّد محمد ارتضیٰ

ان کا خاندان "فوجدار خان والا" کہلاتا تھا۔ پہلے اس کی وجہ تسمیہ سن لیجیے:
جب شاہجہان نے آگرے سے دارالخلافہ تبدیل کر کے دلّی آنے کا فیصلہ کیا، تو سب سے پہلے لال قلعہ اور جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ شہر تو پہلے ہی سے موجود تھا، شاہی کے یہی دو نشان تھے، جو کسی دیندار بادشاہ کی نظر میں دارالخلافہ کی نمایاں خصوصیات ہو سکتے تھے۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا، اور جامع مسجد ۱۶۵۶ء میں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ جامع مسجد اور عیدگاہ میں امامت کس کے سپرد کی جائے؛ اور جب حضرت بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہوں، تو ان کے اور عماری کے درمیان کون بیٹھے کیونکہ کسی شخص کا حضرت ظلِ سبحانی کی طرف پشت کر کے کھڑے ہونا، یا بیٹھنا عظمتِ شاہی اور آدابِ سلطنت کی رُو سے سخت ناروا اور احترامِ سلطانی کے منافی تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس کا یہ حل نکالا گیا کہ بخارا سے تین مستند عالم اور نکوہرے سیّد بلائے جائیں، جو یہ فرائض انجام دے سکیں۔ سادات آلِ رسول ہونے کے باعث سب کے لیے قابلِ احترام اور پورے عالمِ اسلام کے مطاع ہیں، ان کے پیچھے بیٹھنے، یا

چلنے کو رُبی مسلمان کیوں باعثِ عار سمجھیگا! چنانچہ تین سید بلائے گئے: ایک جامع مسجد میں امامت کے لیے (سید عبداللہ بخاری، موجودہ امام جامع مسجد، دلّی، انھیں بزرگوار (سید عبدالغفور شاہ بخاری) کی گیارھویں پشت میں ہیں) دوسرے عیدگاہ میں امامت نماز کرنے کے لیے؛ اور تیسرے ہاتھی پر عماری اور بادشاہ وقت کے درمیان عماری کی طرف پشت اور بادشاہ کی طرف منھ کرکے بیٹھنے کے لیے؛ یہ گویا عماری کی پیٹھ اور روئے مبارک کے درمیان حجاب کا کام دیتے تھے۔ اس عہدے کو پیش نشینی کہتے تھے اور اس عہدے دار کا خطاب فوجدار خان تھا۔ تو یہ ہے وجہ تسمیہ اس خاندان کی۔

مُلّا واحدی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار خاندان مغلیہ کے فوجدار خان میر نجف علی خان تھے۔ ان کی بیٹی مُلّا واحدی صاحب کی پردادی تھیں، جو میر پناہ علی کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ میر پناہ علی، میر محمد اکبر معروف بہ حکیم شیر شاہ ارزانی کی چوتھی پشت میں تھے، جن کا ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ (۱۴ جنوری ۱۷۲۲ء) کو عہد شاہ عالم ثانی میں وصال ہوا۔ میر محمد اکبر طبیب بھی تھے اور درویش بھی۔ انھوں نے طبِ یونانی کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور یوں طب کا علم عوام میں ارزاں کر دیا؛ اسی سے ان کا عرف ارزانی مشہور ہو گیا۔ ان کے والد میر محمد قاسم (ف: ۱۱ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ (۲۶ مارچ ۱۶۸۶ء) حضرت مجدد الف ثانی کے خلف رشید اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی نقشبندی (ف: ۱۷ اگست ۱۶۶۸ء) کے خلیفہ تھے۔

مُلّا واحدی کا اصلی نام محمد ارتضیٰ تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ جب میں اینگلو عربک ہائی اسکول میں طالبِ علم تھا تو میرے ایک ہم سبق ظہیر احمد زاہدی تھے۔ ایک دن ہنسی ہنسی میں محمد ارتضیٰ صاحب نے ان سے کہا: تم زاہدی، ہم واحدی۔ بس اس دن سے یہ واحدی بن گئے۔ بعد کو خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کے مرید ہوئے، تو انھوں نے واحدی نام اتنا چمکایا اور اسے اپنی تحریروں میں اس تواتر سے استعمال کیا کہ

وگ ان کا اصلی نام محمد ارتضیٰ گویا بھول ہی گئے، اور ملا واحدی ہی ان کا علم ہو گیا۔ انھیں نے "واحدی" کے ساتھ لفظ "ملا" کا سابقہ بھی جوڑا تھا۔
ملا واحدی کے والد بزرگوار سید محمد مصطفیٰ محکمۂ انہار میں سب ڈویژنل افسر تھے۔ رڑما (ضلع کانپور) میں تعینات تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا، وہیں دفن ہوئے۔
ملا واحدی جمعرات ۱۷ مئی ۱۸۸۸ء ۶ رمضان ۱۳۰۵ھ[5] جمعرات کے دن اپنے آبائی مکان واقعہ کوچہ چیلان، دلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سراسر نجی طور پر گھر پر ہوئی۔ قرآن ناظرہ ختم کیا اور اردو فارسی میں بھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ اب مرحلہ اسکول میں داخلے کا آیا۔ اس زمانے میں پرائمری درجوں کے بعد پانچویں کی بھی سند ملتی تھی، انسپکٹر مدارس کے دستخطوں سے۔ اس لیے ضروری تھا کہ کسی اسکول سے باقاعدہ امتحان دیا جائے۔ یہ مہم یوں سر ہوئی کہ ضروری امتحان دینے کے بعد سان سٹیفنز مشن ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ مل گیا، جو اس زمانے میں یہاں کے انگریزی اسکولوں میں چوٹی کا اور بہترین اسکول شمار ہوتا تھا۔ اس وقت اس کی عمارت چاندنی چوک میں اس جگہ تھی، جہاں اب ٹاؤن ہال کے سامنے کپڑے کی منڈی ہے۔ بعد کو یہ عمارت مطبع مجتبائی کے مالک خان بہادر مولوی عبدالاحد نے خرید لی، تو اسکول یہاں سے اٹھ کر موری دروازے چلا گیا۔ خیر، آٹھویں درجے تک انھوں نے تعلیم اسی مشن اسکول میں پائی، اس کے بعد اینگلو عربک ہائی اسکول میں چلے گئے۔
لیکن پڑھنے لکھنے میں وہ بہت کھسڈی ثابت ہوئے۔ انٹرنس (دسویں درجے) کے امتحان میں تین بار بیٹھے اور ہر مرتبہ ناکام رہے۔ یہ تیسری مرتبہ کی ناکامی ہی تھی، جس نے انھیں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے اتنا قریب کر دیا کہ جب تک خواجہ صاحب مرحوم کا ذکر نہ آئے، ملا واحدی کی سوانح عمری مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

[5] ملا واحدی نے ایک جگہ اپنی پیدائش ۱۳۰۴ھ کی لکھی ہے (سوانح عمری خواجہ حسن نظامی: ۵۰) یہ لغزشِ قلم ہے؛ صحیح ۱۳۰۵ھ ہے۔

ملا واحدی خود لکھتے ہیں کہ مجھے خواجہ صاحب سے ملنے کا خیال ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ اس سال امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان وائسرے کی دعوت پر ہندستان آئے۔ مخالفانہ پراپگنڈے کے باعث وہ علی گڑھ کالج کے اگر مخالف نہیں، تو اس سے بدظن ضرور تھے۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک مہدی علی خان (ف: اکتوبر ۱۹۰۷ء) کالج کے سکریٹری تھے۔ نواب صاحب موصوف نے شاہِ افغانستان کو کالج آنے، اور وہاں کے حالات دیکھنے، اور اس سے متعلق اصحاب کو شرفِ ملاقات عطا فرمانے کی دعوت دی۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ علی گڑھ آکر وہاں کے حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھینگے، تو ان کی بدگمانی دور ہو جائیگی۔ نواب محسن الملک مرحوم بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ انھوں نے خیال کیا، کہ امیر صاحب کی ساری مخالفت ہندستان کے طبقۂ علما کے غلط پراپگنڈے کی بنا پر ہے؛ اس کا توڑ انھوں نے یوں کیا کہ امیر موصوف کے وہاں پہنچنے پر جو لوگ ان کا استقبال کریں، ان میں ایک بڑی تعداد ملک کے بڑے بڑے علما اور اصحابِ دین کی بھی ہونا چاہیے، تاکہ امیر موصوف کو معلوم ہو کہ جب ایسے ایسے جیّد علما کا اتنا بڑا طبقہ کالج کا مؤیّد اور معاون ہے، تو مٹھی بھر مخالف لوگوں کا کالج کے خلاف باتیں کرنا معاندانہ پراپگنڈے، یا کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ان علما نے امیر موصوف کو ایک ایڈریس بھی پیش کیا تھا، اور اس کے آخر میں ان سب کے نام مع القاب وغیرہ کے درج تھے۔ انھیں میں خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور ان کا نامِ نامی اس طرح لکھا تھا: "مولانا سید حسن نظامی، خواجہ زادۂ حضرت سلطان نظام الدین اولیا، دہلوی"۔ ملا واحدی دلّی والے تھے، بھلا کیسے ممکن تھا کہ ان کے نام سے واقف نہ ہوتے، لیکن اس خبر نے ان کے دل میں خواجہ صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا کردیا۔

اب سنیے! ملاقات کی، جو کسی عجوبۂ روزگار سے کم نہیں ہے۔

لکھتے ہیں کہ میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ اپنے مکان کے صحن میں لیٹا ہوں۔

رات کا وقت ہے اور چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یکایک چاند میں ایک سمندر نمودار ہوا تھوڑی دیر میں سمندر میں سے ایک غوطہ خور کچھ چیزیں لے کر برآمد ہوا اور یہ سب فتوحات لے کر میرے گھر میں اتر آیا۔ اس کے چند دن بعد چاندنی چوک جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں ملا واحدی شعر بھی کہتے، اور ایک صاحب محمد مرزا مشتاق تخلص سے مشورہ کرتے تھے۔ مشتاق صاحب کی چاندنی چوک ہی میں دکان تھی۔ ملا صاحب ان کی دکان پر ذرا ٹھکی لینے کو رک گئے۔ برابر کی دکان غلام نظام الدین عرف خاکسار کی تھی، جو خواجہ حسن نظامی کے مربی اور محسن اور ایک طرح سے استاد بھی تھے۔ خواجہ صاحب اس وقت ان کی دکان میں موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب، خاکسار صاحب کے دہاں سے اٹھ کر کسی کام سے مشتاق صاحب کی دکان پر آئے، جہاں ملا صاحب بیٹھے تھے۔ جونہی وہ دکان میں داخل ہوئے، اور ملا صاحب نے انھیں دیکھا، تو یہ چونک پڑے، وہی قد و قامت، شکل صورت، جسم کی ساخت جو اس چاند کے سمندر میں غوطہ خور کی تھی، اور جو وہاں کا سامان لے کر ان کے مکان میں اترا تھا۔ مشتاق صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ خواجہ حسن نظامی ہیں۔ تو یہ تھی ابتدا اس مثالی تعلق اور قرب کی جو اس دن ان دونوں میں مدۃ العمر کے لیے قائم ہو گیا۔

لیکن یہ صرف تعارف کا قصہ ہے، قرب کا واقعہ مئی ۱۹۰۸ء میں پیش آیا۔

ملا صاحب دسویں کے امتحان میں تیسری مرتبہ فیل ہو گئے۔ ملال ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر مرحوم کے نیچے کھڑے تھے، کہ خواجہ صاحب آنکلے۔ انھیں غمگین دیکھ کر رک گئے اور پوچھا: کچھ پریشان ہیں آپ، خیر باشد؟ انھوں نے اپنے فیل ہو جانے کا قصہ بیان کیا، تو خواجہ صاحب نے تسلی کے لہجہ میں فرمایا: پھر کیا ہوا! گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ اگلے سال پھر امتحان میں بیٹھ جانا، پاس ہو جاؤ گے۔ انھوں نے کہا: یہ تیسری مرتبہ بیٹھا تھا اور اب کے بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ خواجہ صاحب نے پوچھا: اور

اگر پاس ہو جاتے تو کیا کرتے؟ اس پر انھوں نے کہا: ولایت جاتا۔ انھوں نے پھر دریافت کیا: ولایت جا کر کیا کرتے؟ "بیرسٹر بنتا" اس پر خواجہ صاحب نے حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے تتبع میں فرمایا: بیرسٹر مشو، چیزے دیگر شو۔ آؤ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں بیرسٹری سے بہتر کام بتاتا ہوں۔ اور انھیں اپنے کمرے پر لوا لے گئے۔ راستے بھر اور پھر مسکن پر پہنچنے کے بعد ان سے ایسی باتیں کیں کہ نہ صرف ان کا ملال دور ہو گیا، بلکہ یہ اتنے مطمئن ہو گئے جیسے انھیں دین و دنیا کی تمام نعمتیں مل گئی ہوں!

۱۹۰۸ء میں خواجہ حسن نظامی مرحوم نے حلقۂ نظام المشائخ قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف خانقاہوں اور درگاہوں اور مذہبی اوقاف میں جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں اور ان کے منتظمین جس طرح ان مقامات کی آمدنی میں دست اندازی کرتے ہیں، اور خود ان مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کرتے ہیں، اس کی اصلاح کی جائے۔ خواجہ صاحب منصوبے بنانے اور انھیں چلانے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جتنی ان کی مخالفت ہوتی، اتنی ہی ان کی سرگرمیاں تیز تر ہو جاتیں، اور وہ غیر متوقع اور نئے نئے وسائل اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے سوچتے۔ حلقۂ نظام المشائخ کی مخالفت ہونا ہی تھی۔ جن لوگوں نے ان اداروں پر قبضہ کر رکھا تھا، اور ان کی آمدنی کو آج تک اپنی ذاتی جائداد خیال کیا تھا، وہ بھلا کسی شخص یا انجمن کی مداخلت کیونکر برداشت کر سکتے تھے! انھوں نے حلقۂ نظام المشائخ کے قیام کو دخل در معقولات قرار دیا اور کہنے لگے کہ خواجہ حسن نظامی اپنے بزرگوں کے مسلک سے روگرداں ہو گیا ہے اور وہابیت و تردد میں درگاہوں کی مخالفت کرنے لگا ہے۔

اس پر خواجہ صاحب نے اپنا نقطۂ نظر لوگوں تک پہنچانے کے لیے جولائی ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ نظام المشائخ جاری کر دیا تاکہ اس سے حلقے کے مقاصد کی تبلیغ وسیع تر ہو سکے۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور ملا واحدی نائب ایڈیٹر۔ کم و بیش چھ مہینے تک اس کا دفتر خواجہ صاحب کے کمرے پر رہا۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء کے آخر یا ۱۹۱۰ء کے آغاز میں یہ ملا صاحب کے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ پرچہ دونوں کے سرمایے سے جاری ہوا تھا!

اور آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ صرف ڈیڑھ سو روپے سے ، دونوں نے چھ چھ روپے لگائے تھے ۔ لیکن پہلے شمارے ہی سے پرچہ خود کفیل ہو گیا اور کسی کو نقصان نہیں رہا ۔ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء تک دونوں اس میں شریک رہے۔ یوں بھی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے پانچ برس خواجہ صاحب بیوی بچوں سمیت ملا صاحب ہی کے یہاں مقیم رہے تھے ۔ کیونکہ حلقۂ نظام المشائخ کی سرگرمیوں کے باعث درگاہ حضرت سلطان اولیا میں ان کی بہت مخالفت تھی اور وہاں کا قیام خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ جب مخالفت فرو ہوگئی اور خواجہ صاحب نے درگاہ میں اپنے مکان پر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، تو وہ رسالہ نظام المشائخ کی ملکیت سے بھی دستبردار ہو گئے ، اور اسے کاملاً ملا صاحب کے ہاتھ میں دے دیا کہ اب سے اس کے نفع نقصان کے آپ واحد ذمے دار ہیں ۔

مئی ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب مصر و شام و حجاز کے سفر پر روانہ ہوگئے (ان کا یہ سفرنامہ شائع ہو چکا ہے)۔ خواجہ صاحب مختلف منازل سے اپنے سفر کے حالات و تاثرات باقاعدہ بھیجتے رہے اور یہ نظام المشائخ میں شائع ہوتے رہے ۔ اس سے پرچے کی ہر دلعزیزی میں بہت اضافہ ہوا ۔ خواجہ صاحب اس سفر سے چھ سات مہینے میں وطن لوٹے ۔ اب ملا صاحب نے نشر و اشاعت کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا ۔ یوں بھی خدا کے فضل سے انھیں اپنے بزرگوں کے ترکے سے اتنا کچھ ملا تھا کہ نہ ملازمت کی ضرورت تھی، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت ۔ ادھر خواجہ صاحب کے زرخیز دماغ اور آئے دن کی اسکیموں نے ان کے کام کو خوب چمکایا ۔ انھوں نے اپنا ذاتی مطبع قائم کیا ، جس میں وہ خواجہ صاحب کی کتابوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور دلی کے دوسرے ادیبوں سے بھی کتابیں لکھوا کر شائع کرنے لگے ۔ خدا نے بھی ان کی مساعی میں برکت دی ، اور انھیں اس سے بہت یافت ہوئی ۔ کئی ماہنامے اور روزنامے جاری کیے، لیکن ایک نظام المشائخ کے سوا باقی سب تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بند ہو گئے ۔

اب ان کا شمار شہر کے معززین میں تھا۔ وہ دلی میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہو گئے۔
اور ایمان کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس حیثیت میں دوسرے احباب کے ساتھ مل کر
اہل شہر کی اور خاص کر اپنے علاقے کی بہت خدمت کی۔
۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اس کے ساتھ ہی بدامنی بھی آئی۔ جب دلی میں
حالات بہت مخدوش ہو گئے، تو وہ بادل ناخواستہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شب میں
ہوائی جہاز سے بیوی بچوں سمیت ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ یہاں سے راولپنڈی
پہنچے۔ وہاں سے ریل کے ذریعہ لاہور ہوتے ہوئے کراچی گئے اور وہاں سب نے
رخت سفر کھول دیا۔
ہجرت کرنا آسان تھا لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد روزگار کا مسئلہ بہت مشکل ثابت
ہوا۔ خیال فرمائیے کہ جس شخص کے دلی کے مکان میں ماشاءاللہ نو کمرے تھے اور ہر
کمرہ کسی ایک کام کے لیے مخصوص تھا، اُسے مہینوں دو کمرے (کمرے بھی کیا، دو
کوٹھریوں) کے ایک جھونپڑے میں گزارا کرنا پڑے، تو اس پر کیا گزرے گی، اور
اس پر مستزاد یہ کہ آمدنی کے سب ذرائع مفقود۔ اتنا بڑا کنبہ اور کمانے والا
صرف ایک لڑکا، مجتبیٰ موسیٰ رضا واحدی، پوری پڑے تو کیونکر! خدا رازق ہے
اور ہر ایک کو اپنا بھلے کا ملے کے رہتا ہے! کراچی میں روزنامہ "انجام" کے مالک
عثمان آزاد صاحب نے ان کا پرانا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ آڑے آئے۔ انھوں
نے مہربانی کی اور اپنے اخبار کی منیجری ان کے سپرد کر دی۔ زیر تعلیم منجھلے بیٹے (علی
مقتدی واحدی) نے ایم اے کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور کلرکی کر لی۔
سب سے چھوٹا عیسیٰ رضا واحدی، ابھی چھوٹے درجوں میں پڑھتا تھا۔ غرض
کسی طرح دال روٹی کا انتظام ہو گیا۔ تھوڑے دن بعد مجتبیٰ واحدی کو بھی ان
کی ملازمت کے استحقاق کے مطابق مکان تفویض ہو گیا، اور خاندان وہاں
منتقل ہو گیا۔
جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ملا واحدی نے خواجہ حسن نظامی کے اشتراک سے ماہنامہ

نظام المشائخ، اکتوبر ۱۹۰۹ء میں جاری کیا تھا۔ جب تک ملّا واحدی ہندستان میں رہے (یعنی اکتوبر ۱۹۴۷ء تک) یہ بلاناغہ شائع ہوتا رہا۔ کراچی کے ابتدائی زمانے میں جب جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، اسے دوبارہ جاری کرنے کا تصور بھی کیونکر کیا جا سکتا تھا! لیکن ملّا واحدی صاحب بھی دُھن کے پکّے تھے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۴۷ء کے دو پرچے تو نہ نکل سکے، لیکن ذرا سانس لینے کے قابل ہوئے، تو انھوں نے جنوری ۱۹۴۸ء میں اسے پھر جاری کر دیا کہ "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے مطابق دل بھی لگا رہیگا، اور شاید یہ چار پیسے کی یافت کا وسیلہ بھی ثابت ہو۔ بحمدہٖ تعالیٰ دونوں مقصد پورے ہو گئے۔

ملّا واحدی کی صحت بالعموم اچھی رہی۔ آسودہ حالی اور بے غل و غش زندگی بسر کی۔ مذہبی رجحان کے باعث کسی طرح کی بد اعتدالی تو کجا، بے اعتدالی تک کے نزدیک نہیں گئے۔ کراچی کی افتاد نے البتہ برا اثر ڈالا۔ سب سے پہلے آنکھوں نے جواب دیا، پانی اترنے لگا۔ لیکن انھوں نے آخر تک لکھنے پڑھنے کا کام نہیں چھوڑا۔ یوں بھی یہی ان کی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔

بہت دن ہوئے ایک کتاب "میرے زمانے کی دلّی" شائع کی تھی (کراچی ۱۹۵۶ء) اگرچہ اس پر لکھا ہے: "حصہ اول" لیکن دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے خواجہ حسن نظامی کی وفات کے بعد ماہنامہ منادیؔ دلّی میں خواجہ صاحب مرحوم کے کچھ حالات اور تاثرات کے بارے میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا، جو بعد کو "سوانح عمری حضرت خواجہ سید حسن نظامی دہلوی" کے عنوان سے شائع ہوا (دلّی، ۱۹۵۷ء)۔ نظام المشائخ میں تو وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے، لیکن کراچی کے دوران قیام میں، خاص کر ۱۹۵۰ء کے بعد انھوں نے قرآن اور اسلام کے بارے میں کثرت سے لکھا ہے۔ سنا ہے یہ مضامین "ملّا واحدی کے مقالات، انشائیے اور شخصیتیں" کے عنوان سے ان کے منجھلے صاحبزادے سید علی مقتدر واحدی نے جمع کر لیے ہیں اور شائع ہونے والے

ہیں ۔ ملا واحدی نے ایک اور کتاب اپنی یادداشتوں اور احباب کے احوال میں "ناقابل فراموش لوگ اور ناقابل فراموش باتیں" کے عنوان سے بھی مکمل کر لی تھی، یہ بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔
صحت کبرسنی کے ساتھ خراب رہنے لگی تھی ۔ اس پر فالج نے آدبوچا ۔ اسی میں ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے خالق کے سامنے حاضر ہو گئے ۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ ۔ ان کے ساتھ دلی کی تہذیب کا ایک بہت بڑا عاشق اور نمائندہ ہم سے جدا ہو گیا ۔
انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے ۔ چار بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں ۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر رہے ۔

محشر عنایتی رامپوری، صابر رضا خاں

ان کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، کسی نے کچھ لکھی ہے کسی نے کچھ۔ لیکن سب سے زیادہ ثقہ روایت ان کے حقیقی بڑے بھائی جناب محمود رضا خاں صاحب (دادا بھائی رامپوری) کی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جب ہمارے والد مولوی احمد رضا خاں کا نومبر ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا ہے، تو اس وقت میری عمر ساڑھے آٹھ سال کی تھی، اور صابر رضا خاں (مجھ سے ڈھائی برس چھوٹے) چھ سال کے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے ۔
ان کی تعلیم سراسر گھر پر ہوئی، اور وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی ۔ البتہ اس سے ان کے دل میں وسیع حصول علم اور مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعد کو انھوں نے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور اسی دوران میں عروض میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی ۔
معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کم عمری میں شعر گوئی کا آغاز کیا ۔ شروع میں تخلص پروین تھا اور اس زمانے میں وہ صفدر علی خاں سے اصلاح لیتے تھے، جو منجم کی حیثیت سے بھی مشہور تھے ۔ صفدر نے انھیں پروین ترک کر کے محشر تخلص اختیار کرنے کا مشورہ

دیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ مشورہ قبول کر لیا بلکہ اس کے ساتھ عنایتی کے لاحقے کا اضافہ کر کے محشر عنایتی ہوگئے۔ یہ نسبت انھوں نے اپنے بزرگ مولوی حافظ عنایت اللہ خاں کے نام سے اختیار کی۔ حافظ صاحب موصوف بیک وقت ان کی والدہ مرحوم عزیز بیگم کے حقیقی دادا! اور ان کی دادی کے عم زاد بھائی تھے، اس طرح گویا وہ محشر کے والد احمد رضا خاں مرحوم کے ماموں ہوئے۔ وہ بڑے متقی اور پرہیز گار، صاحب دل اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کا ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ ان کی خانقاہ عنایتیہ رامپور کے محلہ زیارت حلقے میں موجود ہے۔

صفدر سے تلمذ کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں منقطع ہوگیا، اور اس کے بعد وہ منشی رشید احمد خاں رشید (ف: اپریل ۱۹۶۴ء) کے باقاعدہ شاگرد ہوگئے۔ رشید خود محمود رامپوری (تلمیذ داغ) کے جانشین تھے اور رامپور میں اپنے استاد داغ دہلوی کے رنگ سخن کے سب سے بڑے علمبردار۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، داغ کے ہاں زبان اور محاورے اور روزمرے، اور معاملہ بندی اور محاکات پر خاص توجہ ہے۔ ادھر محشر محض زبان اور چونچلے سے نکل کر اس سے بلند تر فضا میں پرواز کرنے کے لیے پرتول رہے تھے۔ استاد کو اپنے گھرانے کی روایت سے یہ انحراف پسند نہ آیا۔ اس لیے چھ برس کے تعلق کے بعد ۱۹۲۸ء میں محشر نے ان سے بھی مشورہ کرنا بند کر دیا۔ اس زمانے میں انھوں نے غالباً چند غزلیں خود حضرت محمود کو بھی دکھائیں لیکن جو مشکل رشید سے مشورہ کرنے کے رستے میں حائل تھی، وہی یہاں بھی مانع آئی۔ بالآخر انھوں نے قاضی حافظ الدین نشتر مقتدری سکندر آبادی سے رجوع کیا، جو اپنے استاد (اور ماموں) قاضی محمد حیات بخش رسا سکندر آبادی کی وفات (۲۲ نومبر ۱۹۱۳ء) کے بعد دربار رامپور میں ملازم ہوگئے تھے: اور ان دنوں رامپور ہی میں مقیم تھے۔ نشتر استادِ فن اور قادر الکلام شاعر تھے۔ افسوس، ایک مختصر مجموعے "جام و مینا" کے سوائے ان کا اور کلام شائع نہیں ہو سکا؛ اور اس مجموعے میں بھی صرف خمریات کے اشعار ہیں۔ ان کا ۱۹۷۴ء یا ۱۹۷۵ء میں پاکستان میں انتقال ہوا

تھا۔

نشتر صاحب سے بھی زیادہ دن مشورہ نہیں رہا کیونکہ انھوں نے محشر کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

محشر نظم ہی نہیں، نثر میں بھی بند نہیں تھے۔ شروع میں کچھ افسانے بھی لکھے، لیکن جلد ہی یہ میدان چھوڑ دیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں رامپور کی دیسی حکومت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ملک کی سیاسی تحریک اور عام بے چینی کے اثرات ریاست میں بھی نہ پہنچ جائیں۔ ان کا سدِّ باب کرنے کی خاطر روزنامہ "ناظم" (رامپور) میں ایک ہفتہ وار ضمیمے کا اضافہ کیا گیا، جس میں دیہاتی موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔ اس ضمیمے کی ترتیب و تدوین محشر کے سپرد تھی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ریاست کے محکمہ مال میں "محرر سرسری" (عارضی کلرک) رہے تھے اور اس زمانے میں بھی ان کی ادبی اور شعری صلاحیتوں کی شہرت تھی۔ اس ملازمت کا ذکر ان کے ایک قطعے میں بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

مانا نہیں ہے میری طرف چشمِ التفات ۔۔۔ مانا تری نگاہِ کرم سے بری ہوں میں
اچھا تو پھر مری طرف اک سرسری نگاہ ۔۔۔ وہ اس لیے کہ "اہلمد سرسری" ہوں میں

معلوم نہیں، وہ کلرکی سے کیوں مستعفی ہو گئے اور کاشتکاری کرنے لگے۔ جلد ہی وہاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا، بہت پہلے یعنی ۱۹۳۸ء میں وہ مقامی میونسپل کمیٹی کا انتخاب لڑ کر اور اس میں کامیاب ہو کر سیاستِ حاضرہ سے اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ صحافت میں گویا کہ یہ شوق دوآتشہ ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں روزنامہ "آغاز" جاری ہوا، تو محشر اس میں بھی کام کرنے لگے۔ سال بھر بعد "آغاز" روزنامہ سے ہفتہ وار ہو گیا، جب بھی انھوں نے دونوں سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ لیکن چار سال بعد ۱۹۵۱ء میں وہ "ناظم" کے عملے سے الگ ہو کر کلیۃً "آغاز" کے ہو کر رہ گئے۔ سال بھر میں اسے بھی چھوڑ دیا اور پھر موروثی زمین کی دیکھ بھال کرنے کو دیہات میں چلے گئے۔ لیکن سیمابی طبیعت نے یہاں بھی جمنے نہ دیا اور ۱۹۵۳ء میں "ناظم" میں

واپس آ گئے۔ دو سال یہیں گزرے۔

"ناظم" کی ادارت کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا۔ دلی کے ایک ہفتہ وار میں یوپی کی حکومت کے خلاف سخت تنقیدی اداریہ شائع ہوا۔ محشر صاحب ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے بھیرا یوں گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں جائنٹ ایڈیٹر نے، جو اس وقت مدیر تھے یہ اداریہ "ناظم" میں اداریے کے طور پر نقل کر لیا۔ حکومت یوپی نے اس پرچہ "ناظم" کے مالک اور مدیر (محشر عنایتی) پر دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ قائم کر دیا۔ رامپور کی عدالت نے انھیں ڈھائی مہینے قید کی سزا دے دی۔ اپیل پر وہ بری ہو گئے، لیکن اس سے پہلے وہ ہفتہ عشرے کی قید کاٹ چکے تھے۔

اب انھوں نے اپنا "ہفتہ وار" "شیرازہ" جاری کر لیا۔ وہ مدتوں "روشن ضمیر" کے قلمی نام سے ایک کالم "پس پردہ" بھی لکھتے رہے۔ اس میں طنز و مزاح کے انداز میں مقامی اور ملکی مسائل پر تبصرہ ہوتا تھا۔ افسوس کہ انھوں نے یہ انداز سخن ترک کر دیا، اور یوں اردو دنیا ایک ابھرتے مزاح نگار سے محروم ہو گئی۔

اسی دوران (۱۹۵۳ء) میں وہ دوبارہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔

غرض ان کی پوری زندگی بے ہمہ اور باہمہ جستم کے ہنگاموں میں بسر ہوئی۔ آپے کی خوشی نہیں، گئے کا غم نہیں۔ اس کا ثبوت ان کی زندگی کے ایک اور واقعے سے بھی ملتا ہے۔

ان کے ایک ماموں تھے، مولوی احسان اللہ خان۔ مولوی صاحب کا ایک باغ تھا۔ انھوں نے اس کی فصل بعض لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دی۔ جب باغ پر ان اصحاب کا قبضہ ہو گیا، تو انھوں نے وہاں شراب کی بھٹی لگا دی۔ یہ نہ صرف معاہدے کی اور قانون کی خلاف ورزی تھی، بلکہ اخلاقاً بھی قابلِ اعتراض بات تھی۔ لہٰذا مولوی صاحب موصوف ان لوگوں سے بات چیت کرنے اور انھیں سمجھانے بجھانے کی خاطر

ان کے مکان پر گئے۔ محشر بھی ماموں کے ساتھ تھے۔ اتفاق سے مولوی احسان اللہ خاں کی بندوق ان کے ہاتھ میں تھی۔ بات چیت میں کچھ تیزی اور تلخی پیدا ہوگئی۔ مولوی صاحب نے بہت برداشت کیا، اور طرح دیتے رہے، یکایک مخالف نے ظلم سے ان پر وار کر دیا۔ یہ بھی آخر پٹھان تھے، جواباً انھوں نے بندوق سے فیر کر دیا۔ گولی حملہ آور کے سینے میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اب مخالفوں نے بھالوں، بلموں اور تبروں سے مولویوں پر ہلہ بول دیا؛ سب کے زخم آئے، لیکن محشر صاحب بلوہ بچ گئے، حال آں کہ ان کے پاس فقط ایک پتلی سی چھڑی تھی جسے وہ عموماً ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ غرض، دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کے تحت قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور محشر صاحب بھی اس میں ماخوذ ہو گئے۔ قصہ کوتاہ، بہت دن کے بعد اس کا فیصلہ ہوا، اور یہ سب لوگ بری الذمہ قرار پائے۔ لیکن اس دوران میں محشر صاحب نے جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا، دوست دشمن سب اس کے معترف تھے۔ ان کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ عدالت میں، مقدمے کی کارروائی سے بے پروا، وکیلوں کی جرح سے بے تعلق، فیصلے سے بے نیاز بیٹھے کتاب دیکھتے رہتے، یا اپنی روایتی شگفتگی اور بذلہ سنجی سے دوستوں کے ساتھ شعر و شاعری اور گپ بازی ہوتی۔

انھیں ایک زمانے سے ذیابیطس کا عارضہ لاحق تھا۔ لیکن سخت بد پرہیز تھے؛ کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں صحت بحال ہونے کا کیا امکان تھا! جون ۱۹۷۶ء میں پیٹھ میں پھوڑا نکل آیا، علاج سے یہ دب گیا۔ اگر پک کر پھٹ جاتا، تو شاید نقصان نہ ہوتا۔ اس کے دب جانے سے اس کی سمیت سارے جسم میں تحلیل ہو گئی اور خاص طور پر خون میں زہریلا مادہ پیدا ہو گیا۔ شہر بھر کے ڈاکٹر علاج میں جُٹے رہے، لیکن موت کو کون ٹال سکتا ہے۔ اسی میں بدھ کے دن ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء صبح نو بجے کے قریب جاں بحق ہو گئے؛ اور اسی دن عشا کے وقت انھیں درگاہ عنایتیہ کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ

راجعون۔

مرحوم کی شادی ۱۹۲۵ء میں رامپور کے مشہور حکیم نذیر احمد خان (عرف ڈھومی خاں) کی صاحبزادی اعجازی بیگم سے ہوئی تھی؛ یہ بفضلہٖ بقید حیات ہیں۔ اولاد میں پانچ بیٹے (۱) مشہور رضا خاں عرف سلیم عنایتی، (۲) معنبر رضا خان عرف نعیم، (۳) نوازش رضا خان عرف فہیم، (۴) جمال افروز رضا خان عرف دیم، (۵) مکرم رضا خان عرف صمیم) اور دو بیٹیاں (گلنار خاتون عرف رباب اور نادرہ زبیر (عرف بیو) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ وہ اس کا نام اپنی چہیتی بڑی صاحبزادی کے عرف کی نسبت سے "رباب حیات" رکھنا چاہتے تھے۔ سنا ہے کہ ان کے شاگرد جناب اطہر عنایتی ایڈوکیٹ اس کی اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں۔ رامپور میں ان کے شاگردوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ ان کی زندگی میں ۱۹۷۱ء کے "جشن بہار" کے موقع پر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مقامی صولت پبلک لائبریری میں "جشن محشر" کے نام سے ایک جلسہ کیا تھا۔ اس تقریب میں محشر کے بعض دوستوں نے کچھ مضامین پڑھے تھے۔ انھیں کا مجموعہ، ان کے کلام کے مختصر انتخاب کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں چھپا تھا۔ لیکن کتاب کی عام اشاعت نہیں ہوئی۔

محشر نے ایک اور معرکے کا کام کیا تھا۔ انھوں نے ایک دیہاتی لڑکی کے جذبات اور تاثرات، اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چھپ چابکدستی سے قطعے اور رباعیاں کہی ہیں۔ وہ خاصے کی چیز ہے۔ فراق نے "روپ" میں اور جاں نثار اختر نے "گھر آنگن" میں اسی رنگ کی کچھ چیزیں پیش کی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فراق کے ہاں سنگھار رس اور جنسیت زیادہ ہے اور جاں نثار اختر نے زیادہ تر ایک گرہستن کا نقشہ پیش کیا ہے۔ محشر نے ان کے مقابلے میں گاؤں کی ایک الھڑ

٭ محشر مرحوم کے حالات بھی انھیں سے ملے، جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

اور شوخ لڑکی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ تاثرات انھوں نے اس زمانے میں
فراہم کیے، جب وہ شہری زندگی سے دُور، کھیتوں کی آبیاری اور دیکھ بھال میں
مصروف تھے۔ انھوں نے ان منظومات کا نام "دیہات رس" رکھا تھا؛ لیکن ان کے
بعض احباب اسے "گوری نامہ" کہتے ہیں۔ بہرحال یہ بھی چھپ جانا چاہییں کیونکہ
اس رنگ کی چیزیں ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔
مرحوم کے رنگ سخن پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں۔ قدرتِ کلام، اور
مہارتِ فن ان کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ سرزمینِ رامپور
نے ان کے قد و قامت کے بہت کم شاعر اور ادیب پیدا کیے ہیں۔ افسوس کہ ان کے
استغنا اور لاابالیانہ پن نے انھیں وہ شہرت حاصل کرنے سے محروم رکھا، جس کے
وہ جائز طور پر مستحق تھے۔

کلیم، مکین احسن

نگرام کے ایک صاحب وجاہت خاندان میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امین احسن
مرحوم مدتوں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر متمکن رہے تھے، اور ان کا یو پی کے عمائد میں شمار
ہوتا تھا۔
مکین احسن نے الہ آباد یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ عربی میں ایم اے کیا تھا۔ اس کے
بعد وہ مرکزی حکومت کے ریڈیو مانیٹرنگ سکشن میں ملازم ہو گئے۔ اس شعبے کے فرائض
میں بیرونی ممالک کے ریڈیو کا سننا اور وہاں کی خبروں کی تلخیص پیش کرنا ہے؛
اس کام میں عربی کا علم ان کے بہت کام آیا۔
لیکن انھوں نے جلد ہی یہ سرکاری ملازمت ترک کر دی، اور لکھنؤ کے روزنامہ
"قومی آواز" کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد تک وہ یہیں کام
کرتے رہے۔ پھر غالباً ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان چلے گئے، اور وہاں لاہور کے روزنامہ
"مشرق" میں ملازم ہو گئے۔

کلام پر انھوں نے اپنے چچا نجم احسن صاحب سے اصلاح لی تھی ۔
شب ہفتہ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء کو لاہور (پاکستان) میں بعارضۂ قلب انتقال ہوا ۔

صوفی بانکوٹی، محمد ابراہیم غلام محمود پرکار

خطۂ کوکن (دکن) کا "پرکار" خاندان اپنی شہرت کے باعث کسی تعارف کا محتاج نہیں، اس میں ہر میدان کے شہسوار گزرے ہیں ۔ صوفی بانکوٹی بھی اسی خانوادے کے نام لیوا تھے ۔ ان کے والد غلام محمود پرکار عربی فارسی کے جید عالم تھے، اور پیشے کے لحاظ سے طبیب ۔ ان کی حذاقت کا دور دور شہرہ تھا ۔ دادا مولوی غلام محی الدین پرکار (ف ۱۸۹۷ء) ریاست جنجیرہ میں منصف اعلیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے تھے ۔

صوفی ۲۷ مئی ۱۹۱۹ء کو بانکوٹ (ضلع رتناگیری ۔ مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم دیر سے شروع ہوئی، اور بدقسمتی سے وہ بھی مکمل نہ کر سکے ۔ ابھی چوتھے درجہ ہی میں تھے کہ ۱۹۳۱ء میں والد کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے علاوہ چار بہن بھائی اور تھے ۔ ان کی دادی اماں کو اپنے میکے کی طرف سے ناریل کا ایک چھوٹا سا باغ ورثے میں ملا تھا ۔ یہ بانکوٹ سے کوئی دو میل دور ایک گاؤں ویلاس نامی میں آج بھی موجود ہے (ضمناً ویلاس مشہور مجاہد آزادی نانا فرنویس کا وطن ہے) اس کے علاوہ کچھ کھیتی بھی تھی ۔ یہی دونوں چیزیں خاندان بھر کے لیے قوت لایموت کا وسیلہ بن گئیں ۔

غرض تعلیم کا سلسلہ تو منقطع ہونا ہی تھا، ۱۲ برس کی عمر میں معاشی پریشانیوں نے بھی آگھیرا ۔ خدا خدا کرکے کہیں ۱۹۴۱ء میں (بعمر ۲۲ سال) انھوں نے ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا، جب وہ تین بچوں کے باپ بن چکے تھے ۔ اس کے بعد پرائمری درجوں کو پڑھانے کی ملازمت مل گئی ۔ ساری عمر مدرسی میں گزری اور دوران ملازمت ہی میں کچھ ہندی کے امتحان اور ۱۹۵۲ء میں تربیتی کورس بھی مکمل کر لیا ۔ وہ طویل

ملازمت کے بعد مئی ۱۹۷۷ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہونے والے تھے کہ اس سے پہلے ہی اکتوبر ۱۹۷۶ء میں قیدِ حیات ہی سے نجات کا فرمان صادر ہوگیا۔ اِنّا للہِ وَ اِنّا الیہ راجعون۔

۱۹۳۷ء کے لگ بھگ بعض احباب نے بانکوٹ میں ایک ادبی انجمن "معیار الادب" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کے زیرِ اہتمام ادبی اور شعری اجتماع تو ہونا ہی چاہیے تھے، ان کے علاوہ بھی بیت بازی اور شعر خوانی کے ہنگامے رہتے۔ صوفی ان جلسوں میں دلچسپی لینے لگے۔ یہیں انھیں خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء سے انھوں نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی اور ابر احسنی گنوری (ف: نومبر ۱۹۷۳ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ جس زمانے میں ابر احسنی بسلسلۂ ملازمت رامپور میں مقیم تھے، انھوں نے وہاں اپنے استاد مولانا احسن مارہروی (ف: اگست ۱۹۴۰ء) کی یاد میں ایک ماہنامہ "احسن" نکالا تھا۔ صوفی بھی اس کی مجلسِ ادارت میں شامل رہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ استاد کو ان کی قابلیت پر کس درجہ اعتماد تھا کیونکہ ابر احسنی زبان و بیان اور فن کے معاملے میں نہ صرف سہل انگار نہیں تھے بلکہ خاصے سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ صوفی کو بھی استاد سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ وہ "احسن" کی ترقی میں قلمے اور درمے ہر طرح کوشاں رہے۔

اپنی خاندانی روایت کے زیرِ اثر مرحوم کا شروع سے دین اور تصوّف کی طرف رجحان رہا۔ صوفی تخلص اختیار کرنا بھی اسی میلان کے باعث تھا۔ وہ حضرت سید خاکسار علی شاہ قادری خاک کلیانوی (ف: ۳۰ جنوری ۱۹۵۸ء) کے مرید تھے اور شمالی کوکن کے مشہور بزرگ سید حسام الدین قادری (کرده شریف) کے معتقدِ خاص۔ سید حسام الدین صاحب اردو اور عربی میں شعر کہتے اور حسامی غوثوی تخلص کرتے ہیں۔ انھیں نسبتوں کا نتیجہ تھا کہ صوفی نے حمد و نعت اور منقبت میں بھی وافر کلام کہا ہے۔ لیکن طبیعت کے استغنا کے باعث کبھی اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی۔ مشاعروں میں بھی بہت کم شرکت کرتے تھے۔ رسائل و جرائد میں شاذ و نادر ان کا

کلام دیکھنے کو ملتا تھا۔
ان کی غزل کلاسیکی انداز کی ہے، اور فن پر ان کی قدرت کی بیّن دلیل۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ "بادۂ صافی" کے نام سے عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ افسوس کہ یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔
صوفی کی شادی ۱۹۳۵ء میں شیخ عبداللہ محمد برکار کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی۔ شیخ عبداللہ لحاظ پیشہ جہاز پر خلاصی تھے۔ بدقسمتی سے صوفی کی رفیقۂ حیات نے ۱۹۵۲ء میں داغ مفارقت دیا۔ حال آں کہ اس وقت عمر صرف ۳۳ برس کی تھی اور ماشاء اللہ صحت بھی بہت اچھی تھی، انھوں نے محض اولاد کی خاطر نکاحِ ثانی سے اجتناب کیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑے۔ یہ اکلوتے بیٹے اردو کے نوجوان اور خوش گو شاعر بدیع الزماں خاور ہیں (ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء)
صحت بظاہر ٹھیک تھی۔ یکایک ۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ اس سے پہلے بھی غالباً ایک دورہ پڑا تھا، جو بہت ہلکا تھا اور ان کی تسلی بخش تندرستی کے پیشِ نظر اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ اب کے انھیں وہیں بمبئی کے نائر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن علاج معالجے سے حالت بہتر نہ ہوئی اور اسی میں وہ ۱۱ اکتوبر (۱۹۷۶ء) پیر کے دن جاں بحق ہو گئے۔ لاش ان کے وطن بانکوٹ گئی، جہاں اگلے دن منگل (۱۲ اکتوبر) کو انھیں اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے استاد بھائی صغیر احسن نے تاریخِ وفات کہی:

بچ نہیں سکتا ہے کوئی دستبردِ موت سے — روز و شب رہتا ہے مصروفِ عمل دستِ قضا
رفتہ رفتہ جا رہے ہیں دوستداران کہن — کیا شگفتِ دل کا ساماں بزمِ ہستی میں رہا
بن گیا صوفی بھی اٹھ کر، ہم تڑپتے رہ گئے — دور تھے لیکن تھا دونوں کے دلوں میں رابطہ
ہم تو لیں گر اشک غم کر لیں گے صبر و ضبط بھی — مرنے والے! شاد تجھے آسودگی ربِّ علا

سالِ رحلت از لبِ اطلاعات کلاں، صغیر: "آہ متوفی بھی ہمیں اب رنج فرقت دے گیا"
(۱۳۹۶) ۱ + ۱۳۹۵

ذکی، دامودر ٹھاکور

قدیم ریاست حیدرآباد (حال آندھرا پردیش) کے ذولسانی تعلقہ کوڑنگل میں ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء کو ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کا حیدرآباد ملک کی سب تہذیبوں اور زبانوں کا گویا سنگم بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تعلیم کا مرحلہ آیا، تو کنڑ، تلگو اور مراٹھی کے علاوہ انھیں اردو اور فارسی کی بھی تعلیم دی گئی۔ ذہن براق تھا، اور حصولِ علم کا شوق۔ رفتہ رفتہ ان سب زبانوں میں پوری مہارت حاصل کر لی۔
گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مانع تھے۔ جلد ہی کسبِ معاش کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ چنانچہ مکلمی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی میں پوری عمر بسر کر دی۔ جیسی شرافت اور وضعداری ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی، اسی کا مظہر ان کا کلاسیکی انداز کا کلام بھی ہے۔ مذہب اور تصوف سے بھی شغف تھا۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "آذنج" اور "سفینۂ ذکی" شائع ہو چکے ہیں۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور بہار اُردو اکیڈمی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انعامات دیے تھے۔
۷۳ سال کی عمر میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو اپنے وطن کوڑنگل میں انتقال کیا۔

اختر لکھنوی، مرزا سجاد علی خان

لکھنؤ کے شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی والدہ افضل بیگم، نواب بہو بیگم کے خاندان سے تھیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، بہو بیگم، نواب وزیر شجاع الدولہ کی بیوی اور

نواب وزیر آصف الدولہ کی والدہ تھیں۔ اختر کے والد نواب سالار جنگ کی نسل سے تھے؛ اور دادی نواب شجاع الدولہ کے خاندان سے۔ چنانچہ ان تینوں کے ترکے سے اختر کے خاندان کے افراد کو وثیقہ ملتا تھا۔

اختر کے والد نواب مرزا مہدی وثیقہ دار ہونے کے علاوہ ٹھیکیدار بھی تھے۔ جنگلوں کے بڑے ٹھیکے سے لے کر چھوٹے موٹے کاموں تک کا ٹھیکہ لیتے تھے، مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر روشنی اور کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کے لیے۔ اس سے اچھے خرچ کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

نواب مرزا مہدی کے پانچ بچے تھے: (۱) حسن عسکری عرف نواب؛ (۲) سجاد علی خاں عرف بابو صاحب؛ (۳) زینب بیگم؛[٭] (۴) راضیہ بیگم؛ (۵) جعفر علی خاں عرف ننّن صاحب۔ سجاد علی خاں مرحوم ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دسویں تک تعلیم حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ انٹر اور بی اے اور بی ٹی کے تمام امتحان یہیں سے پاس کیے۔

اس کے بعد انھوں نے تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے بہت جگہ کام کیا، لیکن کہیں بھی مستقل صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بلکہ اس دوران میں اپنے بہنوئی سید شبیر حسن قتیل (ف جولائی ۱۹۴۶ء) کے ساتھ مل کر دو ڈرامے "خونی سردار" اور "اودھ کا کنھیا" بھی لکھے۔ انھیں اسٹیج کرنے کے لیے دونوں کلکتے پہنچے۔ ایک چھوٹی سی تھیٹریکل کمپنی قائم کی، لیکن کمپنی چل نہ سکی اور بہت زیرباری ہوئی۔ اس پر دونوں واپس لکھنؤ آ گئے اور دونوں کھیل یہاں گولا گنج کی ایک کمپنی نے اسٹیج کیے۔

انھیں تعلیمی امور سے بہت دلچسپی تھی، اور اس میں بھی چھوٹے بچوں کی تعلیم۔ جغرافیہ ان کا خاص مضمون تھا۔ اس موضوع پر ان کی کچھ کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ غرض اب انھوں نے ریاست کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ وہاں کوئی دو تین سال کام

[٭] یہ حالات انھیں زینب بیگم اور ان کے صاحبزادے جناب عباس ظہیر سے معلوم ہوئے۔ جناب زینب بیگم، شبیر حسن قتیل مرحوم کی بیوہ ہیں۔

کیا تھا۔

سجاد علی خاں مرحوم کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ ہارمونیم اور طبلہ خاص طور پر بہت اچھا بجاتے تھے، کلاسیکی فنِ موسیقی میں بھی استادانہ مہارت حاصل تھی۔ ان کی ملاقات نواب رضا علی خاں مرحوم والیِ رامپور سے ہوئی، جو خود بھی ان فنون میں ماہرانہ درک رکھتے تھے۔ انھوں نے سجاد علی خاں کو رامپور آنے کی دعوت دی۔ سجاد علی خاں نے نواب صاحب کو اس پر راضی کر لیا کہ رامپور میں بچوں کے لیے کنڈر گارٹن درجے کا مونٹسری اسکول قائم کیا جائے، چنانچہ نواب صاحب نے اپنا انگوری باغ والا محل اس کے لیے خالی کر دیا، جہاں یہ اسکول ۱۹۴۳ء میں جاری ہو گیا۔ بعد کو (غالباً ۱۹۴۸ء میں) اسکول مچھی بھون کی عمارت میں چلا گیا تھا۔ یہ اسکول اب بھی بحسن وخوبی چل رہا ہے۔ سجاد علی خاں ۱۹۷۰ء تک اس اسکول کے پرنسپل رہے، اور اس کے بعد سبکدوش ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی والدہ کے اصرار پر کلکتے کی ایک خاتون سے ہوئی۔ لیکن یہ سنجوگ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسری شادی اپنی مرضی کی لکھنؤ کے ایک ہندو صرّاف کی صاحبزادی سے کی؛ اسے انھوں نے کنیز عباس کا نام دیا تھا۔ انھیں اس بیگم سے عشق تھا۔ ۱۹۴۴ء میں اس کی دائمی مفارقت کے بعد غریب کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ مثلاً وہ انگریزی لباس کے بہت شوقین تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد انھوں نے کوٹ پتلون کا استعمال یکسر ترک کر دیا۔ اسی طرح موسیقی جو گویا ان کی روح کی غذا تھی، بالکل چھوٹ گئی۔ رہی سہی کسر ۱۹۴۸ء کے فسادات میں ان کی دو بیٹیوں اور ایک داماد کی موت نے پوری کر دی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے بہت حوصلے اور ضبط سے کام لیا اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے۔ اتوار ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دل کا شدید دورہ پڑا اور اسی دن شب کے ساڑھے نو دس بجے کے درمیان روح قفسِ عنصری سے

پرواز کر گئی۔ جنازہ اگلی صبح (بدھ، ۲۵ اکتوبر) اٹھا اور ۱۱ بجے انھیں امامباڑہ غفراں مآب میں اپنے والد کی قبر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اولاد میں دو بیٹے (صادق علی خاں عرف چھوٹے جانی ؔ اور سعید تیدین، عرف پیارے) اور دو بیٹیاں (سلمہ بانو عرف ذکو اور انیس بانو) ان سے یادگار ہیں۔

اختر نے شعر گوئی ہائی اسکول کے زمانے میں شروع کی۔ اس میں مشورہ سید شبیر حسن تبسل سے رہا۔ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ، زمانہ ہوا چھپا تھا۔ ایک نثری کتاب "دورِ اوّل کا اودھ پنچ" ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ کلام نظم و نثر کی پختگی واقفیتِ فن اور مہارت پر دال ہے۔

آغا حیدر حسن مرزا

آغا حیدر حسن مرزا کی ایک ذات میں ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے کئی دھارے مل گئے تھے۔ دیکھیے:*

(۱) ان کے پردادا مرزا احمد شکوہ کی دو بیویاں تھیں، ایک کٹّر خاندان کی کشمیری برہمن خاتون اور دوسری، ایک ایرانی بیگم۔ ایرانی بیگم کے بطن سے صرف ایک بیٹی ہوئی، جس کا نام پیاری بیگم تھا۔ کشمیری خاتون کے بطن سے مرزا حسن جان پیدا ہوئے، جنھیں) مرزا حسن الدین کھی کہتے تھے (عرف مرزا حسنو تھا) انھیں ان کی سوتیلی والدہ (یہ ایرانی بیگم) نے پالا، جن کے اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ وہ انھیں آغا حسن کہہ کر پکارتی تھیں۔ وہ اس خاندان کے پہلے آغا تھے، ان کے بعد آغا خاندان کے نام کا جزو ہو گیا۔ یہی آغا حسن جان، ہمارے آغا حیدر حسن مرزا کے دادا تھے۔ ان کا ۱۸۷۸ء میں انتقال ہوا۔

(۲) آغا حیدر حسن مرزا کے والد آغا صفدر حسن مرزا کی شادی ہمارے مشہور شاعر نظام جواحسان (ف، ۱۲۷۶ھ) کی پرپوتی سے ہوئی تھی۔ احسان کے دو بیٹے تھے:

* ان واقعات کا بیشتر حصہ خود آغا حیدر حسن مرزا کا مہیا کردہ ہے۔

سیف الرحمٰن خان المخاطب بہ موسیٰ خان اور عبدالکریم خان المخاطب بہ عیسیٰ خان۔
سیف الرحمٰن خان موسیٰ خان کی شادی مریم زمانی بیگم (بنت ذوالفقار خان) سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے احمد حسن خان کا نکاح افضل زمانی بیگم سے ہوا، یہ نواب شرف الدولہ احمد قلی خان کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ان سے بڑی بہن ملکہ زمانی بیگم، ملکۂ دوراں زینت محل بیگم تھیں، جن سے بہادر شاہ ظفر نے اپنے بڑھاپے میں شادی کی تھی اور جن کے بیٹے جواں بخت کی شادی پر غالب اور ذوق نے سہرے کہے تھے۔ انھیں احمد حسن خان اور افضل زمانی بیگم کی صاحبزادی حسن زمانی بیگم تھیں، جو آغا صفدر حسن مرزا کے عقدِ نکاح میں آئیں، اور جو آغا حیدر حسن مرزا کی والدہ تھیں۔
آغا صفدر حسن مرزا کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوا۔
(۳) آغا صفدر حسن مرزا کی ایک ہمشیر تھیں انجم زمانی بیگم۔ یہ نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ (ف: ۱۸۶۹ء) کے سب سے بڑے بیٹے نواب محمد علی خان ترسکی (ف: مئی ۱۸۹۹ء) سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی، تو انھوں نے اپنے بھتیجے آغا حیدر حسن مرزا کو بیٹا بنالیا، اور یوں ان کی ابتدائی تربیت انھیں کے وہاں ہوئی۔
آغا حیدر حسن مرزا جمعہ ۱۲ محرم ۱۳۱۰ھ (۵ اگست ۱۸۹۲ء) کو اپنے خاندانی مکان (حویلی والاں، لال کنواں) میں پیدا ہوئے[۵]۔ یہ حویلی احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان کی ملکیت رہی تھی اور بعد کو آغا حیدر حسن مرزا کے دادا نواب موسیٰ خان کے قبضے میں آگئی تھی۔

آغا حیدر حسن مرزا کی تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ چونکہ اس زمانے میں وہ نواب شیفتہ کے گھر میں رہتے تھے، ان کی پہلی معلمہ نواب والی داد خان والیِ مالاگڑھ (نزد بلند شہر) کی صاحبزادی مقرر ہوئیں۔ جب دلی آئے، تو لال قلعے کی دو شہزادیاں انھیں پڑھانے لگیں: اول، مرزا فخرو (ف: جولائی ۱۸۵۶ء) کی بیٹی تو نینہ سلطان بیگم

۵ بعض اصحاب نے ان کی تاریخ ولادت کچھ اور لکھی ہے، لیکن یہ وہ تاریخ ہے، جو مرحوم نے خود مجھے بتائی تھی۔

اور دوسری بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی کلثوم زمانی بیگم۔ کلثوم زمانی بیگم پر غالباً ۱۸۵۷ء کی افتاد کے باعث، مذہب اور تصوف کا بہت غلبہ تھا؛ گیروے کپڑے پہنتیں، گلے میں تسبیح اور ہاتھ میں سمرن رہتی۔ آغا نے ان سب سے فارسی، اردو اور بغدادی قاعدے کے علاوہ ناظرہ قرآن کے اسباق لیے۔ اس کے بعد انھوں نے اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں تیسرے درجے تک تعلیم پائی؛ پھر غازی الدین فیروز جنگ کے مدرسے (بیرون اجمیری دروازہ) میں چوتھے درجے میں داخل ہو گئے۔ اس مدرسے میں وہ ۱۹۴۰ء تک دس برس رہے؛ اگلے پانچ برس ایم اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۹ء) یہاں ان کے مضامین میں فارسی اور انگریزی کے علاوہ قدیم تاریخ (روم و یونان و ہندستان) تھی۔

علی گڑھ میں ان کے ہمعصروں میں بڑے بڑے نام ہیں: رشید احمد صدیقی، اقبال احمد خاں سہیل، ذاکر صاحب، صاحبزادہ خورشید احمد خاں، ڈاکٹر سلیم الزماں (چودھری خلیق الزماں کے بھائی) وغیرہ۔

۱۹۱۹ء میں گاندھی جی علی گڑھ آئے۔ دیوانہ را ہوے بس است۔ آغا حیدر حسن نے انگریز کے خلاف ایک مضمون لکھا، جو غالباً علی گڑھ میگزین میں چھپا۔ اس پر پرچہ ضبط ہو گیا اور خود انھیں راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ یہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔

حیدر آباد میں چند مہینے کے انتظار کے بعد ۱۹۲۰ء میں یہ محکمۂ پولیس میں مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) مقرر ہو گئے۔ پھر وردی خانہ کے انچارج بنا دیے گئے۔ اس شعبہ کے ذمّے ریاست کے سپاہیوں کی وردیاں مہیّا کرنا تھا۔ اس زمانے میں اس عہدے کا مشاہرہ ۲۰۰ روپے حالی تھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ سر اکبر حیدری اس کے کرتا دھرتا تھے۔ وہی امورِ داخلیہ کے سکرٹری تھے، جس کے ذمّے تعلیمی امور کی دیکھ بھال تھی۔ آغا کی ان سے علیک سلیک تھی۔ جب انھوں نے سر اکبر سے یونیورسٹی میں ملازمت کی درخواست کی تو انھوں نے

کہا کہ آپ ابھی پولیس کے محکمے میں کام کرتے رہیے، جب موقع ملیگا آپ کو یونیورسٹی میں بلا لینگے اور اردو کی جگہ پر وحید الدین سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۲۸ء) کا تقرر ہوگیا۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ سے آغا حیدر حسن مرزا کا مجموعۂ مضامین "پس پردہ" شائع ہوا۔

۱۹۲۳ء میں سر اکبر نے انھیں جاگیردار کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر کردیا۔ تین سال بعد (۱۹۲۶ء میں) اسی عہدے پر نظام کالج میں تبادلہ ہوگیا۔ یہیں سے وہ ۲۸ سال بعد ۱۹۵۴ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

ان کے دل میں لکھنے پڑھنے کا شوق علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ انکی تعلیم کے ابتدائی دور میں انھیں لال قلعہ کی مخدرات کی صحبت میسر آئی، بلکہ ان کی تعلیم ہی ان کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اس سے انھیں بیگماتی زبان اور اس کے محاورے اور روزمرے پر پوری قدرت حاصل ہوگئی۔ نہ صرف یہ بلکہ جب وہ بیگماتی زبان میں گفتگو کرتے تھے، ان کا لب و لہجہ بھی بالکل زنانہ ہوجاتا تھا اور آواز کے اسی اتار چڑھاؤ سے بات کرتے، جو عورتوں سے مخصوص ہے۔ یہ اسی ابتدائی تربیت کا ثمرہ تھا۔

علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم میں اپنی اس خصوصیت کے باعث انھوں نے خاص شہرت پائی کی۔ ان کے دوست انھیں "آپا حیدری" کے نام سے پکارتے تھے۔ سہیل نے خاص طور پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ان سے فرمائشیں کرکے عورتوں کی زبان میں لکھواتے رہتے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو (ف: مارچ ۱۹۴۹ء) علیگڈھ آئیں، تو انھوں نے سہیل کے کہنے پر ان کے بارے میں مضمون لکھا، جو بعد کو علیگڈھ منتھلی میں شائع ہوا۔ "پس پردہ" اسی منتھلی کے بیشتر مضامین کا مجموعہ ہے۔ کاشکے کوئی اللہ کا بندہ ان کے تمام مضامین جمع کرکے شائع کردے! انھوں نے جان صاحب کا ریختی دیوان بھی شائع کیا تھا۔

جب یہ حیدرآباد پہنچے تو وہاں دکنی زبان کا شوق پیدا ہوا۔ ایک دن مہاراجا سر کشن پرشاد شاد مرحوم (ف: مئی ۱۹۴۰ء) کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک ملّا سے افغانی

تشریف لائے۔ مہاراجانے ان سے کچھ سلوک کیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ ان صاحب کے پاس منطق الطیر (عطار) کا دکنی ترجمہ "پنچھی باچا" تھا۔ آغا حیدر حسن مرزا نے یہ کتاب ان سے چار روپے میں خرید لی۔ اسے پڑھا، تو زبان کی پنجابی سے مماثلت دیکھی۔ اس سے کتاب کی فرہنگ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اب تو گویا ان کے منھ کو خون لگ گیا۔ جمعرات کی پینٹھ کا چکر ان کا معمول بن گیا۔ ہر ہفتے کباڑیوں سے کتابیں خرید کر لاتے، انھیں پڑھتے، ان کے خلاصے اور الفاظ کا مجموعہ تیار کرتے۔ ان کا مکان (حیدر منزل) بلامبالغہ ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے۔ پرانے قلمی نسخے، وصلیاں، تصویریں، تاریخی ملبوسات۔ غرض عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اسے کسی مستقل میوزیم کا حصہ بنا دینا چاہیے۔

حیدرآباد میں وہ مدتوں ریڈیو سے تقریریں کرتے رہے۔ کھانے پینے کے محاورے، شادی بیاہ کے محاورے، حیدرآباد کے میلے ٹھیلے۔ تقریروں کے یہ سلسلے بہت مقبول ہوئے تھے۔ اگر یہ سب تقریریں بھی جمع کر دی جائیں، تو ان میں ایک ایک کتاب کا مواد ہے۔

ان کی شادی ۱۹۲۱ء میں بدرالنسا بیگم سے ہوئی تھی۔ بمبئی کے پہلے سندشانی پولیس کمشنر خان بہادر سر امیر عبدالعلی تھے۔ ان کے صاحبزادے سردار میر عون علی ولایت گئے اور بیرسٹر بن کر وطن واپس آئے۔ ان کی شادی نواب محسن الملک (ف: اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے چھوٹے بھائی امیر حسن کی صاحبزادی مرتضائی بیگم سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہی امیر حسن علی گڑھ کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن (ف: مئی ۱۹۶۳ء) اور جافر حسین (جعفر حسن) (ف: جون ۱۹۷۳ء) کے والد تھے، اور مرتضائی بیگم ان دونوں کی سوتیلی بہن تھیں۔ ان بیچاری کی موت دردناک حالات میں جل مرنے سے ہوئی تھی۔

خیر، بدرالنسا بیگم انھیں سردار میر عون علی اور مرتضائی بیگم کی صاحبزادی تھیں۔ میر عون علی اس زمانے میں ریاست گوالیار کے قانونی مشیر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس مشہور مقدمے کی پیروی کی تھی، جس میں مہاراجا مادھوراؤ سیندھیا، انگریز ریذیڈنٹ

کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ طویل مقدمے کے بعد مہاراجا اس الزام سے بری قرار دیے گئے، اور اس کے بعد میر عون علی اور ان کے خاندان کے تعلقات حکمراں خاندان سے اور بھی قریب ہو گئے۔ مہاراجا کی پٹ رانی مہارانی جنگو لاولد تھیں؛ انھوں نے بدر النسا کو گود لے لیا۔ یہ اس وقت تین برس کی تھیں۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت گوالیار کے شاہی محل میں ہوئی؛ وہ فارسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پوری طرح قادر تھیں۔

آغا حیدر حسن مرزا کے دو بچے ان کی یادگار ہیں: مہر النسا بیگم (عرف شہزادی) اور آغا سرتاج حسن مرزا (عرف چاند پاشا)۔ بیٹی میر معظم حسین خاں کے عقدِ نکاح میں ہیں، جو یونسکو میں ملازم ہیں۔ وہ پہلے بہت دن پیرس کے صدر دفتر میں رہے، آج کل کابل دفتر کے انچارج ہیں۔ آغا مرحوم اکثر اپنی صاحبزادی اور داماد سے ملنے یورپ جاتے رہے۔ انھیں سفروں کے دوران میں فرانس اور جرمنی کے بہت لوگوں کو ان سے بطور صوفی عقیدت ہو گئی تھی۔

۱۹۷۶ء کے موسمِ گرما میں بھی وہ اپنے عقیدتمندوں کی دعوت پر یورپ گئے۔ وہاں سے اکتوبر میں کابل آئے، جہاں مہر النسا بیگم اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہیں۔ کابل سے بیٹی کے ہمراہ دلّی آئے، تین دن یہاں قیام کیا اور پھر حیدرآباد چلے گئے۔ بظاہر بالکل خوش و خرّم تھے اور یہاں گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ جمعہ ۵ نومبر ۷۶ کی شام ایک دوست کے ہاں چائے پی۔ واپس مکان آئے، تو سینے میں درد کی شکایت کی۔ فوراً ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے کہ یکایک روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ شب کے ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے۔ اِنّا للہ وَ اِنّا اِلیہ رَاجعُون۔

جنازہ ہفتے کے دن، ۶ نومبر کو ظہر کے وقت اٹھا اور "نیس خطۂ صالحین" میں دفن کر دیا گیا۔ باقر امانت خانی نے ہجری اور عیسوی میں دو تاریخیں کہیں:

(۱) کہی تاریخ حسبِ واقعہ رحلت کی باقر نے " رکا قلبِ معمّر چل بسے حیدر حسن مرزا "
(۱۳۹۶ھ)

(۲) کچھ یادیں، وہ تاریخ، جو میں حقیقت ہے " زبان بگماتی دیدۂ نم ہے آغا صاحب پر"
(۱۹۷۶ء)

سید ریاست علی ندوی

ان کے مورثِ اعلیٰ میناؔ مشہدی عہدِ شاہجہانی میں ہندستان آئے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی بھی تھے۔ ایک بھائی یہیں دلّی میں رہ گئے، دوسرے کڑہ مانکپور میں ٹھہرتے ہوئے پورب پہنچے۔ حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، اور چند گاؤں بھی معافی میں عطا ہوئے۔ رشد و ہدایت اور طبابت اس خاندان کا خصوصی مشغلہ رہا۔

اس خانوادے کے پہلے فرد جو انگریزی عہد میں حکومت کی ملازمت میں شامل ہوئے، ان کا نام سید احسان علی تھا؛ ان کے والد سید یوسف علی نامور طبیب اور ممتاز عالم تھے۔ لیکن ان کے بعد خاندان نے آزادہ روی کے ساتھ ساتھ حکومت سے بھی تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ سید احسان علی پٹنہ (عظیم آباد) میں ناظم مقرر ہوئے، جو اس زمانے میں بہت معزز عہدہ تصور کیا جاتا تھا۔ وہ پٹنے سے خشکی کے راستے گیا جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی، جس میں وہ جاں بحق ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے میر سید آلِ نبی گیا کے پہلے سرکاری وکیل تھے۔ ان کی سندِ وکالت (مورخہ ۱۸۴۳ء) آج تک خاندان میں محفوظ ہے۔

سید آلِ نبی کے دو بیٹے تھے: سید اولاد علی اور سید امید علی۔ یہی سید اولاد علی ہمارے سید ریاست علی کے حقیقی پردادا تھے، اور سید امید علی حقیقی نانا۔ سید اولاد علی کے بیٹے ڈاکٹر سید فرزند علی نے پٹنہ میڈیکل کالج میں تعلیم پائی تھی۔ انھوں نے نوجوانی میں وفات پائی۔ ان کے اکلوتے بیٹے سید بشارت علی ان کی وفات کے چند ماہ بعد جنوری ۱۸۸۷ء (ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ) میں پیدا ہوئے؛ یہی سید ریاست علی ندوی کے والدِ بزرگوار تھے۔

سید بشارت علی کے والد اور دادا دونوں ان کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے، اس لیے

وہ مجوب الارث قرار پائے۔ ان کے پرداداسید آل نبی نے اپنے دوسرے بیٹے سید اُمید علی کی رضامندی اور تائید سے سید بشارت علی کو حاجب کیا اور معتدبہ جائداد ان کے نام لکھ دی اور چونکہ وہ ابھی کمسن اور نابالغ تھے، سید امید علی ہی کو ان کا سرپرست اور ان کی جائداد کا منصرم مقرر کر دیا۔ سید امید علی نے فرض شناسی سے کام لیا۔ نہ صرف جائداد کی مناسب دیکھ بھال کی اور اسے ترقی دی، بلکہ اپنی منجھلی صاحبزادی ان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔ سید ریاست علی ندوی اسی نکاح کا نتیجہ تھے۔

سید ریاست علی خاندان کے سکونتی مکان (محلہ آیکلم گیا) میں ۸ اپریل ۱۹۰۴ء (مطابق ۲۰ صفر ۱۳۲۲ھ) کو پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچے، تو چندے گھر پر تعلیم پانے کے بعد صاحب گنج ہائی اسکول، گیا بھیج دیے گئے۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس سے تعلیم کا سلسلہ بھی درہم و برہم ہو گیا اور پھر خاندان کے بزرگوں نے انھیں گیا سے بلوا کر پٹنہ اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ لیکن وہ یہاں بھی اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ جلد ہی فیصلہ ہوا کہ انھیں ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۶ء میں انھوں نے ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کا قیام ۱۹۲۴ء تک رہا۔ تکمیلِ نصاب تو خیر اس کا مقصد تھا ہی، لیکن یہاں ان کے خیالات پر دیرپا سیاسی رنگ بھی چڑھا۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (ف: جون ۱۹۵۹ء) مصر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے۔ چونکہ مصر میں پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے دوران میں ان کی سرگرمیاں مشتبہ رہی تھیں، اور انگریز وہیں سے ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے، اس لیے توقع اندیشہ تھا کہ یہاں ہندستان پہنچنے پر انھیں گرفتار کر لیا جائیگا۔ انھوں نے خفیہ پولیس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تکمیل حدیث کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سید ریاست علی بھی وہاں طالب علم تھے، اور ان کے بزرگ ان کے سابق نگران ڈاکٹر سید شاہ زین العابدین پیر بگھوی مرحوم

کے لکھنؤ سے چلے جانے کے باعث متشوش تھے کہ انھیں اب کس کی نگرانی میں چھوڑا جائے۔ ملیح آبادی مرحوم کے وہاں پہنچ جانے سے ان کی مشکل حل ہوگئی۔ یہ بھی اسی کمرے میں رہنے لگے، جس میں ریاست علی مقیم تھے۔

ملیح آبادی سیاسی خیالات میں انگریز دشمن تو تھے ہی، وہ طریق کار کے لحاظ سے انقلابی بھی تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ خفیہ طور پر غالباً ان کا بنگال کے دہشت پسند عناصر سے بھی تعلق تھا۔ بہرحال، ان کے نوجوان ریاست علی مرحوم کے ساتھ رہنے کا وہی نتیجہ نکلا، جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ملیح آبادی مرحوم بڑے لسان اور بذلہ سنج آدمی تھے، ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور حافظہ بھی قوی۔ وہ ہنسی مذاق میں بڑے تے کی بات کہہ جاتے تھے۔ ریاست علی کے ساتھ ان کا دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لاشعوری طور پر ان کا ملیح آبادی کے سیاسی خیالات سے متاثر ہو جانا لابدی تھا۔ قصہ کوتاہ یہ بھی انگریز دشمنی کے رنگ میں رنگ گئے۔ حکومت کے کارندے جو ملیح آبادی کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ خود ملیح آبادی تو خاموش ہیں، کہیں آتے جاتے نہیں، لیکن ان کا یہ شاگرد (اور ان کے بھی کان کاٹنے لگا) ہے۔ تدریجاً یہ معتوب سرکار ہو گئے، بلکہ سنا ہے کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تک جاری ہو گئے تھے۔

خاندان کے بزرگوں تک خبر پہنچی، تو انھوں نے انھیں وطن طلب کیا۔ پہلا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کی شادی کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید اکرم امام کی منجھلی بیٹی سعیدہ خاتون سے ان کا عقد کردیا گیا۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ سید اکرم امام ان کے والد سید بشارت علی کے سگے ماموں تھے اور پہلی بیوی (بنت سید امید علی) کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی اپنے انھیں ماموں کی منجھلی بیٹی سے ہو چکی تھی۔ انھیں کی چھوٹی ہمشیر سے اب سید ریاست علی کی شادی ہو گئی، گویا ان کی سگی بڑی سالی، ان کی سوتیلی ماں بھی تھیں۔

شادی کے بہانے سے گھر والوں نے انھیں مکان پر روک لیا اور چند مہینے لکھنؤ نہیں جانے دیا۔ ادھر ملک کی سیاسی سرگرمیاں بھی رفتہ رفتہ کچھ سرد پڑ گئیں اور غالباً وارنٹ

بھی منسوخ کرا دیا گیا۔ اس کے بعد یہ دوبارہ ندوہ پہنچے اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا شبلی کی وفات (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) کے ساتھ ہی دارالمصنفین، اعظم گڑھ کی باگ ڈور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وہ اس تلاش میں تھے کہ کچھ ہونہار نوجوانوں کو اپنے اردگرد جمع کریں، جو تصنیف و تالیف کے کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں، اور استاذ کے لگائے ہوئے اس پودے کی آبیاری کر سکیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ریاست علی ندوی ہر طرح اس کام کے اہل ہیں، تو وہ انھیں اگست ۱۹۲۴ء میں اپنے ساتھ دارالمصنفین لے گئے۔

دارالمصنفین میں ان کا قیام تیرہ برس تک رہا (اگست ۱۹۲۴ء تا جون ۱۹۳۷ء)۔ اس زمانے میں وہ دوسرے کاموں کے علاوہ معارف کی ترتیب و تدوین میں بھی مدد دیتے رہے۔ ان کی دو مشہور کتابیں تاریخ صقلیہ (دو جلدیں) اور تاریخِ اندلس (جلد اول) اسی زمانے میں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۳۷ء میں وہ اپنے وطن گیا واپس آئے۔ اور اسی سال انھوں نے ماہنامہ "ندیم" کی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ چار سال یعنی ۱۹۴۱ء تک یہ پرچہ ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں وہ دوبارہ دارالمصنفین میں بطور رفیق چلے گئے اور اب کے ۱۹۴۹ء تک وہاں رہے۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، اور اگلے تقریباً دس سال (مارچ ۱۹۵۹ء تک) اسی عہدے پر متمکن رہے۔ اسی زمانے میں وہ حکومتِ بہار کے شعبۂ اسلامی تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی رہے (۱۹۵۲ - ۱۹۶۲ء)۔ شمس الہدیٰ کی ادارت سے سبکدوش ہونے کے بعد (مارچ ۱۹۵۹ء میں) انھیں عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ کا صدر اور پروفیسر بنایا گیا۔ یہاں وہ سات برس تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء) وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے گیا کالج، مگدھ یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات

کے پروفیسر رہے۔
ان کی وفات اتوار ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو بلگرام اسپتال میں بعارضۂ قلب ہوئی، اور اسی دن اپنے آبائی قبرستان (آبگلہ) میں سپردِ خاک کیے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ پانچ صاحبزادے ان کی جسمانی یادگار ہیں۔ (سید اسد علی، سید ارشد علی، سید اشہد علی، سید امجد علی، سید شوکت علی) ماشاء اللہ سب خوش وخرم اور معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔
تاریخ منقلیہ (دو جلدیں) اور تاریخ اندلس (جلد اول) کے علاوہ، جن کا اوپر ذکر ہوا، ان کی دوسری مطبوعہ کتابیں یہ ہیں: عہدِ اسلامی کا ہندستان، اسلامی نظامِ تعلیم، المرأۃ اسلام، سرگذشت ادب ترکی۔ ان کی دو کتابیں (چند تنقیدیں اور عہدِ رسالت و خلافت راشدہ) زیرِ طبع ہیں۔ ابھی سترہ سولہ اور کتابیں منتظرِ طباعت ہیں۔ متعدد مقالات ان کے علاوہ ہیں، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف علمی مجالس میں پڑھے تھے۔ یہ سب چیزیں محفوظ ہو جانا چاہییں۔

سید وقار عظیم، پروفیسر

ان کا خاندان میرٹھ کا رہنے والا تھا، لیکن یہ خود دسمبر ۱۹۱۰ء (۱۳۲۷ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان دنوں ان کے والد سید مقبول عظیم مقیم تھے۔ سید مقبول عظیم شاعر بھی تھے، نعتِ رسول صلعم سے زیادہ مزاولت تھی۔ وقار عظیم ان کا نام تاریخی ہے، جس سے ۱۳۲۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔
لامحالہ وقار عظیم کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتداً ایک پنڈت جی کے مدرسے سے ہوئی۔ یہاں ہندی اور حساب سیکھا، پھر اسکول پہنچے۔ بالآخر جوبلی کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی پہنچے، اور ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے درجۂ اول میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ وہ اپنے استاد پروفیسر سید اعجاز حسین (مدظلہٗ) کے چہیتے شاگرد تھے۔

میں سے تھے۔ اُن کے علاوہ اس یونیورسٹی کے دو اور استادوں کا ان پر گہرا اثر رہا۔ اول پروفیسر ایس سی دیب اور دوسرے، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری؛ یہ دونوں یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پڑھاتے تھے۔ دونوں بے پناہ مطالعے کے شائق اور ہمہ جہتی علم کے مالک تھے۔ وقار عظیم کے کردار اور ادبی رجحانات کی تشکیل میں ان دونوں کا بہت بڑا حصہ ہے، جس کا شاید ہی اعتراف کیا جائے۔

اپنے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں ان کا بہت گہرا تعلق جوبلی کالج کے پروفیسر سید علی عباس حسینی (ف: ستمبر ۱۹۶۹ء) سے رہا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھیں شروع سے افسانہ اور فنِ افسانہ سے دلچسپی ہو گئی، اور اس صنف میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق ہو گیا کہ انھوں نے قیامِ الٰہ آباد کے دوران دو کتابیں ("ہمارے افسانے" اور "اردو افسانہ نگاری") تصنیف کیں۔ یہ کتابیں اوّل مرتبہ الٰہ آباد ہی سے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئیں۔ یہ دونوں آج بھی مقبول ہیں، حال آں کہ یہ ان کے طالب علمی کے دور کی یادگار ہیں۔ دراصل یہ انھیں دونوں کتابوں کی تصنیف تھی، جس نے انھیں دیب اور فراق سے اتنا قریب کر دیا۔ فنِ افسانہ نگاری پر اردو میں کوئی مواد نہیں تھا، انگریزی میں جو کچھ تھا، اس تک کسی کی رہبری کے بغیر رسائی ممکن نہیں تھی۔ ان دونوں استادوں کی مشورت اور دستگیری ان کے لیے اپنے کام کی تکمیل میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

الٰہ آباد سے ایم اے کی سند لینے کے بعد وہ علی گڑھ آئے اور یہاں سے بی، ٹی کا امتحان پاس کیا۔ جب سب تعلیمی منازل طے ہو گئیں، تو کسبِ معاش کا مشکل ترین مرحلہ سامنے آیا۔ چونکہ تعلیمی دَور بہت کامیاب رہا تھا اور وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی داخل ہو چکے تھے، اس لیے ملازمت کے حصول میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ ان کی سب سے پہلی تقرری بحیثیت استاد اردو جامعہ ملیہ ہائی اسکول دلّی میں ہوئی۔ اس زمانے میں یہاں سے ماہنامہ "جامعہ" ڈاکٹر سید عابد حسین کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب ڈاکٹر صاحب موصوف

دنیات

انجمن ترقی اُردو کے سکتر مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) کی فرمائش پر اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی تیاری میں مصروف تھے۔ چونکہ وہ "جامعہ" کی ترتیب و تدوین پر پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے، انھوں نے اس رسالے کی ادارت پر سیّد وقار عظیم کو مقرر کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بسا اوقات وہ اپنے طلبہ کو بھی ان کے پاس مشورے کے لیے بھیج دیتے تھے۔

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا نام بڑا تھا، لیکن اس کی اس زمانے کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہاں کے کسی استاد کو سوا سو روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں ملتا تھا۔ سیّد وقار عظیم کو بھی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھی۔ لیکن آدمی تھے متحمل مزاج اور ایثار پیشہ، اس لیے کسی سے شکایت بھی نہیں کی۔ آخر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم شیخ الجامعہ (ف: مئی ۱۹۶۹ء) نے خود ہی ایک دن کہا کہ اگر آپ چاہیں تو کسی دوسری جگہ ملازمت کا انتظام کریں، تاکہ آپ کی مالی دشواریاں بھی کچھ کم ہو جائیں، اور لکھنے کے شوق کی تسکین بھی۔ پھر ذاکر صاحب نے خود ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں (ف: اکتوبر ۱۹۵۱ء) صدر مجلس انتظامیہ اینگلو عربک کالج سے سفارش کی (ذاکر صاحب خود اس کے نائب صدر تھے) اور وقار عظیم اس کالج میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ اس کے چند ے بعد دہلی پالی ٹکنک میں استادِ اردو کی جگہ نکلی۔ وہاں کے اصحابِ مجاز نے وقار عظیم کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی؛ مشاہرہ بھی زیادہ تھا، اس پر وہ اینگلو عربک کالج سے مستعفی ہو کر وہاں چلے گئے۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) کے دوران میں (۱۹۴۲ء) حکومتِ وقت نے پراپیگنڈے کے لیے پندرہ روزہ "آجکل" جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ مختلف اوقات میں پندرہ روزہ اور ماہانہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا، تا آں کہ ۱۹۴۸ء میں مستقلاً اس کی شکل ماہانہ کی ہو گئی۔ اس کے سب سے پہلے ایڈیٹر آغا محمد یعقوب دوانی تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ترقی پر ان کا تبادلہ ہو گیا اور ایڈیٹر کی جگہ خالی ہو گئی۔

سید وقار عظیم نے بھی درخواست بھیج دی، اور وہ "آجکل" کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے۔ وہ اس جگہ پر کوئی دو برس رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا اور وہ کراچی چلے گئے۔ حکومتِ پاکستان نے بھی "آجکل" کے انداز کا ماہنامہ "ماہِ نو" جاری کر دیا۔ سید وقار عظیم کی "آجکل" کی ایڈیٹری ان کے کام آئی، اور "ماہِ نو" کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی۔

کراچی کا یہ قیام بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کسی ماہنامے (خاص کر اردو ماہنامے) کی ادارت بھی مدیر کو پورا وقت مصروف رکھنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ سید وقار عظیم نے خالی اوقات میں تنقیدی اور ادبی مضامین کے علاوہ متعدد درسی کتب اسی زمانے میں لکھیں۔ لیکن کراچی کی مرطوب آب و ہوا نے ان کی تندرستی پر بہت برا اثر کیا۔ وہ شروع سے قوام کے گرویدہ اور دھان پان تھے۔ اب ان پر دمہ کا مرض مسلط ہو گیا۔ پہلے تو انھوں نے پروا نہ کی؛ لیکن تابکے، بالآخر ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ انھوں نے کراچی سے لاہور منتقل ہو جانے میں عافیت دیکھی۔ خوش بختی سے ۱۹۵۰ء میں یہاں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اردو کی مدرسی مل گئی۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر "معلم" تھے، اس لیے اس تبدیلی سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔

اورینٹل کالج میں وہ تقریباً ۲۰ برس رہے۔ لیکچرر سے ریڈر ہوئے، اور ریڈر سے پروفیسر۔ جب وہ ۱۹۷۰ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو صدر شعبہ تھے۔

صحت بالعموم تسلی بخش نہیں تھی، لیکن انھوں نے کبھی مایوسی یا افسردگی کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا، نہ کبھی محنت سے جی چرایا۔ ظاہر ہے کہ روح خواہ کتنی مضبوط اور طاقتور ہو، جسم کب تک اس کا ساتھ دے سکتا ہے! ۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو یرقان کا حملہ ہوا، اور بعید شدید۔ گردوں میں بھی کچھ پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ بغرض علاج لاہور کے ماجرہ کلینک میں داخل ہوگئے۔ دوا دوش میں کمی نہیں ہوئی، لیکن

بہبود، حالت نزعت سے بگڑتی گئی۔ ایک مرحلے پر فیصلہ ہوا کہ انھیں خون دیا جائے۔ اس پر کلینک کے باہر ان کے دوستوں اور مداحوں کا تانتا لگ گیا، جو اپنا خون پیش کر رہے تھے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء شام کے وقت جان بحق ہو گئے۔ تجہیز و تکفین اگلے دن ۱۸ نومبر کو ہوئی۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ منظور حسن عباسی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ازاں کہ ہر نفسش بودہ فیض بادِ عظیم
ترا دشش قلمش گشتہ شاہکارِ عظیم
چو رخت بست ز دنیائے دوں بگفت حسن
ز سالِ رحلتِ او "نوحۂ وقارِ عظیم"
(۱۳۹۶)

جسمانی اولاد میں پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

سید وقار عظیم نے اپنی زندگی میں افسانے بھی لکھے اور شعر بھی، انھوں نے سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ ہندوستان میں "آجکل" کی اور پاکستان میں "نقوش" اور "ماہ نو" کی ایڈیٹری بھی کی؛ وہ ریڈیو اور ٹی وی کی بھی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ غرض ان کی ذات کئی پہلوؤں کی حامل تھی۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ، جس کے لیے وہ تاریخ ادب اردو میں یاد کیے جائیں گے، ان کی تنقید ہے، خاص طور پر افسانے اور غزل کے میدان میں۔ افسانے میں تو ان کا کام اتنا نمایاں ہے کہ شاید ہی کوئی اور نقاد ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اگرچہ اور بہت اصحاب نے بھی افسانے کی تاریخ و تنقید پر لکھا ہے، مثلاً احتشام حسین اور احسن فاروقی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کا پلہ سب پر بھاری ہے۔ وقار عظیم تاریخ تنقید میں ایک طرح سے حالی اور ترقی پسند نقادوں کے درمیان برزخ کا کام دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیشک کلاسیکی تھا، اور وہ حالی سے متاثر بھی تھے، لیکن ان میں حالی کی مقصدیت اور اصلاح کی خواہش کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح وہ ترقی پسند

تحریک سے بھی متاثر ہوئے، بلکہ کچھ زمانہ ان اصحاب کے ہمراہ بھی چلے، لیکن وہ کبھی ان کی
تخریبی تنقید اور انقلابی روش سے اتفاق نہ کر سکے۔ انھوں نے دونوں کی افرا
تفریط سے دامن بچایا اور اپنی انفرادیت کا سکہ منوا لیا۔

معزز لکھنوی، میرزا محمد عزیز

میرزا محمد عزیز مرحوم برادرِ بزرگ تھے، مشہور مزاح نگار میرزا محمد اقبال ماچس ل
کے، جن کا ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا تھا۔ ماچس مرحوم
مفصل حالات قلمبند کر چکا ہوں (دیکھیے، تذکرۂ معاصرین (۱): ۲۲۸-۳۷
دہ میں میں نے خاندان کا ذکر بھی شرح و بسط سے کیا ہے۔ مختصراً انھیں کا اعاد
یہاں کرتا ہوں۔

میرزا محمد عزیز کے والد مرزا مہدی حسین (ف: ۱۹۴۹ء) پوتے تھے، میرزا افق
کے جو بادشاہِ اودھ محمد علی شاہ کے بیٹے تھے۔ محمد علی شاہ کے بعد ان کے بڑے
امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے تھے، اس لیے بقیہ اولاد کے لیے وظائف مقرر ہو
یہ وظیفے بھی اس وقت بند ہو گئے، جب انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں امجد عل
کے بیٹے، آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتے میں نظر بن
اس کے بعد انگریزوں نے خاندانِ شاہی کے افراد کے وثیقے مقرر کر دیے۔
حکمراں کی براہِ راست اولاد تھے، انھیں مزید برآں کچھ سیاسی پنشن بھی ملتی تھ
میرزا مہدی حسین کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا تھا۔ آمدنی قلیل
کنبہ بڑا، پس انداز کرنے کا کیا سوال تھا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اولاد کی
طریقے پر تعلیم نہ ہو سکی۔ معزز کی بھی (ماچس کی طرح) سرپرستی ان کے نانا
محمد ابراہیم عیش نے کی تھی؛ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم انھیں سے حاص
یہ عیش مرحوم کا دورِ انحطاط تھا؛ اس لیے دونوں بھائی ان سے بہت کم
کر سکے۔

لکھنؤ کا وہ ماحول، اس پر گھر میں ہر وقت شعر و سخن کے چرچے! معزز نے بھی بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ روایت ہے کہ انھوں نے شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۲۲ء میں کی، جب ان کی عمر ۱۲ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اور یہ ابتدا بھی ایک سلام سے ہوئی۔

شروع میں چند روز صدق لکھنوی سے اصلاح لی۔ پھر دو برس بعد (۱۹۲۴ء) جب غزل کی طرف توجہ ہوئی، تو اس پر سید انور حسین آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے شاگرد رشید وقار لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ وقار کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔ اس دوران میں حکیم منّے آغا صاحب آفتاب فیض آباد سے لکھنؤ آئے، تو معزز ان کی خدمت میں پہنچے۔ آفتاب فارسی عربی میں منتہی اور پرانی وضع کے استاد تھے، جو فن کی تعلیم فن کی خاطر حاصل کرنے کے قائل تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ شاگرد ہونہار ہے، لیکن فن شعر میں اسے مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے معزز کو عروض باقاعدہ پڑھایا۔ کچھ مدت بعد آفتاب واپس فیض آباد چلے گئے، تو اب معزز نے صفی لکھنوی (ف: جون ۱۹۵۰ء) سے رجوع کیا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلا لیکن صفی کی پیرانہ سالی اور صحت کی خرابی کے باعث ۱۹۴۰ء میں اسے مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کلام کسی کو نہیں دکھایا۔ البتہ کوئی علمی مسئلہ یا فنی نکتہ حل طلب ہوتا تو میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی (ف: جون ۱۹۶۷ء) سے استفسار کر لیتے۔

اثر مرحوم جب ۱۹۵۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً لکھنؤ میں مقیم ہو گئے، تو معزز نے "مجلس شعر و ادب" قائم کی تھی۔ اثر اس مجلس کے صدر تھے اور معزز نائب صدر۔ اس کے ماہانہ مشاعرے اثر کے مکان (کشمیری محلہ) میں ہوا کرتے تھے۔

معزز کی شادی صادق حسین صدق لکھنوی کی بیٹی صولت آرا بیگم (عرف چھیتی بیگم) سے ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے: مرزا احمد عزیز عرف فرخ نواب

وفیات

سگار لکھنوی (ولادت: ۱۹۳۱ء) اور میرزا احسن عزیز عرف شہنشاہ نواب (ولادت: ۱۹۳۵ء) یہ دونوں کمسن تھے، جب مختصر علالت کے بعد جیتی بیگم مئی ۱۹۳۶ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ معزز نے عہد کیا کہ میں نکاح ثانی نہیں کرونگا اور ان بچوں کے لیے والد اور والدہ دونوں ثابت ہونگا۔ اس وقت وہ ۲۵ برس کے جوان تھے، لیکن انھوں نے یہ عہد نبایا اور واقعی ان بچوں کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت میں اپنی جان کھپا دی۔ دونوں بحمدہٖ تعالیٰ کامران و کامیاب، خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بڑے سگار، اپنے چچا ماچس مرحوم کی طرح مزاح نگار ہیں اور اس میدان میں ہر طرح قابل قدر۔ آج کل بمبئی میں قیام ہے۔

معزز مرحوم کی علالت کا سلسلہ جولائی ۱۹۷۵ء سے شروع ہوا۔ گلے کے بائیں طرف گلٹی نمودار ہوئی۔ کسی کو معاملے کی نزاکت کا احساس نہیں ہوا۔ ادھر اُدھر کا علاج ہوتا رہا۔ جب تکلیف کسی طرح رفع نہ ہوئی، تو لکھنؤ کے ایک مشہور ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا، انھوں نے کینسر تشخیص کیا۔ اب تگ و دو شروع ہوئی۔ بڑے بیٹے سگار کی درخواست پر ٹاٹا میموریل اسپتال، (پریل) میں علاج کے لیے بمبئی گئے۔ وہاں گلٹی کا آپریشن بھی ہوا۔ لیکن معاملہ حد سے گزر چکا تھا۔ وقتی افاقہ ضرور ہو گیا، لیکن مرض جڑ سے نہیں گیا۔ وہ واپس لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۲۳ نومبر ۱۹۷۶ء کی سہ پہر میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن رات کے نو بجے تجہیز و تکفین کے بعد انھیں کربلاے امداد حسین خاں میں ان کے برادرِ خورد ماچس مرحوم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ پرتو لکھنوی (تلمیذ آرزو لکھنوی) نے تاریخ وفات کہی۔

ہوئی ہے لکھنؤ کی آج بزم شعر سونی
مرض یہ کینسر کا جیسے پیغام قضا ہے
ہیں سب اس کے لیے غمگین، پرتو!
عزیزِ قوم خوش گو معزز اٹھ گیا ہے

(۱۳۹۶ھ)

افسوس، ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔

فانی بلگرامی، سید وصی احمد

غالب کے شاگردوں میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کا نام بہت مشہور ہے۔ انھوں نے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا اور ان کی بدولت بہار میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ان کا ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ) کو پٹنے میں انتقال ہوا اور وہ اپنے آبائی وطن آرہ میں دفن ہوئے۔ ان کے اکلوتے صاحبزادے سید نور احمد بھی شعر کہتے، اور نگرامی تخلص کرتے تھے۔ سید وصی احمد فانی بلگرامی انھیں کے چھوٹے بیٹے تھے۔

فانی ۱۶ دسمبر ۱۸۸۹ء (۲۲ ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ) کو اپنے خاندانی مکان واقع پھاٹک میر صاحب، آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم آرہ ٹاؤن اسکول میں پائی اور ۱۹۰۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کی سند لی۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں انٹر کا امتحان جی بی بی کالج مظفر پور (بہار) سے اور ۱۹۱۱ء میں بی اے کا پٹنہ کالج سے پاس کیے۔ ہر مرتبہ امتیاز اور وظیفہ حاصل کیا۔ بی اے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے ایم اے (تاریخ) کے درجے میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن عین امتحان کے دنوں میں بیمار ہو جانے کے باعث ۱۹۱۳ء میں امتحان دینے سے قاصر رہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم کا دور ختم ہو گیا۔

۱۹۱۸ء میں سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے؛ اور ان کا تقرر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔ تقریباً ۲۸ سال کی ملازمت کے بعد مئی ۱۹۴۷ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا تھا۔ اسی وقت انھوں نے نقل مکان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پورے خاندان کے ساتھ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی چلے گئے۔ جہنیا بھر کے بعد حج کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں سے اواخر نومبر ۱۹۴۷ء میں واپس آئے۔

۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء رات ساڑھے نو بجے کراچی میں رہگرائے عالمِ فانی ہوئے۔
اگلے دن (۱۵ نومبر) انھیں ان کے برادر ڈاکٹر سید عنایت احمد ونگر بلگرامی
(ف: مئی ۱۹۷۶ء) کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔
شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ دادھیال اور ننھیال میں متعدد شاعر ہوئے۔
کمال مرحوم نثر بھی خوب لکھتے تھے اور اس میدان میں سب ان کا لوہا مانتے
تھے۔ ان کا مضمون "س، ش، ص" جس میں انھوں نے شاد عظیم آبادی کے
تلمذ صفیر پر بحث کی گئی ہے، خاصے کی چیز ہے۔ جس زمانے میں یہ پہلی مرتبہ نگار
میں چھپا ہے اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔
افسوس کہ مجموعۂ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔

رول (۸)　　　　فارم (۴)

۱۔ تحریر، تاریخ: مارچ، جون، ستمبر، دسمبر
۲۔ (۱) اڈیٹر: مالک رام؛ (۲) قومیت: ہندستانی
(۳) پتا: سی ۴۰۵، ڈیفنس کالونی، نئی دلی ۲۴
۳۔ (۱) پرنٹر و پبلشر: ظلِ عباس عباسی (۲) قومیت: ہندستانی
(۳) پتا: ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶
۴۔ نام و پتا مالک: علمی مجلس، ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی
میں ظلِ عباس عباسی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں
صحیح ہیں۔　　　(دستخط)　　　ظلِ عباس عباسی

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر: امرت لال   مترجم   رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے۔ وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر۔ آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا جڑا ہوا اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۲۸/۷۵

ہندی کے یک بابی ڈرامے: مرتبہ: چندر گپت ودیالنکار مترجم ڈاکٹر محمد حسن

زیر نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈراموں کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈرامانگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔   قیمت ۱۲/۵۰

میلا آنچل: بھونیشور رینو   مترجم: سلمیٰ صدیقی

یہ ہے "میلا آنچل" ایک ناول مقامی رنگ لیے ہوئے۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، دھول بھی ہے اور گلال بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ان میں سے کسی سے بھی دامن بچا کر نہیں نکل پاتا۔ میلا آنچل عالمی ناول کہا جا سکتا ہے۔

قیمت ۱۸/۷۵

راگ درباری: شری لال شکلا۔   مترجم   راشد سہسوانی

"راگ درباری" کو ہندی میں با مقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے۔ یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے مختلف طرز کے پلاٹ، ایک نئی تکنیک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول   قیمت ۱۵/۵۰

تقسیم کار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

(۴۰)

مرتب مالک رام

جلد ۱۱ اپریل/جون ۱۹۷۷ء شمارہ ۲

چندہ سالانہ ہندستان : پندرہ روپے یہ شمارہ
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) / ۸ ڈالر (امریکی) پانچ روپے

پرنٹر پبلشر ظلّ عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں
چھپوا کر علمی مجلس، ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶
سے شائع کیا۔

ملاحظات

سالِ رواں کا دوسرا شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے، آیندہ شمارہ خاص نمبر ہو، اس لیے اس کی ضخامت معمول سے کچھ زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں، اگر یہ ستمبر میں ناظرین تک نہ پہنچ سکے، تو تاخیر کے لیے ابھی سے معذرت قبول فرمائیے۔

مالک رام

محمد مشتاق شارق

غالب اور بندیل کھنڈ

بندیل کھنڈ میں یو۔پی کے چار ضلعے[1] شامل ہیں: جھانسی، جالون، باندہ اور ہمیر پور۔ جھانسی کے متعلق کے تو معلوم نہیں لیکن بقیہ تین ضلعوں سے غالب کا خاص تعلق رہا ہے۔ باندہ میں غالب کے عزیزوں میں سے نواب ذوالفقار بہادر اور نواب علی بہادر اور جالون کی ریاست کدورہ باؤنی میں ان کے شاگرد نواب انوار الدولہ شفق حکمران تھے۔ ہمیر پور کے ضلع کو یہ شرف حاصل ہے کہ غالب لکھنؤ سے باندہ جاتے ہوئے، اس کی سرحد سے گزرے، اور اس کے ایک قصبے موزھا میں دو دن اور دوسرے گاؤں چبینتا میں ایک دن قیام کیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے:

مرزا صاحب اپنے مقدمے کے سلسلے میں، کلکتے کے لیے روانہ ہوئے، تو راستے میں کانپور پہنچتے پہنچتے بیمار ہو گئے۔ چونکہ کانپور میں حسبِ منشا علاج ممکن نہ تھا، اس لیے مجبوراً انھیں لکھنؤ کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں وہ پانچ ماہ سے کچھ اوپر فروکش رہے[2]۔ اس طویل بیماری سے عاجز آ کر انھوں نے باندہ جا کر علاج کرانے کا ارادہ کیا، جہاں ان کے عزیز اور قدردان نواب ذوالفقار بہادر، براورِ ریاست باندہ تھے۔ اس سفر کے لیے مرزا ۲۶ ذی قعدہ یعنی ۲۷ جون

۱- اب پانچ ضلع بنا دیے گئے ہیں۔ جھانسی کو جھانسی اور للت پور دو ناموں میں تقسیم کر دیا گیا۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھیے غالب کا خط بنام ابن حسن خان (اردو ادب، جولائی ۱۹۵۲ء)۔ اس سے حالی کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ "چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کانپور پہنچ کر خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں۔"
(یادگارِ غالب (مرتبہ مالک رام): ۲۳)

غالب اور بندیل کھنڈ

۱۸۴۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے ہوں تین روز بعد پیر کو کانپور پہنچے۔ کانپور سے باندہ اندازاً ۸۰ میل دور ہے۔ چونکہ بندیل کھنڈ میں گرمی بہت شدید پڑتی ہے اور مرزا اس وقت کمزور اور بیمار تھے۔ اس لیے لازماً وہ دس بجے صبح سے قبل ہی اپنا سفر ختم کر دیتے ہونگے، گویا یہ سفر تقریباً بیس میل روزانہ سے زیادہ نہ ہوا ہوگا۔ اسی لیے وہ پنج شنبہ کو موڈا (مودھا) پہنچے اور یہاں دو روز قیام کیا۔ موڈا اصل میں ضلع ہمیر پور کا مشہور قصبہ مودھا ہے۔ بندیل کھنڈی لہجے کے باعث غالب اس کا تلفظ موڈا سمجھے۔ اس سلسلے میں، باندہ سے روانگی کے بعد مرزا کا وہ بیان غلط ہو جاتا ہے جس کا اظہار انھوں نے مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ کے نام اپنے خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

روز پنج شنبہ در موڈا رسیدہ، تا یک شنبہ بہ آرامش گرائید۔ دوشنبہ
کوس رحیل کوفتہ شبے بہ روستا بسر بردہ سہ شنبہ در چلہ تارہ رسیدہ بامدادان
اگر حیات باقی است، ہیچ راہ فتح پور کردہ خواہد شد۔

اس خط میں مرزا نے باندہ سے چلہ تارا تک پہنچنے کا حال لکھا ہے کئی برس کی مسلسل پوچھ گچھ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باندہ اور چلہ تارا کے درمیان موڈا نام کا کوئی گاؤں یا قصبہ نہیں! یہ مرزا کا سہو ہے۔ اصل میں یہ قصبہ کانپور اور باندہ کے درمیان پڑتا ہے۔ ویسے بھی باندہ اور چلہ تارا کے درمیان صرف ۱۲ کوس کا فاصلہ ہے اس لیے اتنے فاصلے کو تین دن میں طے کرنا بعید از قیاس ہے۔ کانپور سے مودھا کا فاصلہ ۶۰ میل ہے۔ اس لیے یقیناً مرزا کی تیسری منزل مودھا (موڈا) ہوگی۔ وہ وہاں جمعرات کو پہنچے اور جمعے سے اتوار تک تین دن انھوں نے مودھا میں گزارے[۳]۔ دوشنبے کو وہ باندہ کے لیے روانہ ہوئے۔ چونکہ اس راستے پر اس وقت لڑھا کے سوا اور کوئی گاڑی دستیاب نہ تھی اس لیے لڑھا (سینا گاڑی) کی رفتار کے پیش نظر مرزا کسی گاؤں میں رات گزارنے کے لیے مجبور ہوئے

۳۔ مودھا غالب کے قیام کے وقت پانچ ہزار کی آبادی کا قصبہ تھا۔ پہلے یہ نواب باندہ کی ریاست میں شامل تھا اور یہاں ان کی ایک گڑھی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے زیر اقتدار آنے کے بعد یہ گڑھی تحصیل کا دفتر بنا دی گئی۔ قصبے میں دوسری بڑی عمارت نواب کی بنوائی ہوئی جامع مسجد ہے۔ غالب یقین ہے تحصیل میں ٹھہرے ہوں، جہاں نواب کے زمانے کے بہت سے لوگ موجود ہونگے۔

ہونگے۔ گانو کا نام غالب نے نہیں لکھا۔ سفر کا حال خود غالب کے الفاظ میں دیکھیے:

دوشنبہ از موڈا[4] برآمدم۔ گرد دیگے کہ درین ملک بہ کڑھا موسوم است،
برائے بار کشیدن یافتم۔ چوں از من ضعیف الخلقت فرا افتادہ بود، آں
آہستہ خرام بلکہ مخرام دوازدہ کردہ راشبانہ روز پیمود۔ از موڈا تا چلہ تارا
نرسید۔ ناچار بہ دیہے در دشتار اتفاق اقامت افتاد۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ باندہ سے چلہ تارا کے درمیان سفر کرتے ہوئے اگر میرزا کو کہیں قیام کرنا پڑا ہوگا، تو وہ کوئی اور جگہ ہوگی، موڈا نہیں ہوگا۔ یہ قصبہ کانپور اور باندہ کے درمیان واقع ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔

بدھ کے روز میرزا باندہ پہنچ گئے اور یہاں نواب ذوالفقار بہادر کے مہمان ہوئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں[5]:

میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی بہت پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب صاحب موصوف کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے میں جوں توں گرتا پڑتا باندہ (بندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان[6] پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

۴۔ موڈا سے مراد موداہا ہے۔ موداہا کو حضرت سید مودا احمد نے اپنے نام پر آباد کیا تھا جو گزر کر موڈا پھر موداہا ہو گیا۔ حضرت سید مودا احمد سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ وارد ہندوستان ہوئے تھے اور کالنجر کے معارکے میں شریک تھے۔ واپسی میں وہ یہیں تعینات کیے گئے۔ اب موداہا بیس ہزار کی آبادی کا قصبہ اور تحصیل کا صدر مقام ہے۔ رحمانیہ انٹر کالج (جہاں میں ۱۹۵۰ء سے ملازم ہوں) اس سڑک کے کنارے واقع ہے جس سے مرزا غالب گزر کر باندہ گئے تھے۔ اس قصبے میں کچھ دن جناب فتحپوری بھی گزار چکے ہیں۔

۵۔ انڈیا آفس ص ۴۴۴ بحوالہ ذکر غالب (از مالک رام) : ۹۲ (پانچواں ۱۹۷۶ء)

۶۔ اس مکان میں آج کل باندہ نگر پالکا کے دفاتر ہیں۔

غالب اور بندیل کھنڈ

چونکہ اس وقت مرزا کی مالی حالت سقیم تھی، اور لکھنؤ سے وہ بے نیلِ مرام آتے تھے، اس لیے وہ باندہ میں قرض لینے پر مجبور ہو گئے۔ نواب ذوالفقار بہادر نے اپنی ضمانت پر امین چند نامی کسی ساہوکار سے انھیں دو ہزار روپے قرض دلوائے، جو اُن کے سفرِ کلکتہ کے زادِ راہ کے کام میں آئے۔

باندہ سے مرزا براہِ چلہ تارا کشتی کے ذریعے الٰہ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ چلہ تارا میں ان کا قیام ایک سرائے میں رہا۔ باندہ میں مرزا مغل نے انھیں مشورہ دیا تھا اگر مولوی محمد علی خان (صدر امین) کو خط بھیجنا ہو، تو وہاں کے تھانیدار کے ذریعے بھیج دیں۔ اتفاقاً تھانیدار سے مرزا کی ملاقات سرائے کے اندر ہی ہو گئی۔ مرزا نے اظہارِ حال کیا۔ اس نے اعانت کا وعدہ تو کر لیا، مگر اس کے متکبرانہ اندازِ گفتگو سے مرزا کو تکلیف پہنچی اور انھوں نے اپنا خط باندہ جانے والے ایک مسافر کے ذریعے بھیجنا پسند کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> مرزا مغل در باندہ فرمودہ بودند کہ عریضۂ مولوی صاحب بحوالۂ تھانہ دار چلہ تارا باید کرد، تا بخواہد رسید۔ اتفاقاً آخرِ روز، بلکہ اوّل شب، بہ کاروانسرائے چلہ تارا در انتظارِ گردونگ در واماندگانِ راہ نشستہ بودم کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کاروانسرا رسید و ہرسو خرامیدن آغاز کرد۔ در بابِ ارسالِ نامہ اعانت جُستم۔ اگرچہ پذیرفتن سخت سفیہانہ بود، بیمناکہ ہیچ را کرد و گوارائش مکتوب بودنے دادن۔ رہروے مجہول الاحوال بیوں نامِ جناب از من شنید، نامہ بعجز از من طلب کرد۔

مرزا کے ایک خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ باندہ میں وہ دوسرا ندر بخار میں مبتلا ہو گئے تھے ایک اور خط میں محمد علی خان صدر امین کو لکھتے ہیں:

> للہ الحمد زحمتِ صداع رفتگی ہم از باندہ اثرے در طبع نگذاشتہ، ضعف اگر باقی است نزدِ تو دے نیست کہ ایں رفیق است کہ از وطن کمر ہمرہی بستہ است۔

باندہ کے قیام کے دوران مرزا کی خاطر مدارات میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی۔

ے۔ ضلع باندہ میں چلہ تارا دریائے جمنا کا گھاٹ ہے۔ فتحپور جانے کے لیے اس گھاٹ کا استعمال ہ

جناب نواب ذوالفقار بہادر، نواب علی بہادر اور مولوی محمد علی خان صدر امین نے ان کی دلدہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ باندہ میں میرزا کو ایسا خوشگوار ماحول میسر آیا کہ غالب نے کئی غزلیں یہاں کہیں۔ ان غزلوں کی نشاندہی حافظ محمود شیرانی مرحوم کے مملوکہ دیوان اردو کے اس نسخے میں کی گئی ہے، جو اب پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی ملکیت ہے۔ ان غزلوں کے سامنے حاشیے پر "از باندہ فرستادہ" لکھا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں قیامِ باندہ کے نتائجِ فکر کا حاصل ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے :

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں :

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ حسنِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اس کا خیال رہے کہ بیماری اور مفلسی کے جس عالم میں میرزا کلکتے کا سفر کرنے پر مجبور تھے، اس کے پیشِ نظر یہ سفر "جادۂ راہِ فنا" ہی تھا۔ [۸]

مرزا نے باندہ میں جتنی غزلیں کہیں، ان میں ایک نوع کی افسردگی کی لہر نمایاں ہے۔ تمام غزلوں میں ایک ہی قسم کی فضا شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔

۸- یہاں غالب سے ایک فنی غلطی ہو گئی۔ جادہ اور راہ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ ان دونوں لفظوں میں سے ایک زائد ہے۔ جادۂ فنا کہیے یا 'راہِ فنا'

غالب اور بندیل کھنڈ

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

اس غزل کے درج ذیل شعار میں مرزا نے اپنی بیماری کی طرف کیے ہیں:

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا — خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

غربت اور گردشِ زمانہ نے اُن کے جذبۂ الفت کو بھی سرد کر دیا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

اور مقطع دیکھیے کتنا حسرتناک ہے!

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

باندہ میں کہی ہوئی ان کی مندرجۂ ذیل غزل بھی اسی فضا کی عکاسی کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ظلمتکدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ذیل میں یہاں کے ان اصحاب کے نام درج کیے جاتے ہیں، جن سے مرزا کو کسی نوع کا تعلق رہا یا جنھیں مرزا سے مراسلت کا شرف حاصل ہوا:

۱۔ نواب انور الدولہ شفق والیِ ریاست کدورہ باؤنی (ضلع جالون)
۲۔ نواب ذوالفقار بہادر والیِ ریاست باندہ
۳۔ نواب علی بہادر والیِ ریاست باندہ

۴۔ مولوی محمد علی خان صدر امین

اب علیحدہ علیحدہ ان تمام اشخاص کا ذکر بتفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

انوار الدولہ نواب سعد الدین خان شفق

شفق ریاست کدورہ باؤنی کے نواب تھے۔ کدورہ، ضلع جالون (بندیل کھنڈ) میں کالپی سے آٹھ میل جانب جنوب ایک معمولی سا قصبہ ہے۔ چونکہ یہ جاگیر باون گاؤں پر مشتمل تھی اس لیے ریاست کا نام باونی پڑ گیا۔ نواب پہلے کالپی میں رہتے تھے، پھر کدورہ اپنی گڑھی میں مستقلاً منتقل ہو گئے۔
نواب انوار الدولہ، نواب عماد الملک غازی الدین خان متخلص بہ نظام کے پڑپوتے تھے۔ فارسی اور اردو کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ آفتاب الدولہ سید محمد علی قلق سے نسبت تلمذ تھی۔ اگرچہ غالب سے ملاقات نہ تھی، مگر غائبانہ تعارف کا شرف حاصل تھا اور وہ انھیں اپنا استاد تصور کرتے تھے۔ غالب بھی انھیں انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ شفق کے نام کئی خط اُن کے مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہیں، جن میں سے بعض میں ادبی نکات سے بحث کی گئی ہے اور وہ ادبی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ غالب کے فنِ خطوط نویسی کی ایک مسلّمہ خوبی اس کا اندازِ مکالمہ نگاری ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ لمبے چوڑے خطابی الفاظ کو متروک سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی اس خوبی کی طرف شفق کو متوجہ کرکے، کہتے ہیں :

> یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں؛ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔

شفق کے نام غالب کے کئی خطوط ایسے ہیں، جن سے بظاہر ہوتا ہے کہ وہ نواب کے کلام کی اصلاح کرتے اور انھیں ادبی نکات سے واقفیت بہم پہنچاتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ بڑی متانت

۹۔ یہ ریاست نواب عماد الملک غازی الدین خان کو مہاراجہ گوالیار کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی سی ریاست تھی، مگر یہاں اچھے اچھے ادیب اور شاعر بسلسلۂ ملازمت رہ چکے ہیں۔ جسٹس کرامت حسین، نیاز فتحپوری، آفتاب الدولہ قلق کا ابتدائی زمانۂ ملازمت یہیں بسر ہوا۔

اور تہذیب کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک خط میں ایک سقم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> زوائد سے فارغ ہو کر عرض کرتا ہوں کہ اے کیا غزل لکھی ہے۔ قبلہ، آپ فارسی
> کیوں نہیں کہا کرتے؟ کیا پاکیزہ زبان ہے اور کیا طرزِ بیان! کیا میں نا سخن شناس
> اور نا انصاف ہوں کہ ایسے کلام کی حک و اصلاح پر جرأت کروں۔ ع
> چہ حاجت است مشاطہ روے زیبا را۔ ہاں ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں
> ط اے مطرب جادو فن، بازم رہِ ہوشم زن، دو میم آ پڑے؛ ایک میم محض
> بیکار۔ دیگر کی جگہ آپ بازم، لکھ گئے ہیں۔ ط "اے مطرب جادو فن!
> دیگر رہِ ہوشم زن۔"

غالب کو شفق سے بدرجۂ کمال انس تھا، اور اُن سے ملنے کی اتنی تمنا تھی کہ کہتے ہیں: "اے خدا، جب تک صاحب عالم اور انوار الدولہ سے نہ مل لوں، تو میری روح قبض نہ کرنا۔" ایک مرتبہ غالب نے کدورہ آنے کا ارادہ بھی کیا، مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس سلسلے میں شفق کو لکھتے ہیں:

> میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزو مند ہوں۔ میرا ایک
> بھائی، ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار الدولہ بہادر کی حقیقی خالہ کا
> بیٹا ہوتا تھا، اور مسند نشینِ حال کا چچا تھا، اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا
> یعنی میں نے اپنی مانی کا اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا؛ وہ باعث
> ہوا تھا میرے بندیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامانِ سفر کر لیا۔ ڈاک میں
> روپیہ ڈاک کا دے دیا۔ قصد تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا۔
> وہاں سے نواب علی بہادر کے یہاں کی سواری میں باندہ جا کر، ہفتہ بھر رہ
> کر کالپی ہوتا ہوا، آپ کے قدم دیکھتا ہوا بسبیلِ ڈاک دہلی چلا آؤں گا۔
> ناگاہ حضورِ والا بیمار ہو گئے اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت
> سے فعل میں نہ آیا، اور پھر مرزا ازبک خان میرا بھائی مر گیا۔ اے بسا
> آرزو کہ خاک شدہ۔ واللہ وہ سفر بھائی کی استدعا سے تھا، مگر میں نتیجہ

اس مشکل کا آپ کا دیدار سمجھا ہوا تھا۔

مرزا نے ایک دفعہ شفق کو ایک قصیدہ بھیجا مگر جواب میں دیر ہوئی۔ مرزا نے بسبیلِ شکایت انھیں خط لکھا، مگر کس شوخی کے ساتھ! امیدگاہ کی بجائے امیدکاہ لکھا۔ انوارالدولہ بھی ذہنِ رسا رکھتے تھے، مرزا کی رمز کو سمجھ گئے اور جواب میں اس کے متعلق اشارہ کیا۔ غالب نے لکھا:

امیدکاہ بکافِ عربی از رہِ شکوہ لکھا، تو کیا گناہ! نہ خط کا جواب نہ قصیدے کی رسید:

دیں خستگی پوزش از من مجوے

بو دیدہ خستہ گستاخ گوے

اور یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ ان موانع کی وجہ سے ہیں قصیدے کی تحسین نہ لکھ سکا، بندہ بے ادب نہیں تحسین طلب نہیں، ایسے مجمع میں محشور ہوں کہ سوائے احترام الدولہ کے کوئی سخنداں نہیں۔ یہ جو اپنا کلام آپ کے پاس بھیجتا ہوں، گویا آپ اپنے پر احسان کرتا ہوں:

دلے بر جانِ سخن، اگر بہ سخنداں نہ رسد

اس سلسلے میں ایک لطیفہ اور قابلِ ذکر ہے۔ شفق نے غالب کو ایک خط لکھا اور اس کے سرنامے پر "مخدوم۔ کیشاں" لکھا۔ ڈاکیے نے (کیشاں) کو کپتان پڑھا اور اس عطیہ خطاب پر غالب سے انعام کا طالب ہوا۔ مرزا حیران کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے! کجا کپتانی اور کجا غالب! آخر راز کھلا، تو نواب صاحب کو اس لطیفے سے مطلع کیا۔

غالب اور شفق کی مراسلت نگاری میں، باوصفِ متانت و سنجیدگی کسی قسم کے تکلف کو دخل نہ تھا۔ غالب اپنے خطوط میں بہت سے فقرے مزاحیہ انداز میں لکھ جاتے تھے۔ نواب صاحب بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں، "حضرت بہت دنوں سے امجد علی کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ان کے تخلص نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے۔ یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔"

غالب اور بندیل کھنڈ

نواب انوار الدولہ شفق گاہے ماہے غالب کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں۔

سینتیس روپے کی ہنڈوی پہنچی۔ اس کا بھی حال سابق ہی کی ہنڈوی کا سا ہے، یعنی ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو یہاں کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی ہے، جو روپیہ دیں۔ اگر سرکار کے کارپرداز وہاں کے ساہوکار کو کہہ کر اجازت لکھوا بھیجیں تو مناسب ہے۔

اسی طرح اور بھی کئی خطوں میں ہنڈوی نہ پہنچنے کے اشارے موجود ہیں۔ غرض میرزا کے آخیر وقت تک انوار الدولہ شفق سے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شفق اردو میں آفتاب الدولہ قلق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اس لیے شفق کی شاعری کا لکھنوی اندازِ سخنگوئی سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ غالب سے شفق کو شاگردانہ نیاز حاصل تھا، مگر وہ دور کی بات تھی۔ قلق اور قلق کے تعلق سے دوسرے لکھنوی حضرات ہمہ وقت ان کے گرد و پیش رہتے تھے۔ لہٰذا نواب انھیں رنگِ سخن اختیار کرنے پر مجبور رہتے۔ چنانچہ ان کے یہاں رعایتِ لفظی اور خارجیت کے نمونے تو بکثرت ملتے ہیں، مگر سوز و گداز اور تاثیر کا عنصر مفقود ہے۔ بایں ہمہ شفق کی شاعری استادانہ ہے، اور ایک حد تک رکاکت سے پاک ہے۔ افسوس ان کا کلام مطبوعہ صورت میں دستیاب نہیں۔ جو کچھ مل سکا ہے، اس کا انتخاب پیش نظر ہے :—

سرمایۂ دکاں ہے ہر آئینہ ساز کا ہر کالہ ایک میرے دلِ پاکباز کا

بعد سر کٹنے کے بھی اک دردِ سر پیدا ہوا ٹھوکریں کھاتا ہے میرا کاسۂ سر خاک میں

صراحی مے کی جو رونے لگی، ایاغ ہنسا کہیں امیدِ وفا خا... اہلِ محفل سے

سخت جانی سے مری خنجرِ قاتل ٹوٹا آرزو دل کی نہ اے شوقِ شہادت نکلی

مجھ کو آتا تھا سمجھ کر عالمِ اسباب میں کیوں فریبِ زندگی میں کھا کے آفت میں پھنسا

کردیا نزع میں کس لطف سے پانی مجھ کو یاد ہے چشمۂ خنجر کی روانی مجھ کو

سیرِ ہستی کی مبارک ہو گراں جانوں کو ہم سبک روح چلے جانبِ گلزارِ عدم

نواب ذوالفقار بہادر عرف ذوالفقار علی خان

یہ وہی نواب ذوالفقار بہادر ہیں جن کا ذکر غالب نے اپنے ایک مکتوب بنام شفق میں کیا ہے:

میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا
ہوتا تھا اور مسند نشینِ حال (علی بہادر) کا چچا تھا۔

انھیں کی مدح میں غالب کا ایک مدحیہ قطعہ ہے۔

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است
بادِ تو در مصافِ فلک ذوالفقارِ من
دانی کہ در فراقِ تو، اے رشکِ مہر و ماہ!
روزم سیہ تر است ز شبہائے تارِ من

نواب ذوالفقار بہادر، نواب علی بہادر کے چھوٹے فرزند اور نواب شمشیر بہادر کے بھائی تھے۔ چونکہ نواب شمشیر بہادر لاولد تھے، اس لیے ان کی وفات کے، بعد ۳۱ اگست ۱۸۲۳ء (مطابق ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ) کو اپنے بھائی کی جگہ تخت نشین ہوئے ۱۸۴۹ء میں انتقال ہوا۔ منیر شکوہ آبادی نے تاریخ وفات کہی:

موزوں نمود سالِ مسیحی چنیں منیرؔ
"شد آہ ذوالفقارِ علی در نیام، آہ"

جیسا کہ شفق کے نام غالب کے خط سے ظاہر ہے، ذوالفقار بہادر، مرزا غالب کی خالہ کی ہمشیر کے بطن سے تھے۔ ۱۸۲۶ء میں غالب کی آمدِ باندہ کے وقت یہی تخت نشین تھے۔ نواب علی بہادر ان کے ولی عہد تھے۔ غالب کی بیماری میں ذوالفقار بہادر نے ان کا بڑا خیال رکھا۔ غالب چھ ماہ کے قریب باندہ میں ان کے مہمان رہے، اور جب غالب نے سفرِ کلکتہ کا ارادہ کیا تو زادِ راہ کے اہتمام کے لیے ایک ساہوکار مسمّی امیں چند سے اپنی وساطت سے دو ہزار روپے قرض دلوائے۔ نواب ذوالفقار بہادر کی ہمدردی کا

اعتراف غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار (باندہ) کے باہمی بہت پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب صاحب موصوف کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے میں جوں توں کرتا پڑتا باندہ (بوندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

شمشیر بہادر کے عہدِ حکومت میں، انگریزوں نے ۱۸۰۴ء میں ریاست کو واپس لے کر نواب کے گزارے کے لیے چار لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ بعد میں باندہ کے قریب ایک وسیع علاقہ دے کر حفاظتی دستہ رکھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ نواب ذوالفقار بہادر جب تخت نشین ہوئے، تو وہ با اختیار نہ تھے، مگر نواب کا خطاب انھیں انگریزوں نے عطا کیا تھا اور وہ پنشن اور جاگیر سے استفادہ کرتے تھے۔

نواب ذوالفقار بہادر کو ادب سے لگاؤ تھا یا نہیں، اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔

نواب علی بہادر ثانی والیِ باندہ

غالب کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

یہاں علی بہادر سے مراد ہے نواب علی بہادر ثانی نواب باندہ ہے، جو نواب ذوالفقار بہادر کے بعد ۱۸۵۰ء میں مسند نشین ہوئے۔ منیر نے تاریخ جلوس کہی :

علی بہادرِ عالم پناہ بندہ نواز
نہاد چوں بسرِ خویش افسرِ شوکت

منیر مصرع تاریخ ایں عمل گفتہ

جلوس باد مبارک بمسندِ نصرت
(۱۲۶۵)

چونکہ ۱۸۱۲ء کے معاہدے کے تحت انگریز والیِ ریاست کا خطاب نوابی تسلیم کر چکے تھے اس لیے بعد جلوس گورنر جنرل نے نواب علی بہادر کو خلعت سے سرفراز فرمایا۔ منیر کہتے ہیں:

کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ

آج آیا ہے خلعتِ اقبال
(۱۲۶۵)

لیکن ان کا عہدِ حکومت بہت جلد ختم ہو گیا۔ ہنگامۂ غدر میں عملاً شریک ہونے کے باعث[10] وہ عام دار وگیر سے نہ بچ سکے۔ ان کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور ۳۶۰۰ روپے سالانہ کا حقیر وظیفہ دے کر انھیں اندور میں نظر بند کر دیا گیا۔ البتہ کچھ عرصے بعد ۱۸۷۲ء میں بمبئی مدعو کر کے انھیں دربار میں جگہ دی گئی۔ ۱۸۸۳ء میں وہ گورنمنٹ کی اجازت سے بنارس گئے تھے۔ وہیں مختصر سی علالت کے بعد ۱۴ اگست کو ان کا انتقال ہو گیا[11]۔

منیر نے اپنے محسنِ اعظم کی یاد میں بے نظیر تاریخ کہی:

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے منیر

فیاضِ زماں، امیرِ زیبا، ہے ہے!
(۱۲۹۰)

نواب علی بہادر نہ صرف شجاع اور جری تھے، بلکہ بالطبع شریف بھی تھے۔ جب ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو باندہ میں سراسیمگی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھا اور انھیں کسی قسم کی گزند نہیں پہنچنے دی۔ ان کی فیاضی اور احباب نوازی کا یہ حال تھا کہ معزول ہونے کے بعد بھی ان کا خیال رکھا۔ اس کا اندازہ منیر کے دو قطعاتِ تاریخ سے ہوتا ہے۔ اندور میں نظر بندی کے دوران اگرچہ ان کی آمدنی محدود ہو گئی تھی لیکن ۱۸۸۶ء میں ان کی بیگم افتخار محل نے منیر کو زمرد کی انگوٹھی

۱۰۔ جنگِ آزادی میں ان کی شرکت کا آغاز قلعۂ راج گڑھ کی تسخیر سے ہوتا ہے جس کی تاریخ "خدا فتح عالی بہ نواب داد" (۱۲۷۴) سے نکلتی ہے۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں کی فوجیں باندہ پہنچیں، تو نواب، تانتیا ٹوپے اور رانی جھانسی سے جا ملے اور کالپی کی جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد گوالیار کی جنگ میں شریک ہوئے۔

۱۱۔ "مشاہیر جنگِ آزادی" میں مفتی انتظام اللہ شہابی نے بتایا ہے کہ علی بہادر کا انتقال اندور میں ہوا۔ یہ غلط ہے۔

اور نواب نے دوشالہ بطور تحفہ عطا کیا۔ دونوں کی تاریخ ملاحظہ ہو:

تاریخ عطیۂ انگشتری

تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی منیرؔ

"انگشترِ زمردِ پاکیزہ آئی آج"

(۱۲۸۳)

تاریخ عطیۂ دوشالہ

تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی منیرؔ

"باریک ہے سفید دوشالہ بہت لطیف"

(۱۲۸۳)

نواب علی بہادر بڑے سخن فہم اور ادب نواز تھے۔ انہیں شعر گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔ پہلے عباس بریلوی اور پھر منیر شکوہ آبادی سے اصلاح لی۔ ایک دیوان اور مثنوی مہر وماہ ان سے یادگار ہیں۔ جب غالب ۱۸۶۷ء میں، نواب ذوالفقار علی کے یہاں مقیم تھے، تو اس وقت علی بہادر ولی عہد ریاست تھے۔ غالب کے طویل قیام نے علی بہادر کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ یہ سلسلہ بعد کو بھی جاری رہا جیسا کہ غالب کے فارسی خطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی بہادر کے یہاں سلیقے کے شعر ملتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار شگفتہ، پاکیزہ اور پُر تاثیر ہیں۔ نمونے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ترے خدنگِ ادا کا وہی نشانہ ہوا ۔۔۔ کہ جس کے عشق سے تو آفتِ زمانہ ہوا

یہ کچھ نہ سوچی کہ مجھ پہ گذر گئی کیا کیا ۔۔۔ تمھیں تو وجہ مسرت مرا فسانہ ہوا

یہ کیا کیا جو کیا دعوائے وفا نواب!

کہ اس کو اور جفا کے لیے بہانہ ہوا

تذکرۂ نادر مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (ص ۱۱۴) میں علی بہادر کے مختصر حالات اور ایک غزل ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

علی = حافظِ قرآن، عالی دودمان، رئیسِ باندہ اشرف الامرا نواب علی بہادر ولد نواب ذوالفقار بہادر ملقب پیشوا صاحبِ دیوان و مثنوی مہر وماہ شاگردِ منشی منیر

قلق نہیں، جو غمِ بیشمار دل میں ہے ۔۔۔ ہزار شکر ہو، پر جائے یار دل میں ہے

کدورت آئینۂ صاف کی چھپے کیونکر — عیاں ہے منھ سے صفائی، غبار دل میں ہے
ہمیشہ اس کی زیارت کو آتی ہے حیرت — کسی شہید جفا کا مزار دل میں ہے
مزاج پاک مکدر نہ ہو، میں ڈرتا ہوں — نکھر کے آپ نہ آئیں، غبار دل میں ہے

علی! بھرا ہے یہ عطر بہشت شیشے میں
تصور عرقِ روئے یار دل میں ہے

مولوی محمد علی خان (صدر امین باندہ)

مولوی محمد علی خان، باندہ میں صدر امین تھے۔ حال آں کہ اس سے قبل وہ غالب سے رُوشناس نہ تھے، لیکن باندہ پہنچنے پر انھوں نے غالب کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان کی رفاقت و دلنوازی سے باندہ میں غالب کے چھ مہینے بڑی راحت سے گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب مدت تک ان کی یاد دل سے نہ بھلا سکے۔ باندہ سے رخصت ہونے کے بعد غالب نے جو کئی خط لکھے، "نامہای فارسی غالب" کے مشمولہ خطوط تقریباً سب کے سب انھیں کے نام لکھے گئے تھے۔ ایک خط کا اقتباس دیکھیے، جس میں وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ جیسا کہ پہلے خط میں ارادہ ظاہر کیا تھا اس کے برخلاف وہ بجائے فتحپور جانے کے دریا کے راستے الٰہ آباد جائینگے:

آخر از بیدادِ گردونِ دوں ستوہ آمدہ، خود را بدریا انداختم، یعنی ہم ازیں مقام کشتی بکرایہ گرفتہ و آدم و متاع ہمہ درو سے گنجیدہ، دبسم اللہ مجریہا و مرسٰہا برخواندہ، سفینہ در رودِ جمن راندہ ام

بنارس سے ایک خط میں وہ قیامِ بنارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

عطوفت نامہ در ایامِ خاک نشینی ہائے بنارس چشمِ بخت را نورے و بخت چشم را عروجے بخشیدہ بود۔

کلکتہ سے ایک اور خط مولوی صاحب کو بھیجتے ہیں، جس میں اپنی رہائشگاہ کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں:

غریب نوازیہاے وہّابِ بے منّت را نازم کہ چنیں دیار خانہ بہ ایں کو بہ بینہ

دہرگونہ آسایش را بکار آید۔ ہم اورا بہ اندازۂ فراخِ خاطر فضاے دہم۔ اندرونِ وے
مانندِ دہانِ دنیا طلباں بیت الخلاے، در گوشۂ چمن پُر از آبِ شیریں چاہے،
و در طرفِ بام درخورِ اہلِ تنعم آرامگاہے، بے آنکہ جستجوے شود، یا گفتگوے
رود، بے زحمت و منت بہ کرایہ دو روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ۔

مولوی محمد علی خان نے باندہ سے روانگی کے وقت غالب کو کلکتے کے چند معزز اصحاب کے نام خطوط
بھی دیے تھے۔ ان میں نواب اکبر علی خان طباطبائی متولی امام باڑہ ہگلی کا نام سرِ فہرست تھا
طباطبائی نے کلکتہ پہنچنے پر غالب کی بڑی مدد کی جیسا ان کے فارسی خطوں سے ظاہر ہے۔
مولوی محمد علی خان یقیناً بڑے ظرف کے انسان تھے۔ انھوں نے رسمِ مروت کو یہاں تک
نباہا کہ کلکتہ پہنچنے پر غالب کی دو سو روپے سے مالی امداد بھی کی۔

چونکہ صدر امینی کا عہدہ اس وقت منصف درجۂ دوم کے برابر تھا، اس لیے اس معزز عہدے پر
تقرری کے لیے ضروری تھا کہ امیدوار علمی حیثیت سے اس کا اہل ہو۔ یقیناً مولوی محمد علی خان
عربی و فارسی کے عالم ہونگے۔ ان کی قدر افزائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مذاقِ ادب اعلیٰ اور
پاکیزہ ہوگا۔ آیا وہ خود بھی شعر کہتے تھے یا نہیں، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ بہرحال سخنگو نہ سہی،
وہ سخن فہم ضرور تھے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

پدماوت اُردو
(سرسری تعارف)

ملک محمد جائسی کا لاجواب اور لافانی شاہکار داستانِ پدماوت ایک ایسی داستان ہے جس نے نہ صرف ہندی اور اردو کی مثنوی اور داستانوں کو متاثر کیا ہے اور اس کے نقش قدم پر دیگر کئی داستانوں نے جنم لیا، بلکہ اس نے پورے ہندستانی ادب پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ جائسی نے اودھی کی ایک مقبول قدیم کہانی "رانی طوطے کی کہانی" کو اپنی مثنوی کے لیے چنا[1]، اور اس کہانی میں اپنے عہد کے تہذیبی، تاریخی اور سماجی حالات کو اس طرح سمویا کہ ان کی یہ داستان ایک پورے دور کی تاریخ بن گئی۔

ہندستان کی دیگر زبانوں پر پدماوت کا کیا اثر پڑا ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے چونکہ میں صرف بنگلہ، اردو اور ہندی ہی جانتا ہوں۔ ہندی زبان و ادب کا میرا مطالعہ بھی برائے نام ہی ہے۔ لہٰذا ہندی کے بارے میں بھی کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ ملک محمد جائسی نے اپنی داستان کو جس زبان میں قلمبند کیا، وہ اودھی ہے۔ اودھی میں پدماوت کے علاوہ دوسری بہت مقبول اور مشہور تصنیف تلسی داس کی رامائن یعنی "رام چرت مانس" ہے۔ ان دونوں کو آج عام طور پر ہندی والے "ہندی تصانیف" کہتے ہیں، لیکن لسانیات کے علما کے نزدیک یہ اودھی زبان ہی کی تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر صفدر آہ ان دونوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں[2] کہ تلسی داس کی تصنیف پر نہ صرف پدماوت کا گہرا اثر

---

۱ دیکھیے مضمون "صاحب پدماوت" از شہاب سرمدی مشمولہ "نذر مقبول" مرتبہ خیر بھوروی

۲۔ دیکھیے ماہنامہ "صبح امید" بمبئی، جنوری ۱۹۷۵ء

ہے بلکہ کئی لحاظ سے پدماوت تلسی داس کی رام چرت مانس سے آگے ہے۔

بنگلہ میری مادری زبان ہے اور اس کے ادب کا میں نے کچھ مطالعہ کیا ہے، لہذا اردو میں پدماوت کا ذکر کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پہلے بنگلہ پدماوت کا سرسری ذکر کردوں۔

بنگال میں سترھویں صدی میں جائسی کی اس داستان کا سید علاؤل نے بنگالی میں ترجمہ کیا۔ قدیم بنگلہ ادب کے مسلم شعرا میں علاؤل سب سے زیادہ نامور شاعر ہے۔ وہ مادری زبان بنگلہ کے علاوہ سنسکرت، عربی، فارسی اور ہندی سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اسے مختلف علوم وفنون مثلاً جوگ شاستر، تصوف، کام شاستر اور سنگیت کا بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ دنیش چندر سین نے ۱۶۱۸ء اور شہید اللہ نے ۱۵۹۲ء قرار دیا ہے۔ علاؤل نے اپنے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق ان کے والد ضلع فتح آباد (فریدپور) میں جلال پور کے باشندے تھے اور حاکم فتح آباد کے وزیر تھے۔ علاؤل کا مدفن ضلع چٹگام کے تھانہ ہاٹ ہزاری کے تحت "جوبرا" نامی گاؤں میں ہے۔ مزار پختہ ہے اور اس کے قریب ایک مسجد اور تالاب ہے۔ اسی مزار کی بنا پر عبدالکریم اور ڈاکٹر انعام الحق نے "جوبرا" کو علاؤل کا مقام پیدائش قرار دیا ہے۔ لیکن خود علاؤل نے اپنے جو حالات قلمبند کیے ہیں ان کی بنا پر یہ درست نہیں۔ محققین بنگلہ ادب کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ پیدا تو فریدپور ہی میں ہوئے تھے، لیکن آخری عمر میں ضلع چٹگام کے اسی علاقے میں آکر بس گئے تھے۔

پدماوت میں علاؤل نے اپنے جو حالات لکھے ہیں ان کے مطابق لڑکپن میں اپنے والد کے ہمراہ کشتی پر سفر کر رہے تھے کہ پرتگیزی سمندری لٹیروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ مقابلہ کرتے ہوئے والد تو شہید ہو گئے اور علاؤل پکڑے گئے۔ بعد کو پرتگیزوں نے انھیں شاہی فوج کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ گھوڑ سوار فوج میں داخل کیے گئے۔ جلد ہی ان کی شاعری اور علم وفن کی بات فوجیوں میں پھیل گئی اور ہوتے ہوتے ان کی شہرت شاہی دربار تک جا پہنچی۔ اس طرح انھیں فوج سے اراکان کے شاہی دربار تک رسائی حاصل ہوئی، جو ان دنوں علم و ادب کے لیے مشہور تھا۔ یہاں پدماوت کا ترجمہ علاؤل نے راجا شری دھرم اور راجکمار ماگن ٹھاکر

کی فرمائش پر کیا۔ یہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ہوبہو ترجمہ نہیں ہے۔ انھوں نے جائسی کی داستان میں کچھ رد و بدل بھی کیا ہے۔ اگرچہ یہ تبدیلیاں ایسی نہیں، کہ ان سے اصلی داستان میں کوئی خاص اختلاف پیدا ہو جائے۔ علاؤل نے جہاں تک ممکن ہو سکا، کرداروں کو بنگالی بنا دیا ہے۔ اور ساتھ ہی بعض ضمنی قصے بھی جوڑ دیے ہیں۔ علاؤل کی اس داستان کا کوئی مکمل نسخہ آج تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ ان کے نام سے جو داستان شائع شدہ ملتی ہے، اس کا آخری حصہ بہت بعد کی تخلیق معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی زبان اور اندازِ بیان جدید ہے۔ شری سوکمار سین اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "کون جانے علاؤل نے اس داستان کو مکمل کیا بھی تھا یا نہیں"۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت اور علاؤل کی "پدماوتی" میں چند باتوں کا فرق ہے۔ مثلاً علاؤل کی داستان میں رتن سین کے دو بیٹوں چندر سین اور اندر سین کا تذکرہ ہے جنھیں رتن سین کی وفات اور پدماوتی کے ستی ہو جانے کے بعد سلطان علاؤالدین اپنے ساتھ لے گیا! ان کی اپنی اولاد کی طرح لاڈ پیار سے پرورش کی اور جب وہ بڑے ہوگئے، تو ان کے سر پر خود اپنے ہاتھ سے تاج رکھا۔ یہ قصہ جائسی کی پدماوت میں شامل نہیں ہے۔ پدماوت میں گورا اور بادل باپ بیٹے ہیں، لیکن "پدماوتی" میں یہ دونوں بھائی بھائی ہیں۔ پدماوت میں گورا اور بادل دونوں ہی جنگ چتوڑ میں مارے گئے ہیں "پدماوتی" میں گورا جنگ میں مر جاتا ہے اور بادل کو سلطان انعام دیتے ہیں۔ جائسی اور علاؤل کی داستان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جائسی کی پدماوت میں عجیب و غریب واقعات، فوق البشر کردار، دیوی دیوتا، توہمات اور خرافات وغیرہ کے اثرات بہت ملتے ہیں، جو اس عہد کے سماج کی دین ہیں، لیکن صرف ایک صدی کے اندر ہی علاؤل نے اس داستان کا جب ترجمہ کیا تو اس نے اسی طرح کی بیشمار لغویات سے اپنی داستان کو بڑی حد تک پاک رکھا۔

اردو میں "پدماوت" یا "پدماوتی" کے نام سے چند کہانیاں ایسی بھی ہیں، جن کا جائسی کی

پدماوت سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ان کہانیوں کو "پدماوتی" کا نام دینا ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ان کے خالق جائسی کی پدماوت کی مقبولیت سے متاثر رہے ہیں۔ میرے ذاتی کتب خانے میں "خیالِ گلشن یعنی فسانۂ پدماوتی" کے نام سے ایک ناول ہے، جس کے مصنف آگرہ کے باشندے بابو ستیش چندر بوس ہیں۔ یہ کتاب آگرہ کے مطبع اندر پرکاش میں باہتمام بابو بیرپرشر سانیال ۱۹۱۵ء میں باراوّل چھپی ہے۔ اس "پدماوتی" یا "فسانۂ پدماوتی" یا "خیالِ گلشن" (چونکہ کتاب کے مختلف سرورق پر یہ نام ملتے ہیں) کا بھی کسی قسم کا کوئی تعلق جائسی کی پدماوت سے نہیں ہے۔ اس کے کردار گلاب سنگھ، لجونتی، پدماوتی، اندگر، مادھوگر، دیانند اور رام پیاری وغیرہ کا جائسی کے کرداروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے کالی داس کی شکنتلا کے علاوہ سرور، نسیم، پنڈت رتن ناتھ وغیرہ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ پدماوتی کے حسن کا بیان کرتے ہوئے مصنف رقمطراز ہے:

> افسوس، مجھ میں وہ لیاقت نہیں کہ نازنین پری جمالوں کا سراپا لکھوں۔ اس لیے پروردگار سے مدد چاہتا ہوں کہ میں پدماوتی کا سراپا تھوڑا بہت لکھ سکوں۔ اے اللہ تو، تو نے جو لیاقت اور مدد کالی داس کو شکنتلا کے سراپا لکھنے میں بخشی تھی، اس کا عشر عشیر میری زبان کو عطا کر۔ مگر میری ایسی خوش نصیبی کہاں کہ میری دعا اثر پذیر ہو۔ افسوس میں ہیچمداں، حسن کی سی شیریں زبانی یا سرور کی سی لسانی یا نسیم کی فصیح بیانی اور پنڈت رتن ناتھ کے سے خیالات کہاں پاؤں، جنھوں نے اپنے اپنے نظم و نثر دلکش میں اپنے قصص کے پری تمثالوں کی تصویر اتار کر تماشائیانِ عالمِ خیال کو اپنی تصانیف کا خود فریفتہ کر لیا۔ ناچار ستیش عرض گزار ہے کہ نوعِ ذکر، پدماوتی آپ کے معشوق کی مانند سراپا خوبصورت ہے۔

اردو میں مثنویوں کی کوئی کمی نہیں اور کئی قابلِ ذکر مثنویاں ہیں۔ سیدھی سادی بات ہے کہ سحر البیان

اور گلزارِ نسیم کی جو شہرت ہوئی، وہ کسی اور مثنوی کے حصے میں نہیں آئی۔ جائسی کی پدماوت جب اتنی مقبول اور ہر دل عزیز تھی، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا ترجمہ یا اس سے متاثر ہو کر کوئی داستان اودھی سے اتنا قریبی تعلق رکھنے والی اردو زبان میں نہ ہو، خاص کر ایسی حالت میں جب کہ پدماوت کی داستان ایک عرصے تک (اتر پردیش کے علاقے میں) گھر گھر پڑھی جاتی رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عشقیہ داستان کا علم اردو شعرا کو تھا اور وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ حال ہی مجھے اپنے گھریلو کتب خانے میں کتاب "پدماوت عبرت و عشرت باتصویر" کا نسخہ دستیاب ہوا۔ کافی چھان بین کے بعد مجھے اس سلسلے میں صرف ایک مضمون "پدماوت اردو" ملا جو جناب دلدار حسین خان نے لکھا ہے اور رسالہ "آجکل" دہلی کے مارچ ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے بھی "پدماوت اردو" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

> یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پدماوت اردو نکتہ شناسوں کی نظر سے روپوش رہی ہے لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ تغافل کا شکار کیوں رہی، اور اب تک اس درِ نایاب کو قبولِ عام کا درجہ کیوں نہیں ملا۔

دلدار حسین خان صاحب کے اس مضمون کے سوا میں اس موضوع پر کسی اور تحریر کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ کسی اور نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ ان کا مضمون پڑھنے کے بعد بھی مجھے پدماوت اردو کے سلسلے میں لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کیوں کہ ان کی نظر سے "پدماوت اردو" کا صرف ایک نسخہ گزرا ہے جو ۱۲۶۵ھ کا مطبوعہ ہے اور رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تذکرۂ کاملانِ رامپور" کے مطابق یہ مثنوی متعدد مرتبہ طبع ہو چکی ہے اور قبولِ عام پا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قبولِ عام تذکرہ نگاروں کی حد تک بھی سرسری ذکر سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر مصنفِ تذکرہ کے مطلب قبولِ عام سے وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اس مثنوی کو پڑھا اور وارداتِ قلبی کا گہرا اثر محسوس کیا، تب یہ قول حرف بحرف صحیح ہے۔ رہی کئی بار طبع ہونے

کی بات، سو وہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری نظر سے اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن نہیں گزرا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرے گھریلو کتب خانے کے نسخے کے سرورق پر اس کا نام "پدماوت عبرت و عشرت بالتصویر" درج ہے لیکن یہ وہی تصنیف ہے جس کا ذکر دلدار حسین خان صاحب نے کیا ہے کیونکہ سرورق کے علاوہ اندر کے تمام صفحات پر صرف "پدماوت اردو" ہی لکھا گیا ہے۔ میرے نسخے کے بل بر یہ کہنا ممکن ہے کہ "پدماوت اردو" بار بار چھپی ہے، کیونکہ اس پر "بار سوم، ماہ اکتوبر ۱۹۲۸ء" درج ہے اور یہ کتاب "باہتمام خواجہ قطب الدین احمد، نامی پریس لکھنؤ میں چھپی" ہے۔ اس کا پہلا سرورق رنگین بالتصویر ہے؛ چار گلدستوں کے درمیان پدماوت کی تصویر ہے اور تصویر کے سلسلے میں کتاب کے نام کے اوپر یہ شعر درج ہے:

ہر اک کا دل نہ ہو کس طرح تسخیر
یہ ہے تصویر، پدماوت کی تصویر

اور کتاب کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے تحت لکھا گیا ہے:

سبحان اللہ خامۂ داستان طراز کیونکہ محو سجدۂ شکر کارساز نہ ہو جائے اور گرد کدورت طبائع مصفا سے کس طرح سر دست نہ ہو جائے کہ ان ایام عشرت فرجام میں یہ کتاب لاجواب کہ جس میں صورۃً تماشائیوں کے لیے شوخی بزم آرائی اور گرمی محفل زیبائی کا تماشا نمایاں ہے، اور بوقلمونی چرخ دوّار اور نیرنگی انقلاب زمانۂ ناہنجار کی بے ثباتی کا رنگ عیاں ہے اعنی پدماوت اردو مع تصویرات جو تصنیف میر ضیاء الدین عبرت اور غلام علی عشرت ہے، مرتب ہو کر تیسری بار باہتمام حافظ حاجی خواجہ قطب الدین احمد پرو پرائٹر نامی پریس، لکھنؤ میں چھپی، ستمبر ۱۹۲۸ء۔

گارسیں دتاسی کے خطبات میں بھی ہمیں اس "پدماوت اردو" کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے

اپنے پانچویں خطبے (۱۸۵۴ء) میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے[۳]:

اسی قسم کا قصہ پدماوتی کا ہے، جو ہندستان کے قرونِ وسطیٰ کی مشہور رانی ہوئی ہے۔ وہ لنکا کے ایک بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کی شادی چتوڑ کے راجا رتن سے ہوئی تھی، جسے علاء الدین نے ۱۳۰۳ء میں مغلوب و مفتوح کیا۔ جائسی کے قول کے مطابق وہ اپنی رضا و رغبت سے کئی ہزار عورتوں کے ساتھ چتا میں جل کر مر گئی ... ... عشرت اور عبرت دو شاعر ہوئے ہیں، جنھوں نے ہندستانی میں اس بہادر راجپوت رانی کے قصے کو نظم کیا ہے۔

دلدار حسین خان نے اسی "پدماوت اردو" کی جن باتوں کو ضروری سمجھا ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن چند اور باتیں ایسی ہیں جن پر روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ اس کتاب کا ذکر مکمل اور اہمیت واضح ہو جائے۔

چونکہ یہ مثنوی پدماوت دو شاعروں یعنی حکیم ضیاء الدین عبرت اور غلام علی عشرت کا مشترکہ کارنامہ ہے، اس لیے سرورق پر اسے بجا طور پر "پدماوتِ عبرت و عشرت" کہا گیا ہے۔ عبرت کب یہ مثنوی کہنے لگے تھے اس کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے۔ البتہ دلدار حسین خان کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ "اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۸ھ اور ۱۲۰۴ھ کے درمیان ہوا ہے کیوں کہ عبرت ۱۱۸۸ھ میں رامپور آئے اور زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۴ھ تک زندہ رہے" ان کی موت کی وجہ سے ان کا یہ کارنامہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ پھر غلام علی عشرت نے یہ کام سات آٹھ سال بعد شروع کیا، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

پس یہ حکایت نہایت کو پہونچی کہ میر ضیاء الدین عبرت کو مرض الموت ہوا اور ساتھ حسرت و غم تاتمامی اس داستانِ ندرت بیان کے، دار الفنا سے طرف دار البقا کے قدم رنجہ فرمایا۔ اب عرصہ سات آٹھ برس کا گزرا کہ کوئی

۳۔ خطبات گارساں دتاسی، (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء)۔ مولوی عبدالحق نے حاشیے میں یہ واضح کیا ہے کہ عشرت اور عبرت دونوں نے مل کر اردو پدماوت کو مکمل کیا تھا۔

موزونی طبع کچھ کچھ اپنے جی میں سمجھ کر واسطے تمام کرنے .... یہ قصۂ عجیب و غریب بہ کاوشِ بسیار و فکرِ بیشمار عرصۂ یک و نیم ماہ میں .... تمام کیا اور منظورِ خاص و عام و جمہور انام کا ہوا؛ اور مادۂ تاریخ اتمام یعنی خاتمۂ کلام کے سوائے الفاظ "تصنیف دو شاعر" کے بہتر نہ پایا بلکہ یہ تاریخ ایسی مناسب اور انسب ہوئی کہ شعرائے شہر وغیرہ صغیر و کبیر کو رشک آیا اور سب نے متفق ہو کہ فرمایا کہ یہ مادۂ تاریخ کا الہامِ غیبی ہے:

قطعۂ تاریخ

یہ کہہ کر مثنوی میں نے جو کی غور
کوئی تاریخ اس کی کہیے خوش طور
کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر
بلا شک جانیے "تصنیف دو شاعر"
(۱۲۱۱)

مثنوی سحرالبیان قطعۂ تاریخ کی رُو سے ۱۱۹۹ھ (مطابق ۱۷۸۴-۱۷۸۵ء) کی تصنیف ہے اور گلزارِ نسیم ۱۲۵۴ھ (مطابق ۱۸۳۸-۱۸۳۹ء) کی، جو بار اوّل ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں چھپی۔ پدماوت اردو ۱۲۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اس طرح یہ گلزارِ نسیم سے کوئی ۴۳ سال پہلے اور سحرالبیان سے ۱۲ سال بعد مکمل ہوئی۔ لیکن عشرت نے عبرت کی موت کے سات آٹھ سال بعد یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اگر یہ آٹھ سال کا عرصہ نکال دیا جائے، تو عبرت کم و بیش انھیں دنوں پدماوت اردو کہنے لگے ہونگے، جب میر حسن سحرالبیان کی تخلیق میں مشغول تھے اس طرح اردو کی ان دونوں عظیم مثنویوں کی تصنیف کا زمانہ ایک ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ دونوں کا زمانۂ تخلیق ایک ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی پدماوت اردو کی اہمیت زیادہ ہے کہ یہ سحرالبیان سے طوالت میں تقریباً دوگنی ہے۔ میر حسن کی مثنوی ۲۲۰۰ اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ پدماوت اردو کے جملہ اشعار ۴۳۵۸ ہیں۔ اس کے علاوہ سحرالبیان کے ابتدائی ۲۰۰ اشعار کا اصل داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ روایتی اشعار ہیں جن میں حمد، نعت، منقبت اصحا

مناجات، تعریفِ سخی، بادشاہ اور نواب وزیر کی مدح اور سخاوت وشجاعت وغیرہ کا بیان ہے۔ حمد ومناجات کے سلسلے میں عبرت نے بھی کئی اشعار کہے ہیں (تگ بھگ ۲۳۱) لیکن اس کے باوجود اصلی داستان کے اشعار چار ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہیں اور اس طرح بھی "پدماوت اردو" سحرالبیان سے دوگنی ہی ہے۔

عبرت نے اس مثنوی کا نام "شمع پروانہ" رکھا تھا؛ وہ کہتے ہیں:

لگا دل کو پدم کے شعلہ اڑکر — چلے اک گھر سے جیسے دوسرا گھر

وہ دونوں عاشق ومعشوق ہو جمع — جلے اک بار جوں پروانہ کو شمع

سو ان کا میں نے لکھ کر قصہ تمام — مدلل "شمع پروانہ" رکھا نام

اصل داستان سے پہلے جیساکہ مثنوی کا طریقہ رہا ہے حمد، نعت، تعریف وغیرہ کے علاوہ دو خاص باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک "وصفِ ہندستانِ جنّت نشان" اور دوسرا "جوابِ تشنگیٔ آب قلم کا" ہے۔ "وصف ہندستانِ جنّت نشان" کا ہر شعر گواہ ہے عبرت کے اپنی مادرِ وطن سے پیار کا۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں اس دھرتی کے ذرّے ذرّے سے بے پناہ محبّت تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں دیکھا بیانِ شہر و بازار — متاعِ درد کا تجھ سا خریدار

جہاں تک پائے جنسِ بیقراری — فلک نے آکے تیرے سر سے ماری

سدا رکھتا ہے تو راحت فراموش — پریشانی کو مثلِ زلف بردوش

سمندر تیرا ہمسر ہووے کیونکر — تو ہیگا آتشِ غم کا سمندر

عجب صورت ہے تیری چشمِ بد دور — ہزاروں آبلے جوں نخلِ انگور

میں غمخواری میں تیری اے دلِ زار! — تڑپتا ہوں سدا جوں نبضِ بیمار

میں اور تو دونوں ڈوبے خوں میں صد حیف — گل وغنچہ کی صورت بے کم وکیف

مرض میں تیرے بھی ہو جو گرفتار — کہ ہو بیمار وار آخر کو بیمار

ولیکن قصّہ کہتا ہوں وطن کا — کہ ہوں میں عندلیب اپنے چمن کا

سوادِ ہند کو، اے ہوسِ جاں! — بناؤں سرمۂ چشمِ صفاہاں

اگر دل ہندوستاں کا عشق مرقوم ۔۔۔ مچے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
کہ شورِ عشقِ ہندی تیز تر ہے ۔۔۔ عرب کے عشق سے خونریز تر ہے
عجم میں ہند کا ہے عشق خونخوار ۔۔۔ قیامت ہند کی کاٹے ہے تلوار
ہے شعلہ عشقِ ہندی کا شرر ریز ۔۔۔ کہ ہیگا آفتاب اس جاں پٹ تیز
لکھوں ہندوستاں کی گر میں تعریف ۔۔۔ تو دفتر ہو جدا اک اور تصنیف
نہایت طول یہ مذکور ہو جائے ۔۔۔ ہزاروں کو سن مطلب دور ہو جائے
غرض آتش ہے اس کی آتشِ دل ۔۔۔ ہوا اس کی ہے روحِ مرغِ بسمل
بتاؤں اس کا پانی، آہ کیا ہے! ۔۔۔ مگر طوفاں کا پانی رہ گیا ہے
جلے پروانے کی ہے خاک واں کی ۔۔۔ کہ عشق افزا ہے خاک ہندوستاں کی

عبرت کو یہ فکر تھی کہ چونکہ وہ مسلمان ہے، اس لیے ہندو کہانی قلمبند کرنے پر اس کے مسلمان ساتھی اسے "کافر" قرار دے کر "برا بھلا" نہ کہیں اسی لیے وہ "قلم نزاکت" سے "سوال" کرتے ہیں:

صلاح اک لیک میں پوچھوں ہوں تجھکو ۔۔۔ کہ کرتا ہوں بیانِ عشقِ ہندو
کہے کوئی کہ عبرت سا مسلماں ۔۔۔ ہوا ہے عشق کافر سے سخن راں
جواب معترض مجکو بتا دے ۔۔۔ میرے دل سے یہ شبہ تو مٹا دے

اور قلم یوں "جوابِ تشفی" دیتا ہے:

قلم بولا کہ، اے سرمایۂ عقل! ۔۔۔ تو جس قصّہ کو چاہے کر دے نقل
کہ عشق آزاد ہیگا کفر و دیں سے ۔۔۔ نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
[illegible] دونوں ہی عالم سے ہے آزاد ۔۔۔ کرے ہے کفر و دیں دونوں کو برباد
نہیں کچھ مانتا عشقِ ستمگار ۔۔۔ کہ کیا تسبیح ہے، اور کیا ہے زنّار!
مسلماں، کافر اس سے سب ہیں مجبور ۔۔۔ حقیقت شیخِ صنعاں کی ہے مشہور
نہیں نظر میں لاتا عشقِ سرکش ۔۔۔ کہ ہیں کیا خاک و آب و باد و آتش
جسے رنگ اپنا وہ دکھا دے ۔۔۔ وہیں رنگ اسکے چہرے کا اڑا دے

اسے معشوق و عاشق کا نہیں غم | وہ دونوں کو کرے رسوائے عالم
نہ اک بلبل ہی کو رکھتا ہے غمناک | کرے ہے گل کے بھی سینہ کو صد چاک
کرے ہے روشن اپنا شعلہ جس دم | جلاوے شمع پروانے کو با ہم
نہایت وہ کرے جس شخص کو پیار | اسے دم لینا ہو جاتا ہے دشوار
حقیقی عشق ہووے، یا مجازی | کریں ہیں دونوں سر کے ساتھ بازی
سنی، اے نبیرۂ امید، عبرت | جناب عشق کی تو نے حقیقت
جہاں میں عشق کا جو رسم و دین ہے | معاف حضرت شرع میں ہے
کریگا اعتراض اس میں جو بیجا | جناب عشق کا مردود ہوگا
جو کچھ آتا ہے تیرے جی میں، اے یار | شتابی کہہ، میں ہوں لکھنے کو تیار
قلم نے جیسے ہی ڈھارس بندھایا | سخن کے گھر فراغت سے میں آیا

حکیم ضیاء الدین عبرت موت سے پہلے اس داستان کے ۱۳۰۳ اشعار کہہ چکے تھے، جن میں اصلی داستان کے اشعار ۹۷۲ ہیں۔ یعنی اس نے "رتن سین کا سراندیپ کے بتخانہ میں فروکش ہونا اور پدماوت کا پیغام زبانی طوطے کی سننا اور تخم محبّت رتن کے دل میں بونا" کا باب مکمل کر کے پدماوت اور رتن سین کی محبّت کی داستان کے پہلے مرحلے کو ختم کیا تھا کہ اس فانی دنیا میں ان کے دن پورے ہوگئے۔ اس کے سات آٹھ سال بعد داستان شروع کرتے ہوئے عشرت کہتے ہیں :

یہاں سے انتہا ہے نظم آرائی میر ضیاء الدین عبرت کی ۔
اور ابتدا ہے طبع آزمائی سید غلام علی عشرت کی ۔
کہا یاں تک یہ قصہ بس ضیاء الدین عبرت نے
اب اس کا شوق ہر دم مجکو یوں رغبت دلاتا ہے کہ

عشرت پی کے تو الفت کا اک جام | مری خاطر سے کردے اسکا اہتمام
کہ اس میں روح بھی عبرت کی ہو شاد | دعائے خیر سے مجھ کو کرے یاد

غرض قصہ ادھورا رہ نہ جائے — جو ہیں مشتاق، ان کے کام آئے
سو میں نے شوق کی خاطر یہاں سے — کہ ہیں مشفق میرے اعلیٰ جہاں سے
اٹھا کر اپنی کلک درفشاں کو — کیا تحریر یوں اس داستاں کو
کہ سن کے سب بیانِ وحشت آمیز — ہوئی الفت کی آتش دل میں اس تیز

اور اس کے بعد عشرت "سیر باغ کو پدماوت کا جانا اور تنہائی میں چند شعر عاشقانہ پڑھ کے دل کو بہلانا" سے داستان جاری کرتے ہیں۔

"پدماوت اردو" اور" مثنوی سحرالبیان" چونکہ ایک ہی زمانے کی تخلیقات ہیں، لہذا دونوں کی زبان اور اندازِ بیان کا مقابلہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ میر حسن کی سحرالبیان نے جو شہرت پائی ہے اس کا مقابلہ کسی اور مثنوی سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب ہم "پدماوت اردو" کی زبان پر غور کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان اور اندازِ بیان دونوں لحاظ سے یہ مثنوی کسی طرح بھی میر حسن کی تخلیق سے کمتر درجے کی قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ بقول دلدار حسین خان صاحب "میر حسن کی مثنوی کا دامن جہاں ثقیل، متروک اور غیر ثقہ الفاظ کا بارگراں اٹھائے ہوئے ہے، وہاں عبرت کی زبان ثقالت سے صاف ہے۔ اگرچہ متروکات "پدماوت اردو" میں بھی آئے ہیں، لیکن ان کی تعداد محدود ہے"۔ منظر نگاری اور حسن کی تعریف مثنوی کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلسلے میں میر حسن، عبرت اور عشرت کا مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے پہلے سحرالبیان میں میر حسن نے شہزادی بدر منیر کا حسن، سراپا، لباس، سج دھج، زیورات، زلف اور چوٹی کی تعریف کرتے ہوئے جو تصویر اتاری ہے، اسے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ "پدماوت اردو" سے اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ملاحظہ ہو میر حسن کا کمال؛

کروں اس کی پوشاک کا کیا بیاں — فقط ایک پشواز آبِ رواں
زبس موتیوں کی تھی سنجاف گل — کہے تو، وہ بیٹھی تھی موتی میں تل
اور اک اوڑھنی جوں ہوا یا حباب — جیسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب
صباحت صفا اس میں جھلکی ہوئی — پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی

وہ کرتی، وہ انگیا جواہر نگار — نیا باغ اور ابتدا کی بہار
وہ چھب تختی اور اس کی کرتی کا چاک — ترا تے کی انگیا کسی ٹھیک ٹھاک
جھلک پائجامہ کی دامن سے یوں — کہ روشن ہو فانوس میں شمع جوں
صفائی یہ پوشاک کی دیکھیو — نظر سوچ میں ہے کہ میلی نہ ہو
وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن — وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
جڑاؤ وہ بالے کہ ہالے کا رشک — وہ موتی کے مالے کہ عاشق کا اشک
وہ آنکھوں کی مستی، وہ مژگاں کی نوک — کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
وہ موتی کا دلڑا، وہ موتی کا ہار — سدا اشک غمدیدہ جس پر نثار
لگا دھکدکی لڑا ست لڑا — سراسر گلے حسن اس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چنپا کلی — رہے جس سے الماس کو بیکلی
تلے اس کے موتی ٹکے گرد کل — کہ جوں شبنم آلودہ ہو برگِ گل
جہانگیریوں کا کروں کیا بیاں — کہ اٹھتی تھی ہاتھوں سے جس کی فغاں
جواہر سے بینے کی ہیکل جڑی — کمر اور کولے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی پڑی پائے زیب — کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب
کسی کے کہاں ہاتھ وہ پاؤں آئے — جواہر جہاں پاؤں پر پڑ کے جائے
سراپا اگر ہو زباں میرا تن — سراپا میں اس کے کروں کیا سخن
سب اعضا بدن کے موافق درست — ہر اک کام میں اپنے چالاک و چست
جہاں راستی چاہیے، راستی — کجی جس جگہ چاہیے، واں کجی
وہ سکڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے — وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہیے، ٹھیک نک سک سے انگ — نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ بانکپن — غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن
کرشمہ، ادا، غمزہ ہر آن میں — غرض دلبری اس کے فرمان میں
تغافل، حیا، ناز، شوخی، غرور — ہر اک اپنے موقع پہ وقتِ ضرور

تبسم، تکلم، ترنم، ستم — موافق ہر اک، جو ملے کے کرم
وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن — جھکی شاخِ نخلِ گلستانِ حسن
نگہ آفت و چشم عینِ بلا — مژہ دیں صفوں کو الٹ برملا
دُرِ گوش جب، اس کا تابندہ ہو — صدف کا دلِ صاف شرمندہ ہو
وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر — ہے انگشتِ قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسار نازک کہ ہو جائے لال — اگر اس پہ بوسہ کا گذرے خیال
نہیں رطب و یابس کا یاں کچھ حساب — بیاضِ گلو سب کی سب انتخاب
وہ ساعد، وہ بازو، بھرے گول گول — برابر ہو الماس کے جس کا مول۔
وہ دستِ حنابستہ خوبی کا باب — شفق میں ہو جوں پنجۂ آفتاب
زبس مثلِ آئینہ تھا اس کا تن — کہے تو کہ تھی ناف عکسِ ذقن
کمر کو کہوں کیونکر ہیں اس کی ہیچ — نہ آوے نظر تو ہے قسمت کا پیچ
وہ زانو کہ آجائے گر اس پہ ہاتھ — رہے عمر بھر ہاتھ زانو کے ساتھ
وہ ساقِ بلوریں، وہ اندازِ پا — پھرے ہر سحر چشم و دل میں سدا
قدِ و قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
وہ اٹکھیلیاں اور وہ اس کی چال — کہ دل جس سے عالم کا ہو پایمال
بنا کبک کیسی ہی گو چال لائے — کہاں پر وہ افتاد کو اس کی پائے
ٹلک چال اس کی کوئی کیا چلے — یہ انداز سب اس کے پاؤں تلے

اس کے بعد زلف اور چوٹی کی تعریف ملاحظہ ہو:

کروں اس کے بالوں کا کیا میں بیاں — نہ دیکھا کسی رات میں یہ سماں
وہ زلفیں کہ دل جن میں الجھا رہے — الجھنے سے جی جن کے سلجھا رہے
وہ کنگھی، وہ چوٹی کھنچی صاف صاف — کناری کا پیچھے چمکنا مو باف
کہوں اس کی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ — کہ جوں آخری شب ہو چھلکے کا رنگ
نمایاں تھی یوں اوڑھنی سے جھمک — کہ جوں ابر میں برق کی ہو چمک

موبافِ زری لے کیا ہے غضب   دیا ہے گرہ دن کو دنبالِ شب

سنگاروں میں وہ سب کو ہے اتار   یہ کہتے ہیں چوٹی کا اس کو سنگار

نہ ہو کیونکہ چوٹی کا رتبہ بڑا   کہ اک نور ہے اس کے پیچھے پڑا

گل و سنبل اس پر سے قربان ہے   کہ اس کی لٹک میں عجب آن ہے

لڑی تھی زلفِ سحر سے اس کے ساتھ   شب و روز کر دے رکھا اس نے گانٹھ

وہ لے ہاتھ آتا ہے اس کا کنٹھن   کہ ہے فی الحقیقت وہ کالے کا من

الٹ کر نہ دیکھے اسے ہوشیار   کہ وہ اک ستارہ ہے دنبالہ دار

وہ پیٹھ اس کی شفاف آئینہ ساں   رکش اوپر وہ چوٹی کا پڑنا وہاں

کہوں اس کے شانہ کا کیا ماجرا   کہ جوں ہو وے دریا پہ کالی گھٹا

بھری تھی جو بالوں سے زلفوں اس کی مانگ   جہت دل لیے اس کی کنگھی نے مانگ

دلِ عاشق اس پر سے قربان ہے   کہ مشاطہ کا سر پہ احسان ہے

کشاکش میں تھا ورنہ جینا تو ہیچ   سلجھا کر رکھا اس نے ڈھیلا ہی پیچ

غرض حسن کا اس کے ہے سب یہ بھید   جو چاہے ہے کرے وہ سیاہ و سفید

یہ ہے میر حسن کا کمال اور اب دیکھیے عبرت اپنی ہیروئن پدماوت کے حسن و جمال کی تصویر کیونکر کھینچتے ہیں۔ یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ شہزادی بدر منیر ایک مسلم خاتون ہے اور پدماوت ایک ہندو عورت۔ لہٰذا دونوں کا لباس اور ماحول یکساں نہیں ہے۔ بدر منیر پاجامہ اور کرتی میں ہے، تو پدماوت ساری پہنے ہے۔ لیکن حسن بہرحال حسن ہے اور عبرت نے پدماوت کے حسن کو زندہ جاوید بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ طوطے کی زبانی وہ پدماوت کے حسن و جمال کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

کہوں کیسا ہے اس کا قد و قامت   بلا و فتنہ و آفت، قیامت

نظر جس کو پڑا اس کا سراپا   وہیں دل سے اٹھا اس کے بھبھوکا

جو کوئی دیکھے وہ گیسوئے سیہ فام   بلا ٹوٹے وہیں اس پر سرِ شام

جواہر بال بال اس کے ہیں افزوں   اندھیری شب میں جیسا چمکے جگنوں

عیاں موئے سیہ سے اس کے یوں فرق ۔۔۔ سیہ بادل میں چمکے جس طرح برق
نمایاں مانگ ہے یوں اس کے سر پر ۔۔۔ فلک پر جیسے کھنچا ہو خطِ زر
عیاں موے سیہ سے فرقِ پُرنور ۔۔۔ برنگِ شعلہ بالائے سرِ طُور
وہ بیچ پیچ محرابی جو دیکھے ۔۔۔ وہیں زاہد زمین پر سر کو پٹکے
جو باندھے کھینچ کر جوڑا وہ مغرور ۔۔۔ بندھا دل ان سے چھوٹے کیا ہے مقدور
وہ ڈھیلا پیچ ہے جو اس کا سادا ۔۔۔ نہ چھوٹے اس میں آ رستم کا دادا
عجب رہتا ہے وہ موبندِ زرتار ۔۔۔ شبِ یلدا میں جوں ثاقب نمودار
جو سر میں تیل ڈالے تھی سہیلی ۔۔۔ رکھا تھا نام اس کا بھی چنبیلی
ذقن چاہ و سفِ مژگاں وہ خونخوار ۔۔۔ وہ کاکل اژدہا زلفِ سیہ مار
کہا یہ جس نے یوں زلفوں کو دیکھا ۔۔۔ یہ لشکر بے طرح شب خوں کریگا
کھوا کیا جس گھڑی وہ درۃ التاج ۔۔۔ کرے زلفوں میں اپنے شانۂ عاج
نمایاں شانۂ زلفِ گرہ گیر ۔۔۔ ہے ابیض نیل کے دانتوں میں زنجیر
غلط میں نے یہ دی سا تھا اس کے تمثیل ۔۔۔ لگا زنجیرِ دندان دکھا نیل
سیہ زلفوں میں اس کے شانۂ عاج ۔۔۔ رواں مانندِ مہتابِ شب داج
غرض وہ زلف جو ہے یا صد امید ۔۔۔ شعاعی خط کالا دے شانہ خورشید
ہے دل بس مانگ کے رشتہ میں ششدر ۔۔۔ کہ آدھی رات اندھیری جائیں کدھر
تہِ زلف اس کے وہ کن پھول زیبا ۔۔۔ گلِ شبو ہے جیسے شب کو پھولا
کہ وہ زلف اور لڑیاں موتیوں کی ۔۔۔ سیہ ناگن ہے جوں انڈوں پہ بیٹھی
جبین پر اس کی ٹیکا آشکارا ۔۔۔ سحر کا جس طرح نکلے ہے تارا
مگر اک مصرعِ قد پر مبین ۔۔۔ ہے نہ زر کا انتخابی نقطہ روشن
دبا لیتے ہیں دم میں صیدِ دل کو ۔۔۔ برنگِ ناخنِ شیر اس کے ابرو
وہ بیمار آنکھیں ہوویں کیا شفا خیز ۔۔۔ نہیں کرتی غذائے خوں سے پرہیز
نگس کی طرح دل ہے اس پہ بیتاب ۔۔۔ ہے اس کی چشم میں شاید شکر خواب

[illegible]

میں اس کی چشم کی شوخی کہوں کیا | کہ جس کی شکل سے ہے خوں برستا
اسی کا عشوہ و غمزہ پکارے | کہ دل یاں ہم نے ہیں تیغوں سے مارے
کنارے چشم کے اک خال ہے گا | کہ جیسے بچۂ آہو ہو بیٹھا
مشابہ کر کے اس کے رخ سے اکثر | بناتے آینہ ہیں آینہ گر
عجب حسنِ رخ و چشم بلا زاد | گیے جس چہرے پر اللہ نے صاد
جو ہووے آیینہ اس رو سے ہمسر | وہ مژگاں گھس پڑیں مانندِ جوہر
جو روئیں تن کے وہ سینہ کو توڑیں | بھلا پھر اور کس سے منھ کو موڑیں
نوکیلی خوشنما بینی طرحدار | ہے گویا حسن کے طوطے کی منقار
لبوں کی کیا کہوں میں دلربائی | کہ ہے وندان مصری کی مٹھائی
مسی مل کر جو برگِ پان چباوے | وہ لب جوں برگِ نافرمان دکھاوے
دہن میں اس کے ہے وقتِ تکلم | برنگِ غنچہ اک رنگیں تبسم
ہنسے قہقہہ وہ جب مانندِ مینا | گلوے نازنیں سے جلوہ گر تھا
ہوا عالم دہن کے اس کے غم میں | کہ دیکھیں جا کہیں خوابِ عدم میں
در دندان دہن میں یوں ہیں باہم | نہاں غنچہ میں جوں قطراتِ شبنم
چبا کر پان، منھ اس نے کیا لال | چھپائی خونخوری کس ڈھب سے فی الحال
کہ جوں میخوار کھا لیتے ہیں کچھ شے | برائے دفعِ بوے ظاہری مے
جو سرخی پان کی پھیکی وہ پڑ جائے | وہ لب جوں شربتی یاقوت دکھلائے
دہیں پر حلقۂ نتھ کیا کہوں یار | ہے مرکز پر طلائی خطِ پرکار
وہ پونچھے دھوکے یوں رومال سے رُو | لپیٹیں جس طرح کپڑے میں گل کو
زنخ پر اس کے ہے جو خوشنما تل | کسی عاشق کا جل کر رہ گیا دل
عجب گردوں ہے جس کا حسن پرتو | ہے بزم آرائے دل جوں شمع کی لو
وہ اس کا ساعدِ سیمیں، وہ بازو | ہے حسن رشدِ افزوں کی ترازو
وہ پنجہ ہے جس پر لڑکے باہم | حنا کا قتل ہو جاتا ہے عالم

جو دیکھا حُسن اس سینہ کا رخشاں — ہوا آبِ بقا ظلمت میں پنہاں

وہ زیور اور کناری سینہ فرسائے — ہے عکسِ ماہ جوں دریا میں لہرائے

مصفا سینہ پر جو تل عیاں ہے — کسی کی مردمک کا وہ نشاں ہے

پڑی سینہ پہ ہے یوں زلفِ بیتاب — اُگا ہو جیسے سنبل بر لبِ آب

مصفا سینہ پر زلفِ دلآرا — نظر آتی ہے مثلِ موجِ دریا

جو زلف اس کی ہے پستان کے مقابل — ہے برجِ سنبلہ میں بدر داخل

نہ ہو کیونکر فرح بخشِ دلِ زار — وہ پستاں میں طلائی دست افشار

مگر لوگوں کی نظروں سے بچا کر — رکھے دو دل ہیں انگیا میں چھپا کر

کبھی نظارہ کہتا ہے کہ شہباز — پکڑ کر ڈورسے باندھے ہے طناز

نہیں ہے اب فلک وہ دست آموز — اسے ٹوپی میں رکھتے ہیں شب دروز

وہ انگیا ہے مگر ابرِ بہاری — کرن چمکے ہے واں برف و کناری

کہوں کیا حلقہ اس نازک کمر کا — ہے چشمِ حور کے سرمہ کا ڈورا

لکھے کیونکر کمر کا اس کے انداز — کہ حائل ہے کمر کے چینِ پشواز

نہیں چلتی نگہ کی تیز بینی — دکھائی دے ہے کمتر موئے چینی

نہ پہونچا ناف تک اس کے قیافہ — کہ تھا وہ حسن کے آہو کا نافہ

حیا آگے ہے بس اب منع کرتی — سرِ عجز اپنا ہے زانو پہ دھرتی

کہوں آئینۂ زانو کی کیا بات — کہ ہے وہ عینکِ چشمِ خیالات

شگوفہ ارغواں کا واں نہاں ہے — وہ ساعد اس کی شاخِ ارغواں ہے

حنائی وہ کفِ پائے نو آئیں — گل متھوری سے بھی ہے شوخ رنگیں

کہوں کیا جلد کی اس کی صفائی — ہو جیسے دودھ پر ہلکی ملائی

جو پہنے شوخ نافرمانی جوڑا — نظر آتی ہے جوں لنکا میں سیتا

اگر پہنے وہ جوڑا ارغوانی — ہو شادی مرگ عالم ناگہانی

اگر دامن وہ شوخی سے جھٹک جاے — پری کی آنکھ میں بجلی چمک جاے

وہ اودے تاش کے سنجاف داماں	یہ لپٹی ہے کسی کی آہِ سوزاں
نزاکت سے لباس اس گلبدن کا	بجز شبنم نہیں تن زیب ہوتا
بدن سے اس کے زیور کو جلا ہے	کہ جیسے آگ پر رکھا طِلا ہے
سجے ہے موتیوں کا اس کو زیور	کہ گل کو زیورِ شبنم ہے بہتر
جو حسنِ گرم آئینہ کو دکھلائے	وہیں سیماب آئینہ کا اڑ جائے
اسے کس پیار سے آئینہ لے کر	چھپا لیتا ہے اپنے دل کے اندر
ولیکن عکس وہ شوخی سے جاوید	نکل جاتا ہے مثلِ عکسِ خورشید
حیا میں کیا کہوں اس فتنہ گر کی	عرق کرتی ہے گرمی سے نظر کی
نظر آتا ہے اس کا وہ پسینہ	جڑا کندن پہ ہیرے کا نگینہ
جو ہو اس آتشیں خو کے مقابل	سینہ آسا کھلے ہے عقدۂ دل
جو دل اس مست کی آنکھوں سے اٹکا	لہو بھر کر وہیں مینا سے ٹپکا
دلِ گریاں جو زخم اس چشم سے کھائے	وہیں جو زخم روئے آپ مل جائے
غرض میں کیا کہوں اس کا سراپا	کہ ہیں دلچسپ اس کے جملہ اعضا
ہنوز اس گل کا غنچہ وا نہیں ہے	صبا نے اب تلک چھیڑا نہیں ہے

"پدماوت اردو" میں تین غزلیں اور ایک بارہ ماسا بھی شامل ہے۔ پہلی غزل بزبانِ فارسی ہے، جو عبرت نے کہی اور پہلی اردو غزل بھی عبرت ہی کی ہے۔ عشرت نے ایک غزل کے علاوہ بارہ ماسا بھی کہا ہے۔ خود جائسی نے بھی ناگمتی کے ہجر و فراق کو بارہ ماسا کے طور پر قلمبند کیا ہے اور عشرت نے بھی اسے بارہ ماسا ہی کے طور پر قلمبند کیا ہے۔ یہ بارہ ماسا ماہ اساڑھ سے شروع ہوتا ہے اور ماہ جیٹھ پر ختم ہوتا ہے۔

"پدماوت اردو" کا جو نسخہ میرے یہاں ہے، خیر میں اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ جیسا کہ کہہ چکا ہوں، یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، جو نامی پریس لکھنؤ سے ستمبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے صفحات ۹۶ ہیں۔ مسطر ۲۷ سطروں کا ہے، یعنی ہر مکمل صفحے پر ۵۴ اشعار ہیں۔ یہ باتصویر ہے۔ سرورق پر پدماوت کی تصویر کے علاوہ پوری

۔۔ پدماوت اردو

کتاب میں دیگر ۲۴ تصاویر ہیں۔
اس مثنوی کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہے کہ یہ اردو مثنویوں میں بلند مقام حاصل کرنے کی مستحق ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے اغلاط دور کر کے جدید رسم الخط کے ساتھ اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جائے تاکہ عبرت وعشرت کا یہ کارنامہ اردو داں طبقہ کے سامنے آجائے۔

کالی داس گپتا رضا

فخر الدولہ منشی الملوک
راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ زخمی

[مخففات (۱) ریاض الفصحا: مصحفی (۲) رقعاتِ مرزا قتیل مرتبہ امامی
= رقعات (۳) صبح گلشن = صبح (۴) روز روشن = روز (۵)
مطلعِ خورشید دیوان جواہر سنگھ جوہر لکھنوی (مطبوعہ نولکشور ۱۲۶۹ھ)
= جوہر (۶) آثار الشعراے ہنود = لشباش (۷) بہارِ سخن = برق
(۸) ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ = ادبیات (۹) صبح امید
لکھنؤ جلد ۲، ۴ اپریل ۱۹۱۹ء مضمون سید سلیمان ندوی = ندوی
(۱۰) اورینٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری = بیل (۱۱) قاموس المشاہیر = قاموس

۱۔ یہ رقعات خواجہ امام الدین امامی نے قتیل کی زندگی (وفات قتیل ۱۲۳۳ھ) ہی میں مرتب کر لیے تھے۔
خواجہ امامی لکھنؤ کے رہنے والے اور خواجہ قاضی خان بن خواجہ بادشاہ خان کے بیٹے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نثر میں طبعِ سلیم اور ذہنِ مستقیم رکھتے تھے، مگر نظم میں باوجود موزونیِ طبع کے فکر رسا نہیں پائی تھی۔ اس لیے قتیل ان سے شعر کہنے سے روکتے رہتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳-۱۸۳۴ء میں تاج الدین حسین خاں کنبو کے ایک ملازم کے ہاتھوں کانپور میں قتل ہوئے۔ (صبح: ۳۵) رشک نے تاریخ کہی:

خواجہ امامی کا ہوا قتل — مردِ گرامی قتل ہوا
رشک لے یہ تاریخ کہی — "خواجہ امامی قتل ہوا"
(۱۲۴۹)

(دیوان رشک: ۴۰۰ مطبوعہ ۱۲۵۳ھ)

راجہ رتن سنگھ زخمی

(۱۲) قیصر التواریخ = قیصر (۱۳) تاریخِ اودھ از نجم الغنی = نجم (۱۴) دیوان زخمی رتن سنگھ، فارسی (قلمی ۲۵ ۷ MSS) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، چنڈی گڈھ = دیوان (۱۵) ہندو شعراء = عشرت]

نام، قوم | رتن سنگھ نام اور تخلص زخمی پر سب متفق ہیں۔ یہ بھی یقینی ہے کہ وہ کائستھ تھے۔ برق نے "سکسینہ" کا اضافہ کیا ہے۔ بقولِ قاموس ان کا خاندان تین پشت سے دربارِ اودھ میں معزز عہدوں پہ ممتاز تھا۔ صرف دو پشتوں (یعنی ان کے دادا اور والد) کے حالات ہمیں معلوم ہو سکے، مگر ان کے پر دادا کے حال تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ ندوی کہتے ہیں کہ راجہ پورن چند کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فی الحال اس پر کچھ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

دادا | دادا کا نام راجہ بھگوان داس تھا جو آصف الدولہ کے ایامِ شہزادگی میں ان کے اتالیق اور عہدِ حکومت میں دیوان تھے (قاموس)۔ ۱۲۰۱ھ (۸۷-۱۷۸۶ء) میں انتقال کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کے خنجر کا شکار ہوئے۔ دیوان میں زخمی کے دو تاریخی قطعات ہیں:

راجہ بھگوان داس چوں، زخمی! — خورد زخمے ز خنجر اعدا
گفت ہاتف بسالِ تاریخش — شد رواں سوئے جنتِ اعلیٰ ۲
(۱۲۰۱ھ)
راجہ بھگوان داس مصدرِ جود — چوں بحکم خدا بخلد شتافت
سالِ تاریخِ او طلب کردم — داد ہاتف ندا: شہادت یافت
(۱۲۰۱ھ)

والد | والد کا نام رائے بالک رام تھا (مصحفی: رقعات نمبر ۶ و نمبر ۱۳؛ صبح؛ روز؛ ادبیات؛ ندوی: نجم، ۴: ۱۲۰)۔ آصف الدولہ کی سرکار میں میر آتش کے عہدے پر فائز تھے۔ بالک گنج کا توپخانہ انھیں کے نام پر مشہور رہے (صبح)۔ اور

۲۔ اس مصرعے سے ۱۲۰۲ برآمد ہوتے ہیں، مگر دیوان میں سال ۱۲۰۱ھ درج ہے۔ البتہ دوسری تاریخ "شہادت یافت" سے ۱۲۰۱ ہی نکلتا ہے، اور یہی سال صحیح معلوم ہوتا ہے۔

راجہ رتن سنگھ زخمی

اب تک لکھنؤ میں باقی ہے (روز)۔راے بالک رام شاعر بھی تھے؛ صبوری تخلص کرتے تھے۔ روز میں ان کا ترجمہ تخلص کے تحت ہے؛ ذیل کے دو فارسی شعر بھی درج ہیں:

گر یار سرِ وفا ندارد، تاثیرِ دعا و زاریِ ماست

جاں زود بدر مزن کہ جاناں غمگین زنفس شماریِ ماست

سر بازی من دیدی و راندی زدرِ خود قرباں شومت، حاصلِ آں بندگی ایں بود

اولاد | صبح اور روز سے زخمی کے صرف ایک بیٹے کا علم ہوتا ہے، جس کا نام دولت سنگھ اور تخلص شکری تھا۔ روز میں دیے ہوئے ترجمے کی پوری عبارت یہ ہے:

شکری۔ کنور دولت سنگھ لکھنوی فرزندِ راجہ رتن سنگھ زخمی؛ ولادتش درشہر لکھنؤ سنۂ الف ومأتین (۱۲۰۰) اتفاق افتادہ، مردے خلیق و مہذّب وادیب و مؤدب و نکتہ سنج، دقیقہ رس و در علمِ ریاضی خلف الصّدق پدرِ خود بود۔

صبح میں زخمی کے ترجمے کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے، جسے روز پر اضافہ کہنا چاہیے:

کنور دولت سنگھ شکری تخلص کہ در عنفوانِ جوانی مُرد۔ در جملہ فنون از پدرِ والاقدر قدم فراتر می گذاشت۔

اس سے معلوم ہوا کہ کنور دولت سنگھ شکری، نہ صرف علمِ ریاضی میں اپنے لائق باپ کے خلف الصّدق تھے، بلکہ جملہ فنون میں ان سے آگے تھے۔ اور یہ کہ کنور دولت سنگھ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵۔ ۱۷۸۶ء) میں پیدا ہوئے اور عنفوانِ شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نجم (۴: ۱۲۰) میں ہے کہ وہ کنور رتن سنگھ... (راجہ دیا کشن کا سمدھی تھا اور ضلع بریلی سے کئی برس کے بعد آیا تھا" یہ واقعہ غازی الدین حیدر کے آغازِ عہد (۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء) کے ذرا بعد کا ہے۔ اگر کنور دولت سنگھ شکری زخمی کے اکلوتے بیٹے تھے، تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہو چکی تھی اور راجہ دیا کشن ان کے خسر تھے، نیز وہ ۱۲۳۰ھ کے کچھ عرصہ بعد تک زندہ رہے۔ قیاس ہے کہ دولت سنگھ شکری کا انتقال ۱۲۳۴ھ کے

لگ بھگ بعمر ۲۵ سال ہوا۔ عین ممکن ہے کہ اولاد بھی چھوڑی ہو، مگر اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔

روز میں شکری کے مندرجہ ذیل ۱۲ اشعار درج ہیں :

زندگی مرگ بود کشتۂ ہجرانِ ترا | خونبہا زخمِ خدنگ ست شہیدانِ ترا
چو بر رخِ تو کشودیم چشمِ بینا را | عیاں بہ پیشِ نظر برقِ لن ترانی بود
آہِ سوزانِ نفس بادِ بہار ست مرا | سینہ گلزار ز داغِ غمِ یار ست مرا
چشمِ بیدار چراغ شبِ تار ست مرا | شمع را نیست دریں کلبۂ احزاں گذری
قاصدِ ناداں بدشمن داد مکتوب مرا | بر داز من نامہ دلشتہ تحت محبوب مرا
تو دل بدستِ کسے دادہ ای، چنیں پیداست | شکستِ خاطرت از روی نازنیں پیداست
بلای دین و ایمان آفریدند | رخش غارتگرِ جان آفریدند
زنامہ بُردنِ خود شرمسار می آید | و لے کہ نامہ بر از کوے یار می آید
گفتا ہمیں جا بود، از خانہ بیروں کردمش | شب چون کسے پرسید از شکری کجا رفت، بگو
جفای دیدم، اما خوشدلی اظہار میکردم | برای آنکہ غیر از رشک می بردی بہ بزمِ او
رشکم نگذارد کہ بہ ہیچم خبرِ تو | مشتاقم واز ہر کہ بیاید ز درِ تو
عیاں نمود کہ پنہاں بما نظر داری | تبسمِ شکری و نہفتنہ دیدنِ تو

وفات صبح اور جوہر نے لکھا ہے کہ وفات ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔ بیل ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) بتاتے ہیں۔ قاموس میں تو بیل ہی کی تقلید ہے۔ برق اور عشرت کا ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) پر اتفاق ہے، جو یکسر غلط ہے۔ زخمی کا انتقال بالیقین ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰-۱۸۵۱ء) میں ہوا، جس کے ثبوت میں جوہر (ص۔ ۵۵) کا کہا ہوا زخمی کا قطعۂ تاریخ وفات پیش کیا جا سکتا ہے۔ قطعے کی تفصیل آگے آئیگی، فی الحال اسی پر اکتفا کی جاتی ہے کہ فخر الدولت (۱۳۵۱) (خطابِ زخمی) سے سرِ فخر (یعنی ف) سرِ دولت (یعنی د) (کے ۸۴ عدد) منہا کریں، تو ۱۲۶۷ھ برآمد ہوتا ہے، جو ۶ر نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوا تھا۔

راجہ رتن سنگھ زخمی

عمر عشرت اور برق نے عمر ۶۵ سال بتائی ہے۔ عشرت کا کہنا، نہ کہنا ایک برابر ہو۔ برق بھی اس معاملے میں قطعاً نامعتبر ہے۔
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زخمی نے طویل عمر پائی۔ ہم مختلف شواہد سے ان کی عمر متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
مصحفی نے جب زخمی کو مرزا حاجی کے مشاعرے میں دیکھا ہے، تو وہ اسے قریب ۴۰ سال کے دکھائی دیے۔ وہیں اسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ "شاگردِ مرزا قتیل مرحوم" ہیں۔ مصحفی ظاہراً زخمی سے اس سے پہلے واقف نہیں تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ باوجود اسے کہ زخمی کی پیدائش لکھنؤ کی تھی، وہ ایک لمبا عرصہ بریلی میں گزار کر ۱۲۳۰ھ کے بعد لکھنؤ واپس آئے تھے (نجم، ۴: ۱۲۰) قتیل کو مرحوم لکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ زخمی کا ترجمہ ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان کسی وقت لکھا گیا تھا۔ خیال غالب یہ ہے کہ ۱۲۳۳ھ ہی میں لکھا گیا۔ اس طرح زخمی کی ولادت ۱۱۹۳ھ کے قریب اور عمر ۷۰ سال (ہجری) کہی جائیگی۔ مگر یہ درست نہیں؛ زخمی نے اس سے زیادہ عمر پائی۔
اوپر ان کے دادا راجہ بھگوان داس کے حال میں ہم نے زخمی کے کہے ہوئے دو تاریخی قطعات درج کیے ہیں، جن سے تاریخ ۱۲۰۱ھ (۱۲۰۲ھ) برآمد ہوتی ہے۔ اگر ۱۱۹۳ھ کو سالِ ولادت مان لیا جائے تو ان قطعات کی فکر کے وقت زخمی صرف آٹھ سال کے ٹھہرتے ہیں۔ اس سن میں شعر و سخن میں یہ مشاقی ممکن نہیں۔ ایسے اشعار کہنے کے لیے ذہین سے ذہین شاعر کو بھی اٹھارہ بیس سال کا تو ہونا ہی چاہیے۔ مگر ضروری نہیں کہ قطعاتِ تاریخ راجہ بھگوانداس کی وفات ہی کے سال میں کہے گئے ہوں؛ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ دس پندرہ سال بعد کہے ہوں۔ مگر ہمارے پاس ایک اور ثبوت موجود ہے جو ناقابلِ تردید ہے۔ یہ ہے زخمی کے فرزند کنور دولت سنگھ شکری کا سالِ ولادت؛ شکری ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کیا اس وقت زخمی سترہ اٹھارہ سال کے نہ ہونگے؟ لہذا ہمیں اِدھر اُدھر ایک سال کے فرق کے ساتھ زخمی کا سالِ ولادت ۱۱۸۳ھ تسلیم کرنا چاہیے۔ اس طرح ہمارے خیال میں زخمی نے

۸۵ سال (ہجری) کی پختہ عمر پائی۔

تبدیلِ مذہب صبح میں ہے کہ ۱۲۶۴ھ میں اسلام کو دینِ حق سمجھ کر اختیار کر لیا اور تین سال بعد ۱۲۶۷ھ میں وفات پائی۔ بیل کہتا ہے کہ مرنے سے چند سال پیشتر سنہ ۱۸۴۶ء میں اسلام قبول کیا (قاموس حسبِ عادت محض بیل کے غلط سلط کی پیروی کرتا ہے)، اور رقعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ روز، بشاش، برق، ادبیات، ندوی، قیصر، نجم، دیوان، عشرت وغیرہ میں اس بات کی طرف قطعاً کوئی اشارہ نہیں۔ صبح اور بیل بھی صرف تبدیلِ مذہب کا پتا دیتے ہیں، مگر کسی اسلامی نام کا ذکر نہیں کرتے جو بیحد ضروری تھا دونوں زخمی کو مہاراجہ رتن سنگھ بہادر اور فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہی لکھتے ہیں۔

بشاش (ص ۲) میں ہے کہ جن لوگوں نے تذکرۂ آثار الشّعرائے ہنود (مطبوعہ جنوری ۱۸۸۶ء) کی تالیف میں عملی طور پر مدد کی تھی، ان میں جواہر سنگھ جوہر لکھنوی بھی شامل تھے۔ اس پر بشاش (ص ۲۵) جوہر کے حال میں لکھتے ہیں۔

> فخر الدولہ منشی الملوک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ زخمی تخلّص، نامی فاضلِ متبحر، میر منشیِ سلطنتِ اودھ ..... ان جوہر صاحب کے ماموں تھے۔

جواہر سنگھ جوہر لکھنوی کا جو ترجمہ بشاش میں شامل ہے، وہ خود جوہر کا مہیا کردہ ہے۔ اگر ان کے ماموں زخمی نے تبدیلِ مذہب کیا ہوتا، اور کوئی اسلامی نام اختیار کر لیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس کا ذکر نہ کرتے۔ جوہر بچپن ہی سے زخمی کو جانتے تھے اور قیاس ہے کہ زخمی کے انتقال کے وقت لکھنؤ ہی میں ہونگے۔ ان کے دیوان مطلع خورشید (مطبوعہ ۱۱۶۹ھ) میں زخمی کی وفات کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔ قطعہ مع عنوان ملاحظہ کیجیے:

> تاریخ فوتِ فخر الدولہ منشی الملوک / راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ / زخمی تخلّص۔

سرِ فخر و سپرِ دولت کسند دفع ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ ز فخر الدولہ[3] آنچہ آنچہ ماند

ازاں تاریخ مرگ و دفنِ او را ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ بخواہد ہر کہ آنے جو ہر بخواند

یہاں لفظ دفن[4] سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ اس عہد کے بزرگ بلا تخصیص مذہب و ملّت اس قسم کی زبان استعمال کر لیا کرتے تھے[5]۔ ادبیات (ص ۲۷۱) میں ان امور پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

ہندوؤں نے اسٹائل کے علاوہ بعض ان مذہبی اثرات و رسمیات کو بھی اپنی کتابوں میں قائم رکھا، جو مسلمانوں کی محبوب خصوصیات تھیں، لیکن ہندوؤں کا انھیں اختیار کر لینا بہت کچھ قابل تعجب ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵ الحمدُ للہ، صلی اللہ علیہ وسلّم، رمضان المبارک کے علاوہ اپنے آپ کو برلبِ گور لکھنا اور ہندوؤں کے لیے داخلِ جہنم، وغیرہ الفاظ اس کثرت کے ساتھ کتابوں میں آتے ہیں کہ اگر مصنّف کا نام معلوم نہ ہو، تو بمشکل پتا چل سکتا ہے کہ مصنّف ہندو ہے۔

اس صدی میں بھی ایسی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں جیسے چکبست (صبح وطن: ۱۸۷) کا یہ مصرع پرتاپ کشن گرٹو کی موت پر

خاک کے دامن میں کیسا بےخبر سویا ہے تو

یا پنڈت یوگ راج نظر سوہانوی شاگردِ حالی (شعلۂ زار: ۲۱) کے اپنی بہن کے مرثیے کے ایک بند کے دو مصرعے

سو رہی ہے قبر میں تو آج لمبی تان کر ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ تیرا بھائی آج تیری قبر پر ہے نوحہ گر

۳۔ یہاں فخر الدولہ کی جگہ فخر الدولت پڑھنا چاہیے، ورنہ اعداد صحیح نہیں ہو سکتے۔ جوہر نے یہی لکھا ہوگا، فخر الدولہ سہو کاتب ہے۔

۴۔ ہمارے استفسار پر قاضی عبدالودود صاحب نے بھی یہی جواب دیا ہے۔

۵۔ ہندوؤں میں دفن تین صورتوں میں روا رکھا جاتا ہے (الف) کمسن بچوں کے لیے (ب) سادھو سنتوں کے لیے (ج) اگر میّت کی وصیت میں دفن کی خصوصی ہدایت موجود ہو۔

علاوہ بریں ایک ذہین، لائق اور عالی مرتبت انسان کا خواہ وہ کسی مذہب سے بھی تعلق رکھتا ہو، ۸۰-۸۲ سال کی عمر کو پہنچ کر تبدیلِ مذہب کرنا قرینِ قیاس نہیں ہے۔

وضع قطع عادات | ہمارے پیشِ نظر صرف دو ماخذ ایسے ہیں، جنھوں نے زخمی کو بچشمِ خود دیکھا تھا، یعنی مصحفی اور رقعات۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مصحفی نے جب زخمی کو دیکھا ہے تو وہ اُسے چالیس سالہ جوانِ وجیہہ معلوم ہوئے۔ چونکہ ۱۲۲۳ھ میں زخمی چالیس سال کے نہیں بلکہ پچاس کے پیٹے میں تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی صحت غیر معمولی طور پر اچھی رہی ہوگی۔ مصحفی نے انھیں مہذب الاخلاق لکھا ہے، اور کہا ہے کہ "وضع میرزایانہ" تھی، اور وہ (در مشاعرۂ مرزا حاجی) شعر پڑھنے میں ایرانیوں کا تتبع کرتے تھے۔ قتیل استادِ زخمی رقعات (ص ۶۰) میں لکھتا ہے کہ کم گوئی کی عادت کے باوجود زخمی جو کہنا چاہے، کہہ سکتا ہے۔ (اگرچہ کم گواست، زبان را جنبش می نواند داد) رقعات[6] ۶۰ اور ۱۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زخمی نے بریلی کی سکونت کے دوران وہاں اور اس کے نواح میں اچھا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ کلکٹر صاحبان کے مختاروں اور منشیوں سے ان کا خاصا ربط ضبط تھا۔

علمیت | یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ زخمی نے کہاں تک اور کس سے تعلیم حاصل کی، لیکن تمام تذکرے ان کی علمی اور ادبی لیاقت اور استطاعت کے معترف ہیں۔ مصحفی انھیں "قابل و دانا" کہتا ہے۔ صبح میں ہے کہ "اکثر علومِ عربی و فارسی و ترکی و انگریزی و سنسکرت" سے واقف تھے۔ روز نے شکری کے ترجمے میں لکھا ہے کہ شکری پسرِ زخمی علمِ ریاضی میں اپنے باپ کا خلف الصدق ہے۔ بشاش (ص ۴۵) میں "نامی و

۶- یہ دونوں رقعے بریلی میں کسی ایسے شخص کو لکھے گئے تھے، جو قتیل اور زخمی (جو اس وقت کنورجی یا کنور رتن سنگھ کہلاتے تھے) دونوں کو جانتا تھا۔ زخمی ان دنوں مستقل طور پر بریلی میں مقیم تھے۔ رقعے سفارشی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے رقعات دیکھیے۔

وفاضلِ متبحر" کے الفاظ ملتے ہیں۔ ندوی رقم طراز ہیں کہ " اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ عربی فارسی میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ منطق، فلسفہ اور خصوصاً ریاضیات میں ان کا پایہ بہت بلند تھا"۔ بیل کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بریلی میں ایک بڑا کتابخانہ چھوڑا (جو زخمی کے وسیع مطالعے کی نشاندہی کرتا ہے۔) قاموس میں درج ہے کہ "بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا"۔ نجم (۴: ۱۲۰) کہتا ہے کہ "نہایت دانشمند اور صاحبِ علم آدمی تھا"

دربارِ اودھ | غازی الدین حیدر کے عہد کے آغاز میں (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) نجم (ص ۱۲۰) رقم طراز ہے کہ "ایک کلکٹری کنور رتن سنگھ کے نامزد ہوئی۔ یہ شخص .... ضلع بریلی سے کئی برس کے بعد آیا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ اودھ کے ماتحت یہی پہلی ملازمت ہے، جو زخمی نے کی، اگرچہ ان کے آبا و اجداد ایک عرصے سے اس دربار سے منسلک تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مصحفی نے زخمی کو مرزا حاجی کے مشاعرے میں دیکھا تھا۔ نتیجتاً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زخمی پہلی بار تقریباً پچاس سال کی عمر میں دربارِ اودھ سے متعلق ہوئے، اور پھر کم از کم ۲۵ سال (یعنی ۱۲۵۸ھ تک)، جب ان کی عمر لگ بھگ ۷۵ سال تھی، یہیں معزز عہدوں پر فائز رہے، اور اعلیٰ خطابات سے نوازے گئے۔ بقولِ صبح، زخمی پہلے پہل شاہِ اوّل غازی الدین حیدر کے زمانے میں اور بعد میں ان کے جانشین نصیر الدین حیدر کے عہد میں امیر الانشا مقرر ہوئے اور منشی الملوک کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔

۷۔ نجم (۴: ۱۸۳) محکمے کا نام دفترِ بیت الانشا یعنی منشی خانۂ سلطانی تھا۔ "اس دفتر میں رازداری کے کاغذات اور پولیٹیکل صحیفے کے احکام رہتے تھے۔ یہیں سے ریذیڈنٹ کے نام پرچہ پیام جاری ہوتا تھا۔ اس دفتر کا افسر منشی الملوک کہلاتا تھا۔ احکامِ بادشاہی اس عبارت سے صادر ہوتے تھے "اہالیانِ بیت الانشا چنیں کنند و چنیں نمایند"۔ اس کے علاوہ عرضداشتوں پر تجویز مہتمم سررشتہ لکھ کر وزیر بادشاہ سے دستخط صاد کرا لیتے تھے"۔

نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد محمد علی شاہ نے شنبہ ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق (۸ جولائی ۔ نجم) ۱۸۳۷ء کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ زخمی (دبیر الدولہ منشی الملوک راجہ رتن سنگھ بہادر، ہشیار جنگ امیر الانشائے سرکار شاہی) نے سکّہ گزرانا:

بجود و کرم سکّہ زد در جہاں   محمد علی بادشاہِ زماں

(قیصر، ۱: ۳۵۱؛ نجم، ۵: ۲)

بادشاہ نے بہت پسند کیا اور اسے روپوں اور اشرفیوں پر مسکوک کرایا۔ نجم میں ہے کہ مصرعِ ثانی کے دو لفظوں محمد علی (نام شاہ) اور محمدؐ اور علیؓ نے جو لطف پیدا کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ مبیع کی رُو سے اسی بادشاہ کے عہد میں زخمی کو منصبِ دیوانی عطا ہوا اور وہ مہاراجگی کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

قیصر (۱: ۳۶۶) سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد علی شاہ کے زمانے سے مرزا ولی عہد بہادر (امجد علی شاہ) کی جو مذہب میں بہت غلو رکھتے تھے، شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں اور زخمی سے "بہ سبب تعصبِ مذہب" ان بن رہتی تھی۔ چنانچہ قیصر (ص ۲۷۳) لکھتا ہے کہ محمد علی شاہ کے انتقال پر جب امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے، تو شرف الدولہ تو صورتِ حال دیکھ کر خود ہی رخصت لے کر خانہ نشین ہو گئے، اور زخمی جو اس وقت دیوانی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، مہاراجہ بالکرشن بہادر کے حق میں موقوف کیے گیے۔ نجم (۵: ۳۳) سے ظاہر ہوتا ہے کہ زخمی یکسر موقوف نہیں کیے گیے تھے، بلکہ انھیں وزارت کی میر منشی گری (جو دیوانی سے کم رتبہ ہے) پیش کی گئی تھی، جو انھوں نے قبول نہیں کی۔ چنانچہ یہ عہدہ راجہ کندن لال کو دے دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱ رجب ۱۲۵۸ھ (۱۹ اگست ۱۸۴۲ء) کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد زخمی کا دربارِ اودھ سے پشتہا پشت کا تعلق ختم ہو گیا۔ اگرچہ قاموس نے لکھا ہے کہ زخمی "واجد علی شاہ کے زمانے میں وزیر تھا" مگر یہ نا ممکنات سے ہے۔[۸] سلطان التواریخ مصنفۂ زخمی کو ۱۲۵۸ھ تک کے شاہانِ اودھ کے حالات پر ختم کرنے کے بھی یہی معنی ہیں۔ زخمی کا اس کے ۹ سال بعد ۱۲۶۷ھ

۸۔ قاموس نے بریلی کو بھی رائے بریلی لکھا ہے، جو ٹھیک نہیں۔

میں انتقال ہوا۔

تصانیف | زخمی عالمِ علومِ طبیعہ، ماہرِ ریاضیات، ادیب اور شاعر تھے ان کی تصانیف سے متعلق ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ تاہم جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ سلطان التواریخ: یہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۴۲ء) میں لکھی گئی تھی۔ اس میں آغازِ سلطنت سے ۱۲۵۸ھ تک کے شاہانِ اودھ کے حالات ہیں۔ کتاب فارسی میں ہے۔ ہماری نظر سے نہیں گزری، شاید شائع نہیں ہوئی (ادبیات: ۲۰۳)

۲۔ شرحِ گلِ کشتی: یہ میر نجات کی مشہور مثنوی "گلِ کشتی" کی شرح ہے۔ ایک قدیم قلمی نسخہ میرے پیشِ نظر ہے۔ شرح کا آغاز قتیل کی اجازت و ارشاد پر ۱۲۳۰ھ میں ہوا اور [illegible] شعبان ۱۲۳۴ھ کو [illegible]۔ زخمی کا نام اس طرح درج ہے: "رتن سنگھ زخمی تخلص ابن رائے بال رام ابن راجہ بھگوان سہائے"۔[9] چھوٹی تقطیع کے ۱۸۴ صفحے ہیں۔

۳۔ حدائق النجوم: زخمی کی نہایت معرکہ آرا کتاب ہے۔ یہ ریاضیات میں ہے۔ اب تک عربی درسگاہوں میں مستند ہے (ندوی)۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں محمد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اس کے ۶۵ جزو ہیں۔ انگریزی کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے (ادبیات: ۳۱۹) یہ کتاب بھی ہماری نظر سے نہیں گزری۔

۹۔ یہ سہو کاتب ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ راجہ بھگوان داس اپنے خاندان میں راجہ بھگوان سہائے کے نام سے جانے جاتے ہوں کیونکہ یہ نسخہ بخطِ مصنف معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ انیس العاشقین : یہ فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے۔ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ہمیں اس کے دو قلمی نسخوں کا علم ہے : ایک لکھنؤ میں ہے، دوسرا لاہور میں۔ یہ معلوم نہیں کہ نسخے مکمل ہیں یا ناقص۔ اس سے متعلق نگار کے تذکروں کا تذکرہ نمبر (۳۵۰) پر مندرجہ ذیل اندراج ملتا ہے :

انیس العاشقین، رتن سنگھ زخمی لکھنوی، ۱۲۴۵ھ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

۵۔ دیوان فارسی : زخمی بادۂ شیراز کے متوالے تھے۔ میرزا قتیل کے چہیتے شاگرد تھے استاد کے انتقال کے بعد ۳۴ سال زندہ رہے، اور بہت سی زبانوں خاص کر فارسی میں بڑا نام پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب وغیرہ کچھ ناموں کو چھوڑ کر اس عہد کے چند بہترین فارسی انشار پردازوں، ادیبوں اور شاعروں میں ان کا شمار تھا۔ اگرچہ بشاش اور برق نے لکھا ہے کہ دیوانِ زخمی چھپا ہوا موجود ہے، مگر جہاں تک ہمیں علم ہے، ان کا دیوان طبع نہیں ہوا۔ البتہ ان کے دیوان کے دو قلمی نسخے موجود ہیں ایک پٹنہ لائبریری میں ہے (لندن) اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لائبریری، چنڈی گڈھ میں۔ میں نے دسمبر ۱۹۷۲ء میں چنڈی گڈھ میں یہ خطی دیوان شروع سے آخر تک دیکھا تھا۔ مخطوطہ ضخیم ہے، مرصع و مطلا؛ اور بہت اچھی حالت میں ہے۔ سرورق کی لوح پر اور خاتمے پر ایک مہر ثبت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء-۱۹۱۰ء) میں میرٹھ کے کسی شیخ احسان الحق قادری کے کتابخانے کی زینت تھا۔

دیوان میں قتیل، فغانی، صائب کی غزلوں پر مخمسات ہیں۔ دو مسدس بھی ہیں۔ ۳۶ کے قریب رباعیاں ہیں۔ باقی تمام غزلیں ہیں۔ صفحات پر نمبر موجود نہیں۔ زخمی اچھا کہنے والے تو تھے ہی، اس لیے تمام کلام اوسط درجے کی شاعری سے بہر حال بلند ہے۔ بقول ادبیات (ص ۲۲۳) مخمسات بہت دلچسپ اور شیریں ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم نے حال ہی میں اس دیوان کے جن اجزا کا عکس چنڈی گڈھ سے حاصل کیا، اس میں آغاز اور خاتمے کے علاوہ، دوسرا بہت سا کلام تو ہے، مگر کسی مخمس کا عکس

موجود نہیں، اس لیے کوئی مخمس بطور نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ دیوان کا پہلا شعر یعنی غزل کا مطلع یہ ہے:

اے غازہ زنامِ تو برخِ شاہدِ فن را　　　　پیرایہ ز وصفِ تو عروسانِ سخن را

اور آخری شعر راجہ بھگوان داس کے قطعہ تاریخ وفات کا ہے (مادّہ "شہادت یافت") جو پہلے دیا جاچکا ہے۔

۶۔ اردو اشعار: زخمی گاہے ماہے اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ برق کے ذریعے چار اردو شعروں کا علم ہوا ہے۔ پہلے شعر کو چھوڑ کر جو اس عہد کی سنگلاخ زمینوں کی دین ہے، باقی تین شعر اس بات کے مظہر ہیں کہ اگر وہ اردو میں بھی شعر کہنا چاہتے، تو اچھا کہہ سکتے تھے:

زرباف آج ان کو میسر ہے، اے فلک!　　　　کل تک نہ جن کو آتا تھا، بُننا نواڑ کا

آنسوؤں سے ہوئی سرسبز میری کشتِ مراد
ابر کیا چیز ہے، اور بارشِ باراں کیا ہے!
جُز ترے در کے یہ سب ہیچ ہے، میں جاؤں کہاں
بزمِ زُہّاد ہے کیا، محفلِ رنداں کیا ہے
جا گزیں جس کے وہ دل میں ہو، نہ پوچھو اس سے
راحتِ وصل ہے کیا، اور غمِ ہجراں کیا ہے

استدراک

(۱) مقالاتِ سلیمان حصہ دوم مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

(ص ۴۸) "منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنؤ، قوم کایستھ، اس کا خاندان تین پشت سے دربارِ اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا... اس کا دادا راجہ

بھگوان داس آصف الدولہ کا ایامِ شاہزادگی میں اتالیق تھا، اور عہدِ حکومت میں دیوان تھا۔ رتن سنگھ نے منجملہ اور تصنیفات کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہانِ اودھ کی تاریخ میں لکھی۔ ۱۲۸۰ھ میں ساٹھ برس کی عمر میں یہ کتاب اس نے ختم کی۔"

(ص ۸۳) "۱۱۹۷ھ میں ... پیدا ہوا ... لکھنؤ کی درسگاہوں کی آغوش میں اس کے فضل و کمال نے نشو و نما پایا۔ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور انگریزی زبان سے واقفیت تھی۔ علمِ ہیئت میں اعلیٰ استادی کا رتبہ حاصل تھا۔ فارسی شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتا تھا کچھ دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی۔ اس کے بعد اودھ میں اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا۔ محمد علی شاہ کے زمانے میں دیوانِ شاہی مقرر ہوا اور فخر الدولہ، دبیر الملک، ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا۔

۱۲۵۲ھ میں محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت میں حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب فارسی زبان میں لکھی جو ۶۵ جز میں جا کر ختم ہوئی ہے۔ جدید مغربی تحقیقات کو پرانے عربی معلومات سے اس نے پیوند دیا ہے۔ یہ کتاب اپنے باب میں نہایت مستند اور معرکۃ الآرا سمجھی جاتی ہے اور اب تک علمائے اسلام میں ہیئت کی اعلیٰ کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔"

(۲) فارسی کے ہندو تذکرہ نگار۔ توحید عالم (آج کل اکتوبر ۱۹۷۶ء)

(ص ۳۸) "... کنور رتن سنگھ زخمی ... بریلی کا باشندہ تھا ... زخمی کا دادا راجا بھگوان داس نواب آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۹-۱۲۱۲ھ) کا دیوان اور اتالیق رہا اور بعد میں بریلی کا ناظم ہوا۔ اس کا باپ رائے بالک رام صبوری تخلص کرتا تھا، اور مہاراجا جھاؤ لال کے نائب کی حیثیت سے نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں میر آتش کے عہدے پر فائز تھا ... آصف الدولہ کا دیوان بھی رہا اور ۱۲۱۱ھ میں ... پٹنہ گیا۔ اس کے فوراً بعد نواب آصف الدولہ کی وفات واقع ہوئی (۱۲۱۲ھ) اور بالک رام نے شاہی ملازمت ترک کر دی اور ہندستان کے مختلف شہروں اور مقامات پر پریشانی اور بدحالی کی صورت میں سرگرداں و آوارہ رہ کر ۱۲۶۰ھ میں اس

دنیا سے رخصت ہو گیا۔

رتن سنگھ زخمی کی ولادت ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ کو بمقام لکھنؤ ہوئی"... زخمی نے ہندستان کے اکثر شہروں کی سیر کی۔ سب سے پہلا سفر اس نے لکھنؤ سے بریلی کا کیا۔ اس کے بعد ۱۲۱۸ھ میں کلکتہ گیا اور وہاں کئی سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے وابستہ رہا۔ ۱۲۳۰ھ میں زخمی لکھنؤ واپس آکر شاہِ اودھ کی سرکار میں ملازم ہو گیا۔ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ – ۱۸۲۷ء) اور اس کے بیٹے نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء – ۱۸۳۷ء) کے عہد میں زخمی منشی الملوک کے لقب سے ملقب ہو کر اس خدمت پر مامور رہا.... محمد علی شاہ کے زمانے میں (۱۸۳۷–۱۸۴۲ء) ریاست کا دیوان ہو کر "مہاراجا" کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد وزارت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوا۔

" زخمی کی وفات ۱۲۶۷ھ میں واقع ہوئی۔

" دیوان (فارسی) کا واحد مخطوطہ لاہور یونیورسٹی (پاکستان) کی ملکیت ہے.... زخمی کی جن تالیفات کا علم ہوتا ہے، وہ یہ ہیں :

۱۔ جامِ گیتی نما ؛ ۲۔ حدائق النجوم ؛ ۳۔ شرحِ گلشنی ؛ ۴۔ سلطان التواریخ مولفہ

۱۱۔ زخمی کے سالِ ولادت پر پہلے صفحات میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر محمد توحید عالم نے یہ تاریخِ ولادت " تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" چاپ تہران سے نقل ہے اور مؤلف "تذکرہ نویسی ....." اپنا ماخذ انیس العاشقین، سلطان التواریخ، صبحِ گلشن اور سٹوری کو بتاتا ہے۔ انیس العاشقین اور سلطان التواریخ ہم نے نہیں دیکھے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انیس العاشقین میں زخمی نے اپنی تاریخِ ولادت نہیں دی۔ اور قوی امید ہے کہ سلطان التواریخ میں بھی نہیں دی ہو گی۔ کیونکہ اگر دی ہوتی تو سٹوری اپنی کتاب میں صرف سالِ ولادت کیوں دیتا۔ صبحِ گلشن میں تاریخِ ولادت سرے سے ہے ہی نہیں۔ تاہم اگر یہی تاریخِ ولادت خود زخمی نے کہیں بیان کی ہو تو اسے بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر دولت سنگھ شکری پسر رتن سنگھ زخمی کے سالِ ولادت ۱۲۰۰ھ کے ہوتے اس کا کیا امکان رہ جاتا ہے کہ زخمی ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں۔

۱۱۵۸ھ (۱۲۵۸ھ)؛ ۵۔ دیوان فارسی؛ ۶۔ انیس العاشقین (تذکرہ) انیس العاشقین کی تالیف ظاہرا ۱۲۴۵ھ میں ہوئی۔ لیکن درحقیقت یہ تذکرہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا۔

"تذکرے کے دو حصے ہیں ... شعراء کی مجموعی تعداد دو ہزار سے کچھ زیادہ ہے ... مقدمہ میں نصیر الدین حیدر شاہ کی مدح ہے اور اسی کے نام کتاب منسوب ہے۔ پہلی جلد کی ابتدا آبرو سے ہوتی ہے اور آخری شاعر ضیائی ہے۔ دوسری جلد میں پہلا شاعر طالب جاجری اور آخری یونس ابہری ہے۔"

"شعراء کے حالات اور اشعار بہت مختصر ہیں، اور اکثر جامع ہیں۔ اپنے اشعار کا انتخاب ۷۳ صفحات میں یعنی تمام شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جیسا کہ مقدمہ میں مولف نے لکھا ہے اکثر اشعار غزلوں اور رباعیوں سے ہی لیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں قصیدہ اور مثنوی کے بھی اچھے اشعار منتخب ہوئے ہیں۔"

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ادارہ ہے، جس کی بنیاد بھارت سرکار نے ۱۹۵۴ء میں رکھی تھی۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کا اہم مقصد ہے، ہندستانی زبانوں کی ادبی ہلچل میں تال میل اور ترقی کرنا، اور ترجموں کے ذریعہ کئی ہندستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساہتیہ اکاڈمی نے ایک لمبی چوڑی پبلیکیشن اسکیم ہاتھ میں لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کی اہم اردو مطبوعات:

۱۔	ترجمان القرآن- مولانا ابوالکلام آزاد (چار جلدیں) فی جلد	22.00
۲۔	خطبات آزاد "	18.00
۳۔	غبار خاطر "	15.00
۴۔	ہیملٹ (ڈراما) شکسپیر، مترجم فراق گورکھپوری	10.00
۵۔	پریم چند پرکاش چندر گپت، مترجم ل۔ احمد اکبر آبادی	2.50
۶۔	تاریخ بنگلہ ادب شو کمار سین، مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ	25.00
۷۔	آدم خور (ناول) نانک سنگھ، مترجم پرکاش پنڈت	15.00
۸۔	گورا (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم سجاد ظہیر	10.00
۹۔	کلموہی (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم عابد حسین	7.50
۱۰۔	اپنی کہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن	12.50

ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱

مالک رام

وفیات

تحسین سروری امیر کاظم علی

ان کے خاندان کا حیدرآباد (دکن) کے اچھے خاصے زمینداروں میں شمار تھا؛ کچھ موروثی جاگیر بھی تھی لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تحسین کے والد میر سرور علی سے پہلے ہی خالصے لگ چکا تھا۔ کچھ معمولی رقبہ بچا تھا، جسے وہ سینے سے لگائے رہے؛ اور کسب معاش کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ تحسین اسی خاندانی جاداد ہی پر ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو ایک اضافاتی گاؤں قطب پلی کے پرائیوٹ اسکول میں بھیج دیے گئے، جہاں تلگو کے سوا اور کچھ پڑھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ پرائمری کے درجوں کے بعد ملدے لگے، اور یہاں دسویں کی سند لی۔ اسی زمانے میں والد کا انتقال ہو گیا جس سے نہ صرف آیندہ اعلیٰ تعلیم کا خواب منتشر ہو گیا، بلکہ اب شرکا نے آبائی جاداد کے بارے میں مقدمہ بازی شروع کر دی۔ کئی برس اسی میں ضائع ہو گئے، اور مال زیر باری اس پر مستزاد۔ جب اس مخمصے سے نجات ملی اور سانس لینے کے قابل ہوئے، تو انھوں نے ادیب فاضل (اردو) اور منشی (فارسی) کے امتحانات پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کر لیے۔

گھر کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ دن تک کچھ کمانے کی فکر سے بے نیاز

رہتے۔ اولاً نظام شوگر فیکٹری میں ملازمت ملی لیکن محض کلرکی ان کے بس کی
بات نہیں تھی، مزاج ادبی ڈھب کا تھا۔ اس لیے جلد ہی وہاں سے علیحدگی
اختیار کرلی اور دکن نیوز سروس میں ملازم ہوگئے۔ اسی زمانے میں ہفت روزہ
"آزاد" اور "دورجدید" کے ادارۂ تحریر سے بھی تعلق پیدا کرلیا۔ یہاں سے
ایک قدم آگے بڑھے، تو دکن ریڈیو کے براڈکاسٹنگ سکشن میں مسودہ نگاری اسامی
مل گئی۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت نظمیں لکھیں، جو روزانہ ریڈیو سے نشر ہوتی
تھیں۔ حیدرآباد کا پولیس ایکشن اسی زمانے میں ہوا۔ ریاست کے ہندوستان کے
ساتھ شامل ہوجانے کے بعد وہ جنوری ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے راستے جہاز سے کراچی
چلے گئے۔
کراچی میں بھی اولاً ریڈیو ہی میں ملازمت ملی۔ یہاں مسودے (اسکرپٹ) لکھنے اور
گانے والوں اور داویوں کو صحیح تلفظ سے کلام پڑھانے کی خدمت، ان کے سپرد
ہوئی۔ دو سال بعد اپریل ۱۹۵۱ء میں وہ انجمن ترقی اردو میں ملازم ہوگئے۔ دراصل
یہی وہ زمانہ ہے، جس نے انھیں شاعر سے نثر نگار بنا دیا۔ یہاں انھیں مولوی
عبدالحق (ف: اگست ۱۹۶۱ء) اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (ف:
اگست ۱۹۵۵ء) کی صحبت میسّر آئی۔ دونوں جس پایے کے ادیب اور ادب گر
تھے، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحسین نے شاعری ترک کردی، اور
تحقیقی مضامین لکھنے لگے، مطالعے کا دامن بھی وسیع تر ہوگیا۔
وہ اولاً ۱۹۵۴ء میں اعزہ و احباب سے ملنے کو حیدرآباد آئے تھے۔ پانچ مہینے یہاں
ٹھہرے اور واپس کراچی چلے گئے۔ دوسری مرتبہ جنوری ۱۹۵۹ء میں آئے۔ اب
کے کچھ ایسا پیچ پڑا کہ وہ واپس نہ جا سکے؛ ڈھائی سال تک یہاں سے نکلنے کی صورت
نہ بن سکی، بلکہ ان پر غیر قانونی طور پر قیام کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا، اور چار مہینے
کی قید بھگتنا پڑی۔ خدا خدا کرکے کہیں اگست ۱۹۶۱ء میں واپس جانا نصیب
ہوا۔

اب کے کراچی میں کہیں جم کر کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ رسالوں میں مضمون نگاری سے کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ آخر گلڈ کے ماہنامے "ہم قلم" میں جگہ ملی، ساتھ ہی انجمن ترقی اُردو میں بھی جز وقتی کام مل گیا۔ بہت دن بعد وہ انجمن کے شعبۂ مطبوعات سے مستقلاً وابستہ ہو گئے۔

انھیں مدت سے سانس کا عارضہ تھا۔ کثرت کار اور مالی بے اطمینانی کے باعث کبھی جم کر علاج نہ کرا سکے۔ اسی میں اچانک ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ ان کی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ان سے یادگار ہیں۔ افسر امروہوی نے ہجری میں تاریخ کہی: بسوے جناں رفت تحسین آہ (۱۳۹۶ھ)
عیسوی تاریخ بھی انھیں کی کہی ہوئی ہے:

پائی وفات نج کے جینے میں یک بیک کس درجہ خوش نصیب ہیں تحسین سروری
افسر نے عیسوی میں کہا مصرع وفات "جنت نشین لبیب ہیں تحسین سروری"
(۱۹۷۶)

جب تک حیدرآباد میں رہے، ان کا شمار وہاں کے خوش گو نوجوان شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کے خاندان میں شعر و سخن کا چرچا تھا، اسی سے انھیں بھی شعر کہنے کی تحریک ہوئی۔ تحسین تخلص رکھا، اور چند رے تحسین حیدرآبادی کے نام سے لکھتے رہے۔ بعد کو تخلص کے ساتھ کوئی دُم چھلا لگانے کا خیال آیا تو اپنے والد (میر سرور علی) کے نام کی رعایت سے "تحسین سروری" ہو گئے۔ انھوں نے شوکت بلگرامی (تلمیذ امیر مینائی) کے ایک شاگرد رشید سے کلام پر اصلاح لی تھی۔
کراچی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے بعض پرانی کتابیں مرتب کر کے شائع کی تھیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:-

مسدس رنگین (سعادت یار خان)؛ چند ہم عصر (مولوی عبدالحق)؛ قادر نامۂ غالب؛ معراج العاشقین (گیسو دراز)؛ پری خانہ (واجد علی شاہ) مضامین کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہے۔

عبدالماجد دریابادی، مولانا

دریاباد اترپردیش کا مشہور اور قدیم قصبہ، لکھنؤ سے فیض آباد جانے والی ریلوے لائن پر ان دونوں کے عین وسط میں کوئی ۹۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قصبہ غالباً پندرھویں صدی میں شاہانِ شرقی کے ایک صوبیدار دریاخان نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ اسلامی دور کے بعد مدتوں انگریزی عہد میں بھی دریاباد ضلع کا صدر مقام رہا۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بہت مضر تھی۔ شہر نشیب میں واقع تھا، اس لیے برسات کے موسم میں یہاں ہر طرف بہت پانی جمع ہو جاتا تھا جس سے بعد کو ملیریا دبائی شکل میں پھیل جاتا۔ انگریزوں نے اولاً ضلع کا صدر مقام نواب گنج بنایا اور بعد کو ضلع بھی بارہ بنکی قرار دے دیا، اور دریاباد کی حیثیت محض ایک قصبے کی سی رہ گئی۔

دریاخان نے جب یہ قصبہ آباد کیا، تو اسی کے ساتھ اس نے ایک عارفِ کامل حضرت شیخ محمد کو اس جگہ کے قریبی قصبے محمود آباد سے یہاں آنے کی دعوت دی۔ حضرت شیخ صاحبِ کشف و کرامات تھے، ان کے حالات متعدد تذکروں میں محفوظ ہیں۔ چونکہ وہ بالعموم کنوئیں سے پانی بھر بھر کر لوگوں کو پلاتے رہتے اور نمازیوں کو وضو کراتے تھے، اس سے ان کا لقب "مخدوم آبکش" پڑ گیا۔ ان کا انتقال ۸۸۴ھ میں ہوا۔ "آفتابِ کشف" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ یہی حضرت مخدوم آبکش، مولانا عبدالماجد دریابادی کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان کا مزار بھی مولانا دریابادی کے جدّی مکان کے متصل موجود ہے۔ ان کے خاندان کے افراد کو "مخدوم زادگان" بھی انھیں کی نسبت سے کہتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے مشہور فوجی ہنگامے میں شمالی ہندستان کے متعدد علما بھی معتوب ہوئے تھے۔ ان میں بیشتر پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے جہاد کا فتویٰ دے کر افواج اور عوام کو حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔ انھیں علما میں مولانا مفتی مظہر کریم (بن مولوی غلام بخش) بھی تھے۔ انھیں بھی توسان کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ وہاں مولانا فضل حق خیرآبادی اور قاضی عنایت احمد (مصنّف تواریخ حبیب الٰہ) اور بعض دوسرے علما پہلے سے موجود تھے،

وفیات

ایک سے ایک بڑے عالم اور صاحبِ قلم ۔ مفتی مظہر کریم نے اس جلا وطنی کے زمانے میں ابن عربی کی کتابِ جغرافیا "مراصد الاطلاع" کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ وہ وہاں حکومت کے دفتر میں (بطور مشقت) کچھ محرری کا کام بھی کرتے تھے ۔ اس "خوش اطواری" کے باعث قید کی میعاد میں کچھ تخفیف ہو گئی اور انھیں پونے سات برس بعد رہا کر دیا گیا ۔ ۱۸۶۵ء میں جزیرۂ انڈیمان سے وطن واپس آئے۔

یہی مفتی مظہر کریم، مولانا عبدالماجد دریابادی کے دادا تھے ۔ ان کا ۱۰ شعبان ۱۲۸۹ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۷۲ء) کو انتقال ہوا۔ "دخل جنات النعیم" سے ہجری تاریخِ وفات نکلتی ہے ۔ ان سے بڑے بھائی مولوی حکیم نور کریم تھے، جو اپنے عہد کے مشہور حکیم اور طبیب اور "طبیب گر" تھے۔ طب کے علاوہ ادب میں بھی کئی مشہور اشخاص ان کے شاگرد تھے مثلاً عماد الملک سید حسین بلگرامی، شمس العلما سید علی بلگرامی، وغیرہ ۔ وہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ کئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ۔ ان میں سے بہت سی ان کے خاندان میں آج تک موجود رہیں۔ وہ جمعہ ۶ رجب ۱۲۸۸ھ (۲۲ ستمبر ۱۸۷۱ء) کو اللہ کو پیارے ہوئے ۔ یہ مولانا عبدالماجد کے نانا بھی تھے۔

منجھلے بھائی حافظ مرتضیٰ کریم بڑے عالی ہمت بزرگ تھے ۔ ان کی خوشنویسی کا خاص طور پر شہرہ تھا۔ روایت ہے کہ وہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے ۔ بمبئی پہنچے، تو خدمتگار نے مال و متاع کے لالچ میں انھیں زہر دے دیا اور جو کچھ پاس تھا، لے کر چمپت ہو گیا۔ بارے ان کی جان بچ گئی۔ لیکن اس قلاشی کے عالم میں بھی ہمت نہیں ہارے ۔ وطن واپس آنے کی بجائے وہیں بمبئی میں ملازمت کر لی، اور دو تین برس میں زادِ راہ فراہم کر کے پھر حج کے لیے روانہ ہو گئے ۔ غرض بڑے عالی حوصلہ اور صاحبِ عزم انسان تھے ۔

سب سے چھوٹے بھائی کرم کریم عرف چھیدا میاں تھے ۔ وہ خاندانی زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ ان کا انتقال ۲ دسمبر ۱۸۷۹ کو ہوا۔ دریاباد ہی میں مدفون ہے۔

مفتی مظہر کریم کے دو صاحبزادے ہوئے : بڑے عبدالرحیم، چھوٹے عبدالقادر۔ عبدالرحیم بڑے ہر فن مولا شخص تھے۔ پیشے کے اعتبار سے جون پور کلکٹری میں نقل نویس تھے۔ لیکن اس کے علاوہ فارسی کے ادیب اور اردو کے مزاح نگار بھی تھے، کاغذ کے بیل بوٹے بڑے خوبصورت بناتے تھے، پھول قینچی سے تراش کر بناتے ۔ بڑے نیک بزرگ تھے، اپنے خرچ سے دوائیں تیار کر کے مفت

تقسیم کرتے۔ آخر عمر میں نوکری سے مستعفی ہوکر وطن آگئے اور آبائی زمینداری پر بسر اوقات کرنے لگے۔ وہیں دسمبر ۱۸۹۷ء میں انتقال ہوا۔

چھوٹے عبدالقادر اس سلسلۃ الذہب میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک ہوتے۔ اپنی دل و دماغ کی خوبیوں کے باعث، وہ ایک مستقل سوانحعمری کے مستحق ہیں۔ مئی ۱۸۴۸ء میں دریاباد میں پیدا ہوئے تھے۔ مختلف علماے فرنگی محل سے تکمیلِ تعلیم کے بعد انگریزی پرائیویٹ طور پر پڑھی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس پیشے میں جھوٹ بولنے سے مفر نہیں، تو اسے اختیار کرنے سے انکار کردیا، اور عربی فارسی پڑھانے کو ترجیح دی۔ بعض انگریز حکام بھی ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ انھیں صاحبِ اثر تلامذہ میں سے ایک قدردان افسر نے خوش ہوکر انھیں سررشتہ دارِ عدالت مقرر کرادیا۔ آدمی تھے ذہین اور محنتی، اس پر بے حد فرض شناس اور دیانت دار۔ حکامِ اعلیٰ نے جوہرِ قابل دیکھا، تو انھیں ترقی دےکر تحصیلدار بنادیا۔ اور ترقی ہوئی، تو ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوگئے، یہ عہدہ اس زمانے میں کسی ہندستانی کے لیے گویا معراجِ کمال کے مرادف تھا۔ بڑی عزت و آبرو سے زمانۂ ملازمت بسر ہوا۔ پانسو روپے ماہانہ پنشن پر ۱۹۰۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے ارضِ حجاز کی راہ لی۔ ۱۱ ذی الحجہ (۱۳۳۰ھ) کی شام منیٰ میں ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور تین دن بعد (۱۴ ذی الحجہ / ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء) عین صبح صادق کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مکۂ معظمہ کے مشہور قبرستان "جنت المعلیٰ" میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق سے آخر ہی پائینی آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے دیرینہ دوست اکبرالہ آبادی نے قطعۂ تاریخ کہا:

پیشواے قوم، والا مرتبت	شیخ عبدالقادرِ عالی صفات
آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ	سمجھے تھے دنیاے دوں کو بےثبات
جاہ و منصب میں وہ گو ممتاز تھے	کرتے تھے یادِ خدا، دن ہو کہ رات
ان کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر	"شغل" ہی میں نکلی تاریخِ وفات (۱۳۳۰)

ڈپٹی عبدالقادر کا نکاح اپنے بڑے چچا مولوی حکیم محمد کریم کی صاحبزادی نصیرالنسا کے ساتھ ہوا تھا (وفات، اپریل ۱۹۴۱ء)۔ (۱۰) میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے، بڑے عبدالمجید ۱۸۸۶ء

میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج، لکھنؤ سے ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کی سند لی اور اس کے بعد نائب تحصیلداری سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۹۲۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ یوپی کے متعدد اضلاع میں نیکنامی سے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں پنشن پائی، اور ۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ کو واصل بحق ہوئے۔

مرحوم کو اپنی خاندانی روایت کے مطابق ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ انگریزی عہد میں بھی حکومت ہر سال کی کارگزاری کے کوائف ایک انگریزی یا بعنوان "انڈیا" نشر کیا کرتی تھی۔ اس کا ترجمہ منجملہ دیگر زبانوں کے اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی دو سال کی جلدوں کا اردو ترجمہ انھیں مولوی عبدالمجید کا کیا ہوا تھا۔

ڈپٹی عبدالقادر کے چھوٹے بیٹے عبدالماجد تھے، جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے دور و نزدیک ایسے مشہور ہوئے کہ "مولانا دریابادی" گویا ان کا علم ہو گیا۔ ان کی ولادت وسط مارچ[۵] ۱۸۹۲ء میں دریاباد میں ہوئی۔ رسم دستور خاندان، پانچویں برس کی بسم اللہ کا تھا، لیکن طے پایا کہ ان کی بسم اللہ چوتھے برس ہی کر دی جائے۔ یہ ۱۸۹۵ء کی بات ہے۔ ان کے والد ڈپٹی عبدالقادر اس زمانے میں ضلع لکھیم پور کھیری میں تعینات تھے۔ وہیں یہ تقریب عمل میں آئی۔ اس کا واقعہ انھوں نے خود ایک جگہ بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

> ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات و خوش صفات عالم صاحب جو بھائی صاحب (عبدالمجید) کی اتالیقی پر مامور تھے، وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے۔ مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب بچارے نے پیار اور شفقت کے لہجہ میں کہا کہو بسم اللہ۔ یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ سب نے اپنی والی سمجھائی بجھائی۔ لیکن اس ضدی یا شرمیلے لڑکے کی زبان پر بدستور قفل لگا ہوا تھا۔ وہاں مرحوم کو آخر غصہ آیا اور

---

[۵] ہجری تقویم کی رو سے شعبان ۱۳۰۹ھ تھا۔ وہ خود تاریخ کبھی ۱۵، کبھی ۱۶، کبھی ۱۷ لکھتے رہے؛ آخری مرتبہ ۱۶ لکھی تھی۔ حسن اتفاق سے یکم مارچ بھی یکم شعبان کو تھی۔

کب تک نہ آتا، سمجھانے، بجھانے، چمکارنے کی حد ہو چکی تھی۔ چھڑی ہاتھ
میں لے، انہوں نے جمانا شروع کر دی۔ لوگوں نے آمین آمین کر کے کسی طرح جان
بچائی۔ چلمنوں کی آڑ سے والدہ و ہمشیرہ یہ دردناک تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ تیرہ
اندر بلایا، سمجھایا، آخر بس جو میری کھائی تھیں، ان بوا بچاری نے کہا:
میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا نہیں آتا؟ لڑکے نے کہا: آتا کیوں نہیں!
اور بس ان کے ساتھ جا، مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انہیں
کڑک کر سنا آیا۔ اداسی خوشی سے بدلی، چہروں پر ہنسی اور مسکراہٹ
آ گئی۔ اسی کو کہتے ہیں: ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو۔

حسب رواج تعلیم نجی طور پر ہونے لگی اور یہ زیادہ تر فارسی اور عربی تک محدود رہی۔ اردو
کی حیثیت محض ذیلی تھی۔ جب ناظرہ قرآن ختم کر لیا اور عربی فارسی میں بھی چل نکلے، تو سیتا پور
گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ عربی کا اصلی اور دیرپا شوق یہیں کے ایک معلم مرزا
محمد ذکی مرحوم کے بہت بڑھانے سے پیدا ہوا، اس کی پختگی مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی کی
شاگردی میں پیدا ہوئی۔

تعلیمی دوریوں تو ٹھیک رہا اور سب درجوں میں کامیاب بھی ہوتے رہے، لیکن ریاضی
و حساب میں کمزور تھے۔ بہرحال ۱۹۰۸ میں میٹرک کی سند لی اور اسی سال کیننگ کالج
لکھنؤ میں داخلہ ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں بی اے کی سند دوسرے درجے میں ملی اور اب
ایم اے (فلسفہ) کی تیاری ہونے لگی۔ علی گڑھ کالج پہنچے۔ پہلے سال کا امتحان الٰہ آباد
یونیورسٹی سے دیا (علی گڑھ میں ہنوز یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی، اور یہاں کے طلبہ
الٰہ آباد جا کر امتحان میں بیٹھتے تھے) بدقسمتی سے امتحان میں ناکام رہے۔ اس کے بعد دلی کے
سان سٹیفنس کالج میں داخل ہونے کہ یہاں سے ایم اے کریں گے۔

نومبر ۱۹۱۲ء میں والد کا انتقال ہو گیا تھا اور یوں خاندان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ جاتا رہا تھا
تھوڑا بہت جو پس انداز ہوا تھا، وہ پیپلز بنک (لاہور) میں جمع تھا۔ بدقسمتی سے یہ بنک
ٹوٹ گیا اور یوں ان کی ساری پونجی اس میں ڈوب گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد تعلیم

کے جاری رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یوں بھی انہیں دلّی کی آب و ہوا راس نہ آئی
لکھنؤ کی صحبتیں اور یادیں نیند حرام کیے ہوئے تھیں بنک کا ٹوٹنا گویا اونگھتے کو ٹھیلتے کا
بہانا ہو گیا! یہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر وطن آ گئے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے
ٹوٹ گیا۔

بارے، مولوی عبدالحق سکتر انجمن ترقی اردو (ف: اگست ۱۹۶۱ء) نے دستگیری کی، انھوں
نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے کا کام دے دیا۔ تاریخ اخلاقِ یورپ (ترجمہ لیکی)
اسی عہد کی کتاب ہے۔ "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" بھی اسی زمانے میں
تالیف کیں۔ یہی زمانہ ہے، جب مولانا شبلی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۱۴ء) نے سیرۃ النبی
کی تالیف کی داغ بیل ڈالی۔ سیرت پر انگریزی میں جو ذخیرہ ہے، اسے کھنگالنے اور
اس میں سے متعلقہ مقامات کے اخذ و ترجمہ کا کام انھوں نے عبدالماجد صاحب کے
سپرد کیا، اور اس کے لیے پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر دیا۔ غرض اس طرح کام
چل نکلا اور بیکاری کی کوفت سے بچ گئے۔

۱۹۱۶ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) نے جو اس زمانے میں
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکتر تھے، انھیں بطور ادبی معاون علی گڑھ طلب کر لیا،
۱۰۵ روپے مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن کسی وجہ سے ان کا دل یہاں بھی نہ لگا۔ دو ہی
مہینے میں خرابیِ صحت کے بہانے سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکیم منظور ہو گئی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ یونیورسٹی کے
مختلف درجوں میں پڑھانے کے لیے نصاب تیار کیا جائے۔ لامحالہ اس میں سوال اٹھا
کہ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کیا جائے۔ کیونکہ اردو میں تو کتابیں تھیں ہی نہیں۔ چنانچہ
مولوی عبدالحق مرحوم کی نظامت میں دارالترجمہ قائم ہوا۔ مولانا عبدالماجد کی ان
سے پرانی یاد اللہ تھی۔ انھوں نے تین سو ماہانہ تنخواہ پر انھیں دارالترجمہ میں مترجم
فلسفہ مقرر کر دیا، اور یہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو حیدرآباد پہنچ گئے۔

ان کا یہ دور مذہبی پہلو سے بقول خود ان کے الحاد و ارتداد کا تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں

کالج میں داخلہ لیا تھا۔ یہاں ان کے دل پسند مضمون فلسفہ اور منطق اور نفسیات تھے۔ چونکہ ان مضامین کا بیشتر ذخیرہ انگریزی میں ہے، انہوں نے انگریزی کتب کا وسیع مطالعہ کیا۔ ان موضوعات کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوتی ہوں اور ان میں جو مہارت پیدا ہوتی ہو، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کا ایک مخفی اور غیر محسوس اثر یہ ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ مذہب سے برگشتہ ہو گئے اور اپنے آپ کو فخریہ "لا ادری" اور "عقلیت پسند" کہنے لگے، اسلام بھی بس برائے نام رہ گیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے "فلسفۂ اجتماع" تالیف کی تھی، جس میں اسلام اور شارعِ اسلام کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا، جو کسی صحیح العقیدہ مسلمان کا اعتقاد نہیں ہو سکتا۔

جب یہ حیدرآباد پہنچے، تو وہاں کی ریاستی فضا میں یوں بھی "بیرونیوں" کے خلاف نزبہ تو موجود تھا ہی، ان کی بیباک گفتگو نے لوگوں کو اور بھی ان سے بدظن کر دیا۔ رہی سہی کسر "فلسفۂ اجتماع" نے پوری کر دی۔ ان کے مخالفین نے محاذ قائم کر کے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حیدرآباد میں رہنا محال ہو گیا، تو جولائی ۱۹۱۸ء میں رخصت پر وطن آ گئے اور یہاں سے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔

لیکن بیکار تو نہیں رہ سکتے تھے۔ مختصر قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں منجملہ اور عمایدکے سرامین جنگ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ سرامین جنگ رشتے میں حضور نظام کے بھائی تھے اور ان کے چیف سکتر(ٹیری) کے طور پر کام کرتے تھے۔ انگریزی کا سارا کام ان کے ہاتھ میں تھا۔ جب ۸-۱۰ مہینے تک اور کہیں روزگار کی صورت پیدا نہ ہوئی، تو انھوں نے "گذارشِ احوالِ واقعی" کے طور پر انھیں لکھا کہ کسی مناسب موقعے پر حضور نظام کی توجہ مبذول کرائیں تاکہ زندگی آسان ہو سکے۔ چند ہفتے بعد سرامین جنگ کا تار ملا کہ حضور نے طلب فرمایا ہے، چلے آئیے۔ یہ پہنچے تو باریابی ہوئی، حضور نظام نے حکم جاری فرمایا کہ حینِ حیات سوا سو ماہانہ کی پنشن منظور کی جاتی ہے۔ حیدرآباد کے قیام کی کوئی شرط نہیں، جہاں جی چاہے، رہیں؛ البتہ آیندہ اپنی تصنیفات کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کریں۔ امین الملک سر مرزا محمد اسمٰعیل کی مدارالمہامی کے زمانے میں

(۱۹۴۲ء) ہوشیار جنگ ہوش بلگرامی (ف: دسمبر ۱۹۵۵ء) کی سفارش پر یہ پنشن بڑھاکر دوسو ماہانہ کردی گئی۔ جب ۱۹۴۸ء میں ریاست کا جمہوریۂ ہند سے انضمام ہوا، تو یہ بند ہوگئی۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) اور پنڈت جواہرلال نہرو (ف: مئی ۱۹۶۴ء) کی ذاتی مداخلت پر دوبارہ جاری ہوئی، لیکن وہی ابتدائی رقم سواسو کی۔ اس کے بعد یہ ان کی وفات تک انھیں لکھنؤ کے خزانے سے ملتی رہی۔

ان کا دورِ الحاد ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ مسٹر عبدالماجد بی اے اور مغربی فلسفے کے ماہر کہلانے پر فخر کرتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے ہندو فلسفے اور یوگ کا مطالعہ شروع کیا۔ بنارس کے مشہور فاضل ڈاکٹر بھگوان داس (ف: ستمبر ۱۹۵۸ء) سے ملاقات اور ان کی تصانیف کے مطالعے نے خیالات کا رخ بدلا۔ والد کے دوست اور خود ان کے بزرگ اکبرالہ آبادی (ف: ستمبر ۱۹۲۱ء) بلطائف الحیل ان کی گمرہی پر ٹوکتے ہی رہتے تھے۔ مولانا محمد علی (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) سے انھیں عشق تھا وہ بھی ڈانٹ ڈپٹ سے گریز نہیں کرتے تھے۔ غرض زمین آہستہ آہستہ تیار ہو رہی تھی کہ کہیں سے مولانا محمد علی لاہوری احمدی (ف: اکتوبر ۱۹۵۱ء) کا انگریزی ترجمہ قرآن ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بحمدہ الحاد کے بادل چھٹ گئے ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ء کے دو سال گویا ایمانی برزخ کا زمانہ تھا۔ اب وہ دوبارہ مسلمان ہوگئے۔ پھر تو اسلام کی بڑی خدمت کی۔ قرآن کے دو دو ترجمے اور تفسیریں (اردو اور انگریزی)، تصوف اسلام، بشریت انبیا، سیرۃ نبوی قرآنی، حیوانات قرآنی، شخصیات قرآنی، مشکلات قرآن ان سے یادگار ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہفتہ وار سچ یا صدق یا صدق جدید بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اس "دوبارہ" مشرف باسلام ہونے کا ان پر جو ردِ عمل ہوا، وہ انہیں دوسرے سرے پر لے گیا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہو سکتا ہے:

بچپن میں انہوں نے اپنے بازو پر نام گدوایا تھا۔ اب جو اسلامی رنگ چڑھا اور مطالعۂ اسلام بڑھا تو ان کی نظر سے وہ حدیث گذری جس میں حضور شارعِ اسلام

علیہ السلام نے بیٹے اور گود دانے والے دونوں پر ناراضی کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ پڑھنا تھا کہ انھوں نے فوراً بازو کے اتنے حصے کی جلد کٹوا دی، جہاں وہ نام لکھا تھا۔ اس سے کتنی اذیت پہنچی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے بطیبِ خاطر برداشت کر گئے۔ شعائرِ اسلام کے احترام کے علاوہ، اس سے ان کی قوتِ ارادی کا بھی غیر معمولی مظاہرہ ہوتا ہے۔

۱۹۲۸ء میں وہ حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی (ف، جولائی ۱۹۴۳ء) کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کی۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ مولانا حسین احمدؒ مدنی (ف: دسمبر ۱۹۵۷ء) سے بیعت کر لیجیے۔ تعمیلِ ارشاد میں انھوں نے حضرت مدنی کی بیعت تو کر لی، لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ انھیں قلبی تعلق حضرت تھانوی ہی سے تھا اور جو کچھ کسبِ فیض انھوں نے کیا، وہ بھی انھیں کی ذات سے۔ اس پر ان کی کتاب ”حکیم الامت: نقوش و تاثرات“ شاہدِ عادل ہے۔

صحت ساری عمر درمیانے درجے کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بری۔ جمعہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو اچانک بعدِ مغرب جسم کے سیدھے حصے پر فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن نہ صرف بنیادی تکلیف رفع نہیں ہوئی، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس حال میں بھی اپنے معمولات نباہنے کی کوشش جاری رہی۔ دو ڈھائی سال اسی طور پر گذرے۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔ بدقسمتی سے وسطِ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وہ حادثہ پیش آیا کہ رات کے وقت لغزشِ پا سے گر گئے، جس سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ابھی پلاسٹر کھلا بھی نہیں تھا کہ وسطِ دسمبر (۱۹۷۶ء) میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا، جس سے زبان اور دماغ دونوں بری طرح متاثر ہوئے۔ اب وہ گویا جسدِ بےجان ہو کے رہ گئے تھے، بیشتر وقت غفلت طاری رہتی۔ جمعرات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کی شب میں (دو بجے) طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور دو گھنٹے بعد سوا چار بجے اپنے خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ نمازِ جنازہ ان کی وصیت کے مطابق بعدِ نمازِ ظہر دارالعلوم ندوۃ العلما کے میدان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی۔ لاش لاری کے ذریعے ان کے وطن دریاباد (ضلع بارہ بنکی) گئی۔ یہاں دوبارہ نمازِ جنازہ

پڑھی گئی۔ شبِ جمعہ ذاتی مکان کے متصل اپنے جدِ اعلیٰ حضرت مخدوم محمد آبکش کے مزار کے پہلو میں الٹے ہاتھ دفن ہوئے۔ یہی ان کی خواہش تھی۔

متعدد اصحاب نے تاریخ کہی۔ میر غلام رسول نازکی (سرینگر) نے آیۂ قرآنی (ورفعنا لک ذکرک) سے ہجری تاریخ نکالی (۱۳۹۷ھ)۔ اس میں بعض اور اصحاب کو بھی توارد ہوا۔

مغیث الدین فریدی نے قطعہ کہا:

تاریخِ رحلتِ بے ہنگام
(۱۹۷۷)
محبِ اسلام حضرت عبدالماجد دریابادی
(۱۹۷۷)

عالمِ دیں، مفسرِ قرآن — مردِ حق، محرمِ رموزِ حیات
اپنے خالق سے جا ملا آخر — چھوڑ کر یہ جہانِ مکروہات
بے "کم و بیش" ہے یہی تاریخ — "پاک دل، پاک ذات، پاک صفات"
(۳۷۸)
۱۳۹۷ = ۳۷۸-۱۷۷۵

اُس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی نسبت بچپن سے والدہ نے ان سے استصواب کیے بغیر خاندان کی کسی لڑکی سے طے کر رکھی تھی۔ جب کالج کے زمانے میں ان پر انگریزیت اور صاحبیت کا غلبہ ہوا، تو انھیں خیال گزرا کہ اگر کہیں اس دیہاتی لڑکی سے شادی ہو گئی، تو زندگی اجیرن ہو جائیگی، جو نہ انگریزی سے واقف، نہ شہر کی بول چال اور رہن سہن سے آشنا! اس کے ساتھ کیونکر کٹیگی! انھوں نے اپنا عندیہ والدہ کے کان تک پہنچا دیا۔ وہ بیچاری پرانے زمانے کی وضعدار قسم کی خاتون، دھک سے رہ گئیں کہ اب میں لڑکی کی والدہ کو منھ کیونکر دکھاؤنگی۔ اس سے بھی بڑھ کر انھیں شبہہ گزرا کہ صاحبزادے کسی کرسٹان لڑکی کے جال میں پھنس گئے ہیں، اور نہیں معلوم، اب کیا گل کھلاتے ہیں! بارے، خدا نے اپنی حفظ و امان میں رکھا۔ انھیں ایام میں انھوں نے کہیں کسی تقریب میں اپنی حقیقی خالہ کی پوتی کو دیکھ لیا۔ لڑکی پڑھی لکھی، شہری معاشرت سے خوب واقف، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اسے دیکھنا تھا کہ یہ جی جان سے اس پر فدا ہو گئے۔ کسی طرح والدہ سے بھی کہلوا دیا۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی بہت خوش ہوئیں، اور فوراً اپنی منظوری دے دی۔ یہ لڑکی بانسے کے رئیس شیخ

یوسف الزمان آنریری مجسٹریٹ کی صاحبزادی تھیں ؛ اس کے بھائی شیخ مسعود الزمان بیرسٹر کالج کے دور میں دو برس تک مولانا عبدالماجد کے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ ان کا نام عفت النسا تھا۔ غرض ہجر کی راتیں جلد کٹ گئیں اور ۴ جون ۱۹۱۶ء کو بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ زندگی بہت اطمینان اور آرام و آسائش سے کٹی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو انتقال ہوا۔

ان سے کئی بچے ہوئے لیکن مشیتِ ایزدی سے صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں: رافت النساء؛ حمیرہ خاتون ؛ زہیرا خاتون ؛ زاہدہ خاتون۔ یہ چاروں علی الترتیب مولانا عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید مرحوم کے چاروں صاحبزادوں، حکیم عبدالقوی (عرف آفتاب احمد)؛ حبیب احمد ایم اے ؛ محمد ہاشم قدوائی ایم اے، پی ایچ ڈی ریڈر شعبۂ سیاسیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی؛ اور عبدالعلیم قدوائی ایم اے، ایل ایل بی کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ سب بفضلہ خوش و خرم ہیں۔

مولانا عبدالماجد نے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ایک مرحوم دوست عبدالرحمن نگرامی کی صاحب اولاد بیوہ سے نکاحِ ثانی بھی کیا تھا۔ لیکن اس سے نبھ نہ سکی، گھر میں بدمزگی رہنے لگی تھی۔ اس لیے مجبوراً چند ماہ بعد جون ۱۹۳۱ء میں اسے طلاق دے دی۔ اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

مولانا دریابادی کی پوری عمر لکھنے پڑھنے میں گزری۔ آغاز قدرتاً پڑھنے سے ہوا۔ شروع میں اچھے برے کی تمیز تو تھی نہیں ؛ جو رطب و یابس ہاتھ لگا، بس پڑھنے لگے۔ آٹھویں درجے میں تھے (۱۹۰۵ء) کہ عیسائیوں کے بعض اعتراضات کے جواب میں ایک رسالہ ہی مرتب کر ڈالا۔ پھر وقت کے مختلف رسائل و جرائد میں مراسلہ نگاری اور مضمون نگاری شروع ہو گئی ـــ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں، ہندستان میں بھی اور انگلستان میں بھی۔ ان کی تصنیفات اور تراجم کی فہرست خاصی طویل ہے : ۶۰ کے قریب کتابیں ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی۔ اپنی سوانحِ عمری بھی لکھی تھی، لیکن وصیت تھی کہ اسے میری زندگی میں شائع نہ کیا جائے۔ اب تک کوئی بات

مانع نہیں رہی، اسے منظرِ عام پر آجانا چاہیے۔

وہ صحافی بھی کچھ کم پایے کے نہیں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے مولوی اسحاق علی ظفر الملک علوی کے ساتھ مل کر ہفتہ وار 'سچ' جاری کیا۔ بوجوہ ۱۹۳۳ء میں اسے بند کرنا پڑا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۳۵ء میں بلا شرکت غیرے خود اسے دوبارہ 'صدق' کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے ہفتے میں دو بار نکلتا رہا، بعد کو ہفتہ وار ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث "صدق" بھی بند ہو گیا۔ لیکن اب کے تعطل چند ہی ماہ کا رہا؛ اسی سال یہ "صدقِ جدید" کے نئے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ آخری دن تک وہ اس کے مدیر رہے۔ اب یہ پرچہ ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے حکیم عبد القوی دریابادی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اللّٰھم زد فزد

انھوں نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی، ناظر تخلص تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں مرزا محمد ہادی مرزا رسوا (ف: اکتوبر ۱۹۳۱ء) سے کچھ مشورہ بھی رہا ہو۔ اسی زمانے میں ایک ڈراما بھی "زود پشیمان" کے نام سے لکھا تھا۔ جسے بعد کو انھوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صاحبِ طرز نثر نگار ہیں، خصوصاً طنز اور پھبتی میں ان کا جواب نہیں۔ انھوں نے سیاسی اور مذہبی قسم کے حد درجہ سنجیدہ اور خشک موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ لیکن کسی موقعے پر بھی شگفتگی کا فقدان نہیں، ادبی چاشنی ہر جگہ موجود ہے۔ ان کے پایے کے انشا پرداز ہماری زبان کو بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ان کی گرانقدر علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی بھرپور ہوا، حکومت کی سطح پر بھی، اور اہلِ علم طبقے کی طرف سے بھی۔ عربی کا راشٹرپتی ایوارڈ انھیں ۱۹۶۵ء کے یومِ آزادی پر دیا گیا، اور اسے مرحوم ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپریل ۱۹۶۶ء کی ایک خصوصی تقریب میں انھیں پیش کیا؛ ایک شال اور سالانہ پنشن کے علاوہ پہلے اس کی رقم دو ہزار سالانہ تھی، اب چند برس سے یہ بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی ہے۔ اسی طرح یوپی حکومت کی طرف سے بھی

یکمشت پانچ ہزار روپے کا انعام ملا تھا۔ مارچ ۱۹۶۵ ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی سند سے نوازا۔

رشید احمد صدیقی، پروفیسر

"حضرت، آپ کا سالِ ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۶ء، کوئی ۱۸۹۴ء! ۔ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟"

"۱۸۹۲ء"

"مہینا؟"

" دسمبر "

" تاریخ؟"

"۲۴"

"سبحان اللہ! آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے"

چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص انداز میں کھل کر مسکرا دیے۔ یہ گفتگو میرے اور جناب رشید احمد صدیقی مرحوم کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے؛ مہینا غالباً مئی کا تھا۔

تو یہ طے ہو گیا کہ ان کی تاریخِ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے بہت دن بعد انھوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ مجھے اپنے پرانے کاغذوں میں خاندان کے کسی بزرگ کی کوئی یادداشت ملی ہے؛ اس میں بھی یہی تاریخِ ولادت درج تھی۔

مشرقی اتر پردیش کے ضلع جونپور میں ایک قصبہ مڑیاہو[٭] ہے، یہ جونپور سے ۱۱ میل دور ہے، اور تحصیل کا صدر مقام بھی ہے۔ حضرت پیر زکریا دادا کا مزار یہاں کا بہت مشہور تاریخی مقام ہے۔ اب تو تعلیم کا رواج عام ہو گیا؛ اور لوگ، خاص کر تعلیم یافتہ لوگ، ہر ایک چیز کے اظہار

٭ اس لفظ کے تلفظ کے بارے میں یقین نہیں ہے۔ اسے مختلف طریقے سے لکھا گیا ہے: مڑیاہوں، منڈیاہوں، منڈدیو، منڈیِ دی آہو۔ خدا معلوم، مقامی لوگ کیسے لکھتے اور بولتے ہیں!

اور روایت شکنی ہی کو روشن خیالی کی دلیل سمجھنے لگے ہیں، پہلے مریاہو میں شادی بیاہ کے موقع پر یہ مسلّمہ رواج تھا کہ دولھا پہلے اس مزار پر حاضری دیتا، سلام کر کے نذر پیش کرتا، اور اس کے بعد بارات روانہ ہوتی۔ ان بزرگ کے اخلاف جس محلّے میں مقیم ہیں، وہ آج بھی محلہ پیر زکریا کہلاتا ہے۔

یہی حضرت پیر زکریا رشید صاحب کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ سترھویں صدی عیسوی میں تبلیغِ دین کی غرض سے ترکستان سے ہندستان آئے تھے۔ پہلے چندے پنجاب میں قیام کیا۔ جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا، تو آگے بڑھے اور دلّی اور الٰہ آباد میں رُکتے ہوئے، جونپور پہنچ گئے، اور بالآخر مریاہو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی، اور بیشتر نے فوج اور سپہگری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انھیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدیقی کے والد جناب عبد القدیر پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ مدتوں بلّیا اور غازی پور اور جونپور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ قیام جونپور کے آخری زمانے میں وہ کوتوال شہر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور، بلکہ بہت حد تک بجا طور پر، بدنام ہے۔ لیکن عبد القدیر صاحب کی نیکی اور دینداری کا شہرہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند، اور مشہورِ زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ف: ستمبر ۱۸۹۵ء) کے مرید تھے۔ اسی سے ان کے عام رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عبد القدیر صاحب کا نکاح بھدوئی (ضلع بنارس) کے سید باسط علی کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ ان سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں: سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبد الصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔

جناب عبد القدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بیریا (ضلع بلّیا) میں تعینات تھے، جب خدا نے انھیں دوسرا بیٹا دیا، جس کا نام انھوں نے رشید احمد رکھا۔ یہی بعد کو پروفیسر رشید احمد صدیقی ہوئے۔ ان سے بڑے بھائی عبد الصمد صاحب وکیل تھے؛ ان کا

۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے جناب نیاز احمد صدیقی بہت دن محمد حسن کالج جونپور کے پرنسپل رہے۔ بقیدِ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں رحلت کر گئے تھے۔

رشید احمد صدیقی اپنے بچپن میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ طرح طرح کے علاج معالجے اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، لیکن ان کی علالت کا سلسلہ بہت دن تک چلا۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی کیونکہ اندیشہ تھا کہ جسمانی کمزوری کے باعث یہ ذہنی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہونگے۔ جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے شریف گھرانوں کا دستور تھا، ان کی تعلیم بھی گھر ہی پر، اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اس دور میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں، عربی کے چند رسالے، دینیات کے کچھ اسباق اور قرآن شریف ناظرہ پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوتے، تو اردو اور حساب، پہاڑے وغیرہ سیکھنے مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں جو مدرس انھیں اردو پڑھاتے تھے، وہ خود اردو سے بالکل نابلد تھے، اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط کر لینے تک محدود تھی۔

اگرچہ ان مدرّس کو نہ پڑھنے سے کچھ تعلق تھا، نہ پڑھانے سے؛ اور مذہباً بھی وہ کٹّر قسم کے برہمن تھے، لیکن بحیثیتِ انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادم خلق اور ہمدرد۔ جب وبائی طاعون کا موسم آتا (اور یہ ہر سال ہی آتا تھا)، تو مدرسہ اپنی عمارت سے اٹھ کر گاؤں کے مندر میں منتقل ہو جاتا۔ ماسٹر صاحب کی روزانہ کی صحبت اور سال بسال اس مندر میں مہینوں بسر کرنے، بلکہ مندر کے بعض چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید صاحب کے دل میں ہندو دھرم، بلکہ تمام دوسرے مذاہب کے لیے رواداری کے جذبات پیدا ہو گئے؛ اور خوشگوار لینت اور نرمی، تحمّل اور بردباری ان کے مزاج کے گویا اجزائے ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، جونپور

بھیجا گیا۔ یہاں انھوں نے ۱۹۱۴ء میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ یہ سند تو انھوں نے جوں توں حاصل کرلی، لیکن ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ یہاں اور تمام امتحانوں میں ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہا، ریاضی میں وہ ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں زندگی بھر ریاضی اور حساب کتاب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

جونپور کو "شیرازِ ہند" کہا گیا ہے، اور واقعی وہ اس نام کا مستحق تھا۔ شاہانِ شرقی کے عہد میں اس نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقی کی، اس کے آثار آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ حکومتِ وقت کی نگرانی نے جونپور میں یگانۂ روزگار علما و فضلا کو جمع کردیا تھا۔ انھوں نے یہاں مدارس و مکاتب کھول دیے، رشد و ہدایت کی مجلسیں قائم کردیں، اور یوں ہر طرف علم اور اس کی تمام شاخوں کا چرچا عام ہو گیا۔

حکومت نے شہر کی ظاہری تزئین و تہذیب پر بھی خاص توجہ کی۔ عالیشان عمارات، مساجد، مقابر، سرائیں جو اس زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں سے بیسیوں کی باقیات آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سطوت و جلالِ ماضی کے یہ آثار رشید احمد صدیقی نے دیکھے۔ ان کا اپنا خاندان بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا، ان کی ابتدائی گھریلو تعلیم بھی بیشتر مذہبی نوعیت کی تھی، طبیعت بھی حساس اور درد مند اور غور و فکر کی عادی تھی۔ اس پر جونپور میں جن ساتھیوں سے، اور ان کے واسطے سے ان کے خاندانوں سے، تعلق پیدا ہوا، وہ بھی اسی کاروانِ رفتہ کی یادگار تھے۔

جونپور میں بیشتر پرانے گھرانے شیعہ عقائد کے تھے۔ رشید صاحب کے ساتھ پڑھنے والے انھیں خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ یہ ان کے گھروں پر جاتے۔ ان سے محبت اور شفقت کا سلوک تو ہونا ہی چاہیے تھا؛ اس کے ساتھ وہاں انھیں شعرا کا کلام، مرثیے اور سوز اور سلام سننے اور پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی اردو دوستی کی بنیاد پڑی اور ان میں ادیب بننے کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسطِ شہر میں دریائے گومتی بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک دو منزلہ عمارت میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا۔ رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتب خانے میں جاتے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے اور اردو و انگریزی کے

ناول اور افسانے پڑھا کرتے۔ یوں رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کردی، اور وہ اردو ادب کے خاصے بڑے حصے سے واقف ہوگئے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب سے بےتکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ معنوی پہلو سے زندگی بھر ان کے شوق و شغف کے موضوع تین رہے ہیں: اسلامیت؛ پرانی اقدار و تہذیب؛ اردو۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیامِ جونپور کے زمانے میں پڑی تھی۔ بعد کو وسیع ذاتی مطالعے اور دوست احباب سے تبادلۂ خیالات، نیز تہذیب کے انحطاط اور نئی نسل کی اخلاق باختگی کے نظارے سے، ان میں ان موضوعات کے زمانۂ حال سے تقابل اور ان کے بارے میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی۔

جونپور گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد مستقبل کا مسئلہ درپیش تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کرسکتی۔ مجبوراً نوکری کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے اس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑا؛ وہیں جونپور کی عدالتِ دیوانی میں کلرک مقرر ہوگئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ بھی ۱۵-۲۰ روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازمت اور گھر کا کمائو فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے، لیکن رشید صاحب خود اس سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد وہ رسی تڑا کر بھاگ نکلے اور علی گڑھ آکر دم لیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

اسکول کے زمانے میں انھیں کھیل کود کا لپکا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے دلپسند کھیل تھے، اور وہ اپنے اسکول کی ان تینوں ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیلوں پر خاص توجہ تھی اور یہاں کے طلبہ کا اس میدان میں دور دور شہرہ تھا۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، وہ علی گڑھ دراصل اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے، جتنا یہاں کے کھیلوں کا چرچا سن کر؛ لیکن یہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا؛ اس زمانے میں علی گڑھ میں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انھوں نے ٹینس پر توجہ کی، اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا کرلی۔ اندرونِ خانہ کھیلوں میں انھیں برج کا بھی شوق تھا۔

علی گڑھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک؛ ۱۹۱۹ء میں بی۔اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں کے طلبہ کو وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا تھا؛ وہیں جاکر امتحان بھی دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیے تھے۔

طالبعلمی کا دور مالی پہلو سے بہت پریشان کُن رہا۔ والد پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور ان کی پنشن ایک بڑے کنبے کی مادّی ضروریات کے ساتھ، ان کی تعلیم کے مصارف بھی برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی لمبی تعطیلات میں نوکری کر کے اتنا کما لاتے کہ یہ تنگی ترشی سے سال بھر کے خرچ کے لیے کفایت کرتا۔ کالج میں ۱۵ جولائی سے ۱۵ اکتوبر تک، تین مہینے گرمی کی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان ایام میں بنارس جاتے اور وہاں دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر مِسلوں کی نقل کرنا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوشخط بھی۔ یہ "مشقت" پانچ برس تک جاری رہی۔ جس صبر و شکر سے انھوں نے یہ زمانا بسر کیا، اور جس آن بان سے انھوں نے ہمچشموں میں اپنا سر اونچا رکھا، یہ ان کا قابلِ فخر کارنامہ تھا۔

علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج محض ایک درسگاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگِ میل، اور ہندستانی مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے نونہالانِ قوم جمع ہوتے اور ملک و ملّت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے، تو تدریجی طور پر وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصّہ بن گئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی ساری تعلیم و تربیت نہ صرف علی گڑھ کی روایات کے منافی نہیں تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ معراج ہونا ہی علی گڑھ چاہیے تھا۔

رشید صاحب کے حلقۂ احباب میں اقبال احمد خاں سہیل (ف: نومبر ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔ سہیل اردو، فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر؛ اور غیر معمولی طور پر ذہین و فطین شخص

تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال تک ساتھ رہا، دن رات کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ من تو شدم، تو من شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلا خوفِ تردید و شبہہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کی تصنیفی صلاحیتوں کے ابھارنے اور اُجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ رشید صاحب اپنے جونپور کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاہ نذیر غازیپوری اس زمانے کے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے نوجوان رشید کی رہنمائی کی، اور انھیں ادب میں راہِ راست پر لگا دیا۔ علی گڑھ آئے، تو یہاں سہیل نے انھیں اس اسلوبِ تحریر کی راہ دکھلائی، جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج یونین کے سکتر مقرر ہوئے؛ اور پھر "علی گڑھ منتھلی" (کالج کا سرکاری جریدہ) کے مدیر۔ یہ ماہانہ انگریزی اور اردو، دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے کہنے پر اس کا نام "منتھلی" سے بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصوں کے الگ الگ مدیر اسٹاف میں سے ہوا کرتے تھے؛ پہلی مرتبہ انگریزی اور اردو دونوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالبعلم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصوں کے لیے مضمون لکھا کرتے تھے۔ اردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں "بوہیمین" (آوارہ گرد) کے قلمی نام سے۔ سہیل ہی نے انھیں سب سے پہلے طنزیہ مضمون لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام "کچی بارک" نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین "گل منزل" کے عنوان سے لکھا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) قائم کی تھی۔ اسے سر سید کی زندگی ہی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار لیکن ہونہار طلبہ کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو وفد روپیہ جمع کرنے کو باہر جائیں وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن

تھے۔ اس کے وفد ہر سال چھٹیوں کے ایام میں ملک کا دورہ کرتے تھے۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے، اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۷ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں پیمونک کا سفر کیا۔ واپسی پر انھوں نے "سیاحتِ برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے تھے، جو میگزین میں شائع ہوئے۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط کتابت بھی بہت حد تک رشید صاحب ہی کے سپرد تھی، نیز مختلف مباحث اور موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچا، اور ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسے پختگی پیدا ہو گئی۔

کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں ان کے انگریزی کے مدرّس انعام اللہ خان صاحب تھے۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز اور ماہر انگریزی داں سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انگریزی ایسی مرصّع اور مسجّع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والے کا منھ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ رشید صاحب پروفیسر انعام اللہ خان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بیشتر انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہے۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر ۱۹۲۱ء میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں "اردو مولوی" کہلاتا تھا۔ اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی، اور معلوم نہیں تھا کہ اصحابِ مجاز کس دن، کس بات پر ناراض ہو کر نکال باہر کر دیں۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرار کی جگہ نکلی، تو انھوں نے بھی درخواست دی۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی۔ اس پر اتمامِ حجّت کے لیے انھوں نے مقالہ "طنزیات و مضحکات" لکھا، جو پہلے ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد کے تماہی رسالے "ہندستانی" میں بالاقساط چھپا اور پھر

کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا، اور ان کا عارضی تقرر ہوگیا۔
ان کے انتخاب کا ایک لطیفہ محفوظ کر دینے کے قابل ہے :

حسبِ قاعدہ ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ وہ مختلف امیدواروں کی درخواستوں کا جائزہ لے، اور ان سے ذاتی بات چیت کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کون صاحب اس اسامی کے لیے موزوں ہیں۔ امیدواروں میں رشید صاحب کے علاوہ اور لوگوں میں مشہور مصنّف اور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر (ف دسمبر ۱۹۲۶ء) بھی تھے۔ کمیٹی کے اراکین کی اکثریت ان کے حق میں تھی۔ بیشک، ان کا تدریسی اور تعلیمی تجربہ صفر تھا، لیکن ناولوں کی کھیپ کی کھیپ ان کی پشت پر تھی، اور یہی ان کی سب سے بڑی سفارش تھی۔ خود وائس چانسلر صاحب بھی رشید صاحب کے حق میں نہیں تھے۔ کمیٹی کے صرف ایک رکن حبیب الدّین خان ان کے خاص دوست تھے، وہ پورا زور لگا رہے تھے کہ مدرّسی کے لیے رشید صاحب ہی موزوں ترین آدمی ہیں، لہٰذا انھیں کا انتخاب ہونا چاہیے۔ لیکن دوسرے سب لوگ ان کے مخالف تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اب ان کے بازی جیتنے کی کوئی توقع نہیں رہی، تو انھوں نے ترپ کا پتّا پھینکا۔ فرمایا: حضرات! مولانا شرر کی قابلیت میں شبہہ نہیں اور آپ بھی مجاز ہیں کہ جسے چاہیں، مقرّر کر دیں۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ نواب محمد حامد علی خان بالقابہ والیِ رامپور ہمارے سرپرست ہیں اور مولانا شرر نے ایک ناول "اسرارِ دربارِ رامپور" کے عنوان سے ان کے خلاف لکھا ہے۔ ان کے انتخاب سے کہیں نواب صاحب ناراض تو نہیں ہو جائیں گے! ان کا اتنا کہنا تھا کہ مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ ہر ایک ان کا شکریہ ادا کرنے لگا کہ حضرت، آپ نے ہمیں ایک بڑے خطرے سے بچا لیا۔ اور اس کے بعد سب نے اتفاقِ رائے سے رشید صاحب کے تقرر پر صاد کر دیا۔

بڑے جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۶ء میں وہ مستقل لیکچرار (مدرّس) مقرر ہوئے۔ اس موقع پر منجملہ دیگر اصحاب کے علامہ اقبال نے بھی ان کی سفارش کی تھی۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے؛ اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر، جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے۔

؎ یہ "لفٹیننٹ" کے عرف سے مشہور تھے۔ مدتوں یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پڑھاتے رہے۔

یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی؛ یہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرلیا تھا۔

اپنی طالبعلمی کے زمانے میں رشید صاحب کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) سے بھی، جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آچکے تھے، بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اکثر اس بات پر افسوس کیا کرتے کہ اردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں؛ اور پھر خود ایک اچھا رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتب کرتے۔ دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل" کہ دونوں میں روشنی کا تصوّر ہے؛ اور نہ صرف خود روشن ہیں، بلکہ اپنے چاروں طرف بھی نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا مقصد اور معیار کتنا بلند تھا۔ تو خیر، ذاکر صاحب ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے، اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف: جون ۱۹۷۱ء) نے بعض احباب کے تعاون سے ایک ماہنامہ جاری کیا، جس کا نام "شمع" رکھ دیا۔ رشید صاحب نے سنا، تو افسوس کیا کہ وہ جو دوناموں میں سے ایک کے انتخاب میں لذّت تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ لیکن انھیں اطمینان تھا کہ خیر، "سہیل" تو ہے ہی؛ جب پرچہ جاری کرینگے، اس کا یہ نام رکھ لینگے۔ اس زمانے میں سیّد سجّاد حیدر یلدرم (ف: اپریل ۱۹۴۳ء) یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان سے بیٹھے اظہارِ افسوس کرنے لگے کہ اردو میں اچھے پرچے کم ہیں؛ ایک پرچہ 'سہیل' کے نام سے نکالنے کا خیال ہے، تو یلدرم مرحوم نے کہا: "ہاں، یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے"۔ یہ سن کر رشید صاحب سٹپٹائے کہ "شمع" تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، یلدرم نے کہیں "سہیل" پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائینگے؛ ذاکر صاحب بھی یورپ میں ہیں، ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔

سہیل انجمن اردوئے معلّیٰ، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے شروع

میں جاری ہوا۔ لیکن آج تک کسی اچھے پرچے کو اِلّا ماشاء اللہ اردو والوں اور اردو حلقوں کی فضا راس نہیں آئی، نہ ان کا تعاون ہی حاصل ہوا۔ یہی حشر "سہیل" کا بھی ہوا۔ سب نے اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت و طباعت، دیدہ زیب شکل صورت کی تعریف کی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے صرف چھ شمارے شائع ہو سکے، اور وسط ۱۹۲۷ء میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔

رشید صاحب اس پر بھی ہار نہیں مانے۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انھوں نے پھر اسے جاری کیا۔ اب کے ارادہ یہ تھا کہ اسے ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع کریں گے۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کا شمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔

رشید صاحب بجا طور پر اردو ادب کے مسلّمہ اور مایۂ ناز نثر نگار، اور طنز و مزاح کے منفرد مصنّف تھے۔ انھوں نے اپنے بیشتر مدّاحوں اور پڑھنے والوں کو خوش وقت کیا ہے؛ ان کی زندگی کی اداس اور بے کیف گھڑیوں کو مسرّت و انبساط سے رنگین کیا ہے۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن تھے، لیکن انھوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا طریقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا۔ یوں اگر ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے، تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو منتھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لیں، تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیّت سو مرتبہ قربان کی جا سکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔

ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدردانی ہوئی اور خود ان کی ذات سے، ملک کے اہلِ علم و فن طبقے نے جو محبّت کی ہے، اس کی آوازِ بازگشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے، جس سے حکومتِ ہند نے انھیں یومِ جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں ساہتیہ اکاڈمی نے اپنا پانچ ہزار کا سالانہ انعام ان کے غالب صدی کے نظام خطبات کے مجموعے "غالب کی شخصیت اور شاعری" پر دیا۔ دو برس بعد ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکاڈمی نے انھیں پانچ ہزار کا خصوصی انعام دیا، جو وہ ہر سال ممتاز مصنّفوں کو ان کی مجموعی علمی اور

ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کرتی ہے۔
ان کی مندرجۂ ذیل چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں:
(۱) طنزیات و مضحکات (الہ آباد)؛ (۲) مضامین رشید (دلی: ۱۹۴۱ء)؛ (۳) خندان (دلی: ۱۹۴۰ء)؛ (۴) سہیل کی سرگذشت (حیدرآباد: ۱۹۴۷ء)؛ (۵) گنجہائے گرانمایہ (۱۹۵۱ء)؛ (۶) ذاکر صاحب (دلی)؛ (۷) ہمارے ذاکر صاحب (نئی دہلی: ۱۹۷۲ء۔ اس میں (۶) پر اضافہ ہے)؛ (۸) جدید غزل (علی گڑھ: ۱۹۵۵ء)؛ (۹) شیخ نیازی (علی گڑھ: ۱۹۵۸ء)؛ (۱۰) آشفتہ بیانی میری (علی گڑھ: ۱۹۵۸ء)؛ (۱۱) ہمنفسانِ رفتہ (علی گڑھ: ۱۹۶۶ء)؛ (۱۲) عزیزانِ ندوہ کے نام (لکھنؤ)؛ (۱۳) علی گڑھ کی مسجدِ قرطبہ (علی گڑھ: ۱۹۶۷ء)؛ (۱۴) غالب کی شخصیت اور شاعری (دلی: ۱۹۷۰ء)؛ (۱۵) علی گڑھ: ماضی وحال (علی گڑھ: ۱۹۷۰ء)۔
ان کتابوں اور رسالوں کے علاوہ ان کے کچھ خطبات اور بہت سے مضامین بھی مختلف [illegible] میں منتشر حالت میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں جمع کر کے محفوظ کر دیا جائے۔ یہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ظلم ہوگا اگر وہ اصحابِ نظر کی دسترس سے باہر رہیں۔
انھیں ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد نقل وحرکت اور خورونوش میں اپنے معالجوں کی ہدایت کے مطابق بیحد احتیاط کی زندگی بسر کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اتنے برس کسی خاص تکلیف کا سامنا نہیں ہوا۔ ہفتہ کے دن ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء صبح ساڑھے چار بجے طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر پہنچ گئے۔ انھوں نے تشخیص کیا کیا کہ خون کا دباؤ بہت کم ہے۔ دوا دوش ہونے لگی، لیکن دوپہر تک گھبراہٹ میں بہت اضافہ ہوگیا۔ خون چڑھایا گیا، اور جو کچھ مزید ہو سکتا تھا وہ بھی کیا گیا۔ لیکن ان کا وقت آن لگا تھا، کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اسی میں تین بجے سہ پہر جان بحق ہوگئے۔
جنازہ اتوار اگلے دن (۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء) اٹھا اور انھیں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انّا للّٰہِ وانّا الیہِ راجعُون۔ ان کی قبر اردو کے ایک اور پرانے خادم قاضی عبدالغفار (ف: جنوری ۱۹۵۶ء) کے پہلو میں ہے۔

مغیث الدین فریدی نے عیسوی میں تاریخ کہی:

تاریخ وفاتِ دردناک
(۱۹۷۷)
رحلتِ پروفیسر رشید احمد صدیقی

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج (۱۹۷۷)
طنز کی آنکھ اشکبار ہے آج

اٹھ گیا نابغہ حیات و ادب
قلب اردو کا داغدار ہے آج

گلفشاں تھے جہاں رشید احمد
رخصت اُس باغ سے بہار ہے آج

قدرِ تہذیب ان کے دم سے تھی
روحِ تہذیب بیقرار ہے آج

جس زباں میں وہ بات کرتے تھے
اُس زباں کا جگر فگار ہے آج

دفن ہوتا ہے لطفِ طنز و مزاح
بذلہ سنجی تہِ مزار ہے آج

نکتہ دانی کا آج ماتم ہے
ذوقِ تنقید اشکبار ہے آج

کان میں گونجتی ہے اُن کی صدا
دامنِ ہوش تار تار ہے آج

"آہ" کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ
"رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج"
(۱۹۷۱+۶ = ۱۹۷۷)

انھوں نے سات بچے اپنی یادگار چھوڑے، پانچ بیٹے (اقبال رشید، احسان رشید، نیازی رشید، احمد رشید، اکبر رشید) اور دو بیٹیاں (سلمیٰ صدیقی اور عذرا صدیقی)۔ ان میں سے سلمیٰ صدیقی اور اکبر رشید بمبئی میں مقیم ہیں؛ عذرا رشید آج کل قاہرہ (مصر) میں ہیں، جہاں ان کے میاں سفارتخانے میں عہدیدار ہیں؛ باقی سب بچے پاکستان میں ہیں۔ ڈاکٹر احسان رشید ان دنوں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔

کرشن چندر

تقسیمِ ملک سے پہلے وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ۔ پاکستان) کھتری ہندوؤں کی مختلف شاخوں کا گویا گڑھ تھا۔ ان میں چوپڑہ کھتری بھی تھے، جن کے ایک فرد ڈاکٹر گوری شنکر سرکاری

ملازمت میں منسلک تھے۔ وہ پہلے بھرت پور ریاست میں رہے؛ پھر ۱۹۱۸ء میں ان کا تقرر ریاست جموں وکشمیر کی ایک ذیلی ریاست پونچھ میں ہوگیا۔ اگرچہ پونچھ کا راجا اس زمانے میں مہاراجا کشمیر کا باجگزار تھا، لیکن اندرونِ ریاست اسے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ ڈاکٹر گوری شنکر نے ۱۹۴۴ء تک اپنی ملازمت کا بقیہ زمانہ پونچھ ہی میں بسر کیا۔ سبکدوشی کے بعد دلّی چلے آئے تھے؛ ۱۹۵۱ء میں یہیں دلّی میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر گوری شنکر خود بھی اور ان کے گھر کے لوگ بھی قدرتاً اکثر اپنے وطن وزیرآباد جاتے آتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں وہ بھرت پور میں تھے، ان کی بیوی وزیرآباد چلی آئیں؛ اور یہیں پیر کے دن ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء صبح چھ بجے ان کے ہاں پلوٹھا بچّہ پیدا ہوا۔ یہی ہمارے کرشن چندر تھے۔ ان کے بعد بار بچے اور ہوئے: مہندر ناتھ (ف: ۹ مارچ ۱۹۷۴ء)، سرلا (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء)، راجندر ناتھ اور اوپندر ناتھ۔ راجندر ناتھ کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا۔

کرشن چندر پانچ برس کے تھے، جب انھیں قصبہ مہنڈر (پونچھ کی تحصیل) کے پرائمری اسکول بھیج دیا گیا، جہاں ان دنوں ڈاکٹر گوری شنکر تعینات تھے۔ اس کے بعد والد کا تبادلہ پونچھ ہوگیا اور یہ وہاں کے وکٹوریا جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوگئے۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ والد انھیں اپنی طرح ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، اس لیے کرشن چندر نے ان کے حکم کی تعمیل میں سائنس کے مضامین نصاب میں لیے، اگرچہ ان کی اپنی دلچسپی آرٹس کے مضامین (تاریخ، ادب، فلسفہ، معاشیات وغیرہ) سے تھی۔ انٹر تو انھوں نے جوں توں کرکے سائنس کے ساتھ میں کر لیا، لیکن بی اے میں داخلہ لیتے وقت والد سے گزارش کی کہ وہ ڈاکٹر نہیں بننا چاہتے، اس لیے انھیں اجازت دی جائے کہ بی اے میں آرٹس کے مضامین لے لیں۔ والد نے اصرار نہیں کیا اور اس طرح بالآخر انھوں نے ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی ادب) کی سند حاصل کی۔ اب والد نے کہا کہ اچھا ڈاکٹر نہیں تو وکیل ہی بن جاؤ۔ اس پر انھوں

نے وہیں یونیورسٹی لا کالج سے ۱۹۳۲ء میں وکالت کی سند (ایل ایل، بی) پائی۔ لیکن یہ بھی مارے بندھے کی بیگار ثابت ہوئی۔

ان کی تعلیمی زندگی کے زمانے کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ وہ انٹر کے پہلے سال میں تھے کہ ان کا مقامی دہشت پسند حلقوں سے تعارف ہو گیا اور یہ بھی ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے دو ساتھی گرفتار ہو کر سزا پا گئے۔ اب ان کی ملاقات مشہور انقلابی بھگت سنگھ (ف: ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء) سے ہوئی۔ اس کے بعد یہ کالج سے بھاگ نکلے اور بنگال پہنچ گئے، جو اس زمانے میں ملکی دہشت پسند سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں مہینا بھر کے قیام میں انھوں نے دیہات کا دورہ کیا اور عوام کی جہالت اور زبوں حالی اپنی آنکھوں دیکھی۔

ان کے کالج سے فرار کی خبر ان کے گھر والوں کو مل گئی تھی۔ والد نے ان کی کھوج میں ایک آدمی لگا دیا، جس نے ٹوہ لیتے لیتے انھیں بنگال میں جا پکڑا۔ وہ تو بعض با اثر حضرات کی سفارش کام آئی، ورنہ ان کی طویل غیر حاضری کے باعث کالج سے ان کا نام کٹ گیا تھا۔ قصہ کوتاہ یہ واپس لاہور آئے اور تعلیم کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ اس زمانے میں وہ پنجاب سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اشتراکی لٹریچر کا بھی وسیع مطالعہ کیا۔ گرمی کی تعطیلات کے زمانے میں وہ دیہات میں چلے جاتے اور لوگوں سے بات چیت کے ذریعے ان کے مسائل معلوم کرتے۔ کشمیر جاتے، تو وہاں بھی یہی مشغلہ رہتا۔

اگرچہ بعد کے زمانے میں انھوں نے عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا، لیکن ان کا یہ علم اور تجربہ ادبی میدان میں ان کے بہت کام آیا۔ جس آرام و آسایش اور عافیت طلبی کے وہ عادی تھے، اس میں اُس زمانے کی پُر خار سیاست ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اولاً پروفیسر سنت سنگھ کے اشتراک سے انگریزی ماہنامہ "ناردرن ریویو" جاری کیا، لیکن گیارہ ماہ بعد یہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد بابا پیارے لال بیدی کی انگریزی بیوی فریدہ (فریڈا)

(ف : ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء) کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ " دی ماڈرن گرل" (انگریزی) شروع کیا۔ یہ تجربہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا اور چند ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ آٹھویں ساتویں لاہور کے مشہور انگریزی روزنامے ٹریبیون میں بھی سیاسی اور معاشی مسائل پر مضامین لکھتے رہے۔

لیکن ان کی اصلی دلچسپی اردو سے تھی، اور یہ بہت قدیم تھی۔ وہ ابھی اسکول کے درجوں میں تھے کہ انھوں نے اپنے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام[۹] پر ایک طنزیہ " پروفیسر بلیکی" کے عنوان سے لکھا۔ یہ دلی کے مشہور ہفتہ وار" ریاست" میں چھپا تھا۔ جب ڈاکٹر گوری شنکر کو اس کا علم ہوا، تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ اس کے بعد ایم اے کے درجے میں پہنچنے تک انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس زمانے میں وہ یرقان سے سخت بیمار ہو گئے۔ جب صحتیاب ہوئے، تو انھوں نے ایک افسانہ" یرقان" لکھا، جو" ادبی دنیا"، لاہور میں شائع ہوا۔ صلاح الدین احمد (ف : جون ۱۹۶۴ء) رسالے کے ایڈیٹر تھے؛ انھوں نے اس افسانے کی بہت تعریف کی۔ اور واقعی یہ پہلی کوشش ہی ستارۂ درخشید و ماہِ کامل شد کی مصداق ثابت ہوئی۔ اس پہلے ہی افسانے نے انھیں شہرت کے اس مقام پر پہنچا دیا، جو بیشتر لکھنے والوں کو عمر بھر کی خامہ فرسائی کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ سجاد ظہیر مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۷۳ء) نے ملک کا دورہ کیا اور ہر جگہ کے ادیبوں سے رابطہ پیدا کر کے وہاں انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ کرشن چندر بھی اس میں شامل ہو گئے۔ بعد کو وہ پنجاب شاخ کے سکریٹری چنے گئے تھے۔ ۱۹۳۸ء کی آل انڈیا کانفرنس، کلکتہ میں انھوں نے پنجاب کے نمایندے کی حیثیت سے بھی شرکت کی۔

ان دنوں آل انڈیا ریڈیو چن چن کر اچھے ادیبوں کو اپنے ہاں ملازمت کی پیشکش کر رہا تھا۔ کرشن چندر ابھی لاہور ہی میں تھے کہ نومبر ۱۹۳۹ء میں ریڈیو نے انھیں پروگرام اسسٹنٹ کی اسامی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ سال بھر لاہور میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ

---

[۹] ہمارے مشہور سیاسی لیڈر شری گلزاری لال نندہ کے والد۔

دلّی دفتر میں ہو گیا۔ یہاں وہ ۱۹۴۲ء کے آغاز تک رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ اب بحیثیت افسانہ نگار اور ڈراما نویس ان کا بوہا سب ماننے لگے تھے۔ وہ لکھنؤ ہی میں تھے کہ فلمساز ڈبلیو ۔ زیڈ ۔ احمد[۵] نے انھیں اپنی کمپنی "شالیمار پکچرز" میں مکالمے وغیرہ لکھنے کے لیے پونا آنے کی دعوت دی۔ کرشن چندر سرکاری ملازمت اور اس کی پابندیوں سے تنگ آ ہی چکے تھے، انھوں نے فوراً یہ دعوت قبول کر لی اور ریڈیو سے مستعفی ہو کر پونا چلے گئے۔

پونا میں دو برس رہنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں بمبئی آ گئے اور "بمبئی ٹاکیز" سے وابستہ ہو گئے۔ سال بھر بعد انھوں نے "نیشنل تھیٹر" کے اشتراک سے اپنی کمپنی قائم کر لی۔ ان کا اپنا ریڈیائی ڈراما "سرائے کے باہر" تھا، اسے فلمایا۔ پھر اپنے سرمایے سے ذاتی کمپنی ("ماڈرن تھیٹر" کے نام سے) قائم کی، اور ایک فلم "دل کی آواز" تیار کی۔ اس کمپنی کی دوسری فلم "راکھ" بن رہی تھی کہ روپے کی کمی کے باعث کمپنی ٹوٹ گئی۔ کرشن چندر کا یہ فلمسازی کا تجربہ بہت ناکام رہا۔ اس میں انھیں کئی لاکھ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا، بلکہ مقروض ہو گئے۔ دراصل اس کاروبار میں بڑے جوڑ توڑ کی اور اندھا دھند سرمایے کی ضرورت ہے؛ یہ ان دونوں صفات سے عاری تھے، بھلا کامیابی ہوتی تو کیونکر! اس کے بعد انھوں نے صرف فلم کمپنیوں کے لیے ڈرامے یا مکالمے لکھے، یا پھر اپنے شوق کا تصنیف و تالیف کا کام کیا، اور ماشاءاللہ اس میں رفتہ رفتہ اتنی ترقی ہوئی اور کامیابی حاصل کر لی کہ ان کا صفِ اول کے مصنفین میں شمار ہونے لگا۔

ملک نے ان کی ادبی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا، اور حکومت بھی پیچھے نہیں رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں انھیں سوویٹ لینڈ نہرو اوارڈ ملا: آٹھ ہزار روپیہ نقد اور پندرہ دن کی روس یاترا۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز حاصل ہوا۔

[۵] پورا نام وحید الدین ضیاء الدین احمد تھا۔ یہ "ادبی دنیا" کے مولانا صلاح الدین احمد کے بھتیجے اور سندھ کے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ کے داماد تھے۔ کمیونسٹ لیڈر زین العابدین احمد (زیڈ۔ اے۔ احمد) ان کے بڑے بھائی ہیں۔

وفیات

اسی سال بمبئی اور دلّی میں ان کے مداحوں نے ان کا جشن منایا اور ان کی خدمت میں کیسۂ زر پیش کیے، بمبئی میں پچپن ہزار اور دلّی میں بیس ہزار۔ بمبئی میں اس تقریب کی صدارت وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی تھی۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ نے انعام دیا۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں حکومتِ ہند نے انھیں آل انڈیا ریڈیو کا ایمریٹس پروڈیوسر مقرر کیا، جس کا مشاہرہ ۱۸۰۰ روپے تھا۔ افسوس، اس سے زیادہ دن لطف اندوز ہونا ان کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ء سے انھیں یہ تنخواہ ملنا شروع ہوئی، ۸ مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کرشن چندر کی پہلی شادی ۱۹۳۹ء (یا ۱۹۴۰ء) میں لاہور میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی کا نام ودیا وتی تھا (یہ زندہ ہیں)۔ ان سے ان کے تین بچے ہوئے: دو لڑکیاں کیپلا اور انکا، اور ایک لڑکا رنجن۔ افسوس کہ چھوٹی بیٹی انکا طالب علمی کے زمانے ہی میں دماغ کا توازن کھو بیٹھی۔ اس کے علاج میں کوتاہی نہیں ہوئی، بہت روپیہ خرچ ہوا، لیکن افاقہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ دوسرے بچے راضی خوشی ہیں۔

ان کی یہ شادی ناکام رہی۔ میاں بیوی میں ہم آہنگی مفقود تھی، نہ جذباتی نہ ذہنی۔ ایسے میں شادی کا اصلی مقصود کہ دونوں کو باہمی تسکین حاصل ہو اور وہ ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی سے پیش آئیں، لازماً ضائع ہو جائیگا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی نینی تال میں سلمیٰ صدیقی سے ملاقات ہوئی، جو خورشید عادل منیر سے طلاق لے چکی تھیں۔ دونوں ٹوٹ کر ایک دوسرے پر فدا ہو گئے۔ سلمیٰ کی والدہ کا اصرار تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ سلمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے کرشن چندر ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ چنانچہ ان کا نام وقار ملک رکھا گیا، اور بالآخر ۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو دونوں کا وہیں نینی تال میں جہانگیر آباد پیلیس میں نکاح ہو گیا؛ گیارہ ہزار مہر مقرر ہوا تھا۔ کرشن چندر آخر تک اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے بھی کفیل رہے۔ پہلے کئی سال تک مکان کے علاوہ خرچ کے لیے ۷۵۰ ماہانہ دیتے رہے۔ جب گرانی کا دور آیا، تو ماہانہ رقم بڑھا کر ایک ہزار کر دی۔ اپنی وصیت میں انھوں نے آمدنی کی دو تہائی

ایلیٹی بھی زیادتی کے لیے لکھی ہے؛ بقیہ ایک تہائی نسلی کے لیے۔
کرشن چندر کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا؛ کھانے میں بھی مرغن گوشت جو خوب چٹ پٹا اور مصالحے دار ہو۔ لذیذ غذا اور زیادہ تر مٹھائی اور اعلیٰ درجے کی شراب، یہ ان کی مرغوب چیزیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ثقیل غذا جوانی تک تو نبھ جائے گی، لیکن رفتہ رفتہ اس کے ناخوشگوار اثرات سے بچنا ناممکن ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ان پر پہلا دورۂ قلب ۱۹۶۷ء میں پڑا۔ گھر ہی پر علاج معالجہ ہوا اور وہ ٹھیک ہو گئے۔ دوسرا حملہ، جو پہلے سے شدید تر تھا، ۱۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو ہوا (۱۸ مارچ کو ان کا جشن بڑے اہتمام سے وزیرِ اعظم کی صدارت میں منایا گیا تھا)۔ مہینوں علاج کے بعد تندرستی عود کر آئی۔ لیکن اب معالجوں نے پابندیاں زیادہ سخت کر دیں۔ تیسرا حملہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ آخری دورہ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو تھا۔ علاج کے لیے وہ بمبئی اسپتال میں داخل ہوئے۔ وہیں منگل وار ۸ مارچ (۱۹۷۷ء) صبح چھ بجے انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہی۔ اسی شام ارتھی اٹھی اور ان کی نعش جوہو کے شمشان میں نذرِ آتش کر دی گئی۔ فیاض گوالیاری کے قطعۂ تاریخِ وفات کے آخری دو شعر ہیں:

جو تھا فسانۂ انسانیت کی روحِ رواں ۔۔۔ فسانہ بن گیا، فیاض! وہ فسانہ طراز
سرِ جلالیِ حداکن، برائے سال وصال ۔۔۔ "کرشن چندر رفت و فسانۂ حیراں"
(۱۹۸۰-۳ = ۱۹۷۷)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کرشن چندر ہماری زبان کے نہایت کامیاب ادیب اور فسانہ نگار تھے۔ پریم چند کے بعد ان کی سی شہرت اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی کم و بیش ۸۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں؛ ان میں افسانے، ناول، ڈرامے، بچوں کے لیے کہانیاں، سبھی کچھ شامل ہے۔ بیشک، سب کا معیار یکساں نہیں۔ لیکن یہ بات بھی بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی منتخب کہانیاں دنیا کی بہترین کہانیوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ، ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئے، اور ہر جگہ کامیاب رہے۔

اختر اورینوی، سید اختر احمد

اورین (ضلع مونگھیر، بہار) میں نقوی زیدی جاجنیری سادات قدیم ایام سے آباد ہیں۔ یہ لوگ عرب سے کب آئے، کیوں آئے، راہ میں کہاں کہاں قیام کرتے آئے، یہ سب حقائق پردۂ خفا میں ہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ وہ ہندستان پہنچنے کے بعد اول پٹیالہ (پنجاب) میں رکے۔ یہاں انھوں نے بارہ گاؤں بسائے، جن میں مرکزی حیثیت جاجنیر کو حاصل تھی، جس سے جاجنیری کی نسبت ان کے نام کا جزو بن گئی۔

تغلق اور خلجی عہد میں خاندان کے کچھ لوگ شاہی فوج میں شامل ہو کر مشرقی علاقوں میں پہنچے۔ ان میں سید احمد جاجنیری، فاتح بہار اختیار الدین بن بختیار خلجی کے لشکر میں شامل تھے۔ ان کا مزار یکساری (ضلع مونگھیر) میں موجود ہے۔ یہی اس خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کے بیٹے سید احمد جان نے اورین فتح کر لیا اور وہیں رخت سفر کھول دیا۔ ضلع مونگھیر کے بیشتر سادات انھیں کے اخلاف ہیں۔ کئی نسلوں تک سپہ گری ان کا پیشہ رہا، یا رُشد و ہدایت۔ پھر جب حالات بدلے، تو ان میں سے بعض لوگوں نے کشاورزی اختیار کر لی۔

حضرت سید احمد بریلوی (ف: مئی ۱۸۳۱ء) نے انگریزوں کو ہندستان سے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگرچہ اپنوں اور بیگانوں کی مہربانی سے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے، اور بالاکوٹ (صوبہ سرحد) کے مقام پر شہید ہوئے، لیکن ان کی بدولت ملک کے طول و عرض میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی، جس کے دل میں آزادی کی تڑپ، دین سے گہری وابستگی، اور خلقِ خدا کی خدمت کا جذبہ تھا۔ ان کے مبائعین میں سید عنایت حسین بھی تھے، جو اختر اورینوی کے پردادا تھے۔

اختر کے دادا ہدایت حسین دین کے ساتھ دنیا کے معاملات میں بھی ماہر تھے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے، سید خلافت حسین بیرسٹر، سید ارادت حسین، سید وزارت حسین۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میرزا غلام احمد قادیانی مرحوم (ف: مئی ۱۹۰۸ء) نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ بہار میں ان کے مسلک کے پرجوش اور مستعد مبلغ مولوی سید عبدالماجد

(مدرس فارسی ٹ، ان، گ، کالج، بھاگلپور) تھے۔ چھوٹے دونوں بھائیوں نے ان کی دعوت قبول کرلی اور احمدی ہوگئے۔ سب سے بڑے بھائی سید خلافت حسین نے اگرچہ احمدیت قبول نہیں کی، لیکن وہ بھی اس کے مخالف نہیں تھے۔ احمدیت نے قرآن وحدیث کے مطالعے اور اسلام کی تبلیغ اور افہام وتفہیم پر جتنا زور دیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں بھائیوں کے احمدیت میں داخل ہوجانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ گھر میں صبح وشام قال اللہ وقال الرسول کا چرچا رہنے لگا، شعائرِ اسلام کی تحریم وتکریم اور پابندی ہر کہ ومہ کا شعار بن گئی؛ اور ہر وقت تبلیغ واحیاے اسلام کے منصوبے بننے لگے۔

یہ تھا وہ ماحول، جب سید وزارت حسین کے ہاں جمعہ ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء پہلوٹھا بیٹا پیدا ہوا۔ ان کی والدہ اس وقت اپنے میکے کاکو (ضلع گیا) میں تھیں، وہیں یہ ولادت ہوئی تھی۔ بچے کا نام اختر احمد رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر اختر اورینوی کے نام سے سپہرِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔

سید وزارت حسین کا نکاح کاکو (ضلع گیا) کے رئیس سید عبدالعزیز کی صاحبزادی خدیجہ (عرف شمسو) سے ہوا تھا۔ خدیجہ کی نانھیال آرہ (ضلع شاہ آباد) میں تھی۔ ان کے نانا سید نورالحسن حکومتِ وقت کے عہدیدار تھے، اور ان کا نجابت و شرافت اور دینی ودنیوی اعتبار سے بہار کے اعلیٰ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔

خدیجہ کے بطن سے ان کے تین بچے ہوئے: اختر احمد، فضل احمد (موجودہ انسپکٹر جنرل پولیس، بہار) اور ایک لڑکی۔ ۱۹۲۵ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ دن بعد انھوں نے نکاح ثانی کیا۔ یہ دوسری بیوی متذکرۂ صدر مولوی سید عبدالماجد کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے بھی ماشاء اللہ کئی بچے ہوئے۔

اختر کی ابتدائی تعلیم سراسر گھر پر ہوئی۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی، انگریزی کی تحصیل اپنے والد، والدہ، اور چچا ابا سے کی۔ پھر اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور بالآخر ضلع اسکول، مونگیر سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند درجۂ اول میں حاصل کی اور وظیفہ کے حقدار ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سائینس کالج، پٹنہ میں پہنچے اور ۱۹۲۸ء

میں انٹر (سائنس) کا امتحان پاس کیا اور اب کے بھی وظیفہ پایا۔ چونکہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے، اس کے بعد میڈیکل کالج، پٹنہ میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے تیسرے ہی سال ان پر سل کا شدید حملہ ہوا، جس سے انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ علاج کے لیے آبائی وطن اورین کا فیصلہ ہوا۔ لہٰذا وہ دیہات کی کھلی ہوا میں چلے گئے۔ اگلے دو برس اسی فضا میں گزرے جہاں انھیں کھیتی باڑی، شکار اور سیر و تفریح یا کتب بینی کے علاوہ اور کسی کام سے سروکار نہیں تھا۔ شکر ہے کہ مکمل آرام اور علاج معالجے سے ان کی صحت بحال ہوگئی۔ ۱۹۳۲ء میں واپس آ کر وہ پٹنہ کالج کے بی اے کے درجے میں داخل ہوگئے کیونکہ معالجوں نے حکم دے دیا تھا کہ اب یہ کوئی ایسا نصاب نہ لیں جس میں زیادہ محنت درکار ہو، لہٰذا بادلِ ناخواستہ ڈاکٹری کی تعلیم ترک کر کے بی اے (انگریزی آنرز) پر اکتفا کرنا پڑی۔

۱۹۳۴ء میں عین امتحان کے زمانے میں سل کا دوسرا حملہ ہوا اور اتنا شدید کہ خون تھوکنے لگے۔ لیکن آفرین ہے ان کی قوتِ ارادی کو کہ اب کے انھوں نے ہتھیار ڈال دینے سے انکار کر دیا۔ وطن میں کسی کو بیماری کی اطلاع نہ دی اور برف چوس چوس کر امتحان کے پرچے لکھتے رہے۔ امتحان کے کمرے کے باہر ان کے ایک دوست تعینات تھے، جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے انھیں برف کے ٹکڑے اور سنگتروں کا عرق بھجواتے رہے۔ بارے، خدا نے ان کی لاج رکھ لی، اور انھیں امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن صحت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ نہ صرف آگے تعلیم جاری رکھنا محال تھا، بلکہ ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم میں قیام کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ڈیڑھ سال رانچی کے قریب اٹکی اسپتال میں گزارا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کا شکیلہ سے نکاح ہو چکا تھا۔ وہ ان کے ساتھ رہیں۔ ان کی رفاقت، دلسوزی اور خدمت اور تیمارداری میں خدا نے برکت دی، اور یہ تندرست ہو کر واپس آئے، لیکن ایک پھیپھڑا وہیں اسپتال کی نذر ہو گیا۔

اٹکی سینی ٹوریم کا قیام اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے کمیونزم کا عمیق مطالعہ کیا اور مغربی ادبیات سے بھی وسیع واقفیت بہم پہنچائی۔ انھوں نے ایم اے (اردو) کی تیاری بھی وہیں بستر پر لیٹے لیٹے کی۔ القصہ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے

ایم اے (اردو) درجہ اول میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں بھی اول رہے؛ سونے کا تمغہ انعام میں ملا۔
یہی وہ زمانہ ہے جب ملک میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بلند ہوا۔ اختر بھی اس میں شامل ہو گئے، بلکہ وہ پٹنہ کی شاخ کے نائب صدر چنے گئے تھے۔ جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے، تو انھیں اس عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔
انھوں نے ۱۹۵۶ء میں ایک تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو ادب کا ارتقاء" لکھا جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی سند عطا ہوئی۔ وہ رفتہ رفتہ ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر بن گئے تھے۔ پھر جب ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر لی، تو اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی پروفیسر بنا دیے گئے۔ یہاں سے اگست ۱۹۷۲ء میں بیماری کے باعث قبل از وقت سبکدوش ہو گئے۔
ان کی صحت، جیسا کہ ذکر ہوا، ۱۹۳۱ء میں بہت خراب ہو گئی تھی۔ یہ زمانہ انھوں نے اورین اور اردل (ضلع گیا) میں گزارا تھا۔ اردل میں ان کا ماحول بہت رومان انگیز تھا؛ دریائے سون کا کنارہ اور اس کے قدرتی نظارے، بڑے دلکش ثابت ہوئے۔ اختر کی ایک پھوپھی زاد بہن اردل کے رئیس شاہ محمد توحید کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ اب بیماری کے ایام میں وہ اردل میں رہے تو ان کا شاہ توحید کے خاندان سے ربط ضبط المضاعف ہو گیا۔ آدمی تھے حسین وجمیل، اس پر پڑھے لکھے اور رلسان، سب چھوٹے بڑے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ خاندان کی لڑکیاں (اور ان کی کھیپ کی کھیپ تھی) ان کے گرد جمع ہو جاتیں، اور یہ ان کے درمیان بیٹھے، راجہ اندر بنے، فلسفہ بگھارتے رہتے۔ ایسی فضا شعر و شاعری کے لیے بہت سازگار ثابت ہوتی ہے۔ اختر کی متعدد رنگین اور رومانی نظمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ جوانی تو "دیوانی" مشہور ہی ہے۔ القصہ ۱۲ مئی ۱۹۳۳ء کو شاہ محمد توحید کی بڑی صاحبزادی شکیلہ سے ان کا نکاح ہو گیا۔ افسوس کہ وہ اولاد سے محروم رہے۔ شکیلہ خود بھی ادب کے میدان میں غیر معروف نہیں؛ شکیلہ اختر کے نام سے افسانے لکھتی ہیں، اور ان کے بعض مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔

ددھیال

اختر کے ددھیال کی خصوصیات کا ان کے کردار کی تشکیل میں نمایاں حصہ ہونا ہی چاہیے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات اور نظریۂ حیات کے ارتقا میں اولاً ان کی ننھیال کا اور اس کے بعد تعلیم احمدیت (اور اس میں بھی بالخصوص جماعت کے خلیفۂ ثانی حضرت میرزا بشیرالدین محمود احمد مرحوم) کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اختر کی صحت بچپن ہی سے خراب رہی۔ آٹھ سال کے تھے کہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ صورت حال بہت تشویشناک تھی۔ ان کے والد سیّد وزارت حسین نے عہد کیا کہ اگر یہ بچ گئے تو وہ انھیں دینی خدمت کے لیے وقف کر دینگے۔ خدا نے انھیں شفا دی۔ اس کے بعد انھیں رخسار کی ہڈی میں ناسور کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ عمل جراحی ہوا اور یہ اس سے بھی بچ نکلے۔ والد کی منّت کے پیش نظر ڈاکٹر بننے کا عزم کیا کہ آزادانہ زندگی بسر کرینگے اور یکسو ہو کر خدمتِ دین میں لگے رہینگے۔ میڈیکل کالج میں سل کا موذی مرض آ لگا۔ پھر وجع مفاصل کی شکایت پیدا ہو گئی۔ غرض ساری عمر مختلف عوارض کی آماجگاہ بنے رہے۔ لیکن ہمیشہ ان کے مدنظر اپنے والد کا عہدِ وقف رہا۔ امام جماعتِ احمدیہ نے ۱۹۳۹ء میں اپنے متبعین سے مطالبہ کیا کہ وہ خدمتِ دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں اور اپنے ترکہ میں سے ایک مقررہ حصے کی دینی کام کے لیے وصیت کریں۔ اختر اپنے خاندانی ماحول میں کتنے پکے مذہبی آدمی تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شروع میں وہ اپنا نام سیّد اختر احمد احمدی لکھتے تھے اور نہ صرف اس پر اصرار کرتے، بلکہ فخر محسوس کرتے تھے۔ امام جماعت کے اس اعلان پر انھوں نے وصیت کی (وقف تو پہلے ہی سے موجود تھا) انھوں نے قرآن کا اور اپنے سلسلے کا مطالعہ خاص طور پر کیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ جب میرے دل میں کمیونزم کے وسیع مطالعے کے نتیجے میں مخفی طور پر دہریت اور الحاد کے جراثیم سرایت کرنے لگے، تو میرزا بشیرالدین محمود احمد مرحوم (ف: نومبر ۱۹۶۵ء) کی تفسیر کبیر راہِ ہدایت ثابت ہوئی۔ کمیونزم کی ریڑھ کی ہڈی اس کا اقتصادی منصوبہ ہے، جسے وہ ساری دنیا میں رائج کرنے کا پرچار کرتے ہیں۔ اختر ۱۹۴۲ء میں اپنے امام کے پاس قادیان گئے، اور ان سے اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ جس کے بعد موصوف نے

اپنے دو سالانہ خطبوں میں ان مسائل پر اسلامی تعلیم وضاحت سے بیان کی۔ بعد کو یہ دونوں خطبے کتابی شکل میں "نظامِ نو" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کے مطالعے نے اختر کے تمام شکوک دور کر دیے، اور وہ کمیونزم کے جنگل سے رہا ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں وہ سخت اعصابی مرض میں مبتلا ہو گئے اور دراصل اسی باعث انھیں اگست ۱۹۷۲ء میں صدارتِ شعبہ کے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ شکایت یہ تھی کہ ان کا جبڑا مسلسل حرکت کرنے لگا تھا، جس سے وہ ٹھیک سے بات تک نہیں کر سکتے تھے۔ جب پٹنے اور رانچی کے ماہر ڈاکٹروں کے مشورے سے کوئی افاقہ نہ ہوا، تو وہ بغرضِ علاج کینیڈا چلے گئے، جہاں ان کے ایک بھائی ڈاکٹر ہیں۔ وہاں تقریباً چھ مہینے قیام رہا، لیکن چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ واپس چلے آئے۔ آخری چھ سات سال اسی اذیت ناک تکلیف میں گزرے۔ یہاں ہندستان میں بھی علاج معالجے میں کوئی کمی نہیں ہوئی، لیکن صحت بحال ہونا تھی، نہ ہوئی۔ اسی میں شبِ ۳۰/۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء میں آدھی رات کے بعد تقریباً ایک بجے (یعنی جمعرات ۳۱ مارچ/۱۰ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ کے اولین وقت) اسپتال میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

موصی کی حیثیت سے وہ قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میت قادیان گئی اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ ان کے دیرینہ دوست پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی نے نثر میں تاریخ کہی:

افسوس، چہکتا ہوا بلبل نہ رہا — رونق گئی گلزارِ ادب کی، صد حیف
اختر جو ادب کا اخترِ تاباں تھا — تھا ذہن رسا جس کا، زباں جس کی سیف
تنقید بھی، تحقیق بھی، افسانہ بھی — اشعار بھی ہوتے تھے نہایت پُر کیف

فکرِ تاریخ میں تھا افسردہ قلم
آئی یہ صدا غیب سے: "حیف اختر حیف" ہے
(۱۳۹۷)

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، شکیلہ اختر سے ان کی شادی عشق کا نتیجہ تھی۔ یہ انھیں پیار سے اختر کی جگہ) تارہ یا تارن (تارد) کہا کرتی تھیں۔ انھوں نے اس حادثے سے متاثر ہو کر چند شعر کہے ہیں؛ شعر کیا ہیں، ایک غمزدہ اور دکھی دل کی کراہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ انھیں محفوظ کر دیا جائے :

جو لرز رہے تھے اب تک، در و بام زندگی کے
وہ گھنڈر سنا رہے ہیں بڑے درد کا فسانہ
وہ بہت تھکا ہوا تھا، اُسے نیند آگئی ہے
نہ سلا سکی تھی جس کو کبھی گردشِ زمانہ
بڑے غم کی داستاں تھی، بڑے کرب کی کہانی
دلِ دردمند تڑپ کر جو بنا تھا اک ترانہ

جو بھنور سے کھیلتا تھا، رہا غم میں مسکراتا
جو جلا تھا آندھیوں میں، وہ چراغ بجھ چکا ہے
یہ فضا دھواں دھواں ہے، کہ جلا ہے آشیانہ
جہاں بجلیاں گری تھیں، وہ چمن سلگ رہا ہے
میرا کعبۂ محبت، میری ہر خوشی کا مرکز
میرا کاروانِ اُلفت، سرِ شام ہی لٹا ہے
اسے آہ! کیسے ڈھونڈوں، کہ ہے سب جہاں اندھیرا
انھی رفعتوں سے آگے، اختر میرا گیا ہے

مرحوم نے اردو زبان کی جو بیش بہا خدمت کی ہے، وہ بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی پندرہ بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک ڈراما، اور بیسیوں افسانے ہیں؛ ایک ناول بھی ہے؛ تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے ہیں؛ تحقیقی مقالہ ہے؛ شعری تخلیقات کا ایک مجموعہ ہے۔ غرض ہر صنف کلام میں ان کے کارنامے موجود ہیں۔ غیر مطبوعہ تحریریں بھی کچھ کم نہیں۔ ایسے خادمِ ادب اور مربیِ زبان کو کون بھلا سکتا ہے!

فضا شمسی، محمد صدرالدین، سید

ریاست بہار کا قصبہ بہار شریف اس لحاظ سے مشہور اور متبرک و مقدس بھی ہے کہ یہاں آٹھویں صدی کے مشہور صوفی مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا مزار ہے۔ اسی بہار شریف میں محمد صدرالدین ایک متوسط گھرانے میں ۱۷ مئی ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ تین مہینے کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی تربیت اور دیکھ بھال کا فرض ان کے بڑے بھائی (ڈاکٹر) نجم الدین احمد پر آ پڑا، جو انھوں نے پوری ذمہ داری سے نبایا۔

خاندان اپنے ماحول کے باعث مذہبی تھا، اس لیے جب یہ سنِ شعور کو پہنچے، تو چند سے گھر پر پڑھنے کے بعد مقامی مدرسۂ عزیزیہ میں دینیات اور عربی کی تحصیل کے لیے بھیج دیے گئے۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں "مولوی" کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنہ چلے آئے اور مشہور مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال بعد ۱۹۳۲ء میں یہاں سے "عالم" کا امتحان پاس کیا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ جو "شمسی" کی نسبت لکھتے تھے، یہ اسی سند کے باعث تھی۔

"عالم" کی سند لینے کے بعد وہ سال بھر کے لیے وطن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انگریزی کے دسویں کی تیاری کی اور ۱۹۳۳ء میں میٹرک پاس کر لیا۔ واپس آ کر پٹنہ کالج میں داخل ہو گئے، جہاں سے ۱۹۳۶ء میں بی اے کا امتحان فرسٹ کلاس عربی آنرز کے ساتھ پاس کیا۔ اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی میں عربی میں ایم اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، اور ایسے تمام طلبہ کو وظیفہ دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا جاتا تھا۔ چنانچہ محمد صدرالدین بھی علی گڑھ چلے آئے، اور یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۸ء میں ایم اے (عربی) کی درجۂ اول کی سند حاصل کی۔

اگلے تین چار برس تلاشِ روزگار میں سرگرداں رہے۔ عارضی طور پر دو تین جگہ کام کیا، لیکن کہیں مستقل صورت پیدا نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کا نام ڈپٹی کلکٹری

کے لیے منظور ہو گیا تھا، لیکن یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور حکومتِ وقت کو فوجی خدمات سر انجام دینے والوں کی دلدہی اور خوشنودی مدِ نظر تھی۔ اعلان ہوا کہ نصف اسامیاں جنگ سے واپس آنے والے موزوں امیدواروں کو دی جائینگی۔ چونکہ مسلمانوں کے لیے صرف دو جگہیں مخصوص تھیں، لہٰذا محمد صدر الدین سے اوپر کے مسلمان کو جگہ مل گئی اور انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس پر بڑی حیص بیص کے بعد انھوں نے سب ڈپٹی کلکٹری قبول کر لی۔ لیکن سرکاری ملازمت کے ماحول اور مقتضیات کو اپنے میلانِ طبع کے منافی دیکھ کر وہ جلد ہی اس سے مستعفی ہو گئے۔

اس دوران میں انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے پہلے فارسی اور پھر اردو ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا تھا۔ ملازمت کا جوا اتار پھینکنے کے بعد انھوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اولاً تھوڑی مدت کے لیے گیا اور مظفر پور کے کالجوں میں فارسی اور اردو کے مدرس رہے؛ اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں مستقلاً پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو میں مدرس مقرر ہو گئے۔ یہاں انھوں نے تدریس کے علاوہ تحقیق پر بھی توجہ کی۔ شاہ آیت اللہ جوہری کے حالات جمع کیے اور ان کی مثنوی گوہرِ جوہری کو مرتب کیا؛ اور "شاہ آیت اللہ جوہری: حیات اور شاعری" کے عنوان سے مقالہ لکھا، جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی سند عطا ہوئی۔

جب بہار ایجوکیشنل سروس کی طرف سے شعبۂ اردو میں درجۂ اوّل کی ایک اسامی کا اعلان ہوا، تو سب سے پہلے اس پر اختر اورینوی کا تقرر ہوا، جو اس وقت صدرِ شعبہ تھے۔ جب ۱۹۶۰ء میں وہ یونیورسٹی پروفیسر مقرر ہو گئے، تو ان کی جگہ محمد صدر الدین صاحب کو ملی۔ یہی ۱۹۷۲ء میں بھی پیش آیا، یعنی اختر اورینوی کے سبکدوش ہونے پر یہ ان کے جانشین ہوئے۔

پٹنہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں وہ چند مہینے کے لیے عارضی طور پر اس کے پرنسپل بھی رہے۔ جب ۱۹۷۳ء میں بہار اردو اکاڈمی قائم ہوئی، تو وہی اس کے پہلے سکتر بھی تھے؛ وہ اس عہدے پر دو سال تک رہے تھے۔

ان کی موت اچانک اور حیرتناک حالات میں ہوئی :
۳۰/۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء کی شب میں اختر اورینوی مرحوم کا انتقال ہوا تھا۔ ۳۱ مارچ کو ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں محمد صدرالدین کئی مرتبہ مرحوم کے مکان پر گئے۔ اسی شام پٹنہ ریڈیو نے اختر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کو ان کے چند دوستوں کو مدعو کیا۔ ان میں محمد صدرالدین بھی تھے۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا خاتمہ اس شعر پر کیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے !
آج وہ، کل ہماری باری ہے

ریڈیو پر تقریر کرنے کے بعد وہ پھر اختر مرحوم کے مکان پر گئے، جہاں ان کی لاش کو تابوت میں رکھ کے قادیان لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ وہ ایک زمانے سے فشارِ دم (ہائی بلڈ پریشر) کے مریض تھے۔ دن بھر کوفت اور پریشانی میں گزرا تھا۔ اب جو انھوں نے یارِ دیرینہ کی لاش کو آخری مرتبہ دیکھا، تو تاب نہ لا سکے۔ سر چکرایا، اور طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً انھیں مکان پر پہنچایا گیا۔ ان کے ایک صاحبزادے خود ڈاکٹر ہیں، انھوں نے کچھ فوری علاج کیا اور انھیں اسپتال لے گئے۔ وہیں شب میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اگلے دن جب اس غیر متوقع اور ناگہانی حادثے کا اعلان ہوا، تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ بعض لوگوں نے اسے اپریل فول خیال کیا۔ دوسروں کو یہ شبہہ ہوا کہ غلطی سے اختر اورینوی کی جگہ محمد صدرالدین کا نام لیا جا رہا ہے۔

عطا کاکوی نے ہجری میں قطعۂ تاریخِ وفات کہا :

کل ہی اختر کو رو چکے تھے سب	آج یہ صدرِ دین کا غم ہے
زندگی میں رفیق تھے دونوں	مرنے پر بھی یہ ربط باہم ہے
موت کیسی ہوئی اچانک، ہائے	یہ خبر سن کے غم سے سر خم ہے
مل رہے ہیں سبھی کفِ افسوس	اور اشکوں سے آنکھ پُرنم ہے
کتنوں کو تو یقیں نہ ہوتا تھا	کتنا گیسوے اردو برہم ہے

صد افسوس کو جھکا نے کے عطا !
بولا ہاتف: "فضا کا ماتم ہے"
(۱۳۹۸-۱=۱۳۹۷)

محمد صدرالدین نے دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ اس بیوی سے دو بچے ہوئے: ایک بیٹا ایک بیٹی۔ لیکن اس بیگم سے نباہ نہ ہو سکا اور علیحدگی ہوگئی۔ دوسری بیگم سے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔
محمد صدرالدین مرحوم نے شعر گوئی مدرسۂ عزیزیہ کی طالب علمی کے زمانے ہی میں شروع کر دی تھی۔ شروع میں کلام پر چند دن حافظ شفیع فردوسی سے اصلاح لی۔ اس زمانے میں یہ ہلال تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کے دوست محمد یحییٰ (آبگلہ، گیا) کا بھی یہی تخلص ہے، تو اسے ترک کر کے فضا تخلص اختیار کیے۔ پٹنہ آ گئے تو یہ شوق یہاں بھی جاری رہا۔ اس زمانے میں نوح ناروی (ف: اکتوبر ۶۲ ۱۹ء) کا پٹنے کا اکثر پھیرا رہتا تھا۔ فضا بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو چار غزلوں پر ان سے اصلاح لی۔ پٹنہ کالج کی طالب علمی کے دور میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر عظیم الدین احمد، بیدل اور شمر آروی سے بھی کچھ مشورہ رہا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، نہ کسی سے زیادہ اصلاح لی۔ شروع میں زیادہ توجہ نظم کی طرف رہی، بعد کو غزلیں بھی کہنے لگے۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نکہت و خلش" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (پٹنہ: ۱۹۷۴ء)۔ نظموں کا مجموعہ "شگفتہ کانٹے" کے نام سے تیار تھا؛ معلوم نہیں، اب اس کا کیا حشر ہوتا ہے!

اشک سنبھلی، محمد ظفر، سید

۱۹۱۴ء میں سنبھل کے ایک معزز اور صاحبِ علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید امراؤ علی مرحوم وہاں کے ممتاز عالم اور فارسی کے استاد تھے۔ محمد ظفر کے نانا سید محمد شاہ مرحوم ماہر ریاضیات تھے، شعر بھی کہتے تھے، ان کا دیوان موجود ہے۔

افسوس کہ محمد ظفر کی تعلیم ناقص رہ گئی۔ کچھ خاندانی ماحول کا اثر، کچھ دوست احباب کی صحبت کی بدولت، جلد ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ چندے ظفر تخلص کیا، بعد کو اشک اختیار کر لیا۔ مشورہ محفوظ سنبھلی سے رہا اور جب ان سے اصلاح لینا ترک کر دی، تو جو کچھ کہتے خود ہی اسے بنظر اصلاح دیکھ لیتے۔ غزلوں کا مجموعہ "امواجِ تغزل" ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔

دوشنبہ ۴ اپریل ۱۹۷۷ کو بعدِ ظہر سنبھل میں انتقال ہوا۔

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر : امرت لال ؛ مترجم : رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے، وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر۔ آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا جڑا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۲۶/۷۵ روپے

ہندی کے یک بابی ڈرامے : مرتبہ چندرگپت ودیالنکار؛ مترجم ڈاکٹر محمد محسن

زیرِ نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈراموں کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے۔ اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈرامانگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔ قیمت ۱۲/۵۰ روپے

میلا آنچل : پھنیشور رینو ؛ مترجم : سلمیٰ صدیقی

یہ ہے "میلا آنچل" ایک ناول مقامی رنگ لیے ہوئے۔ اس میں پھول بھی ہیں، اور کانٹے بھی؛ دھول بھی ہے اور گلال بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ان میں سے کسی سے بھی دامن بچا کر نہیں نکل پاتا۔ میلا آنچل عالمی ناول کہا جا سکتا ہے۔ قیمت ۱۸/۷۵ روپے

راگ درباری : شری لال شکلا ؛ مترجم راشد سہسوانی

"راگ درباری" کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے۔ یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے۔ مختلف طرز کے پلاٹ، ایک نئی تکنیک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول۔ قیمت ۱۵/۵۰ روپے

تقسیم کار :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دلّی ۲۵

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

(۴۱)

مرتّب : مالک رام

جلد ۱۱ جولائی / ستمبر ۱۹۷۷ء شمارہ ۳

ضیا فتح آبادی نمبر

چندہ سالانہ : ہندوستان پندرہ روپے اس شمارے کی قیمت پندرہ روپے

غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ، ۸ ڈالر (امریکی)

پرنٹر و پبلشر ظلِ عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلی میں چھپوا کر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا

ملاحظات

حسبِ وعدہ ہم "تحریر" کا یہ شمارہ خاص نمبر کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ اس میں جناب مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کی شخصیت اور شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہم نے شروع سے یہ لائحۂ عمل مدِ نظر رکھا کہ زندہ ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ اردو کا ماحول بیشتر مردہ پرست رہا ہے؛ ہم ہنوز اپنے معاصروں کو ان کا حق ادا کرنے میں بخل سے احتراز نہیں کر سکے۔ یہ نہ صرف معاصر ادیب سے ناانصافی ہے، بلکہ ہماری اپنی کوتاہ فہمی کا بھی کھلا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویّہ ادب کی ترقی کے رستے کا روڑا ثابت ہو سکتا ہے؛ اور ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک، زبان کے ہر بہی خواہ کو اس سے اجتناب لازم ہے۔ وما توفیقنا الّا باللہ العظیم۔

یہ پرچہ مجبوراً کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، جس کے لیے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ اس کے بعد کا سالِ رواں کا آخری شمارہ بھی بالکل تیار ہے، اور اس کے متعاقب حاضرِ خدمت ہو رہا ہے۔

مالک رام

سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس، دلّی: ۲۷

ضیا فتح آبادی

شخص اور شاعر

مرتّبہ

مالک رام

علمی مجلس، دلّی

۱۹۷۷ء

ضیا فتح آبادی: شخص اور شاعر

مرتّب : مالک رام
مطبع : جمال پرنٹنگ پریس، دلّی
اشاعت: ستمبر ۱۹۷۷ء
تقسیم کار: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلّی، دلّی، بمبئی، علی گڑھ
قیمت : پندرہ روپے

فہرست

جوش ملیح آبادی

مہر لال ضیا فتح آبادی

(۱)

حضرت ضیا میرے قدیم احباب میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت و شاعری سے میں ہمیشہ مانوس رہا ہوں۔

ان کی شاعری میں سنجیدگی ہے، ان کے طرز بیان میں رس اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ یہ عام شعرا کے مانند ردیف اور قافیے کے حدود میں رہ کر، روایتی شاعری سے ہمیشہ دامن بچاتے اور عروس شعر کو اپنی تخیل کے زیوروں سے سجاتے ہیں۔

یہ بڑی بدبختی ہے کہ ضیا صاحب بینک کے دامن خشک سے وابستہ ہیں، جہاں روپے، آنے، پائی کے حسابات سے دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر قدرت ان کو اس قدر مضبوط دل و دماغ عطا نہ فرماتی، تو وہ ناموزوں ہو کر رہ جاتے۔ یہ دراصل ایک معجزہ ہے کہ وہ اس جھلسا دینے والے ماحول میں رہ کر نسیم و شمیم سے کھیلتے رہتے ہیں۔

میری دلی تمنا ہے کہ ارباب ذوق ان کے مرتبۂ سخن کو سراہیں اور ان کی شاعری کو سر آنکھوں پر بٹھائیں۔

جوش

۲۴ مئی ۱۹۶۵ء دہلی شریف

(۲)

مہر لال صاحب ضیا، میرے قدیم احباب میں سے ہیں، یعنی اتنے پرانے دوست ہیں کہ اگر کوئی

اتنا پرانا دشمن بھی مل جائے، تو اس کو کلیجے سے لگا لینا چاہیے۔

رہی ضیا صاحب کی شاعری، سو اس کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام میں خوشگوار سنجیدگی، لوچ اور رس پایا جاتا ہے، وہ اس قدر دلنشین ہوتا ہے کہ روح جھومنے لگتی ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ ان کے کلام کی ارباب ادب و علم قدر کریں اور اسے سر آنکھوں پر جگہ دیں!

مرحوم جوش

مالک رام

ضیا فتح آبادی
(مختصر سوانح حیات)

پنجاب میں امرتسر سے ریلوے لائن پر ترن تارن اسٹیشن سے تقریباً ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر گوبند وال کے راستے میں ایک خاصا بڑا قصبہ فتح آباد ہے۔ یہی قصبہ مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کے بزرگوں کا وطن ہے، اور اسی سے وہ خود کو منسوب کرتے ہیں۔ اس کی تحقیق تو نہیں ہو سکی کہ یہ خاندان فتح آباد میں کب سے آباد ہے، لیکن موجودہ معلومات کی رو سے یہ متحقق ہے کہ ۱۷۳۰ء میں ان کے مورثِ اعلیٰ لالہ باولی داس کے پوتے لالہ تن سکھ رائے وہاں موجود تھے۔ ممکن ہے کہ بعض افراد نے ملازمت بھی کی ہو، لیکن عام طور پر ساہوکارہ اور زمینداری بسر اوقات کا ذریعہ تھے؛ ضرورتمند اصحاب کو سود پر قرض دیا جاتا اور یہی سود کی آمدنی خاندان کے اُجلے خرچ کے لیے کفایت کرتی۔

لالہ باول داس کی ساتویں پشت میں ایک صاحب تھے لالہ تارا چند؛ یہ ضیا کے دادا تھے۔ انھوں نے ساہوکارہ کے ساتھ بزازی کی دکان بھی کر لی تھی۔ ان کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے، لالہ منشی رام اور لالہ درگا داس؛ اور ایک بیٹی اتنی ہوئے۔ یہی بڑے بھائی لالہ منشی رام، ضیا کے والدِ بزرگوار تھے۔

لالہ منشی رام پیشے کے لحاظ سے سول انجینیر تھے۔ مغربی پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات میں رسول کے مقام پر مشہور انجینیرنگ اسکول تھا (غالباً اب بھی ہو گا)؛ یہاں سے دو سالہ نصاب

پورا کرنے پر اُس دور میں سند ملتی تھی۔ اس اسکول کے فارغ التحصیل اصحاب محکمۂ انہار اور حکومت وقت کے دوسرے دفتروں مثلاً پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ وغیرہ میں ملازم ہو جایا کرتے تھے۔ لالہ منشی رام بھی ۱۹۰۹ء میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ میانوالی (۱۹۰۹ء۔۱۹۱۴ء)، الور (۱۹۱۵۔۱۹۱۶ء)، پشاور چھاؤنی (۱۹۱۷۔۱۹۲۲ء) جیپور (۱۹۲۴۔۱۹۲۷ء) وغیرہ پشاور چھاؤنی کی ملازمت کے زمانے میں وہ کابل بھی گئے، جہاں چھ مہینے تک قیام رہا لیکن وہ عجیب مَن موجی آدمی تھے۔ طبیعت میں سیمابیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جب جی چاہا، نوکری کا جوا اتار پھینکا، اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگے آج یہاں کل وہاں۔ جہاں جی چاہا، نوکری کر لی جب کہیں سے دل اُچاٹ ہو گیا، استعفیٰ داخل کر دیا اور کسی اور شہر کی راہ لی۔ کچھ دن جوگندر نگر کے پن بجلی کے کارخانے میں بھی کام کیا، دیوبند اور سکھوتی ٹانڈہ کی شوگر فیکٹری میں بھی ملازم رہے۔ ان کا ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا۔

لالہ منشی رام کی شادی کپور تھلہ کے لالہ مول راج پوری کی منجھلی صاحبزادی شنکر دیوی سے ہوئی تھی۔ کپور تھلہ کے پوری خاندان کا پنجاب کے سربرآوردہ گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ مشہور دیوانی وکیل رائے بہادر بدری داس پوری اور دیوان بہادر کانشی رام پوری، دونوں بھائی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، یہ دونوں لالہ مول راج پوری کے حقیقی بڑے بھائی لالہ میگھ راج کی اولاد تھے۔ خود لالہ منشی رام کے بڑے چچا لالہ گردھاری لال کے بیٹے رائے صاحب لالہ گنگا رام ڈسٹرکٹ اور سشن جج کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔

لالہ مول راج بھی سرکاری ملازم تھے۔ وہ اولاً نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے مرتبے تک پہنچے، جو اس عہد میں بڑا قابل قدر عہدہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس صدی کے آغاز میں وہ یہیں دلّی میں افسر مال کی حیثیت سے تعینات رہے تھے۔

لالہ منشی رام کے تین بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ مہرلال ضیا بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ان سے چھوٹے لڑکے کا صغر سنی میں جل جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ ان سے دو چھوٹے

بھائی گجندر لال (ولادت: ۱۹۲۰ء) اور سریندر لال (ولادت: ۱۹۲۲ء) بفضلہ زندہ وسلامت
موجود ہیں۔ بہنیں تینوں ان سے بڑی تھیں۔ ان میں سے دو کا انتقال ہو چکا ہے۔ تیسری (شریمتی
جانکی دیوی) اپنے گھر بار والی اور خوش وخرم ہیں۔

مہر لال سونی اتوار ۹ فروری ۱۹۱۳ء اپنی ننھیال کپورتھلے میں پیدا ہوئے۔ جب سن شعور کو
پہنچے اور تعلیم کے آغاز کا زمانہ آیا، تو اس وقت ان کے والد لالہ منشی رام پشاور چھاونی میں تھے۔
چنانچہ ۱۹۲۰ء میں انھیں مقامی خالصہ مڈل اسکول میں داخلہ ملا؛ پرائمری کے درجوں کی تعلیم
اسی اسکول میں پائی۔ ۱۹۲۴ء میں والد نے جے پور کی راہ لی، تو انھیں بھی خاندان کے ساتھ
وہاں جانا پڑا۔ پرائمری تک کی پڑھائی پشاور میں ہو چکی تھی۔ جے پور میں مہاراجا ہائی اسکول
میں داخلہ لے لیا۔ بارے اگلے چار سال لالہ منشی رام نے جم کر جے پور میں گزارے۔ یہ نویں
کا امتحان پاس کر چکے تھے کہ انھوں نے جے پور سے امرتسر جانے کی ٹھان لی۔ مہر لال کے لیے بھی
امرتسر جانے سے ایک سال کا نقصان تھا، اس لیے یہ جے پور ہی میں رہے۔ ایک کمرہ کرایے پر
لے لیا اور نوکر کے ساتھ رہنے لگے۔ دسویں کی سند ۱۹۲۹ء میں جے پور ہی سے حاصل کی۔
آگے اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں لامحالہ کسی بڑے شہر جانا تھا۔ بہت حیص بیص کے بعد قرعۂ فال
ہندو سبھا کالج، امرتسر کے نام پڑا اور یہ وہاں انٹر کے درجے میں داخل ہو گئے۔ انٹر کا امتحان
۱۹۳۱ء میں پاس کرنے کے بعد فورمین کرسچین کالج، لاہور چلے گئے، جہاں سے ۱۹۳۳ء میں
بی اے (فارسی آنرز) اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے (انگریزی) کی اسناد حاصل کیں۔

اب کسب معاش کا مرحلہ پیش آیا۔ اپنے کامیاب تعلیمی دور کے باعث اس میں چنداں
دشواری نہیں ہوئی۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں انھیں ریزرو بنک میں کلرک کی جگہ مل گئی۔
۱۹۵۲ء تک بنک کے دلی دفتر میں کام کیا۔ اس دوران میں ترقی کے مدارج بھی طے کرتے
رہے اور سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ بنکنگ افسر کی حیثیت سے بنک کے مدراس
دفتر میں ہو گیا۔ وہاں سے سات سالہ قیام کے بعد ۱۹۵۹ء میں واپس دلی آئے۔ ۱۹۶۶ء
میں اسسٹنٹ چیف افسر مقرر ہو کر بنک کے مرکزی دفتر بمبئی بھیج دیے گئے۔ تین برس بعد
اسی اسامی پر پھر نئی دلی آئے (۱۹۶۹ء) یہاں کچھ دن ڈپٹی چیف افسر کے عہدے پر بھی کام

کیا، اور بالآخر ۱۹۱۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔
بحمدہ تعالیٰ ملازمت کا پورا زمانہ نیکنامی اور عزت و وقار سے گزرا۔ جہاں رہے، اپنی دیانتداری، فرض شناسی اور کارکردگی کے باعث افسرانِ اعلیٰ اور ہمکاروں کے حلقے میں قدر و احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ابھی اسکول کے درجوں میں زیرِ تعلیم تھے، جب انھیں شاعری کی طرف توجہ ہوئی۔ ان کے والد لالہ منشی رام کو موسیقی کا بہت شوق تھا؛ وہ خود بھی گانے بجانے میں اچھے خاصے تھے۔ اسی باعث آئے دن گھر پر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یہ ضیا صاحب کی کمسنی کا اثر پذیر زمانہ تھا؛ ان روز مرہ کی رنگین محفلوں سے ان کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ شہر میں تھیٹریکل کمپنیوں کے پھیرے بھی ہر سال ہوتے تھے۔ لالہ منشی رام کو مفت داخلے کا پاس مل جاتا؛ مہرلال بھی والد کے ہمراہ ناٹک دیکھنے جاتے۔ فارغ اوقات میں ان گانوں کے مصرعے گنگنانے، جو انھوں نے گھر پر یا تھیٹر میں سنے تھے۔ اس سے رفتہ رفتہ خود شعر کہنے تک نوبت پہنچ گئی۔

جے پور کی تعلیم کے زمانے میں انھیں گھر پر اردو پڑھانے کے لیے ایک استاد رکھے گئے تھے، مولوی اصغر علی ان کا نام تھا۔ وہ شاعر بھی تھے، حیا تخلص تھا۔ انھیں دنوں ضیا بھی شعر کہنے لگے، تو انھوں نے حیا صاحب سے مشورے کی درخواست کی۔ مولوی اصغر علی نے بخوشی اصلاح دینا منظور کر لیا، اور انھیں عطا تخلص دیا، چنانچہ یہ بہت دن تک عطا تخلص ہی سے لکھتے رہے۔

جب ہند و سبھا کالج، امرتسر پہنچے، تو یہاں ان کی اپنی ننھیال کپورتھلہ کے ہومیوپیتھک ڈاکٹر شفاعت احمد تسنیم سے ملاقات ہوئی، جو ان کے خاندان کے خصوصی معالج تھے۔ ان ایام میں یہاں امرناتھ محسن کے وہاں ہفتہ واری طرحی مشاعرہ ہوتا تھا، جس میں مقامی شعرا جمع ہوتے، اور اپنا کلام سناتے تھے۔ تسنیم بھی ان مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ ضیا بھی ان کے

ساتھ جلنے لگے۔ پھر ڈاکٹر تسنیم ہی کے ذریعے سے ان کا غلام قادر فرخ سے تعارف ہوا۔ فرخ اپنے زمانے میں نقشہ بندی کے پُرجوش حامی اور پرچارک رہے ہیں، مدتوں "ہمپرس میگزین" ان کی زیر صدارت شائع ہوتا رہا۔ ضیا صاحب نے باقاعدہ فرخ کی شاگردی اختیار کر لی۔ فرخ ہی نے ان کا تخلص عطا سے ضیا کیا۔

یہی زمانہ ہے جب پنجابی کے مشہور شاعر مولا بخش کشتہ کے صاحبزادے محمد افضل اور پورن سنگھ ہنر نے مل کر امرتسر سے "ماہنامہ "چمن" جاری کیا۔ بعد کو دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ "چمن" ہنر نے لے لیا، اور افضل نے اپنا الگ پرچہ "چمنستان" جاری کر دیا۔ بہرحال، کہنے کی بات یہ ہے کہ ضیا کی پہلی غزل "چمن" (مارچ ۱۹۲۹ء) میں چھپی تھی؛ اس کا مطلع تھا،

کیا ٹھہر سکتا فروغِ روئے جاناں دیکھ کر
ہو گیا روپوش آخر مہرِ تاباں دیکھ کر

امرتسر کے دوران قیام میں ضیا نے تسنیم کے کہنے پر چند غزلیں حکیم فیروز الدین فیروز طغرائی (ف: فروری ۱۹۳۱ء) کو بھی دکھائی تھیں، لیکن مستقل تعلق فرخ ہی سے قائم رہا۔

ضیا کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ انھیں دردِ گردہ کی مزمن شکایت تھی۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر نے نسخے میں مارفیا لکھ دیا۔ اس سے انھیں بہت افاقہ ہوا۔ اس کے بعد جب کبھی ان پر درد کا دورہ پڑتا، وہ مارفیا کے لیے اصرار کرتیں۔ رفتہ رفتہ وہ مارفیا کی عادی ہو گئیں۔ اور جب مارفیا کسی مقامی دوا فروش کے ہاں دستیاب نہ ہوتا، تو اس کے حصول کے لیے ضیا کو لاہور جانا پڑتا؛ یہ وہاں سے ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ دکھا کر ٹیکے کی شیشیاں لے آتے۔ ٹیکا ان کی والدہ خود ہی لگا لیا کرتی تھیں۔ ان کا ۱۹۴۹ء میں دلی میں انتقال ہوا۔

ایک مرتبہ ضیا لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل رہے تھے کہ ان کی نظر سڑک کے کنارے پڑے مختلف رسالوں، اخباروں کے ڈھیر پر پڑی، جو کوئی شخص بیچ رہا تھا۔

یہ رک گئے اور پرچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان میں ماہنامہ "شاعر" (آگرہ) بھی تھا جو سیماب اکبر آبادی مرحوم (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں بعض شاعروں کے نام کے ساتھ سیمابی کی نسبت بھی چھپی تھی؛ سیماب مرحوم کے بیشتر شاگرد اپنے نام کے ساتھ سیمابی لکھا کرتے تھے۔ ضیا صاحب، فرخ کی اصلاح سے چنداں مطمئن نہیں تھے۔ اب جو انھوں نے "شاعر" اور اس میں متعدد "سیمابیوں" کے نام دیکھے، تو فوراً طے کر لیا کہ ان کا تلمذ اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ امرتسر واپس پہنچ کر انھوں نے سیماب مرحوم کی خدمت میں آگرے خط لکھا کہ میں فرخ کا شاگرد ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو جاؤں۔ سیماب صاحب کا جواب ملا کہ اگر آپ کے لیے فرخ کا تعلق منقطع کرنا ناگزیر ہی ہو، تو مجھے آپ کے کلام پر اصلاح کی ذمہ داری قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد یہ اپنا کلام بغرضِ اصلاح حضرت سیماب کی خدمت میں بھیجنے لگے۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۴۰ء میں استاد نے انھیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

اب تک ان کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ طلوع (میرٹھ ۱۹۳۴ء) اس میں ۵۷ قطعات ہیں۔ تعارف از ساغر نظامی

۲۔ نورِ مشرق (دلی ۱۹۳۷ء)۔ ۴۴ نظمیں اور ۷ گیت؛ آخر میں ۹ سانیٹ ہیں۔ اس کے شروع میں جوش ملیح آبادی اور آزاد انصاری اور منظر صدیقی کے تعارف شامل ہیں۔

۳۔ ضیا کے سو شعر (یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۴۔ نئی صبح (دلی ۱۹۵۲ء) درسی کتب کے سائز پر ۲۰۰ صفحات ہیں: ۴۸ رباعیات اور قطعات، اور ۲۶ غزلیں۔ آخر میں ۲۹ پابند اور آزاد نظمیں ہیں۔

۵۔ گردِ راہ (دلی ۱۹۶۳ء) رباعیات، نظمیں، گیت اور غزلیں۔ شروع میں ابر احسنی گنوری کا ایک مضمون اور خوشتر گرامی کا تعارف ہے۔

۶۔ حسنِ غزل (انبالہ ۱۹۶۶ء) غزلیات

۷۔ دھوپ اور چاندنی (لندن ۱۹۷۶ء) کلامِ شاعر، بقلمِ شاعر۔ اس میں ۵۰ غزلیں خود ضیا صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی عکس سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا، جس میں ۱۰۰ غزلیں ہیں۔

ضیا کی تربیت کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس پر جو استاد ملے، وہ بھی کلاسیکی انداز میں پختہ تھے۔ لہٰذا ان کا روایت کا پابند ہونا اور زبان و بیان کی صحت پر قدیم نقطۂ نگاہ سے نظر رکھنا چنداں باعثِ تعجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ عصری تحریکوں سے بھی بے تعلق نہیں رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے استاد سیماب خود نئے تجربوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ داغ کا شاگرد رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے پیچھے کتنا متنوع ذخیرۂ کلام چھوڑا ہے۔ ضیا کے ہاں بھی نظم اور رباعی، گیت اور سانیٹ ہر طرح کے تجربے وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ اور وہ ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کی غزل میں وہ پسردگی اور فنادگی نہیں ملتی، جو میر کا طرۂ امتیاز ہے (اور جو بعض کے نزدیک غزل کی امتیازی خصوصیت ہے) بلکہ اس کے مقابلے میں ان کے ہاں مردانہ پن، شکوہ اور خودداری کا جذبہ ہے، جو میر کے بعد کے شعرا خصوصاً عصرِ حاضر کے بعض شعرا (یگانہ، جگر وغیرہ) کا مابہ الامتیاز ہے۔ ضیا کی طبیعت ہمہ جہتی ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ نظم اور رباعی اور قطعہ کے میدان میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔

ضیا صاحب کی اہلی زندگی ماشاء اللہ بہت خوشگوار اور پر مسرت اور شادمانی رہی ہے۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۳۸ء میں موگا (ضلع فیروزپور) کے لالہ خوشی رام کی صاحبزادی سنیہ لتی سے ہوئی۔ لالہ خوشی رام پیشے کے لحاظ سے مدرس تھے۔ ۱۹۴۰ء میں لڑکا پیدا ہوا، افسوس کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہا؛ اور اس کی موت کے بعد اسی سال بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔

دو سال بعد دوسری شادی ہوئی؛ یہ لالہ مرلی رام کی بیٹی راج کماری ہیں۔ لالہ مرلی رام

سیشن کورٹ، لاہور میں ملازم تھے۔ شریمتی راجکماری صحیح معنوں میں ضیا صاحب کی رفیقِ حیات ثابت ہوئیں۔ انھوں نے تمام خانگی شعبے اور فرائض اپنے ذمے کر لیے اور ضیا صاحب کو یکسوئی سے اپنی منصبی ذمہ داریوں کی بجا آوری اور ادبی سرگرمیوں میں انہماک کے لیے آزاد کر دیا۔ غریب ہندستانی بیوی کو کبھی اپنی قربانیوں کی کما حقہٗ داد نہیں ملی۔ شریمتی راجکماری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ضیا کی کامیابی میں اُن کی کامیاب اور پُرسکون اہلی زندگی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان سے چھ لڑکے ہیں جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔

اوم پرکاش بجاج

ضیا فتح آبادی شخصیّت اور فن

آج سے کوئی ۳۵ برس پہلے مجھے بسلسلۂ ملازمت دلّی آنا پڑا۔ میں جولائی ۴۲ء ۱۹ میں یہاں آیا تھا۔ جولائی اور اگست ۱۹۴۲ء کے دو مہینے یہاں گذرے اور اس کے بعد شملے تبادلہ ہوگیا۔ اگلے تین برس شملے کی خوشگوار گرمیوں اور یخ بستہ سردیوں میں بسر ہوئے۔ روزگار کا سلسلہ تو تھا ہی۔ لیکن میرے ادبی ذوق کی نشو ونما بھی یہیں شملے کی شعر انگیز اور رنگین فضاؤں میں ہوئی۔ یہاں کی بزمِ اردو کے جلسوں اور مشاعروں میں بیسیوں شاعروں اور ادیبوں سے روابط پیدا ہوئے۔ بعض سے عارضی، جو تھوڑے دن بعد کسی نہ کسی وجہ سے منقطع ہو گئے، بعض سے دائمی جو آج تک قائم ہیں۔ غرض، شملے کا یہ تین سالہ قیام (۱۹۴۲-۱۹۴۵ء) میری ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ہی نہیں، اس کی تربیت کی بنیاد بھی ہے۔ میں نے شعر گوئی یہیں شروع کی اور میری نظمیں اور غزلیں بھی (جیسی کچھ بھی وہ تھیں) یہیں سے رسالوں میں چھپنے لگیں۔

میں ۱۹۴۵ء میں سرکاری دفتر کے ساتھ دلّی آگیا۔ بیشک، ادبی شوق کی آگ دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ لیکن فن کے پہلو سے میں بہت ناقص تھا اور اسے سیکھنے کی

اشد ضرورت تھی۔ عروض کا ایک سوال بی اے فارسی کے پرچے میں شامل تھا۔ لیکن چونکہ کے۔ ایم۔ سترا کے اشارات (نوٹس) میں سب کچھ حل شدہ مل جاتا تھا، اس لیے مجھے فن کو بنیادی شکل میں پڑھنے اور جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے بزمی انصاری کی کتاب زلیخائے سخن بھی خرید کر پڑھی، لیکن شعر اپنے وجدانی شعور ہی کے بل بوتے پر کہتا رہا۔

دلی کالج، جو ان دنوں اینگلو عربک کالج کے نام سے موسوم تھا، اس میں حلقۂ ارباب ذوق کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اعجاز بٹالوی، محمد حسن عسکری، تابش صدیقی، تابش دہلوی، پریم ناتھ در، ریوتی سرن شرما، ڈاکٹر عبادت بریلوی، اور شاہد احمد دہلوی سے یہیں ملاقات ہوئی۔

ان سب شخصیتوں میں سے شاہد احمد دہلوی مرحوم نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میں نے جب اپنی ایک نظم انھیں ساقی میں چھپنے کے لیے دی، تو انھوں نے مجھ سے پوچھا:

آپ نے یہ نظم کسی استاد کو دکھائی ہے؟ اور میرا جواب نفی میں سن کر فرمایا:

"بھیّا حصولِ فن کے لیے ازحد ضروری ہے کہ کسی ماہرِ فن سے مشورہ کیا جائے۔ میں اس کام کے نااہل ہوں کیونکہ خود شاعر نہیں، اور شاعری کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا بھی نہیں۔"

انھیں کے مشورے سے میں نے جناب ضیا فتح آبادی کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ان دنوں میں کچنر روڈ (حال پٹیل مارگ) پر مجرّدوں کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ چند دن بعد ضیا صاحب کا جواب ملا کہ وہ صبح نو بجے سے پہلے اور شام چھ بجے کے بعد گھر پر مل سکتے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ اگر ان سے ملنا چاہوں، تو وہ ریزرو بنک آف انڈیا کی چاندنی چوک شاخ میں مل جائیں گے۔

میں ایک شام دفتر سے نکلا اور ریزرو بنک، چاندنی چوک پہنچ گیا۔ وہاں پوچھتا پاچھتا عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر پہنچا۔ تذکرۂ شعرائے پنجاب میں ضیا صاحب کی چھپی ہوئی تصویر میرے ذہن میں تھی۔ منزلِ مقصود پہ پہنچ کر میں نے دیکھا

کہ ضیا صاحب بڑے انہماک سے کسی دوست کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف ہیں۔ میں چند منٹ خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ جب بازی ختم ہوئی، تو میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس پر ضیا صاحب نے فوراً کھیل بند کر دیا، حال آں کہ شطرنج کے کھلاڑی کم ہی ایسا کرتے ہیں۔ ضیا صاحب کو شطرنج کا شوق ورثے میں ملا ہے، ان کے والد مرحوم منشی رام سوہنی شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

اب ہم ان کے دفتر سے نکل کر جامع مسجد سے ہوتے ہوئے رگھبیر سنگھ جین بلڈنگ، دریا گنج پہنچے۔ ادبی گپ ہوتی رہی، ادبی دنیا کی باتیں، مولانا صلاح الدین احمد کی باتیں، میرا جی کی باتیں۔ ان کے اصرار پر میں نے انھیں اپنے کچھ شعر سنائے۔ پھر میں نے ان سے کلام سنانے کی فرمایش کی۔ انھوں نے اپنی دو تین تازہ غزلیں سنائیں۔ نیز اپنا مجموعۂ کلام، نورِ مشرق، بھی تحفتہً دیا۔ رات کا کھانا میں نے وہیں کھایا۔ بالکونی میں ان کی والدہ محترمہ بیٹھی تھیں اور ان کی گود میں ضیا صاحب کے فرزندِ رشید تھے؛ یہ ان دنوں کچھ بیمار تھے۔ شعر و شاعری کے علاوہ ضیا صاحب کو زائچے بنانے کا بھی بیحد شوق ہے۔ جوتش ودّیا کے کئی ماہران کے گھر آتے اور یہ ان سے تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ اس سلسلے میں ضیا صاحب نے مجھے بتایا:

> فراستِ الید (سامدرک) کا شوق مجھے کالج کے زمانے سے ہے۔ میری پیدایش پر میرا زائچہ جس پنڈت نے بنایا تھا، وہ انھیں کے پاس رہ گیا۔ جسے میں اب اپنا زائچہ کہتا ہوں، یہ میری والدہ کی یادداشت کی بنا پر ۱۹۳۵ء میں میرٹھ کے ایک پنڈت نے بنایا تھا۔ دہلی آنے کے بعد مجھے اپنے زائچے کی درستی کی فکر ہوئی۔ کئی جوتشیوں سے گفتگو ہوئی۔ رفتہ رفتہ خود جوتش ودّیا سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، جو مدراس پہنچ کر کافی ترقی کر گیا۔

ایک مرتبہ میرے دفتر میں ایک صاحب نے مجھے اپنا ہاتھ دکھا کر پوچھا
کہ کیا وہ سمندر پار جائیں گے۔ میں نے لکیروں کو غور سے دیکھا تو کوئی
مددگار لکیر دکھائی نہ دی۔ چنانچہ میں نے ان کے سوال کا جواب نفی
میں دے دیا۔ چند دن بعد انھوں نے بتایا کہ آپ کی پیشگوئی درست
نکلی؛ میں مزید تعلیم کے لیے ولایت جانا چاہتا تھا اور اس کے لیے
میں نے صدر دفتر سے اجازت کی درخواست کی تھی، مگر صدر دفتر نے
انکار کر دیا ہے۔ اسی طرح دفتر کے ایک اور افسر نے مجھ سے دریافت
کیا کہ کیا جلد ہی ان کا تبادلہ ہونے والا ہے۔ یہ ہفتہ کی بات ہے۔
میں نے سوال کا وقت نوٹ کر کے اتوار کو اس وقت کا زائچہ تیار کیا،
جس سے مجھے لگا کہ وہ فوراً تبدیل ہو کر جانے والے ہیں، چنانچہ پیر کی
صبح میں نے ان کے سوال کا جواب دے دیا۔ دوپہر کی ڈاک سے
ان کے تبادلے کا حکم آگیا۔ اب انھوں نے کہ کیا ان کا
مدراس سے جانا ان کے لیے سودمند ہوگا۔ ان کا زائچہ تو موجود ہی تھا
اس کی مدد سے میں نے کہا کہ ہاں، ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ
کہنے لگے کہ ترقی کی پوسٹ تو فوراً ہے نہیں۔ بہرحال وہ مدراس سے
چلے گئے۔ پھر میری ان سے ملاقات دہلی میں ہوئی، تو انھوں نے بتایا کہ
ان کے لیے ایک خاص پوسٹ بنائی گئی ہے، اور ان کو ترقی مل گئی
ہے۔ اسی طرح کے چند اور واقعات بھی ایسے ہیں جہاں میری پیشگوئی
حیرتناک طور پر صحیح نکلی۔ میں اب تک خود نہیں سمجھ سکا کہ ایسا
کیونکر ہوا۔

میں ہفتہ میں دوبار ان کے وہاں جاتا، اور اپنا تازہ کلام انھیں سناتا۔ وہ اسے بڑی
توجہ سے سنتے اور مناسب تبدیلیوں کا مشورہ دیتے۔ بعض اوقات ماہنامہ شاعر
کے لیے (جو ان دنوں آگرے سے نکلتا تھا) طرحی غزل کہنے کے لیے کہتے۔ میری

شاید دو غزلوں کا انتخاب انھیں دنوں شاعر میں چھپا بھی۔ ضیا صاحب مولانا سیماب اکبرآبادی مرحوم کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں سے ہیں۔ انھیں اپنا کلام بغرضِ اصلاح دیکھتے رہنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بار بار سوچتے اور اپنے کلام میں ردو بدل کرتے رہتے ہیں۔ ان کے چند شاگرد بھی ہیں۔ ان میں ایک نشانتی سروپ کیف تھے۔ وہ ان سے اپنے گیتوں پر اصلاح لیتے تھے۔ افسوس کہ وہ عین عالمِ شباب میں راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ ان کے ایک اور شاگرد طالق ہمدانی تھے جو لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سیماب مرحوم نے اپنے چند لائق فارغ الاصلاح شاگردوں میں مختلف علاقے تقسیم کر دیے تھے، اور اعلان کر دیا تھا کہ آیندہ ان کے مبتدی شاگرد اصلاحِ کلام کے لیے ان میں سے کسی کی طرف رجوع کریں۔ ضیا صاحب کا نام بھی اس فہرست میں تھا، اور پنجاب اور دلی کا علاقہ انھیں تفویض ہوا تھا۔ چنانچہ طالق ہمدانی نے، جو سیماب کے شاگرد تھے، اپنا کلام اصلاح کی غرض سے ضیا صاحب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ خلیق ایوبی بھی اسی زمانے سے اپنا کلام انھیں دکھاتے ہیں۔ ضیا صاحب کسی کو باقاعدہ شاگرد نہیں بناتے کیونکہ ان کے خیال میں استاد بننا کارِ محال ہے۔ تاہم ان سے مشورہ کرنے والوں کی کمی نہیں۔ نئے احباب میں رادھا کشن سہگل، جانباز پانی پتی، شاد اور شاہد ساگری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ غرض میں بھی ان سے مشورہ کرنے لگا۔ جہاں اختلافِ رائے ہوتا، ان سے تفصیل سے بات کرتا، اپنا نکتۂ نظر پیش کرتا، ان کی بات سنتا۔ کیونکہ شعور ابھی پختہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے ان کی اصلاح کا کچھ خاص فائدہ محسوس نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ سمجھ میں آنے لگا کہ اردو شاعری اتنی آسان نہیں، جتنی میں سمجھ بیٹھا تھا۔

قدم قدم پر ٹھوکریں لگنیں۔ فنی غلطیوں کا شمار نہیں تھا۔ ان کی بتائی ہوئی غلطیوں پر بار بار غور کرتا۔ کئی بار محسوس ہوتا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ شعروں کی تبدیل شدہ صورت سے ادا نہیں ہوا۔ ضیا صاحب کی طرف سے مجھے کھلی چھٹی تھی کہ ان کی

اصلاح قبول کروں یا نہ کروں۔ ان دنوں کی بیشتر غزلیں میں نے پنڈت لبھورام جوش ملسیانی مرحوم کی زمینوں میں کہی تھیں۔

اب ضیا صاحب کے ہاں میرا آنا جانا مستقل تھا۔ ایک دوبار میں ان کے ساتھ سیتا رام بازار کی ایک دھرم شالہ کے مشاعرے میں بھی شامل ہوا۔ ضیا صاحب کی دلی کے شاعروں میں بیحد عزت تھی۔ حکیم اعظم ایک اردو مجلّہ نکالتے تھے "دستگیر"۔ اس کا حصّہ نظم ضیا صاحب دیکھتے تھے۔ ان مشاعروں میں منوّر لکھنوی مرحوم، امن لکھنوی، مشیر جھنجھانوی، فیض جھنجھانوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کالی چرن اثر اور بیسیوں دوسرے شعرائے کرام شامل ہوتے۔ استادوں کے پڑھنے کی باری کہیں آدھی رات کے بعد آتی تھی۔

لوگ بڑی تہذیب اور توجہ سے شعر سنتے، سلیقے سے داد دیتے۔ تحت اللفظ اور ترنم دونوں طرح شعر پڑھے جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں ضیا صاحب نے مندرجۂ ذیل غزل پڑھی اور ہر شعر پر خوب داد پائی:

خوبصورت فریبِ شادی ہے — فطرتِ غم ہی مسکرادی ہے
ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں — تیرگیِ شب کی گنگنا دی ہے
عالمِ وجد و بیخودی میں، تجھے — ہم نے آواز بارہا دی ہے
اے زمیں! ہم نے تیرے قدموں پر — آسماں کی جبیں جھکا دی ہے
ہم نے طوفانِ شور و شیون سے — کشتیِ جبر ڈگمگا دی ہے
کوششِ امن تو بجا ہے، مگر — آدمی فطرتاً فسادی ہے
اے خدا! تو نے اپنے بندوں کو — زندگی کی کڑی سزا دی ہے

ان مشاعروں کے علاوہ وہ یوم برق کے جلسوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے۔ ایک ایسے ہی جلسے اور مشاعرے کے بارے میں مولانا ابر گنوری مرحوم فرماتے ہیں:

اور اب آپ کے سامنے ملک کے نامور شاعر جناب ضیا فتح آبادی

تشریف لا رہے ہیں"۔ اور ایک حسنِ مردانہ کا مجسمہ، صبیح چہرہ، حسین عینک لگائے، جھومتا جھامتا ڈائس پہ آ گیا اور نہایت خود اعتمادی سے اپنی غزل سنائی۔ محفل کے جمود کو توڑ کر داد کا ہنگامہ بپا کرا کر انتہائی بے نیازی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

یہ واقعہ مشاعرۂ یومِ برق، دلّی کا ہے۔ یہی محفل تھی، جس میں ضیا صاحب اور ابر صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کا ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف تو ایک مدت سے تھا، لیکن آج تک کبھی ایک دوسرے سے ملے نہیں تھے۔

غرض اس کے بعد ضیا صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مدتوں دلّی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر ملاقات پر میں یہ تاثر لے کر اٹھا کہ ضیا کتنے صاحبِ نظر ہیں۔ ان کا معیارِ سخن کتنا نکھرا ہوا اور ستھرا ہے۔ ان کی فنی معلومات کتنی وسیع ہیں۔ اور قدرت نے انھیں کتنا پرخلوص اور دردمند دل دیا ہے۔ وہ محبت کے آداب سے کتنے آشنا ہیں۔ وضعِ وفا سے کتنے مانوس ہیں۔ انسانیت کی قدروں کو کس درجہ عزیز رکھتے ہیں۔

پھر ضیا صاحب تبدیل ہو کر مدراس چلے گئے۔ وہاں کے مشاعروں میں بھی ابر صاحب کی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ مدراس کے مشاعروں کی روحِ رواں بن گئے تھے۔ اہلِ مدراس نے ان کو وہی شاعرانہ مقام دیا جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ ضیا صاحب کے کلام کی مقبولیت اور ان کی ہر دلعزیزی کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ سچے شاعر ہیں۔ جو بات ان کے دل سے اٹھتی ہے، وہ قاری یا سامع کے دل پر اسی لیے اثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، دل سے کہتے ہیں، صرف زبان سے نہیں۔ اور حقیقت میں یہی کسی بلند پایہ شاعر کا امتیازی وصف ہونا چاہیے۔

ضیا ہر صنفِ سخن میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت کامیاب نظمیں، غزلیں، گیت، قطعے، اور رباعیاں کہی ہیں۔ آپ ان کا جس صنف کا کلام مطالعہ کریں،

یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہی ان کا خاص رنگ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن کے مزاج شناس ہیں اور اس میں وہی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اس کے لیے موزوں ہے اور وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو اسے درکار ہیں۔

اپنا موجودہ مقام حاصل کرنے کے لیے انھیں کتنی ریاضت کرنا پڑی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ضیا کو شاعری کا مذاق تو وراثتاً نہیں ملا، لیکن ذوقِ سلیم یقیناً وراثتاً ملا ہے۔ ان کے والد لالہ منشی رام سوری کو موسیقی سے فطری لگاؤ تھا، حالانکہ پیشہ کے لحاظ سے وہ سول انجینئر تھے۔ ان کے گھر میں خاص طور سے دورانِ قیامِ جے پور دن رات بزمِ موسیقی گرم رہتی تھی۔ یہاں ضیا صاحب نے بھی ہارمونیم پر طبلہ کی سنگت میں گائن ودیا سیکھی، لیکن وہ زیادہ دن اس راہ پر نہیں چل سکے۔ ضیا کی والدہ مرحومہ شریمتی شنکر دیوی حد درجہ شفیق اور نرم دل واقع ہوئی تھیں۔ ضیا صاحب کے بقول ان کی تخیل اور حسّاس دل کی تخلیق کی ذمہ دار ان کی والدہ ہی تھیں۔

ضیا صاحب آج سے ۶۴ برس قبل ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو پنجاب کے مشہور شہر کپور تھلہ میں اپنے ماموں لالہ شنکر داس پوری کے جدی مکان میں پیدا ہوئے۔ پوری صاحب اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مستقل طور پر کپور تھلہ میں مقیم تھے۔ ان کے ماموں انگلینڈ سے فوٹوگرافی کا فن سیکھ کر آئے تھے مگر انھوں نے تمام عمر کوئی کام نہیں کیا۔ صرف آبا و اجداد کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی آمدنی پر بسر کرتے رہے۔ البتہ ان کے دوسرے بھائی ریاست کپور تھلہ میں اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ ضیا صاحب کے بڑے ماموں لالہ درگا داس نے سرکار برطانیہ سے رائے بہادر کا خطاب بھی پایا تھا۔ ضیا صاحب کی پرورش ان کے آبائی گاؤں فتح آباد میں ہوئی۔ فتح آباد جو ترن تارن (امرتسر) سے گووند وال کے رستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی مٹی سے ضیا صاحب کو صرف ایک طرح کی روحانی نسبت رہی ہے۔ کیونکہ یہاں ان کے بچپن کا کچھ زمانہ گزرا تھا، جو

انھیں اچھی طرح یاد بھی نہیں - ہوش سنبھالنے کے بعد وہ وہاں تین چار مہینوں سے زیادہ نہیں رہے - فطرتاً کم آمیز ہونے کی وجہ سے بیشک انہیں بہت نقصان پہنچا لیکن اسی کی بدولت ان میں دروں بینی کی عادت بھی پیدا ہوگئی، جس سے ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ وہ بھیڑ اور مجمع سے گھبراتے تھے۔ خلوت اور تنہائی میں انھیں فکرِ سخن کا کافی موقعہ ملا۔

ان کا ذوقِ شعری خدا داد ہے۔ ان کے خاندان میں کوئی ادیب اور شاعر نہیں ہوا۔ دس برس کی عمر ہوگی، جب انھوں نے اردو شعر سنے، تو وہ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اکثر سوچتے رہتے کہ شعر کیسے کہا جاتا ہے! شعر کہنے کا ڈھنگ کچھ عرصہ بعد انھوں نے جناب اصغر علی حیا سے سیکھا جو جے پور میں انھیں گھر پر اردو پڑھاتے تھے - یہ اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی - جے پور میں انھوں نے ایک شمعی مشاعرہ بھی پڑھا، لیکن یہ ان کی شاعری کے بالکل ابتدائی دور کی بات ہے - ان کے شوقِ شعر گوئی کو گوارا فضا اس وقت ملی، جب ۱۹۲۹ء میں دسویں کا امتحان پاس کرکے انھوں نے امرتسر کے ہندو سبھا کالج میں داخلہ لیا۔ امرتسر میں ان کے فیملی ڈاکٹر شفاعت احمد (ہومیو) پریکٹس کرتے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے اور تسنیم تخلص کرتے تھے - ان کے ذریعے سے ضیا صاحب کی فرخ امرتسری تک رسائی ہوئی اور یہ ان کے شاگرد بن گئے - ان دنوں وہاں ایک ہفتہ واری مشاعرہ ہوتا تھا۔ یہ اس میں طرحی غزلیں پڑھنے لگے۔ امرتسر ہی کے دو پرچوں چمن اور چمنستان (ماہانہ) میں ان کا اس دور کا کلام چھپا۔ انھوں نے ملاپ اور پرتاپ، لاہور کے طرحی مشاعروں میں بھی حصہ لیا۔ یہ شعر اس زمانے کی یادگار ہے:

کیا ٹھہر سکتا فروغِ روئے جاناں دیکھ کر ہوگیا روپوش آخر مہرِ تاباں دیکھ کر

سب سے پہلے انھیں ڈاکٹر اقبال کی اس غزل نے متاثر کیا تھا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ ان کے جے پور کے دورانِ قیام کا ذکر ہے۔ امرتسر ہی میں انھوں نے پہلی مرتبہ احسان دانش کو سُنا۔ احسان ان دنوں اپنا نام احسان بن دانش لکھتے تھے۔ وہ بیحد دلکش انداز سے پڑھتے تھے۔ مشاعرے میں وہ حاوی اور کامیاب رہتے۔
کالج میں ضیا صاحب کے چند ہم جماعت بخاری، تپش وغیرہ بھی شاعر تھے۔ ان دنوں ان کی دو ایک غزلیں کالج میگزین میں بھی چھپیں۔ مشاعروں میں شریک ہونے اور رسائل اور اخبارات میں چھپنے اور شعراء کے ہجوم میں گھرے رہنے کے باوجود ان کی کم آمیزی کی عادت نہ گئی۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتے۔ اسی لیے کسی شخص نے ان کے ذوقِ شعر گوئی کو ابھارنے اور بڑھانے میں مدد نہیں کی۔ بعد میں جب وہ فارمین کرسچین کالج، لاہور میں داخل ہوئے، تو کالج میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔
ان کی فطری کمزوری یعنی خلوت پسندی لاہور کے چار سالہ قیام میں بھی ان کے ساتھ رہی۔ وہ براہِ راست کسی شاعر کے زیر اثر نہیں آئے، حال آں کہ اس وقت اقبال لاہور میں موجود تھے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری، سالک، احسان دانش، تاثیر، ہری چند اختر اپنا مقام بنا چکے تھے۔ تاجور کے گروہ میں میلارام وفا، وقار انبالوی تھے۔ بیرونیوں میں مرزا فہیم بیگ چغتائی مستقل طور پر لاہور میں مقیم تھے۔ ان کے کالج کے ساتھیوں میں بھی شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ عطا اللہ کلیم تھے، سراج الدین ظفر تھے اور کتنے لوگ تھے۔ لیکن ان سب سے بھی رابطہ محض مشاعروں تک محدود رہا۔ منصور احمد (ادبی دنیا) سے ان کی ملاقات عطا اللہ کلیم نے کرائی اور ضیا کی اولین تصنیف 'طلوع' پر منصور احمد نے محض چند سطری ریویو کی جگہ ایک مختصر مضمون لکھ کر انھیں دنیائے ادب سے روشناس کرا دیا۔ یہ مضمون ادبی دنیا کے مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ضیا صاحب فرخ امرتسری کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ لیکن انھوں نے چند غزلیں حق المحنت ادا کر کے جناب فیروز طغرائی کو بھی دکھائیں۔ تھوڑی ہی مدت بعد وہ سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے، اور پھر مدۃ العمر

انھیں کے شاگرد رہے۔ یہ ان کی عادت میں نہیں کہ ہر کسی سے اصلاح لیں یا مشورہ کریں۔ یہاں تک کہ انھوں نے دوستوں میں سے بھی کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ سیماب مرحوم کی شاگردی کا بھی ایک عجیب قصہ ہے۔ وہ اپنی والدہ کے لیے انگریزی دواؤں کی دکان پلومر اینڈ کمپنی سے مارفیا لینے امرتسر سے لاہور اکثر جایا کرتے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر پٹری پر ایک صاحب رسائل اور اخبارات پھیلا کر بیچا کرتے تھے۔ جب ضیا صاحب لاہور جاتے، ان رسائل و اخبارات کو ایک اچٹتی نظر ضرور دیکھتے۔ ایک مرتبہ ان کی نظر ایک نئے رسالہ 'شاعر' پر پڑی۔ انھوں نے اٹھالیا۔ ورق گردانی جو کی، تو طرح کے مشاعرے کے ذیل میں اپنے ہم جماعت تپش کی غزل دیکھی۔ تپش کے نام کے ساتھ لکھا تھا سیمابی۔ 'شاعر' پر مدیر کا نام سیماب اکبر آبادی درج تھا۔ ان دنوں ضیا صاحب، فرخ امرتسری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اس سے کچھ غیر مطمئن سے تھے۔ "شاعر" کا یہ پرچہ دیکھنے کے بعد انھوں نے سیماب صاحب کو ایک خط لکھا کہ اگرچہ میں اپنا کلام فرخ صاحب کو دکھاتا رہا ہوں، لیکن میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ سیماب صاحب کا جواب آیا کہ اگر آپ کے تعلقات فرخ صاحب سے استوار نہ ہوسکیں تو کلام بھیج دیا کریں۔ اس پر ضیا صاحب نے اپنا کلام سیماب صاحب کو بھیجنا شروع کر دیا اور وہ باقاعدہ سیماب کے شاگرد بن گئے۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ کثیر المشاغل ہونے کے سبب سیماب صاحب شاگردوں کی اصلاح پر پوری توجہ نہیں کر سکتے تھے نہ اصلاح کی توجیہہ بیان کرتے۔ شروع شروع میں ضیا صاحب نے ان سے توجیہہ کی درخواست کی، تو سیماب صاحب نے ساغر نظامی صاحب کو لکھا کہ اب ضیا امرتسری بھی اصلاح کی توجیہہ چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ضیا صاحب نے خود ہی وجہِ اصلاح سمجھنے کی کوشش کی اور استاد سے استفسار سے گریز کیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ضیا صاحب اصلاح سے مطمئن نہیں تھے۔ اس صورت میں انھوں نے یا تو شعر بدل دیا یا اسے حذف ہی کر دیا، استاد سے مزید استفسار کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آج کل

بھی جو چند اصحاب ان سے مشورہ کرتے ہیں، وہ ان سے یہی کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی اصلاح ضروری قبول کریں البتہ اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ان سے مشورہ کرنے والے دوست وزن اور زبان و بیان کے دوسرے اصولوں کا لحاظ ضرور رکھیں شعر کمزور ہو تو ہو لیکن اسے باوزن لا زماً ہونا چاہیے۔

جوش ملیح آبادی نے ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" کے دیباچے میں لکھا:

> ضیا صاحب نے، اس میں کوئی شک نہیں، ایک صحیح راستہ اختیار کیا ہے، لیکن میں انھیں مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی راہ میں ایک پتھر بھی موجود ہے، اور وہ ہے نوجوانی کے باوصف ان کی سادگی و سلامت روی، جس پر نگاہ کر کے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب اور اپنے موسم کے ساتھ خلوص نہیں رکھتے ہیں۔ ہر چند یہ خوشی کی بات ہے کہ اب تک ایسی کوئی شہادت فراہم نہیں ہوئی ہے جس سے یہ ثابت ہو تا کہ اپنی جوانی اور موسم کے بعض دیگر صالح نوجوانوں کی طرح باغی بھی ہیں، پھر بھی اپنی فصلِ بہار سے خلوص نہ رکھنا ایک ایسی چیز ہے، جو شاعر کے ادبی مستقبل کو بے سواد بنا دینے کی دھمکی دیتی رہتی ہے۔

اس کے بارے میں ایک مرتبہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے ضیا صاحب نے فرمایا تھا: "جوش صاحب فن اور عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور میں انھیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھتا رہا ہوں، دوست نہیں۔ میں ۱۹۳۶ء میں مستقلاً دہلی آ گیا اس زمانے میں جوش صاحب دریا گنج میں رہتے تھے اور وہیں سے "کلیم" نکالتے تھے۔ جناب آزاد انصاری بھی ان کے ساتھ مقیم تھے۔ میں ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ان کے یہاں جاتا تھا، اور یہ اکثر دفتر کے بعد شام کا وقت ہوتا۔ یہی وقت جوش صاحب اور آزاد صاحب کی مینوشی کا بھی ہوتا تھا۔ جوش صاحب ہمیشہ مجھے مجبور کرتے تھے کہ میں بھی ان کا ہم مشرب ہو جاؤں۔ لیکن میری فطری احتیاط اور جھجک مانع رہی اور

ہیں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر پہلو بچا جاتا۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جوش صاحب نے یہ سب کچھ لکھ دیا۔ میرے نزدیک محبّت کا جذبہ تقدس کا حامل ہے۔ میں جنس اور محبت کو الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔ اگر میں کہوں کہ میں نے جنسی میلان یا کشش کبھی محسوس ہی نہیں کی، تو یہ خود فریبی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری جنسی کشش کبھی محبت نہ بن سکی اور میں نے جنسی تسکین کو انسانیت کے ارتقا کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ جہاں میں محبّت کو انسانی جذبات کا فطری اقتضا خیال کرتا ہوں، وہیں جنس کی تسکین اور اس کے اعلان کو بھی معیوب خیال کرتا ہوں۔ کاش جوش صاحب کی نظر "نورِ مشرق" ہی میں موجود نظموں "حسنِ گمراہ"، "اپنی میرا سے" اور "دیوی" پر پڑتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں محبّت سے جتنا قریب ہوں اتنا ہی ہوسناکی سے دور۔ عقل و دل کا توازن بگڑ جاتا ہے تو انسان کو تخریب کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے، جوش صاحب اور ان کے ہمخیال شعرا کی اردو میں کوئی کمی نہیں۔ شاید وہ مجھ سے متفق نہ ہوں اور محبت تک پہنچنے کے لیے ہوسناکی کو ضروری جانتے ہوں اور اس کی اشتہار بازی کو شاعری کا کمال۔"

ضیا صاحب کی سادگی ضرب المثل ہے۔ وہ محبّت اور مروّت کا مجسّمہ ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع ہے۔ ادبی دنیا میں بھی ان کے دوستوں اور مدّاحوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ یہ درست ہے کہ بقول ضیا صاحب ان کے زائچے میں دشمنوں کی نشاندہی زیادہ ہے، حال آں کہ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان سے نقصان بہت کم پہنچیگا۔ خود ان کا بھی یہ تجربہ ہے کہ وہ جن سے دوستی کا حق نباہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی ناگوار باتوں تک کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، وہی ان کی کسی معمولی سی بات سے خفا ہو کر ان کے دشمن بن جاتے ہیں، یا دوست نہیں رہتے۔ ضیا صاحب میں کمی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور دوستی قائم رکھنے کا آرٹ نہیں جانتے وجہ یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کی کوئی علّت نہیں اور بقول ان کے دوستی قائم

رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی علّت ضروری ہے، جو فریقین میں برابر موجود رہے۔ اس کے باوجود ضیا صاحب کو اپنے کثیر الاحباب ہونے کا دعوےٰ ہے۔ بیشک ان کے دوستوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن انھوں نے بارہا یہ بھی کہا ہے کہ میں دوست بنانے میں ماہر نہیں باستثنائے ان چند حضرات کے جن سے ان کے تعلقات زیادہ تر ادبی نوعیت کے رہے ہیں، کم آمیزی کے باعث وہ لاہور، دلّی، مدراس، بمبئی، کے نیم ادبی حلقوں میں رہ کر بھی وہ کسی کو اپنا صحیح دوست نہ بنا سکے۔ دفتر میں یا ملازمت کے سلسلے میں جن لوگوں سے وہ ملے یا جو ان کے دوست بنے ان میں تاراچند بیتی اور کیلاش چندر ناز کے سوا کسی کو ادب اور خاص کر اردو ادب سے کوئی زیادہ شغف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقۂ احباب میں کوئی ایسا نام نہیں ملیگا، جو حکومتی حلقوں میں موثر ہو۔

بار بار لوگ انھیں فریب دیجاتے ہیں۔ ان سے کام نکال لیتے ہیں لیکن اگر ضرورت پڑے، تو خود ان کا کوئی کام نہیں کرتے۔ اکثر دوستوں کی انھوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں بہت مدد کی۔ ایک دوست کی بیوی کے انھوں نے سو سو روپے کے نوٹ بدلوا کر دیئے حالانکہ ان کے میاں صاحب ان کے دوست ہوتے ہوئے کئی ایک گستاخیاں کر چکے تھے۔ دلّی کے ایک ادبی مجلّہ کے مالک ان سے اکثر بنک کے معاملوں میں مدد لیتے رہے ہیں۔ منور لکھنوی مرحوم نے صحیح فرمایا تھا کہ

جب کبھی میں پھنس گیا ہوں اس کے مایا جال میں
کی ہیں میری مشکلیں آسان بیت المال میں

انھوں نے سب کی غلطیوں کو معاف کرکے سب سے محبت بھرا سلوک روا رکھا ہے۔ بنک میں لوگوں کی خاطر تواضع کی ہے اور ان کے بگڑے کام سنوارے ہیں۔ چھوٹوں کا وہ اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ ان سے بے اختیار محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ضیا صاحب کی گھریلو زندگی بیحد خوشگوار اور ہموار رہی ہے۔ بقول ان کے

اس خوشگواری اور ہمواری کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۱ء
۳۵ برس تک ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہے یعنی ایک جگہ ملازم رہے ہیں۔
البتہ ملازمت سے باہر انھوں نے اپنے گھر میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔
چنانچہ وہ بھی اپنے دل میں اس ابدی شکایت کی کسک محسوس کرتے ہیں ؎

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان کا ایمان ہے نہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید کب کے ترکِ سخن گوئی کر چکے ہوتے۔ انھوں نے گھر کے کسی کام کاج میں آج تک دخل نہیں دیا۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ گھر سے باہر کا کام یعنی روزی کمانے کا فرض مرد کے ذمے ہے اور گھر کے اندر کا کام جس میں بازار سے سودا سلف لانا، خریدنا بھی شامل ہے، بیوی کے ذمے۔ خوش قسمتی سے انھیں بیوی بھی ایسی ملی ہے جس نے ضیا صاحب کی ناز برداری میں اپنی صحت تک خراب کر لی ہے۔ ویسے ہر انسان میں کچھ کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں، اور ان کے کہنے کے مطابق ان کی بیوی میں بھی ہونگی لیکن ان کی بیوی کی اچھائیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کمزوریوں کی طرف کبھی دھیان جا ہی نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی آپس میں چھیڑ خانی بھی چلتی رہتی ہے، اور کبھی کبھی میاں بیوی ایک دوسرے سے کشیدہ بھی ہو جاتے ہیں، لیکن یہ خفگی ہمیشہ عارضی ہوتی ہے غرض بقول داغ

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ضیا صاحب کی پہلی شادی دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ ان بیگم کا ۱۹۴۰ء میں زچگی میں انتقال ہو گیا۔ دو برس بعد ان کی موجودہ بیوی آئیں۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان خدائے کریم نے انھیں سات بیٹے بخشے۔ بدقسمتی سے پہلا بچہ ایک ماہ کے اندر اندر چل بسا۔ بفضلہ تعالیٰ باقی سب بچے زندہ سلامت اس بڑھاپے میں ماں باپ کی آنکھ کا تارا اور زندگی کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ خدائے کریم انھیں لمبی اور تندرست اور مفید زندگی عطا فرمائے۔ تین بچے ہیں دلی کے مختلف بنکوں

ملازم ہیں۔ ایک بچہ لندن میں مقیم ہے اور وہیں ملازمت کر رہا ہے۔ ایک لڑکا خود کو سنوارنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے۔ شاعر اپنے کلام کی اور والدین اپنے بچے کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔ پھر بھی ضیا صاحب نے وثوق سے کہا ہے کہ ان کے بچے ہزارہا دوسرے بچوں کے مقابلے میں کئی اعتبار سے اچھے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ضیا صاحب نے اپنا ذاتی مکان راجوری گارڈن (نئی دہلی) میں بنالیا ہے اور وہیں اب ان کا مستقل قیام ہے۔

(۲)

ضیا صاحب نے کبھی اپنی خودداری کو نہیں چھوڑا، نہ وہ اوچھے ذرائع سے مقبولیت حاصل کرنے کے قائل ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام مجموعے اپنے خرچ سے چھاپے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) "طلوع" ۱۹۳۴ میں چھپا۔ اس زمانے میں ساغر نظامی نے میرٹھ میں اپنا ہینڈ پریس قائم کیا تھا۔ یہ مجموعہ وہیں چھپا۔ سائز چھوٹا حجم ۶۴ صفحات تعارف از ساغر نظامی (صفحات ۱ تا ۸) کل ۵۶ قطعات ہر صفحہ پر ایک قطعہ قیمت درج نہیں۔

(۲) "نور مشرق" کی طباعت دسمبر ۱۹۳۷ء میں گپتا پرنٹنگ ورکس، دلی میں ہوئی۔ بانگِ درا سائز۔ حجم ۱۵۲ صفحات۔ تعارف (۱) از جوش ملیح آبادی تعارف (۲) از حکیم آزاد انصاری، تعارف (۳) از منظر صدیقی اکبر آبادی۔ ۴۷ نظمیں ۱۰۲ صفحے تک، ۷ گیت ۱۱۶ صفحے تک، آخر میں ۹ سانیٹ۔ بقول ضیا صاحب غالباً یہ پہلا شعری مجموعہ تھا جس میں نظموں کے ساتھ گیت بھی شامل کیے گئے۔ مگر تعجب ہے کہ کسی محقق نے ابھی تک اس بات کی تائید یا تردید میں کچھ نہیں کہا۔

(۳) "ضیا کے سو شعر" کی کتابت اور طباعت نور مشرق ہی کی طرح ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ سائز ۳۲/۲۰×۳۰ حجم ۳۲ صفحات تقریب از مصنف ایک صفحہ۔ ہر صفحے پر تین یا چار اشعار

۴) " نئی صبح کی اشاعت کی ایک کہانی ہے۔ علامہ سیماب مرحوم کی وفات کے بعد ضیا صاحب نے ایک ماہنامہ " سیماب " دلی سے جاری کیا تھا جو ۱۹۵۱-۱۹۵۲ ء سال بھر نکلتا رہا۔ " نئی صبح " کی نظمیں، غزلیں وغیرہ پہلے جستہ جستہ " سیماب " ہی میں چھپی تھیں۔ بعد میں انھیں فرموں میں ایک اور فرمے کا اضافہ کرکے اسے کتابی صورت دے دی گئی۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۲ ء میں شائع ہوا۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم صفحے۔ قیمت عہ۔ شروع میں منور لکھنوی کی نظم بعنوان " ضیا فتح آبادی " ہے اس کے بعد پروفیسر مشیر علی صدیقی کا مضمون " ضیا فتح آبادی کی شاعری " ۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر کرنیں کے عنوان سے ۴۸ رباعیاں اور قطعے ہیں؛ ہر صفحے پر چار رباعیاں یا قطعے ہیں۔ سوز و دام کے عنوان سے ۲۶ غزلیں ہیں۔ نئی صبح کے عنوان سے ۲۶ پابند نظمیں، ۳ آزاد و معرا نظمیں اور ۳ گیت ہیں

۵) " گرد راہ " ۱۹۶۳ ء میں دی پرنٹنگ ورکس میں چھپی۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۸۴ صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔ ابراحسنی گنوری کا مضمون " ضیا اور ان کی شاعری " صفحات ۴ تا ۱۳ اور تعارف از خوشتر گرامی صفحات ۱۴ تا ۱۶ پہلا باب نور و رنگ جس میں ۴۴ رباعیات ہیں۔ دوسرا باب خشت و سنگ جس میں ۷۴ پابند نظمیں۔ ۶ گیت اور ۸ آزاد نظمیں ہیں۔ آخر میں باب نغمہ و آہنگ میں ۳۷ غزلیں ہیں۔

۶) " حسن غزل "۔ یہ مختصر سا مجموعہ ۱۹۶۶ ء میں انبالہ سے شائع ہوا۔ سائز $\frac{22 \times 30}{16}$ صفحات ۱۶۔ اس میں ضیا صاحب کی ۲۸ غزلیں شامل ہیں۔

۷) " شعر اور شاعر "۔ ۱۹۷۴ ء میں جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپا۔ سائز $\frac{22 \times 30}{16}$۔ حجم ۱۶۰ صفحات۔ اس مجموعے میں ضیا صاحب نے بیس شعرا کے خود نوشت سوانح حیات مع نمونۂ کلام جمع کرکے بزم سیماب، دہلی کی طرف سے شائع کئے ہیں۔ شعرا کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت: ۵ روپے۔

ضیا صاحب کی شاعری کا سب سے بڑا مقصد تسکینِ ذات ہے۔ جب جذبات

میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور دماغی کناروں سے ٹکراتی ہے تو دماغ کا تخلیقی عمل اسے تخریبی کارروائی سے باز رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو دماغی توازن بگڑ جائے۔ یہ تخلیقی عمل ہر انسان کی زندگی میں پایا جاتا ہے اور مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے، مگر شاعر اس ہیجانی کیفیت کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ مقصدی یا افادی شاعری دراصل کوئی چیز نہیں۔ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ وہ جس ماحول میں پلتا ہے، اس کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب اور شعر پر بقول ضیا صاحب ترقی پسندی اور جدیدیت کے لیبل چسپاں کرنا ستم ظریفی ہے۔ دنیا میں کوئی ادب ایسا نہیں، جس نے زندگی کے کسی نہ کسی گوشے کی نقاب کشائی نہیں کی۔ ضیا صاحب کے نزدیک افادی ادب وہ ہے، جس سے فنکار مفاد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دراصل ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا ہی قباحت ہے۔ "شاعری جزویست از پیغمبری" کہہ کر ڈاکٹر اقبال نے گویا حکم لگا دیا کہ شاعری میں پیغام ہونا چاہیے۔ اب ہر شاعر اپنے یہاں اور ہر ناقد، شاعر کے یہاں پیغام کی تلاش میں لگا ہے۔ اگر ضیا کا نظریۂ شاعری "تسکین ذات" صحیح ہے، تو شاعر کا ہر شعر کسی نہ کسی پیغام کا حامل ہوتا ہی ہے۔ کبھی غم کا، کبھی خوشی کا، کبھی محبت کا کبھی نفرت کا، کبھی غلامی کا، کبھی آزادی کا، کبھی انسانیت کا۔ ضیا صاحب شاعری کو کسی واحد پیغام تک محدود کر دینے کے حق میں نہیں۔ شاعر روزمرہ کی زندگی میں جن گوناگوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کی شاعری میں بھی ان کیفیتوں کی پرچھائیاں نظر نہ آئیں۔ خواہ تکرار اور تضاد کی بحث ہی کیوں نہ چل نکلے۔ ضیا صاحب کی شاعری چونکہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور حالات کے پیدا کردہ تاثرات کی عکاسی کرتی ہے، اس لیے ان کے یہاں بعض جگہ تضاد کا گمان ہوتا ہے حال آں کہ اس سے دراصل ان کے سفر کی مختلف منزلوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ امن لکھنوی نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسی تضاد کی کیفیت کی طرفداری کی ہے اور غور سے دیکھا جائے تو تضاد

کس کے ہاں نہیں؛ یہ کیفیت ناگزیر ہے۔
ضیا صاحب کا فکرِ سخن کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ وہ بستر پر لیٹ جاتے ہیں، کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے ذہن کو یکسو کرنے کے لیے ذرا سہارا لیتے ہیں، پنسل کو انگلیوں پر متواتر اچھالتے رہتے ہیں۔ تاآں کہ ان کے دماغ میں مصرعے موزوں ہونے لگتے ہیں، اور وہ انھیں کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ اس عملِ تخلیق کے لیے صبح شام، دن رات، وقت کی کوئی قید نہیں۔ ہاں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا، کہ غزلوں کے اشعار غیر معمولی ماحول میں ہو گئے مثلاً بس کے انتظار میں کھڑے ہیں، یا بس میں سفر کر رہے ہیں، اور شعر ہو گیا ہے؛ اب غزل پھر کسی وقت مکمل ہو جائیگی۔ شعر میں الہام کے قائل تو نہیں، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ کبھی کبھار ایک مصرع یا پورا شعر غیر شعوری طور پر موزوں ہو گیا، اگرچہ یوں تو غیر شعوری کیفیت کا سراغ بھی کہیں نہ کہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔
ضیا صاحب نے نظمیں بھی لکھی ہیں، پابند بھی اور آزاد بھی۔ غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور گیت منثورات قطعات اور رباعیات میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ میراجی کو ان کی آزاد نظمیں اور غزلیں پسند تھیں ان کی پابند نظمیں پڑھ کر ماہر القادری کے ذہن میں چکبست کی یاد تازہ ہو گئی۔
یوں قنوطیت نہ کلامِ ضیا کی خصوصیت ہے، نہ ان کے مزاج کی۔ لیکن نہ جانے حضرت فانی کی پرچھائیں کیسے ان کے کلام میں کہیں کہیں آ گئی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا تھا کہ ضیا کا کلام پڑھ کر رونے یا سونے کو جی نہیں چاہتا۔ خدا معلوم وہ کیا حالات ہونگے، جن میں انھوں نے ایسے شعر کہے:

زندگی ہے بذاتِ خود اک موت موت کا انتظار کون کرے!
کون پامالِ روزگار نہیں شکوۂ روزگار کون کرے

میں نے جب ضیا صاحب کی توجہ ان اشعار کے قنوطی لہجے کی طرف مبذول کرائی تو انھوں نے جواب میں وضاحت سے فرمایا تھا کہ مجھے اتفاق ہے کہ ان اشعار

میں قنوطیت جھلکتی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو میرے یہاں اس قسم کے ادبی کئی اشعار مل جائیں ، مگر میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ زندگی کے زخموں کو دکھاؤں، اور پھر ان کا کوئی علاج بھی تجویز کر دوں، تاکہ زندہ رہنے کی ہمت بندھی رہے۔ ان اشعار میں بھی یہی دونوں عمل کارفرما ہے۔ پہلا عمل واقعی قنوطی ہے، مگر دوسرا پُرامید ہے۔ اب پہلے ہی شعر کو لیجیے۔ غموں اور مصائب سے ترتیب پائی ہوئی زندگی خود ایک مسلسل موت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر انسان بےحس و حرکت موت کے انتظار میں کیوں بیٹھا ہے، جو بہرحال اپنے طے شدہ وقت پر آنے والی ہے۔ یعنی آدمی کو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل سے موت کا خوف نکال دے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ان لوگوں کے لیے صبح کی ایک کرن پیش کی گئی ہے، جو رات کے ہولناک اندھیروں سے گھبرا کر شور و شغب کو اپنا وطیرہ بنا لیتے ہیں۔ جب ہر شخص پامالِ روزگار ہے، تو شکوۂ روزگار بےسود ہے۔ چاہیے کہ اپنا قیمتی وقت شکوہ و شکایت میں نہ ضائع کیا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے ضیا صاحب سے پوچھا تھا کہ ان کی زندگی شکوہ چینی کی زندگی رہی ہے، یہ شعر انھوں نے کن حالات میں تخلیق فرمایا:

ازل میں جب ہوئی تقسیمِ عالمِ فانی بطورِ خاص ملا سوزِ جاوداں مجھ کو

ضیا صاحب نے جواباً فرمایا:

> یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میری زندگی ہمیشہ شکوہ چینی سے عبارت رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دیگر فنکاروں کی طرح میں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو مشتہر دبے نقاب نہیں کیا۔ دراصل زندگی سے مجھے محبت ہے، اور میں کسی ایسی حرکت کو محبت کی توہین سمجھتا ہوں۔ میرے والد مرحوم کی ملازمت مستقل نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں ایک ملازمت کے بعد دوسری ملازمت فوراً بغیر وقفے کے ملتی رہی۔ میں نے زمانۂ تعلیم

ہی میں ایک وقت ان کی جیب میں ایک لاکھ روپیہ بھی دیکھا، اور پھر ان کی جیب کو خالی بھی پایا۔ اپنی بجی زندگی کا مقابلہ میں نے جب انسان کی عام زندگی سے کیا، تو مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ دل کی تڑپ ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ یہ تڑپ، یہ سوز آپ اس کے دل سے علیحدہ کر دیجیے، تو یقین ہے کہ دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور انسان اور حیوان میں کوئی تمیز ممکن نہ رہے۔ اسی تڑپ اور سوز کو دوسرے لفظوں میں محبت کہتے ہیں، جو خاص طور پر انسان کو ملی ہے۔ کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو نہیں ملی۔

ضیا صاحب کا ایک مشہور شعر ہے

گمرہی میں ہے ایک لطف، ضیا! جاؤں میں راہ پر نہیں آتا

اس شعر کے بارے میں انھوں نے مجھے بتایا تھا:

یہ شعر اس غزل کا ہے جو میں نے زمانۂ مشق میں کہی تھی۔ میں ہائی اسکول سے کالج میں آگیا تھا۔ بچپن پیچھے اور شباب میرے آگے تھا۔ عجیب تذبذب کا عالم ہوتا ہے، زندگی کا یہ موڑ بھی۔ اس کا تجربہ سب کو ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب بغاوت کا جذبہ دل کی کھڑکیوں سے باہر کی طرف جھانکتا ہے۔ مگر ان کھڑکیوں پر کچھ پہرے بھی ہوتے ہیں؛ اور یہاں کھڑا ہو کر کوئی انسان کسی قسم کی ممانعت یا رکاوٹ گوارا نہیں کرتا۔ بس کچھ اسی قسم کا جذبہ اس شعر کی شانِ نزول ہے۔ اور اس کی وضاحت اسی زمانے کی کہی ہوئی ایک نظم "جوانی کا انتباہ ضعیفی کو" میں ملیگا۔ یہ نظم کسی مجموعے میں شامل نہیں البتہ چمنستان، امرتسر میں چھپ چکی ہے۔ پس اس شعر کو اگر مندرجۂ بالا پس منظر میں پڑھا جائے، تو کوئی تضاد کی کیفیت نہیں ہے۔

ضیا نے انگریزی ادبیات میں ایم اے پاس کیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری پر شیکسپیر، بائرن، کیٹس، شیلی، ورڈز ورتھ کا اثر ہے۔ اس اثر کی نشاندہی "نورِ مشرق" کی بعض نظموں سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سانیٹوں کے علاوہ "دعوتِ سیر"، "آئینے کے سامنے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ضیا صاحب کا ایک اور مشہور و مقبول شعر ہے:

کشتی ساحل پر ڈوبی ہے موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

اس شعر کی تضادی کیفیت کی شرح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ شعر سادہ اور صاف ہے۔ انسان کی بےبسی سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

زیبا ہوں کر نازیبا، منظر چمنستاں کے محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے

اور ڈاکٹر اقبال ہی کا ایک اور شعر ہے:

رازِ حیات پوچھ لو، خضرِ خجستہ گام سے زندہ ہر ایک چیز ہے، کوششِ ناتمام سے

زندگی اور موت کے دونوں مناظر بیک وقت نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور ان مناظر کے درپیش انسانی جہد و عمل معرضِ وجود میں آتا ہے۔ افسوس اس کشتی پر ہے جو ساحل پر ڈوب گئی، جہاں جد و جہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زندگی کا ثبوت جد و جہد ہی سے ملتا ہے۔ اگر یہی کشتی بیچ دریا کے پہنچ کر ڈوبتی، تو زندگی کی دلیل بن جاتی کیونکہ دریا کے بیچ پہنچنے میں کچھ جد و جہد تو کرنی پڑتی، اگرچہ کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ موت بہرحال ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

(۳)

غزل کے علاوہ نظم بھی ضیا صاحب کے فن کے اظہار کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کی ایک نظم "شاعر سجدے میں" ہی انھیں اردو میں مستقل مقام دے کر زندۂ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ نظم فیض کی نظم "موضوعِ سخن" سے چھ سال قبل

لکھی گئی تھی، اور میتھیو آرنلڈ کے مضمون "نظموں کے موضوع" سے ۷۰ سال بعد کی تصنیف ہے۔ اس نظم کی تازگی، لفظوں کا دروبست، اور خیالات کی روانی ایسی قدرتی ہے کہ قاری نظم کے ساتھ بہ جاتا ہے۔ یہ نظم نیاز فتحپوری کو پسند آئی تھی اور انھوں نے ضیا صاحب کی آفاقیت کے بارے میں لکھا تھا:

> ہر چند ضیا صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن بلحاظ فطرت وہ سبحہ و زنار کی حدود سے بہت بلند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا نصب العین خارجی حیثیت سے آزادی کا درس دینا ہے اور داخلی حسنِ محض سے متاثر ہونا' جسے ماہرینِ جمالیات خیرِ محض بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر شاعری کریگا، اس کا کلام یقیناً دلکش ہوگا۔ ضیا صاحب باوجود نوجوان ہونے کے ذہنی حیثیت سے پختہ مغزانِ جنوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہیں اور اگر ان اکتسابات کو نظر انداز کر دیا جائے، جو تجربہ کے بعد ہی میسر آسکتے ہیں، تو "نورِ مشرق" وہ خوبیاں رکھتا ہے جو ایک ذہین نوجوان کے کلام میں پائی جاسکتی ہیں۔

ضیا صاحب نے اپنے استاد سیماب مرحوم سے اس سلسلے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ جتنا اچھا مضمون ہو، وہ اس کے لیے اتنے ہی اچھے الفاظ کا انتخاب بھی اپنے فن کا کمال سمجھتے ہیں۔ وہ وجدانی کیفیت میں مستیٔ گفتار کا نام شاعری ضرور سمجھتے ہیں، لیکن وہ شاعری میں طرزِ بیان کو بھی بیحد اہم خیال کرتے ہیں؛ محض خیالات کی بلندی ہی کو شاعری کا وصف نہیں سمجھتے۔ شاعری کی تکمیل ان کے نزدیک اس میں ہے کہ شاعر اپنے ماحول کی حقیر سے حقیر چیز کی پرستش کرنے لگے۔ ان کی نظم "شاعر سجدے میں" کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

اے زمیں! اے آسماں! اے زندگی! اے کائنات!

اے ہوا! اے موجِ دریا! اے نشاطِ بے ثبات!

اے پہاڑوں کی بلندی! اے سرودِ آبشار!
اے گھٹا جھومی ہوئی! اے نغمہ برلب جوئبار!
اے مسرت خیز وادی! اے فضائے کیف ریز!
اے دلِ آبادِ وحشت! اے رگوں کے خونِ تیز!
اے بساطِ ریگ صحرا، بیکس و بے خانماں
اے بگولوں کے مسلسل رقص! اے سیلِ رواں!
اے ستاروں کی چمک! اے گردشِ خورشید و ماہ!
اے سرورِ بیگناہی! اے تقاضائے گناہ!
اے نگاہِ مست و بیخود! مائل تخریبِ ہوش
اے نیازِ میکشانِ زیست، نازِ مے فروش!
اے چراغ آرزو! اے بزمِ ہستی کے شباب!
اے پرِ پروانہ! اے رقصِ نشاطِ کامیاب!
اے حرم! اے دیر! اے مذہب کے اندازِ حسیں!
اے تخیل کی بلندی کے فریبِ بہتریں!
اے قفس میں پلنے والے، بے زبان و بے اماں
اے اسیرانِ محن، مفلس، غریب و ناتواں
اے غمِ ایام! اے فکرِ حصولِ روزگار!
اے خیابانِ عمل! اے بازوئے مصروفِ کار!
اے خمارِ بادۂ دولت میں بیہوش و حواس
اے کہ تم سے ذرہ ذرہ زندگی کا ہے اداس
بے نیازِ مستی جام و سبو کر دو مجھے
اپنے کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے
دل سے وہ نغمے اٹھیں، جن کے لیے شاعر بنوں
بس تمھارے حسن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں

ضیا فتح آبادی

یہ ہیں وہ جذبات و خیالاتِ موضوعِ سخن جن کے درمیان سے گزر کر ایک انسان حقیقی شاعر بن سکتا ہے، اور یہی وہ تجربہ گاہیں ہیں، جن سے الہام لے کر شاعر جھومتا گاتا، اقلیم شاعری میں ضیا باریاں کرتا ہے۔ اسے مناظر خود بلاتے ہیں۔ ذرّے پکارتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں بلکہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری زندگی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔ وہ دامِ ہر موج سے بچتی ہوئی تہ سے گوہر نایاب ڈھونڈ لانے میں کامیاب ہوتی ہے، اور شاعر وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ درد و غم میں ڈوبا ہوا شاعر امید کی دنیا میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ ضیا کی نظم "انقلابِ بہار" کا ایک شعر ہے:

دل سے داغِ سوزِ ناکامی فنا ہو جائیگا۔
اب بہار آئی ہے، عالم گلکدا ہو جائیگا

ضیا صاحب جس طرح خود تصنّع سے پاک اور سادہ ہیں، اسی طرح ان کی شاعری بھی سادہ ہے؛ اس میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنّع نہیں۔ ان کا لہجہ غیر فطری نہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، وہی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں الہام کار فرما ہے۔ وہ زندگی میں سب کے برابر کا شریک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی نظم "گھٹائیں" اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔

کافر گھٹائیں ٹھنڈی ہوائیں
جلوہ نما ہیں راحت فزا ہیں
رنگینیوں کا طوفاں ہے برپا
حسن و لطافت عیش اور نزہت
میخوار آئیں ہشیار آئیں
بیتاب آئیں بیخواب آئیں
دیر و حرم کے آئیں فرشتے

مفلس تونگر سب آئیں مل کر
ساغر بھرے ہیں کوثر بھرے ہیں
میکش اٹھالیں پی لیں، پلا لیں
ہے عام رحمت ہنگامِ عشرت
خالی نہ جائیں کالی گھٹائیں

غرض گیت ہو، غزل ہو، رباعی ہو، نظم ہو، ضیا ہر جگہ ریاکاری اور بناوٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو ان کے دل میں ہے، وہی ان کے لب پر ہے۔
ان کی نظمیں طویل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ بالعموم وہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہیں؛ دو نشستوں کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ نظم کہتے ہوئے ذہنی پس منظر بدلنا نہیں چاہیے۔ نظم کی تخلیق کے بعد وہ اکثر کئی کئی مہینے اس میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظم "بوندوں کا ساز" ۱۹۳۳ء میں کہی گئی تھی۔ پہلے یہ دو بندوں پر مشتمل تھی۔ چار برس بعد انھوں نے اس میں ایک اور بند کا اضافہ کیا۔
اپنے بیشمار ہمعصروں کی طرح ضیا صاحب بھی اقبال سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی نظم "اگر خدا ہے" اقبال کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ میرے استفسار پر انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جب یہ نظم کہی ہے، اس سے بہت پہلے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پڑھ چکا تھا، مگر اس نظم کا صحیح محرک "شکوہ" نہیں ہے، گو ممکن ہے کہ شکوہ کے تاثرات میرے تحت الشعور میں رہ گئے ہوں۔ دراصل ۱۹۳۵ء میں جب میں ایم اے کا امتحان پاس کر کے لاہور سے سکونتی خاندہ آ گیا، تو ایک مرتبہ وہاں سے میرٹھ ساغر نظامی صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ باتوں باتوں میں ساغر صاحب نے ذکر کیا کہ ان کے ذہن میں ایک نظم کا موضوع ہے: "اگر خدا ہے"۔ میں اس موضوع سے اتنا متاثر ہوا کہ وہیں میرے ذہن میں نظم کا خاکہ تیار ہو گیا اور میں نے بعد میں نظم بھی مکمل کر لی، جو مقبول ہوئی۔

یوں سمجھیے کہ میں نے یہ نظم ساغر سے چرائی۔
"نور مشرق" میں ایک نظم ضیا صاحب نے "محروم سے" لکھی ہے جس میں جناب تلوک چند محروم صاحب کی لڑکی کے جل کر وفات پانے کی طرف اشارا ہے۔ اس نظم کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ میں نے محروم صاحب کو "طلوع" کی ایک جلد بھیجی تھی۔ انھوں نے اس کی بہت تعریف کی۔ وہیں سے ان سے تعلقات شروع ہوئے اور خط و کتابت بھی ہونے لگی۔ ایک خط میں انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ ان کی صاحبزادی نے جل کر خودکشی کر لی ہے۔ ان کے خط میں اتنا درد تھا کہ میں بہت متاثر ہوا اور میرے جذبات نے اشعار کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے ان کے خط کے جواب میں یہی نظم محروم صاحب کو بھیج دی۔ ضیا کی تقریباً تمام نظموں کی کوئی نہ کوئی وجہِ تخلیق ہے۔ ان میں واردات، باہمی تعلقات، اور دوسروں کے جذبات کے بارے میں ان کے ذاتی احساسات محرک ہوئے ہیں۔ ضیا صاحب نے محض روایات سے چمٹے رہنے کی غلطی نہیں کی۔ نہ ان کی شاعری محض مشقِ سخن ہی ہے۔ وہ عجیب عجیب موضوعات کے بارے میں سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں وہ کھلے طور پر شامل تو نہیں ہوئے، لیکن ان کی شاعری پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے اچھی نظم "فنکار" ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فنکاروں کی عسرت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ نظم جتنی مکمل ہے، اتنی ہی مقبول بھی ہوئی، پوری نظم ملاحظہ کیجیے:

گل و لالہ و نسترن بیچتا ہوں میں کانٹوں کی رنگیں چبھن بیچتا ہوں
زمین و زمان و زمن بیچتا ہوں میں اپنا ضمیر اور فن بیچتا ہوں
میں اپنی متاعِ سخن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں
روایاتِ ماضی، حکایاتِ فردا تبسم، ترنم، شکایت، مدارا

خموشی، تکلّم، ہنسی، شور و غوغا اجالا، اندھیرا، جوانی، بڑھاپا
نظامِ حیاتِ کہن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

سحر خیز کلیوں کی عصمت خرید و رگوں میں مچلتی حرارت خرید و
لبوں کی گلابی کی رنگت خرید و لطافت، مسرت، محبت خرید و
نزاکت، ادا، بانکپن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

بہاروں کی دلچسپ رعنائیاں لو ربابِ جنوں کی طرب زائیاں لو
عروسِ تخیّل کی انگڑائیاں لو لپکتے شراروں کی اونچائیاں لو
میں اپنا خدا، اہرمن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

میں افسانے لکھتا ہوں، کہتا ہوں غزلیں زمانے میں مقبول ہیں میری نظمیں
ادب کو ہیں مجھ سے بہت کچھ امیدیں نہیں پیٹ کی بھوک ہی میرے بس میں
بہ امیدِ یک نان، فن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

مری آنکھ کی تم نمی کو نہ دیکھو مرے عالمِ برہمی کو نہ دیکھو
مری زندگی کی کمی کو نہ دیکھو مرے پیکرِ ماتمی کو نہ دیکھو
میں انسانیت کا کفن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

شاعری کے سلسلے میں ضیا صاحب ایک ہی راستے اور ایک ہی منزل کے قائل نہیں۔ شاعری تو شاعر کے ہر روز بدلتے ذہن کی پیداوار ہے، جو ایک مرکز پر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انھوں نے ہر اُس ادبی اور سیاسی تحریک سے اثر لیا ہے، جو براہِ راست ان کی ذات سے متعلق یا قریب رہی ہے۔ جب انھوں نے

شعرگوئی کا آغاز کیا، تو اس میں قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ مغربی اور خاص کر انگریزی شاعری کا رنگ بھی شامل تھا۔ یہ سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، لہذا حب الوطنی کا جذبہ بھی ان کے کلام میں کارفرما نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں وہ اقبال سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد غالب اور حالی کے نظریات بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہو گئے۔ حفیظ جالندھری کے ہلکے پھلکے گیتوں نے بھی انھیں اکسایا۔ اپنے ہمعصروں میں سے احسان دانش اور وقار انبالوی کی جھلک بھی ان کے کلام میں مل جاتی ہے۔ اختر شیرانی کے سانیٹ اور اندرجیت شرما کے ہندی گیتوں نے بھی انھیں متاثر کیا، اسی لیے ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں ہندی گیت شامل ہیں۔ پھر جب حضرت سیماب کا تلمذ اختیار کیا، تو قدرتاً ان پر سیماب اور آگرہ اسکول کا اثر بھی پڑا۔ غرض بقول غالب وہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جہاں انھوں نے ترقی پسند تحریک سے اثر لیا تھا، وہیں ان کے کلام میں جدیدیت کے اثرات بھی ناپید نہیں۔ غرض بقول سیماب

ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

یہاں ایک بات واضح کر دینے کے قابل ہے۔ انھوں نے کسی کی اندھی تقلید نہیں کی، بلکہ تمام خارجی اثرات کو اپنے داخلی رنگ میں شامل کر کے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ان کے ہر شعر پر ان کی اپنی ذات کی اور انفرادیت کی چھاپ ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ شاعر اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور وقت کے دھارے کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ شاعری کو زمانے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ صبا صاحب شاعری کو جدید اور قدیم کے خانوں میں تقسیم کرنے کے حق میں نہیں۔ ان کے نزدیک جو کل جدید تھا، وہ آج قدیم ہے؛ اور جو آج

جدید ہے، وہ کل قدیم ہوگا جس طرح انسان کا دائرۂ علم بڑھتا جاتا ہے، اسی طرح ادب اور شاعری کا کینوس بھی بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کی قدریں بدلتی ہیں، تو شعر و ادب کی قدریں بھی خود بخود بدل جاتی ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کو انھوں نے کبھی نعروں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان کے خیال میں وہی ابہام جو زمانۂ قدیم میں اردو شاعری سے خارج کر دیا گیا تھا، آج پھر جدیدیت کا پرچم ہاتھ میں اٹھائے واپس آ گیا ہے۔ یہ تجریدی فن کہلاتا ہے۔ بھلا وہ شعر جس کا مفہوم فی البطن شاعر ہو، افادی ادب میں کیوں کر شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس پرانی دنیا میں کوئی چیز، کوئی بات بالکل نئی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر کوئی نئی جہت پیدا کی جا سکتی ہے، تو وہ پرانے خیالوں کو نئے ڈھنگ سے کہنا ہے۔ ان کو لحاظ نے [illegible] غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر منوا چکا ہے۔ اور اکثر اوقات غالب کے سمجھنے کے لیے بڑی کاوش کی ضرورت ہے، مگر غالب کے یہاں ابہام نہیں، مشکل پسندی ہے، جس کا ہمارے جدید برت کے علمبردار ادیب اور شعرا غلط استعمال کر رہے ہیں۔

عظیم شاعر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ہر عہد میں کوئی نہ کوئی بڑا شاعر ہوتا ہے۔ ولی دکنی جسے اردو شاعری کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے، واقعی بڑا شاعر تھا۔ پھر میر اپنے زمانے پر چھائے رہے۔ غالب اور ذوق کا زمانہ بھی آپ کی نظر میں ہے۔ ادھر نظیر اکبرآبادی نے بھی بڑی شاعری تخلیق کی۔ ایک زمانہ داغ کا تھا۔ پھر ڈاکٹر اقبال اردو شعر پر چھا گئے۔ سیماب صاحب تو خیر، ان کے استاد تھے اور دراصل وہ انھیں کے نام لیوا ہیں۔ غالب کے زمانے تک لوگ میر کو سب سے بڑا شاعر مانتے رہے۔ میر کے بعد کا زمانہ جواب جاری ہے، دراصل غالب کا زمانہ ہے۔ اور غالب ہر لحاظ سے اردو کا ایک عظیم شاعر ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ان کی مندرجہ ذیل تین آزاد اور جدید نظموں کے بارے میں ضیا صاحب سے بات چیت ہوئی تھی :

آخری بار

تو پریشان نہ ہو، خوف نہ کھا
میں اشارے پہ ترے جان بھی دے سکتا ہوں
یہ بڑا بول نہیں، اس کو حقیقت ہی سمجھ
قیس و فرہاد کی الفت ہی سمجھ
سادہ لوحی پہ نہ جا
میں کہیں دور، بہت دور چلا جاؤنگا
لوٹ کر پھر نہ ادھر آؤنگا
تو بھی اس گھر سے چلی جائیگی، شہنائی کے نغمے سنتی
تازہ خوابوں کے حسیں جال سے ہر دم بُنتی
شمع رہ جائیگی اک سر دھنتی
تیرے احساس کی گہرائی میں کھو جاؤنگا
اور تاریک اجالوں میں سکوں پاؤنگا
چاند خاموش ہے، تار دل کا فسوں ٹوٹ گیا
بیتی راتوں کی تجھے یاد دلاؤنگا نہ اب
قول و پیماں کی طرف کوئی اشارہ نہ کرونگا ہرگز
وقتِ گزراں تو گزر جاتا ہے
خود بخود زخم بھی بھر جاتے ہیں
تو کوئی فکر نہ کر
یہ ملاقات محبت کا یہ حکم آخر
ہمیں تسلیم ہی کرنا ہوگا۔

آخری بار ذرا اپنے حسین ہونٹوں پر
مسکراہٹ کی شعاعوں کو بکھر جانے دے
میں اندھیروں میں یہی نور لیے جاؤں گا
تو پریشان نہ ہو، خوف نہ کھا،
بس کہیں دور، بہت دور چلا جاؤں گا
لوٹ کر پھر نہ ادھر آؤں گا۔

میرا خیال تھا کہ ضیا صاحب نے یہ نظم رابرٹ براؤننگ کی نظم "آخری ہمسفری" (The Last Ride together) سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا بھی خیال ہے کہ ممکن ہے، رابرٹ براؤننگ کی اس نظم کا تاثر ان کے ذہن میں اس وقت موجود رہا ہو، جب انھوں نے یہ نظم کہی ہے۔ مگر چونکہ اس نظم کی تخلیق پر اتنا لمبا وقت گذر چکا ہے، اس لیے اب وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے، البتہ نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کامیاب محبت کے حق میں وصل زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتا ہے۔ ان کے خیال میں محبت، جدائی اور تنہائی کے لمحوں ہی میں پلتی ہے اور یہی سبب ہے کہ قیس و فرہاد کی محبت آج بھی زندہ ہے، چاہے اسے دنیا دیوانگی ہی سے کیوں نہ تعبیر کرتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مرکزی خیال کو نظر میں رکھتے ہوئے آپ نظم کا دوبارہ مطالعہ کریں، تو آپ کو اس میں کوئی چیز مبہم نظر نہیں آئیگی۔ یوں سمجھیے کہ لیلیٰ شادی کا لباس زیب تن کیے شہنائیوں کی آوازیں سن کر مایوس بھی ہے اور سہمی ہوئی بھی۔ مگر قیس اسے اپنی سچی محبت کا واسطہ دیتا ہے کہ حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں اور اسے اپنا ہدیۂ ایثار پیش کرتا ہے کہ میں کہیں دور چلا جاؤنگا اور لوٹ کر پھر کبھی ادھر نہیں آؤنگا تاکہ اس کے دل میں رسوائی کا اندیشہ نہ رہے۔

اسی طرح انھوں نے اپنی نظم "شیریں تلخی" کا پس منظر بیان کرتے ہوئے

بتایا کہ اس نظم کی تخلیق میں ان کے ذاتی تجربے کی بجائے مشاہدے کو زیادہ دخل ہے۔ اکثر لوگوں نے محسوس کیا ہوگا کہ جب وہ کسی جلتی چتا کے پاس کھڑے پسماندہ عزیزوں کو روتے دیکھتے ہیں تو خود ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آتی ہیں۔ یہ انسانی ہمدردی اور جذبات کی رقت کا ثبوت ہے۔ ایک شاعر کے دل میں تو تمام کائنات کا درد ہوتا ہے، وہ اکثر و بیشتر خارجی اور داخلی حدوں کو عبور کر کے تخلیقی عمل کا تجربہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کوئی بڑا کلاسیکی شاعر ایسا نہیں جس کا ہر تخلیقی عمل صرف تجربے کے مرحلے سے گزر کر ہم تک پہنچا ہو۔ سب سے اہم چیز جو آپ اس نظم میں محسوس کریں گے وہ اس کا طنزیہ انداز ہے۔ یہ طنز ہے ہمارے موجودہ سماج کے ایک رستے ہوئے زخم پر۔ میں نے کوشش کی ہے کہ صرف اس گھناؤنے زخم کے گھناؤنے پن کو ظاہر کر دوں، اس زخم کا علاج میں نے پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے۔ "فرار" کا پس منظر یہ ہے کہ جب انسان جنم لیتا ہے تو وہ دنیا کی تازگی اور اس کے رنگ و بو میں کھو جاتا ہے مگر یہ کیفیت دیر تک نہیں رہتی۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے، اسے حادثات زندگی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ زندگی میں روشنی کم اور تاریکی زیادہ ہے۔ اور جب یہ بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آجاتی ہے، تو وہ زندگی سے بچ نکلنے کی سوچنے لگتا ہے اور آخرکار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ زندگی کا یہ وہ مرحلہ ہے، جس سے ہر ذی نفس کو گزرنا پڑتا ہے۔

کامیاب نظموں کے علاوہ ضیا صاحب نے اردو شاعری کو بے حد حسین گیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے۔ ضیا کے گیت آسان اور رسیلی زبان کے علاوہ بہترین سرودی شاعری کے نمونے بھی ہیں۔ اس میں انھیں اندرجیت

شرما، مقبول حسین، میراجی، عظمت اللہ خان وغیرہ کی ہندی نما اردو شاعری نے بھی متاثر کیا ہے۔ ان محبت بھرے گیتوں میں چاہے وصل کا بیان ہو، یا فراق کا قصہ، پیا کے پردیس جانے کا ذکر ہو یا محبوب کے روپ کی بات یہ گیت آفاقی اثرات کے حامل ہیں۔ ان میں رس اور لوچ بھی ہے، پیار کی رنگینی بھی؛ ان میں ہجر کا درد بھی ہے، وصال کی چاشنی بھی۔ گیتوں کے علاوہ ضیا نے کامیاب قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔

دورِ حاضر میں سب سے پہلے ضیا صاحب ہی نے قطعات کتابی صورت میں "طلوع" کے نام سے شائع کیے۔ اختر انصاری کی آبگینے، نریش کمار شاد کی قاشیں [illegible] احمد ندیم قاسمی کا مجموعہ کلام 'رم جھم' بعد کی مطبوعات ہیں۔ "طلوع" کے [illegible] بیان کے علاوہ نفسِ مضمون کی بلندی کے پہلو سے بھی نمایاں ہیں۔ [illegible] ری کے چراغ ہیں؛ "طلوع" سے ادب کی کرنیں جھانکتی ہیں چند نمونے ملاحظہ ہوں:

جھٹپٹا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خرید لیتی ہے — ایسے عالم میں بانسری کی نوا

اپنی دھن ہی میں مست رہنے دو — زحمتِ اضطراب سہنے دو
میرے بارے میں دوستو! تم سے — کوئی کہتا ہے کچھ، تو کہنے دو

واقفِ عیش و غم شناسا ہے — نور و ظلمت کا آئینہ سا ہے
حاملِ وسعت و نشیب و فراز — دل کی دنیا، عجیب دنیا ہے

ابر چھایا ہے آسماں پر، ضیا! — اور کیف آفریں ہے بادِ صبا
آرزوئیں ہیں اضطراب انگیز — کیا بتاؤں کہ چاہتا ہوں کیا!

شمعِ احساس جلتی رہتی ہے — آگ دل میں سلگتی رہتی ہے
لب پہ آتا نہیں مگر شکوہ — چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے

ضیا کی شاعری فن اور فکر کا حسین امتزاج ہے۔ ہم جب کبھی اس بحرِ بیکراں میں غوطہ لگاتے ہیں، ہمیں اس میں سے خیالاتِ تازہ اور تاثراتِ نو کے جواہر ہاتھ لگتے ہیں، جن سے مسرت اور لذّت کا احساس ہمارے دل میں جاگتا ہے۔ ان کی نظم "روح کا پیمانہ" ملاحظہ ہو:

بھر دے میرا جام، اے ساقی! بھر دے میرا جام
آیا ہوں میں دور سے ساقی! بھر دے میرا جام
کیفیت اور نور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
نور وہ، جس سے روشن دل کا کاشانہ ہو جائے
کیفیت وہ جس میں ڈوب کے ہستی میخانہ ہو جائے
زیست جسے کہتی ہے دنیا، مستی کا ہے نام

بھر دے میرا جام

مشرق سے وہ سورج ابھرا، پہنے زرّیں تاج
چاند ستارے چھوڑ کے بھاگے اپنا اپنا راج
بیداری کے نغموں سے بیتاب ہوا ہر ساز
تو بھی تو، اے میرے ساقی! دے مجھ کو آواز
میری امیدیں بھی کیوں رہ جائیں تشنہ کام!

بھر دے میرا جام

بیخود ہے نشّے میں رنگ و بو کے کل گلزار
فرق نہیں ہے مطلق کوئی، گل ہو یا ہو خار
دور کہیں اک گلشن ہے، اس گلشن سے بھی خوب
دل تو دل، ہو جاتی ہیں جس سے روحیں مغلوب
اس گلشن کے بھید بتا کر، مجھ کو کر لے رام

بھر دے میرا جام

بادل کرتے ہیں گردوں پر بیتابی کا رقص
خاک کا ہر ذرّہ کرتا ہے شادابی کا رقص
بھول چکے ہیں اکثر تجھ کو، ہو کر ناامید
ناامیدی ہی تو ہے بربادی کی تمہید
مجھ کو بھی اس طرح نہ رکھ تو، نومید و ناکام
بھر دے میرا جام

پی کر میں بیخود ہو جاؤں، گاؤں تیرے گیت
میری جیت، حقیقت میں، ہے ساقی! تیری جیت
دیکھ کے میری مستی، دنیا پھر مستی میں آئے
اس عالم میں مجھ کو کھو دے اور تجھے پا جائے
مجھ سے غفلت کیوں، میں تو ہوں رندِ مےآشام
بھر دے میرا جام

مدت سے تیرا میخانہ ہے بے رنگ و نور
کیا اس کا انجام تجھے ایسا ہی تھا منظور!
ہار کے بیٹھے ہیں اک گوشے میں سارے میخوار
جو بھی ہے اس محفل میں، ہے مستی سے بیزار
لیکن مجھ کو دیکھ کہ میرا شوق نہیں ہے خام
بھر دے میرا جام

تیرے ہی یہ بندے ہیں سب باہوش و بیہوش
زیبا نہیں دیتا ہے تجھ کو ہو جانا خاموش
اے کیف و مستی کے خالق! مستی کر تقسیم
پھر ان تشنہ روحوں کو دے تسکیں کی تعلیم
لا اپنی وہ خاص صراحی، رنگین و گلفام

بھر دے میرا جام، اے ساقی! بھر دے میرا جام

اپنی یہ نظم خود ضیا صاحب کو بھی بیحد پسند ہے۔ یہ "نور مشرق میں" شامل ہے اس کے علاوہ قبلہ سیماب مرحوم کو ضیا صاحب کی نظم "فطرت کا شاہکار" بہت پسند تھی۔ "گردِ راہ" کی یہ غزل بھی ضیا صاحب کی پسندیدہ غزلوں میں سے ہے۔

دنیا مری نظر سے تجھے دیکھتی رہی پھر میرے دیکھنے میں بتا، کیا کمی رہی

"نئی صبح" میں مطبوعہ غزل : تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی، جب پہلی مرتبہ "بلبیویں صدی" میں چھپی، تو اس پر بڑا حوصلہ افزا تعریفی نوٹ ادارے کی طرف سے شریکِ اشاعت تھا۔

اپنی پسندیدہ نظموں، غزلوں کے بارے میں ضیا صاحب نے بتایا کہ "نورِ مشرق" میں مطبوعہ نظم "اگر خدا ہوتا" دو تین جریدوں میں نقل ہوئی تھی۔ جب وہ چند ماہ کے لیے کانپور میں تھے، ایک صاحب سے انھیں ملاقات کا موقع ملا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کا نام ضیا فتح آبادی ہے، تو وہ کہنے لگے کہ میں نے جب آپ کی نظم "بغاوت"، (نئی صبح) "ادبی دنیا" (لاہور) میں پڑھی، تو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اپنے امتحان میں ایک سوال کے جواب میں اس کا اقتباس دیا تھا۔ اسی طرح ان کی نظمیں "فنکار" (نئی صبح) اور "ہجر" (گردِ راہ) بھی بہت مشہور اور مقبول ہوئیں۔ "ڈبونے سے کیا فائدہ ہے" اور "منزل سے آئے ہیں" (گردِ راہ) غزلوں کی بالترتیب ابر احسنی مرحوم اور جناب اعجاز صدیقی نے بہت تعریف کی تھی۔ ان کی پہلی تصنیف "طلوع" کو مرحوم تلوک چند محروم اور منصور احمد نے بیحد سراہا۔

مجموعی طور پر ضیا صاحب ان شعرا میں سے ہیں، جن کی شاعری اقلیم شعر و سخن میں مدتوں ضیا بار ہوگی۔ نظم ہو یا غزل، وہ ہر جگہ کامیاب ہیں۔ ان کے پاس وہ مشاہدہ ہے، جو نقاش کی آنکھ رکھتا ہے۔ اور ان کی شاعری میں کسی خوش گلو کا احساسِ ترنم بھی ہے۔ ان کی شاعری میں پختہ جذبات

درد انسان اور دل کا کرب ہے۔ یہاں حسن و شباب کے نغمے بھی ہیں اور زندگی کی عکاسی بھی اور حب الوطنی بھی۔ غرض، وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے شاعر ہیں

(۴)

میں یہ مضمون ان آرا پر ختم کرتا ہوں، جو مختلف اصحابِ فکر و نظر نے ضیا صاحب کے کلام کے بارے میں وقتاً فوقتاً ظاہر کی ہیں۔

(۱) مرحوم جناب تلوک چند محروم نے ضیا صاحب کی پہلی تصنیف "طلوع" دیکھ کر کہا تھا:

ابتدا میں آپ کے کلام کی انتہائی پختگی دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی ؎
سالے کہ نکو است از بہارش پیدا
قطعات اور رباعیات کی سلاست زبان، ندرتِ خیال، حسنِ تخیل دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی شاعر کی اوّلین تصنیف ہے۔ دعا ہے کہ ایشور آپ کو دنیائے ادب میں حسن قبول کی دولت سے مالا مال کرے۔

(۲) علامہ نیاز فتحپوری نے ان کے مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" سے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا تھا:

ہر چند ضیا صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں لیکن بلحاظِ فطرت وہ سُبحہ و زنّار کی حدود سے بہت بلند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا نصب العین خارجی حیثیت سے آزادی کا درس دینا ہے، اور داخلی حیثیت سے حسنِ محض سے متاثر ہونا جسے ماہرینِ جمالیات 'خیرِ محض' بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر شاعری کریگا، اس کا کلام دلکش ہوگا۔ ضیا صاحب باوجود نوجوان ہونے کے ذہنی حیثیت سے پختہ مغزانِ جنون کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہیں؛ اور

اگر ان اکتسابات کو نظر انداز کر دیا جائے جو تجربے کے بعد ہی میسّر آ سکتے ہیں، تو یہ مجموعہ تمام وہ خوبیاں رکھتا ہے، جو ایک ذہین نوجوان کے کلام میں پائی جا سکتی ہیں۔

(۳) شاہد احمد دہلوی نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

ضیا صاحب خوش فکر اور جدت طراز شاعر ہیں۔ وہ کسی مشہور شاعر کی پیروی، تقلید یا نقّالی نہیں کرتے، بلکہ خود اپنا ایک ڈھنگ، ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ مغربی شاعری کے مطالعے نے ان کے خیال کے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضیا کے اشعار میں زندگی کے آثار اور پیام بیداری ہے۔ انھیں پڑھ کر رونے یا سونے کو جی نہیں چاہتا۔

(۴) پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ضیا صاحب کے بارے میں فرمایا تھا:

"نورِ مشرق" بہت دلچسپی سے پڑھا، اور اس کے کچھ حصے تو بار بار پڑھے اور اب بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ سانیٹوں اور گیتوں میں آپ کی کامیابی نے مجھے خاص طور پر متوجہ کیا۔ کئی مقامات پر مفکّرانہ اور شاعرانہ انداز کے امتزاج نے مجھے بہت لطف دیا۔ آپ کی شاعری بالکل نقّالی یا تقلید نہیں۔ اس میں خلوص ہے: اور کہیں رنگین سادگی ہے، کہیں سادہ اور دلکش رنگینی۔ ترنّم اور روانی اور ایک حسّاس سلامت روی اس کی خاص صفتیں ہیں۔ مشرقی اور مغربی یا یوں کہیے کہ مشرقی اور جدید اسپرٹ یا مزاج بہت اچھی طرح سموئے گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عمق، بلندی اور شاعری کے ماورائی صفات جتنے اس مجموعے میں موجود ہیں، اس سے زیادہ کی توقع آپ کے آئندہ

کارناموں میں کی جاسکتی ہے۔ یہ آہنگِ جنوں اور بھی پختہ اور تیز ہو جائے تو جس رنگ کا آغاز آپ سے ہوا ہے، اس کی تکمیل ہو جائے۔

(۵) حکیم آزاد انصاری مرحوم نے ان کے کلام کا تعارف لکھتے ہوئے لکھا تھا:

یہ مجموعہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک دلچسپ اور نظر نواز مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں سلاستِ زبان اور بلاغتِ بیان کے جا بجا ایسے نادر نمونے نظر آتے ہیں، جن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس مجموعے کی اکثر نظموں میں زندگی کے اکثر پہلو اس خوبصورتی سے روشنی میں لائے گئے ہیں کہ ہمارا اردو ادب اس پر فخر کر سکتا ہے۔

جناب ضیا صاحب ایک نو تعلیم یافتہ اور نوجوان شاعر ہیں اور نئی تعلیم نے اردو میں جس قسم کا نیا رنگِ شاعری پیدا کر دیا ہے، وہ ان کے کلام میں بھی بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی آپ کی شاعری پورے بلوغ کو نہیں پہنچی، مگر آثار کہہ رہے ہیں کہ آپ ایک نہ ایک دن پورے اوجِ شاعری پر پہنچ کر دم لینگے۔

(۶) جناب جوش ملیح آبادی نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی کو میں کئی وجوہ سے عزیز رکھتا ہوں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ان کا قلب صاف اور وسیع ہے، جسے سُبحہ و زنّار کی احمقانہ کشاکش سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ مادرِ وطن کے سچے پرستار ہیں، اور ہندستانی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند وہ ابھی نوجوان ہیں، مگر ان کے تفکّر میں اُس پختگی و رسیدگی کے وہ علامات پیدا ہو چکے

ہیں، جو تجربہ کار پیرانہ سالی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہر وہ شخص جس کا دماغ اس سے زیادہ سن رسیدہ ہو، قابلِ محبت وعقیدت ہوا کرتا ہے۔
تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ ان چند گنتی کے شعرا میں سے ہیں، جنھیں بخت کی یاوری اور قدرت کی فیاضی سے شاعری کا صحیح راستہ معلوم ہو گیا ہے .... وہ جو کچھ مطالعہ یا محسوس کرتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں، اور اس انداز سے کہتے ہیں جو دلنشین ہوتا ہے۔

(۷) پاکستان کے مشہور جدید نقاد وزیر آغا اپنی تصنیف "اردو شاعری کا مزاج" میں گیت کے موضوع پر لکھتے ہوئے ضیا صاحب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

گیت کے سلسلے میں حفیظ، ساغر اور تاثیر کے بعد اگلا اہم نام میراجی کا ہے۔ دراصل میراجی سے اردو گیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو گیت نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کی اور خود کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔ اس تحریک کے علمبرداروں میں میراجی کے علاوہ اندرجیت شرما، آرزو لکھنوی، قیوم نظر، حفیظ ہوشیارپوری، مجروح سلطانپوری، ضیا فتح آبادی، امیر چند قیس، مقبول حسین احمد پوری، وقار انبالوی، بسمنت سہائے اور لطیف انور کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۸) پنڈت بالمکند عرش ملسیانی نے ان کی تصنیف گردِ راہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ضیا صاحب بڑے مشّاق اور خوشگو شاعر ہیں۔ ان کی آزاد نظمیں خلافِ توقع ان کی پابند نظموں سے بھی بہتر ہیں۔ سارے کا سارا کلام معیاری ہے، اور ان کی ہمہ جہت طبیعت کا آئینہ دار۔

(۹) ڈاکٹر منوہر سہائے انور مرحوم کا ارشاد ہے:

جناب ضیا فتح آبادی کی ذاتِ جامع صفات ان کے کلام میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آسکتی ہے:

وہ سادہ بھی ہیں اور پُرکار بھی وہ بیخود بھی ہیں، اور ہشیار بھی

وہ سادہ الفاظ میں دقیق نفسیاتی حقائق بیان کر جاتے ہیں، اور وطنیت کے پرستار رہنے کے باوجود آفاقیت سے رشتہ جوڑ لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ ان کا کلام انسانیتِ کبریٰ کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہونے کے ساتھ ہی حسن پرستی اور عاشق مزاجی کے شورانگیز جذبات کا بھی مظہر ہے۔ ان کی نظمیں دلکش اور غزلیں دلکشائی کے لحاظ سے مقبولِ خاص و عام ہیں۔ قطعات و رباعیات میں طلاقت اور جزالت کا امتزاج قابلِ دید ہے۔

(۱۰) جناب ساغر نظامی نے ضیا صاحب کا ادبی دنیا میں تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

آئیے آپ کو گلزارِ ادبیات کے اس عندلیبِ خوشنوا کے گیت سنائیں، جس کا دل اچھوتے نغموں کی ایک لازوال دنیا ہے، اور جس کی خاموشی ایک عظیم گویائی کا مقدمہ معلوم ہوتی ہے.... روحانی طور پر ان کے قطعات صحیح اور فنی طور پر اغلاط سے پاک ہیں، اور اکثر جگہ وہ شیرینی و بلندی پائی جاتی ہے، جو کامیاب شاعر کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ وہ گوارائی اور استغنا بھی ان کے

قطعات کی روحِ رواں ہے، جو شاعر کا اصلِ اصول ہوتا ہے۔
وہ انسان کو پیغامِ عمل بھی دیتے ہیں، اور رہبانیت کے
خلاف ہیں۔ زندگی سے متعلق ان کا مشاہدہ نہایت صحیح اور روشن
ہے۔ کہیں کہیں فنا کی تعلیم بھی ہے ....
بہر حال مجموعی طور پر ہمارے شاعر کی یہ سعی مستحسن ہے، اور ہم کو
کشادہ دلی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے کیونکہ ہمیں پنجاب کے
مضافات میں رہنے والے ضیا کو آفتاب کی شکل میں دیکھنا ہے۔

(۱۱) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ضیا کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا تھا:

انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اچھی قدروں کی اشاعت
کی ہے ...... زندگی کی تلخیوں کو کم کر کے محبت کے جذبے کو ابھارا
ہے ..... وہ آسودگی بخش بھی ہے، اور ایک حد تک نظر افروز
بھی ۔ اس میں اظہارِ قوت بھی ہے، اور لطافت بھی۔ ان کے
یہاں بیانِ شوق کی بیباکی کے ساتھ انسانیت کی حنا بندی کا
نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں
ہے، نفاست اور نزاکت ہے۔ اسی لیے ان کے لب و لہجہ میں
دل آسائی اور مٹھاس ہے، اور ان کی شاعری میں پُرکاری اور
سرشاری ہے ۔ ضیا صاحب شاعری میں بیراہ روی پسند نہیں کرتے۔

(۱۲) تذکرۂ شعرائے پنجاب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر (نسیم رضوانی) نے ضیا کے بارے میں یوں لکھا تھا:

کلام میں برجستگی اور موزونیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن غزل
کی نسبت نظم کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کے قطعات ایک
مخصوص رنگ کے حامل ہیں، بلکہ صحیح طور پر خود ضیا کے جذبات
کا صادق عکس ۔ ان کی شاعری بیشتر انفرادی ہے ۔

(۱۳) ادبی دنیا کے مدیر جناب منصور احمد نے لکھا تھا۔
ضیا ایک حقیقی شاعر ہیں، اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اسے انھوں نے محسوس کیا ہے، اور سوچا بھی ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں سنجیدگی اور اثر کی فراوانی ہے۔ ان کا ذوق بلند ہے، اور زبان پاکیزہ اور صحیح ہے ...... ضیا کی شاعری ایسی ہے کہ اس میں اجتماعیت کی بجائے انفرادیت زیادہ ہے۔

(۱۴) پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم نے ان کے بارے میں "آجکل" میں لکھا تھا،
ضیا فتح آبادی ان چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے شاعری میں ذوقِ نظر کے سوا کسی اور چیز کو اپنا رہبر نہیں بنایا۔ غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی انھوں نے کبھی زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ان کی نظموں کے اس مجموعے کی خصوصیّت بھی یہی ہے کہ وہ ان کے ذاتی مشاہدات و محسوسات کا ترجمان ہے۔ اس میں نہ شاعری کے نئے تجربے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ قدامت کی کورانہ تقلید ہے۔ شروع سے آخر تک بس ایک چیز ہے : اپنی ذات اور زندگی کے ساتھ خلوص۔ خارجی زندگی اور داخلی کیفیتوں کو سمو کر جو شاعری کی جائے، وہ اپنے ساتھ بھی انصاف ہے، اور دوسروں کے ساتھ بھی ــــ "نورِ مشرق" اسی انصاف اور خلوص کا نمونہ ہے۔

(۱۵) جناب گوپی ناتھ امن نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے ؛
ضیا صاحب نے اپنے استاد جناب سیماب اکبرآبادی کی طرح قدیم و جدید دونوں رنگوں کو ملایا ہے، اور کامیابی سے ملایا ہے۔ وہ رنگِ جدید میں کہتے ہیں، تو فن کی پابندیوں کو خیرباد نہیں کہتے۔ ان کے کلام میں روانی بھی ہے، اور کیف بھی ؛ جدّت بھی ہے اور

پختگی بھی۔

(۱۶) جناب گنپت سہائے سریواستو نے حال ہی میں ان کے بارے میں یوں لکھا ہے :

حالانکہ ضیا صاحب خصوصاً ایک نظم نگار شاعر ہیں، مگر ان کی غزلیں بھی فلسفیانہ تخئیل، جدتِ مضامین، اور دلکش پیرایۂ بیان کی حامل ہوتی ہیں۔ زبان کی سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ کلام میں روانی اور صفائی اور مضامین کی پاکیزگی وشستگی پائی جاتی ہے۔ آپ ہر لحاظ سے اردو کے مایۂ ناز شعرا میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔

ویدپرکاش شرما

ضیا فتح آبادی
کی شاعری میں
ترقی پسند عناصر

ضیا فتح آبادی کے کلام کے چار مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں جن میں سے دو بحیثیت مجموعی رومانٹک نظموں اور قطعوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن "نئی صبح" اور "گردِ راہ" کی بیشتر نظمیں انھیں ترقی پسند شعرا کی اس صف میں لے آئی ہیں، جو ہمارے چند ایسے شعرا کے لیے مخصوص ہے، جن کے ہاں زندگی کی قدروں کو استوار کرنے والا مواد فنکارانہ ہیئت کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔ ضیا ان شعرا میں سے ہیں، جو فن میں دسترس حاصل کرنے کے لیے علم اور ریاضت دونوں کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچتے ہیں۔ "طلوع" ان کی پہلی کتاب ہے۔ قطعہ خاصی مشکل صنفِ شاعری ہے۔ چار مصرعوں کا چھوٹا سا کینوس، قوافی کی بندش اور غزل کی سی خوبصورت اور اشاریت سے بھرپور نگارش، یہ سب باتیں قطعے کو مشکل تر بنا دیتی ہے۔ جو شاعر اپنا اوّلین مجموعۂ کلام ہی ان گلہائے رنگارنگ کی شکل میں پیش کرکے سخن فہم حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہو، اس کی کامیابی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔

دور میں جامِ ارغوانی ہے   صحبتِ عیشِ جاودانی ہے
کیا ڈراتا ہے مجھ کو، اے واعظ!   میں جواں ہوں، مری جوانی ہے

"مری جوانی ہے" یہ سہ لفظی جملہ قطعے کے بقیہ ساڑھے تین مصرعوں کو قطعہ بنا دیتا ہے۔ ہو بہو اسی تکنیک مگر مختلف مضمون کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

جب جہاں محو خواب ہوتا ہے ۔۔۔ بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے
موت دنیا پہ دیکھ کر طاری ۔۔۔ میں بھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے

ترقی پسندی کے عناصر اس قطعے میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کو پیار کرنے والا حساس دل جب دنیا والوں کو زندگی سے بے پروا دیکھتا ہے، تو اس کا رونا ایک لازمی امر ہے۔

صبح مشرق سے آفتاب آیا ۔۔۔ دورِ بیدار ہمرکاب آیا
خوابِ غفلت سے آنکھ کھول ضیا! ۔۔۔ دیکھ دنیا میں انقلاب آیا

یہ قطعہ ضیا صاحب کے لاشعور میں پلتی ہوئی اس چنگاری کی غمازی کرتا ہے جو ان کی دوسری نظم "نئی صبح" میں شعلہ بن کر رقص فرما ہوئی ہے:

فائدہ کیا تمھارے ڈرنے سے! ۔۔۔ رات دن آہِ سرد بھرنے سے!
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے ہو ۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا، کچھ نہ کرنے سے

اس قطعے کی سادہ مگر ٹھوس حقیقت انسان کی بجھی ہوئی، پسی ہوئی، دبی ہوئی روح کو آمادہ بعمل کرنے میں کتنی پُراثر ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ضیا کی دوسری تصنیف "نورِ مشرق" میں نظموں کے علاوہ چند گیت اور سانیٹ بھی ہیں۔ کتاب کا زیادہ حصہ روایتی رومانی شاعری کی شاہراہ پر بڑھتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن اس روایتی شاعری پر بھی ضیا صاحب کی انفرادیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ نظموں میں چھوٹی چھوٹی بحروں کی کئی پیاری نظمیں ہیں۔ مثلاً "ابرِ بہار"، "گھٹائیں"، "بسنت کا ترانہ" اور بحرِ طویل کی نظمیں بھی جیسے "یوندوں کا ساز"، اگرچہ بعض جگہ انھوں نے ایک سے زیادہ بحور کے حسین امتزاج سے نظم کے تاثر کو بڑھایا ہے۔

اس تجربے میں ان کی فنی صلاحیت بہت مددگار ثابت ہوئی۔
"اگر خدا ہے" میں وہ نہایت دلکش اندازِ بیان اور خوبصورت اسٹایل میں دنیا کے غم واندوہ کو پیش کرتے ہیں۔ نظم کے دوسرے حصے میں شاید انھوں نے علامہ اقبال کے تجربے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ "شکوہ" کے بعد "جواب شکوہ" لکھنے کی بجائے انھوں نے ایک ہی نظم میں اپنا پہلو بچانے کی کوشش کی ہے۔
مجھے ڈیوک آف ونڈسر، پر کہی ہوئی کئی نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن محبّت کی خاطر شاہی تخت وتاج کو ٹھکرا دینے والی اس عظیم ہستی کو جس خوبصورت انداز اور بھرپور موثر طریقے سے ضیا صاحب نے پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لوگ لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا کی محبّت کے قصّے سن سن کر تنگ آچکے تھے، اور وہ شاعروں کو قدرے جنونی تصور کرنے لگے تھے جو لکیر پیٹے جا رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ پارینہ داستانیں اپنی تمام دلکشی کے باوجود ہمارے عہد سے بہت دور تھیں۔ محبوب کے لیے قربانی دینے والے عالی حوصلہ لوگ کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے، لیکن ڈیوک آف ونڈسر کے ایثار نے ایک مرتبہ پھر دنیا کو محبّت کی بے پناہ قوت کا تازہ ثبوت بہم پہنچا دیا۔:

زمانہ قیس کی تاریخ کو افسانہ سمجھا تھا ۔۔۔ محبّت کرنے والوں کو فقط دیوانہ سمجھا تھا
یقیں آتا نہ تھا فرہاد کے ایثار پر اس کو ۔۔۔ ہنسی آتی تھی شاعر کے نشاطِ کار پر اس کو
مگر تو نے یہ ثابت کر دیا افرادِ عالم پر ۔۔۔ کہ ہیں موجود اب بھی مٹنے والے شوقِ پیہم پر

"نئی صبح" میں قطعات، غزلیں، پابند نظمیں اور آزاد نظمیں، سبھی کچھ شامل ہے۔ بڑھتی ہوئی زندگی کی نئی اقدار جو ضیا کی پہلی دو کتابوں (طلوع اور نور مشرق) میں ابرآلودہ آسمان پر گاہے ماہے چمکنے والی بجلی کی مانند تھیں، اس مجموعے میں پوری شدت اور تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ زندگی سے متعلق ان کے نظریے میں کس حد تک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی ہے، اس کا اندازہ "طلوع" اور "نئی صبح" کے دو قطعات سے لگایا جا سکتا ہے:

ہے غلامی سے اسیری اچھی اور امیری سے فقیری اچھی
اس جوانی سے تو پیری اچھی (طلوع)

مہکا ہوا گلزار، جوانی میری اک ابرِ گہربار، جوانی میری
پر جوش ہے جذبۂ عمل سے ہر دم ہے کسل سے بیزار، جوانی میری (نئی صبح)

انسانی ذہن جب قدرت کی بے پناہ مگر اندھی طاقتوں کو سر کرنے کے لیے جد وجہد کا قائل ہو جاتا ہے، تو وہ راضی برضا ہونے کی بجائے جذبۂ عمل سے اپنی روح کو سرشار کرنے لگتا ہے، اور کسی غائبانہ قوت کی بخشش کے سامنے اپنا دامن پھیلانے کی جگہ اپنی قوتِ بازو کے بھروسے زندگی کو حسین بنانے کی سعی میں جُٹ جاتا ہے۔ جذبۂ عمل بیشک مبارک ہے، لیکن یہ اس وقت تک انسانی ذہن کو آمادۂ عمل نہیں کر سکتا، جب تک اس میں اس جہان کو اپنا جہان، اس زمین کو اپنی زمین اور اس دنیا کو اپنی دنیا سمجھنے کی اہلیت نہ پیدا ہو جائے۔ اس ذہنی ارتقا کے بعد کسی فنکار کے لیے بھی محض تصوراتی حسن وعشق کی وادی میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی خواہش باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے جہاں کسی زمانے میں ضیا آرام کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیری کو جوانی پر ترجیح دیتے تھے، اب اسے عمل اور جد وجہد کی سنگلاخ راہوں پر ڈال رہے ہیں۔ اس ذہنی ارتقا میں ماحول کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن محض ماحول ہی کافی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو آج ہمارے تمام شعراء ضیا صاحب کی طرح زندگی کی ترقی پسند قدروں کو اپناتے۔ ماحول کے ساتھ شاعر کی قوتِ مشاہدہ، اس کی دوررس نظر، اور تجربہ کرنے کی اہلیت کی موجودگی بھی اشد ضروری ہے۔ ماحول اثر کی چبھن کو محسوس کرا سکتا ہے، لیکن اس کی توجیہہ سے معذور ہے۔ اس لیے جملہ علوم کا وسیع مطالعہ، انسانی تاریخ سے کماحقہ واقفیت سماجی رشتوں کے بارے میں پوری سوجھ بوجھ اور پھر ایک حساس دل، ان کی ضرورت ہے۔ ضیا کے ذہنی رجحانات میں اتنی زبردست تبدیلی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا دامن ان خصوصیات سے مالا مال ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ہمارے پرانے شعرا نے بھی زندگی کی تلخیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ لیکن چونکہ ان کے زمانے میں زندگی کا اشتراکی شعور پوری شدّت سے رُونما نہیں ہوا تھا، اس لیے زندگی کو حسین بنانے کا جذبہ تشنۂ تکمیل رہا۔ ذرائع آمد و رفت کی دقتیں، تحصیل علم اور مطالعے کے رستے میں اقتصادی، سماجی اور سیاسی رکاوٹیں جمہوریت کے واضح تصور کا فقدان، ان سب باتوں نے ان کے نظریۂ حیات کی علمی حیثیت کو بہت محدود کر دیا تھا۔ اس میں ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ آج کے سماجی طور پر باشعور فنکار بھی ان حالات میں ان سے زیادہ شعور پیدا نہ کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حسن و جمال کی متلاشی نگاہیں زیادہ تر محبوب کی خوبصورتی ہی کا طواف کرتی رہیں۔ ان کی بیشتر ذہنی جدوجہد کا مقصود اپنے نجی غموں کی الجھنیں سلجھانا تھا۔ لیکن جب سماجی شعور حالات کی آگ میں تپ کر سن بلوغ کو پہنچا، تو فنکاروں کے نظریوں میں وسعت، ہمہ گیر وسعت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ضیا کے نظریے میں بھی وسعت پیدا ہو گئی۔

منزلیں ہیں ابھی تو اور بہت ایک منزل کو پا لیا بھی، تو کیا!
دل میں ہے درد کی کسک باقی تجھ کو اپنا بنا لیا بھی، تو کیا!

نجی طور پر حسن کا قرب حاصل کر لینے کے باوجود ضرور نہیں کہ سماجی طور پر کسی بیدار شعور کو تسکینِ قلب بھی حاصل ہو جائے۔ وہ اس فضا پر، اس ماحول پر بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر حسن کے نام سے نور کی بارش کا متمنّی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی ذاتی کامیابی سے مسرت حاصل نہیں ہوتی، اور وہ اپنی کامیابی کو فرضی غم و اندوہ، وصل کے بعد ہجر و فرقت کے اندیشوں کے دھندلکوں میں گم کر دینے کی بجائے زندگی کے دوسرے غموں کے علاج کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

ہزاروں سال سے انساں اسیرِ تیرگی ہے میں آج کیوں نہ طلسمِ جہاں کو توڑ ہی دوں

اجل کو تابع فرماں مجھے بناتا ہے   سڑی گلی ہوئی لاشوں کو اب جھنجھوڑ ہی دوں
شاعر کا احساسِ لطافت پے در پے چرکوں سے گھائل ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس جذبۂ بغاوت سے ذہن میں سڑی گلی لاشوں (خستہ حال انسانوں) کو جھنجھوڑ کر اجل (زندگی کی مخالف طاقتوں کو تابعِ فرمان بنانے کا جذبہ جنم لیتا ہے۔

قطعات کے علاوہ ضیا کی غزلوں میں بھی جابجا صحتمندانہ رجا کا جذبہ ملتا ہے:

حیاتِ تازہ کے نغموں سے گونجتی ہے فضا   نئی امنگ، نئی کروٹیں بدلتی ہے
سکوتِ یاس کے لب پر ہے نغمۂ امید   کرن سحر کی شبِ تار ہی میں پلتی ہے

ماحول کی ناسازگاری شاعر کے حساس دل میں یاسیت کی خفی لہر، سیٹھا میٹھا درد اور عجیب سی بےچینی پیدا کر دیتی ہے۔ ضیا کی غزلوں میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جن میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان شعروں کی یاسیت ملاحظہ فرمائیے:

دن وہی ہیں اور راتیں بھی وہی   ہم دلِ مایوس کو سمجھا ئیں کیا!
کہاں کا سفینہ، کہاں کا کنارا   تہِ موجِ گرداب ہے گھر ہمارا

اور یہ کیفیت اور گہری ہو کر جنون میں تبدیل ہو جاتی اور دلِ مایوس کو آمادۂ عمل کرتی ہے۔ اسی ذہنی تبدیلی کا اثر شاعر کے کلام میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ مایوسی کی تمام نہاد لذتوں کی جگہ اپنی بےچین روح کو مستقبل کی ضیا پاش تخیل سے چمکانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ جہاں پہلے زندگی کا تصور مسلسل کرب، لامتناہی آہ و زاری اور ایک نہ ختم ہونے والی مصیبت کی شکل میں اس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا، اب وہاں زندگی کی تلخیاں، زندگی کے تار و پود کو گھلا دینے والا زہر اس نفسیاتی تبدیلی کی لاگ سے ذہن کو اپنی بیخ کنی پر اکسانے لگتا ہے:

انقلاب کا آغاز ہے میرا انجام   خود بدل جائیگی یہ رسم کہن میرے بعد

اس شعر میں 'میرے بعد' کی ردیف شاعر کی پرانی ہمہ یاسیت کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے، لیکن شعر کا مجموعی تاثر غیر مبہم طور پر ثابت کرتا ہے کہ شاعر اب ناامیدی کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کا انقلابات پر ایمان لے آنا ہی اس قلب کی ماہیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ شعر شاعر کی ایک اور ذہنی کیفیت کا بھی پتا دیتا ہے۔ یعنی وہ شخصی طور پر یاسیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ رسومات کہن اس کے بعد تبدیل ہوں گی۔ اس سے ایک دردِ پنہاں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس رنج کا اظہار قدرتی امر ہے۔ شاعر بھی انسان ہے، فرشتہ نہیں، جو ہر قسم کے ذاتی محسوسات سے بے نیاز رہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام (قربانی) انقلاباتِ زمانہ کا آغاز ہوگا اور اس بات سے اس کے جذبۂ سماج دوستی کی تسکین ہوتی ہے۔ شخصی اور اجتماعی زندگی کے دو مختلف (متضاد نہیں) اثرات ایسے شعروں کی تخلیق کے محرک ہوا کرتے ہیں۔ سماج اور فرد کے باہمی رشتوں کو بخوبی سمجھنے والا ذہن ہی دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے، وہ کبھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیگا۔

غزل جو کبھی محض حسن و عشق کی داستان بیان کرنے کے لیے مخصوص تھی، اب زندگی کی ساری الجھنوں، غموں، دکھوں اور حادثوں کے اظہار کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔ ہاں غزل کا نازک مزاج اور اشاریت والا اسلوب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے علمی یا منطقی دلیلوں سے بوجھل کیا جائے۔ جس نے کہا کہ غزل وحشی صنفِ شاعری ہے، اس نے غلط کہا۔ غزل ایک مہذب اور لطیف صنفِ شاعری ہے۔ لیکن تہذیب اور لطافت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ مسائلِ حیات سے بے نیاز ہو جائے۔ غزل ہر موضوع کو برداشت کر سکتی ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ شاعر کو اسے ڈھنگ سے کہنے کا سلیقہ معلوم ہو۔ ضیا نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح نئے انداز کی غزلیں کہی ہیں؛ اور وہ بہت خوبصورت غزلیں ہیں۔ د

غزل کے مزاج سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ اس کی لطافت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اس کی روایت توڑنے کی بجائے اسے آگے لے جانے کے حق میں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ فن کی روایتوں کو توڑ کر زندگی کی خدمت نہیں کی جا سکتی، بلکہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ان روایات کو حیاتِ نو کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھایا جائے۔

ہم نے چھیڑا ہے جب کبھی سازِ جنوں   نیرگیِ شب کی گنگنا دی ہے

جنون کی حسن پرور طبیعت اور اس کی قوتِ تخلیق کو اس سے بہتر الفاظ میں کوئی دوسری صنفِ شاعری پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت اور رومان کا یہ حسین امتزاج غزل کو ہمیشہ زندہ رکھیگا۔

امیدیں جاں بلب کچلی ہوئی دل کی تمنائیں
میں ہنستا ہوں کہ اک اندازِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے

اس میں "یوں" سے پتھر کا دل بھی پسیج جاتے۔ اسی رنگ میں شعر سنیے،

جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا   جب ارادوں کی کائنات بنی

موجودہ سیاسی نظام میں شاعر کا مرتبہ کیا ہے؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاعری اور بیکاری ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعر کی اس زبوں حالی کو نہایت سلجھے ہوئے طنزیہ انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

جس کو ضیا دیکھو ہے شاعر   بڑھتی جاتی ہے بیکاری

"نئی صبح" نامی نظم میں ان کا نظریۂ حیات واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اسے مستقبل سے جوڑتے ہیں؛ اوہام پرستی پر بھرپور وار کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ خدا پر بھی جس سے انھوں نے آج تک کبھی منھ نہیں موڑا تھا، ان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

خدا کا بھرم کھول دونگا جہاں پر   یقیں کانپ اٹھیگا میرے گماں پر

"شبِ تار" (نظامِ کہنہ) کے چلے جانے کا اور "نئی صبح" (جمہوریت) کے آنے کا انھیں پختہ یقین ہے؛

اٹھو، دوستو! وہ سحر آ رہی ہے نہیں دور، اب تو نظر آ رہی ہے

آج کا شاعر اپنے آپ کو سماج کا ایک فرد سمجھنے لگا ہے۔ اسے اس بات کا پتا لگ چکا ہے کہ غموں کا مداوا اور زیادہ غموں میں نہیں، بلکہ اجتماعی جد و جہد میں ہے۔ آج تک زندگی کے مسائل کا حل، اس کی انفرادیت ڈھونڈنے سے قاصر رہی ہے۔ اجتماعیت نے اس کے ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کو تقویت بخش دی ہے اور وہ زندگی کی کشمکش میں برابر کا شریک بن گیا ہے۔ ضیا کے ترقی یافتہ دماغ نے بھی غم کی پرستش چھوڑ کر مسرتوں کا دامن تھام لیا ہے؛

سعی و عمل پہ رکھوں بنائے حیات کو
عشرت کا راز دار بنوں، غم کو چھوڑ دوں

اور جمہور کی قوتِ عمل پر ایمان مرادف ہے، ارضی اور سماوی دونوں سہاروں سے کنارہ کشی کے:

طوفاں کو اپنے عزم کے ہاتھوں سے دوں شکست
چھوڑا ہے ناخدا کو، خدا کو بھی چھوڑ دوں

"جاگ اے انسان" مختصر لیکن بہت کامیاب نظم ہے۔ اس میں وہ جمہور کو بیدار ہونے کے لیے پکارتے اور ماضی کے از کار رفتہ نظام کو بدل دینے کی ترغیب دیتے ہیں؛

نظمِ رنگ و بو بدل بادہ و سبو بدل
وقت کی پکار سن بے درنگ تو بدل
آفتاب آ گیا، انقلاب آ گیا
اب ہے امتحان جاگ جاگ اے انسان جاگ

آج تک ہم جن عوام کو بیوقعت اور حقیر خیال کرتے آئے ہیں، ضیا ان کی

چھپی قوتوں کو فنکارانہ اصطلاحوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں:

ذرّہ آفتاب ہے — قطرہ موجِ آب ہے
راج ہے بہار کا — خار بھی گلاب ہے
یہ ہنسی، یہ دلکشی — دین تیرے ہوش کی

آخری شعر میں وہ حسن لطافت (یہ ہنسی، یہ دلکشی) کو کسی آسمانی یا غیبی طاقت کی دین سمجھنے کی بجائے انسان کے بڑھتے ہوئے شعور کی دین بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ نظریہ اوہام پرستی کی بجائے کہیں زیادہ سائنٹفک ہے۔ خوش اعتقادی اور قدامت پرستی کے خلاف جس قدر اردو شاعروں نے لکھا ہے، شاید ہی کسی اور زبان میں اس کی مثال ملے۔ ضیاؔ نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا ہے:

منزل نہ رہی، رہبر نہ رہے، رہرو خود کو پہچان گئے
ان دھرموں کو، ایمانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

اور جب دھرم اور ایمان حالات کے ساتھ بدلنا شروع کر دیں، تو وہ سائنس بن جاتے ہیں۔ کس لطیف طریقے سے اوہام پرستی پر چوٹ کی ہے!

فردا کے حسین خواب دیکھنے والا شاعر اگر حال سے بے پروا ہو کر صرف مستقبل ہی میں گم ہو جاتے، تو "فردا" کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ مستقبل ہمیشہ حال کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اس لیے حال کے سنوارنے کی سعی اتنی ہی لازمی ہے، جتنا مستقبل کے خوبصورت سپنوں سے دلوں میں ولولہ اور جوش بھرنے کی کوشش۔ فردا کے سپنوں کو مخاطب کرتے ہوئے ضیا صاحب کہتے ہیں، ابھی میں حال کی فکر میں مبتلا ہوں، اس لیے 'اے فردا کے سپنو! تم نہ آؤ، تم اس وقت آنا، جب:

زرا وقت کروٹ بدل لے تو پھر میں — تمہارے ہی رستے پہ گاتا چلوں گا
مٹا کر یہ صدیوں کی پُرہول ظلمت — نکھرتے ہوئے نور میں بن سنور لوں

اور دیکھیے:

تمھارے لیے ڈوب کر زندگی میں غلط رفعتوں کو ڈبونا ہے مجھ کو
چلے جاؤگے تم، تو بھڑکیں گے شعلے نئی قوتوں کے سہارے اٹھونگا
تمھاری قسم ہے، تمھارے لیے میں زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دونگا

ضیا کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم "تین دور" میں ملتی ہے:

وہ دُور سایے افق پر ابھرتے آتے ہیں کوئی حسینۂ کمسن ہے منھ چھپائے ہوئے
مہین ریشمی آنچل میں سرسراتے ہیں نقوش چہرۂ فردا کے تمتماتے ہوئے

۱۹۴۷ء کے فسادات نے ہرادیب اور شاعر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور ان میں سے بیشتر نے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ ضیا کی نظم "سویرا" ان معدودے چند نظموں میں ہے، جو اپنی فنکارانہ قدروں کو پورا کرتے ہوئے شدت اثر کو بھی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ایسی کامیاب نظم لکھنے کے لیے صرف کہنہ مشقی ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ ادب کے گہرے مطالعے کی بھی ضرورت رہتی ہے۔

وہ مذہب آدمی کو آدمی سے جو لڑاتا ہے خدا کے نام پر جو شیطنت کو خود جگاتا ہے
وہ مذہب ابنِ آدم کا ہے رہبر، اے دلِ وحشی!
مجھے انسانیت کی موت پر آنسو بہانے ہیں یتیموں اور بیواؤں کے افسانے سنانے ہیں
جو گھر والے کبھی تھے، اب ہیں بے گھر، اے دلِ وحشی!

اسی مضمون کو انھوں نے "داتا" میں بھی لکھا ہے۔ زبان نہایت عام فہم، انداز بالکل سیدھا سادا اور بات ٹھوس۔ ان سب چیزوں سے یہ نظم عوام کے بہت قریب آگئی ہے۔

اس مجموعے میں ان کی ایک اور بہت کامیاب نظم "فن کار" بھی شامل ہے، جس میں موجودہ نظامِ حیات سے ایک شاعر کی بیزاری اور اس کی مجبوریوں کو کٹیلے طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور

جب تک فنکاریوں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف لکھنے پر مجبور رہیگا، جب تک اسے صرف محبت کے افسانے، گلوں کی خوبروئی کے قصیدے یا چاند کے حسن کی تعریف پر داد ملتی رہیگی، اور اس کی اقتصادی حالت اس کے فن کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہیگی، ایسی نظمیں لکھنا بند نہیں ہونگی۔ ضیا کی اس نظم کا انداز، اس کی بندش اور اس کی تراکیب ——— ان سب نے مل کر اسے اس موضوع کی کامیاب نظموں میں جگہ دے دی ہے

روایاتِ ماضی، حکایاتِ فردا تبسم، ترنم، شکایت، مداوا
خوشی، تکلم، ہنسی، شور و غوغا اجالا، اندھیرا، جوانی، بڑھاپا
نظامِ حیات کہن بیچتا ہوں خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں
میں افسانے لکھتا ہوں، کہتا ہوں غزلیں زمانے میں مقبول ہیں میری نظمیں
ادب کو ہیں مجھ سے بہت کچھ امیدیں نہیں پیٹ کی بھوک ہی میرے بس میں
بہ امیدِ یک نان، فن بیچتا ہوں خریدو مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

اور آخری بند میں یہ طنز اور بھی تیز ہو جاتی ہے:

مری آنکھ کی تم نمی کو نہ دیکھو مرے عالمِ برہمی کو نہ دیکھو
مری زندگی کی کمی کو نہ دیکھو مرے پیکرِ ماتمی کو نہ دیکھو
میں انسانیت کا کفن بیچتا ہوں خریدو مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

یہ ایک مختصر نظم بھی ضیا کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

"گردِ راہ" میں رباعیات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ایک رباعی دیکھیے:

ہے صبح، نہیں رات، ذرا آنکھ اٹھا اٹھتے ہیں حجابات، ذرا آنکھ اٹھا
انسان کی خدائی کا زمانہ آیا کیا بات ہے، کیا بات! ذرا آنکھ اٹھا

جہاں "کیا بات ہے کیا بات" رباعی کو فنی اعتبار سے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے وہیں ضمناً نظریۂ حیات بھی اس سے جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ادب میں صحت مند اور ترقی پسند نظریے کے ادیب اور شعرا نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے، چاہے وہ ظلم کسی ایک طبقے کے خلاف ہو، یا تمدنی اور تہذیبی ورثوں کے خلاف۔ اردو زبان کے ساتھ جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہر حق پسند انسان لامحالہ احتجاج کریگا۔ اور پھر زبان کی حیثیت تو شاعر کی محبوبہ کی ہوتی ہے۔ ان کی اس سلسلے کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

اللہ رے، بہ شوکت و شانِ اردو	ہندی پہ ہے مجھ کو گمانِ اردو
بیگانہ اسے لاکھ کہیں، اہلِ وطن	ہاں اپنی ہے، اپنی ہے، زبانِ اردو

"اپنی ہے" کی تکرار نے اس رباعی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اس مجموعے میں ضیا صاحب کی بعض بہت خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے صرف چند ایک کے اقتباسات پیش کرنے ہی پر اکتفا کرونگا:

جن سے انسان خطرے میں ہے، سہمی سہمی انسانیت
ان محلوں، ان ایوانوں کو میں آج گرانے آیا ہوں
جو رات کہ ننگِ عالم تھی، اس رات کا اب انجام آیا
سونے والو! جاگو، سنبھلو، بیداری کا ہنگام آیا

(صبح کا تارا)

مصائب کی رُوداد کہتے رہے ہو	تھپیڑے حوادث کے سہتے رہے ہو
شب و روز طوفان میں بہتے رہے ہو	بھنور کو کبھی ساحل بناؤ، تو جانوں

(مطالبہ)

ہے بلندی زیرِ پا	پستیوں کا ذکر کیا
کام کیا ہے یاس کا	دل ہے ہمت آشنا

بے نیازی مل گئی
چارہ سازی مل گئی
سرفرازی مل گئی

فکرِ نائے و نوش ہے — یعنی اپنا ہوش ہے
باخبر ہشیار ہے — آدمی بیدار ہے
(انسانِ بیدار)

تقدیر تو کچھ نہیں تدبیر ہے سب کچھ — آرام سے بھاگو، غم دوراں کو پکارو
(وقت کی پکار)

پی کر بھی ہوش ہے جنہیں آداب بزم کا — ساقی سے ایسے بادہ گساروں کو چھین لوں
(سینہ زوری)

حصۂ غزل میں بھی جا بجا ضیا کی انسان دوستی اور صحتمندانہ قوتوں کی ہم نوائی کے جواہر پارے نظر آتے ہیں:

دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائینگے ہم
خونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

جادہ پیما رہے کارواں — مل ہی جائیگی منزل کہیں

اس یاسیت زدہ دور میں ایسے اشعار کمیاب ہی نہیں، نایاب ہیں:

محبت، آرزو، آنسو، تبسم، حوصلہ، کوشش
فرشتے کچھ نہ سمجھینگے، یہ مشتِ گل کی باتیں ہیں

سحر کی منزلِ روشن میں جا پہنچے وہ دیوانے
شب تاریک میں جو نور کا لے کر علَم نکلے

ہمیں موڑنا ہے رُخِ موجِ طوفاں
سفینہ ڈبونے سے کیا فایدہ ہے!

وہی تیرگی ہے ابھی تک دلوں میں
ضیا صبح ہونے سے کیا فایدہ ہے!

ضیا سلجھے ہوئے، کہنہ مشق اور باسلیقہ شاعر ہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیات میں فن کے لوازمات کا پورا پورا احترام ملتا ہے۔ ان کا سینہ انسانیت کے درد سے لبریز ہے۔ ان کا دل اس کہنہ نظامِ زندگی، تقلید پرستی اور انسان کو مجبور و بے بس بنا دینے والی قوتوں کے خلاف جذبۂ بغاوت سے سرشار ہے۔ وہ صرف وہی بات کہتے ہیں، جس پر انھیں خود پورا یقین ہو۔ اسی لیے ان کے شعروں میں شدّتِ تاثر ہے۔ انھوں نے ترقی پسند اقدار کو صحیح طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ صرف فیشن کے طور پر ترقی پسند شعر نہیں کہتے، نہ وہ کسی خارجی اثر کے تحت لکھتے ہیں۔ جب زندگی کے جسم میں تلخیوں کا زہر سرایت کرتا ہے، تو ان کا حسّاس دل جھنجلا اٹھتا ہے، ان کا جذبۂ انصاف شعور کی گہرائی سے بیدار ہوتا ہے، اور دل اور دماغ کی ہم آہنگی ان کے شعروں میں جذبے اور منطق کو شیر و شکر کر کے پیش کر دیتی ہے۔ وہ جب تک خارجی اثرات کو اپنے دماغ میں پوری طرح سے رچا نہیں لیتے، جب تک ان کا منطقی دماغ جذباتی سطح پر نہیں آجاتا، وہ شعر نہیں کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعر جذباتی اور نظریاتی کسوٹی دونوں پر پورے اترتے ہیں۔ وہ پرانی قدروں کو صرف جدّت کی خاطر توڑنے کے حق میں نہیں؛ وہ توڑنے سے زیادہ اسے آگے بڑھانے والے فنکاروں میں سے ہیں۔ انھیں فن کی ضروریات کا نہ صرف پورا پورا احساس ہے، بلکہ ان میں انھیں نباہنے کی اہلیت بھی ہے۔ وہ زندگی اور فن کے رشتے کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور سماج دشمن قوتوں کو کچلنے والی نئی جمہوری قوت کی بے پناہ صلاحیت بھی ان سے مخفی نہیں۔

اعجاز صدیقی

ضیا فتح آبادی، بحیثیت نظم نگار

میرا ذہن ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانے کی طرف جا رہا ہے، جب حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد کی اصلاحی شاعری کے علاوہ ہمارے پاس نظمیہ شاعری کا کوئی قابلِ تقلید یا چونکا دینے والا سرمایہ نہ تھا۔ اگر کوئی بڑی "علامت" تھی تو وہ صرف نظمیہ اکبر آبادی کی ایک وسیع پس منظر میں پھیلی ہوئی نظم نگاری، اپنے دورِ اول میں اقبال کے فکری و فنی سانچوں نے اردو کی نظمیہ شاعری کو ایک اندازِ وقار ضرور عطا کیا اور ان کے ساتھ ساتھ سیماب، چکبست، تلوک چند محروم، ظفر علی خان اور پھر جوش اور علی اختر وغیرہ نے بھی نظمیہ شاعری کو نیا آب و رنگ دیا۔ ان اصحاب کی مساعی سے ہیئتی تبدیلیاں زیادہ نہ سہی، لیکن اسلوبی اور موضوعی تازگی اردو نظم کو ضرور ملی۔

میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں، وہ پرانے سے نئے کی طرف آنے کا ایک عجیب دور تھا۔ زندہ دلانِ پنجاب نے ادب اور شاعری میں نئے نئے تجربے شروع کر دیے تھے۔ نئی کہانی، نئی نظم اور نئی تنقید اردو ادب کے افق سے جھانک رہی تھی۔ "مخزن" کے بعد "پیمانہ"، "شاہکار"، "ادبی دنیا"، "ہمایوں"، "عالمگیر" اور "ساقی" جیسے ترقی یافتہ رسالے یکے بعد دیگرے نکلنا شروع ہو گئے۔ اس دور کی نئی نسل کی دلچسپی مغربی ادب سے بڑھ رہی تھی۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ نئے ادبی رُجحانات بروئے کار آ رہے تھے۔ مغربی شاعری اور کہانیوں کے

تراجم اردو فارسی کے سامنے آئے۔ پابند نظموں کی اس بھیڑ میں، کچھ ایسے نوجوان شعرا ابھرے، جنھوں نے اپنے ذہنوں کو آزاد نظم (FREE VERSE) کی طرف مائل کیا اور علامت نگاری پر توجہ دی۔ یہ وہ دور تھا، جب ترقی پسندی یا جدیدیت کی آویزش نہ تھی، لیکن قدیم اور جدید، کلاسیکی اور غیر کلاسیکی کی بحثیں کبھی کبھی ضرور چھڑ جاتی تھیں۔ نئی شاعری کے ان تجربوں نے نہ صرف پڑھنے والوں کو، بلکہ اس دور کے اساتذۂ سخن کو بھی چونکا دیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلی باقاعدہ اجتماعی بحث ماہنامہ "نگار" لکھنؤ کے "جدید شاعری نمبر" (سنہ یاد نہیں آرہا ہے) میں ہوئی تھی۔ مولانا نیاز فتحپوری اُن نئے تجربوں کے خلاف تھے اور جن اساتذۂ شعر و ادب نے اُس نمبر کے لیے مضامین لکھے تھے، ان میں سے بھی دو تین کے علاوہ، سبھی نے اُن تجربوں کو ناپسند کیا تھا۔ انھوں نے اس دور کی آزاد نظمیہ شاعری کو بے معنی، مبہم اور فن سے بیگانہ قرار دیا تھا، لیکن بعض نے ابہام، اشاریت اور علامتی انداز سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے اسے سراہا بھی تھا اور قافیہ، ردیف اور بحر کی پابندی سے اس "ابتدائی انحراف" کو خوش آیند قرار دیا تھا۔

اس دور کی نئی نسل کے شعرا میں مجھے جو نام یاد آرہے ہیں، وہ ن۔ م۔ راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر (جو نئی نسل سے تعلق تو نہیں رکھتے تھے، مگر وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف نئی نسل کا دل بڑھایا، ان کے تجربوں کو سراہا، بلکہ خود بھی آزاد، مبہم اور معرّا نظمیہ شاعری کی) میراجی، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، سیّد فیضی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور مخمور جالندھری وغیرہ ہیں۔ ضیا فتح آبادی بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور کے عام رواج کے مطابق انھوں نے سیماب اکبرآبادی کو اصلاحِ سخن اور تربیتِ فن کے لیے منتخب کیا۔ اس لیے کہ اپنے دور کے ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ سیماب نئے میلاناتِ شعری کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ نئے میلاناتِ شاعری رکھنے والے نوجوان شعرا کی بڑی تعداد

سیماب ہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئی اور ہمیشہ رہی۔ مختار صدیقی، ضیا جالندھری، سید فیضی، مخمور جالندھری، الطاف مشہدی، سراج الدین ظفر جیسے چند بڑے نام بطورِ مثال لیے جا سکتے ہیں۔ گویا اس دور کی نئی نظمیہ شاعری کے فروغ میں "آگرہ اسکول" کا فیض اور ایماء بھی شامل رہا ہے۔

ضیا فتح آبادی کا نام ۱۹۲۹ء ہی میں اُبھرنے لگا تھا۔ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۳ء کی چند نظمیں جو انھوں نے لاہور اور امرتسر میں کہی تھیں، اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" (۱۹۳۷ء) میں شامل ہیں۔ ۱۹۳۳-۱۹۳۵ء میں غالباً ضیا ایم اے کے طالب علم تھے۔ یہ ۴۴ سال پہلے کی بات ہے۔ "نورِ مشرق" کے آخری حصے میں ضیا فتح آبادی کے نو" سانیٹ"، جوانی، محبت، دل، اپنی میرا سے، یاد، دھوکا، اضطراب، جدائی اور دیوی کے عنوانات سے شامل ہیں۔ "سانیٹ" مغربی صنفِ نظم ہے۔ پنجاب کے زندہ دل نوجوانوں نے اس صنفِ سخن کو بھی اپنایا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ صنفِ سخن مقبول نہ ہو سکی۔ اس کی ہیئت ذرا سے اختلاف کے ساتھ پابند نظموں کی ہیئت ہی سے ملتی جلتی ہے۔ ضیا فتح آبادی کا ایک بہت پرانا "سانیٹ" یہاں پیش کرتا ہوں۔

جوانی

بہار و شعر و موسیقی لیے دامانِ رنگیں میں
جوانی ہر نظر کو حُسن کا پیغام دیتی ہے
اُمید و آرزو اور شوق کے ایوانِ رنگیں میں
شرابِ بیخودی کے جام صبح و شام دیتی ہے
جوانی سرمدی نغمے کچھ اس ڈھب سے سناتی ہے
جنھیں سُن کر یقیں انساں کو آجاتا ہے ہستی پر
کہیں چشمے بہاتی ہے، کہیں غنچے کھلاتی ہے
کہیں مجبور کرتی ہے، چمن کو خود پرستی پر

دلِ آزاد میرا بے نیازِ رنگ رہبر ہے
یہ جس رستے پہ لے جاتا ہے، اُس رستے پہ چلتا ہوں
نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ قہرِ داور ہے
جوانی ڈھالتی ہے مجھ کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں
یہی دن ہیں جوانی کے، محبت کے، مسرت کے
ضعیفی کو مبارک حوصلے زہد و عبادت کے

(لاہور ۱۹۳۴ء)

یہ بات ۴۴ سال پہلے کے نئے شعری رجحانات کی کر رہا تھا، جو نظمِ آزاد کا دورِ آغاز تھا اور نئی تعلیم یافتہ نسل بہت سی قیودِ شعری کو توڑ کر استعارہ سازی، علامت نگاری اور ابہام کی طرف آ رہی تھی۔ ضیا فتح آبادی نے بھی اس وقت آزاد نظمیں کہیں۔ اُن کے مجموعۂ کلام "گردِ راہ" میں دریچے سے، نروان، جنگ کے بعد، پس منظر، خواب اور خواب، طوفان اور انگڑائی کے عنوانات سے سات اور تیسرے شعری مجموعے "نئی صبح" میں آخری بار، شیریں تلخی، فرار، تین آزاد نظمیں شامل ہیں۔

انگڑائی

گدگدی دل میں ہوئی
ولولے جاگ اُٹھے
آرزوؤں کے شگوفے پھوٹے
اُفقِ یاس سے پیدا ہوئی امید کی بیتاب کرن
شبستانِ تمنا میں ہر اک سمت اُجالا پھیلا
کھول دی، دیر سے سوئے ہوئے جذبات نے آنکھ
خرمنِ دل میں پھر اک آگ سی بھڑکی، چمکی
اک تڑپ، ایک شرار ـــــ
اس پہ ہے انجمنِ دہر کی گرمی کا مدار

خون رگ رگ میں رواں
اس سے حرکت میں ہے عالم کا نظام (۱۹۴۸)

نظم میں نرم اور شگفتہ الفاظ ہیں، کوئی ابہام اور رمزیت بھی نہیں ہے اور نہ وہ علامتی انداز جو اس دور میں ن۔م راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد کے یہاں ابھرا تھا نظم میں ایک واضح معنویت ہے۔ لیکن

خرمن دل میں پھر اک آگ سی بھڑکی، چمکی
اک تڑپ، ایک شرار

نظم کے یہ دونوں ٹکڑے یا مصرعے ایک تجریدی فضا اور آزاد اسلوب کا پتا ضرور دیتے ہیں۔ ہر چند یہ نظم ۲۹ سال پہلے کی ہے، لیکن اپنے اسلوب کے اعتبار سے اختر الایمان کی ایک بہت خوبصورت نظم "باز آمد" سے ملتی جلتی ہے:

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہو جو
کان میں کہنی ہو خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا کرتا ہے سن کر یہ بات (اختر الایمان)

ضیا فتح آبادی کی ایک طویل نظم "فرار" جو غالباً نظم انگڑائی سے بھی پہلے کی ہے، ان کی آزاد نظموں میں زیادہ پہلو دار، عصری حیثیت سے ملو اور جذبے سے بھرپور ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ اسے ۳۰ سال پہلے کی کہی ہوئی منتخب آزاد نظموں کے مجموعے میں شامل کیا جائے۔

جھنجھوڑ کر یہ کس نے خواب ناز سے جگا دیا
میں سو رہا تھا گہری نیند بےخبر جہاں سے
نہ ابتدا کا عکس تھا، خیال کی نگاہ میں
میں پی رہا تھا پے بہ پے

انڈیل کر شرابِ حال وقت کے پیالے میں
حیاتِ مختصر مرے لیے پیامِ عیش تھی
شباب و حسن کی لذیذ چٹکیوں سے گدگدی تھی قلب میں
سجی سجائی اک عروسِ نو کی طرح دل نشیں
بہارِ غنچہ ہائے آرزو کو تھی نکھارتی
بھنور میں ولولوں کے پھنس گئی تھی کشتیٔ جنوں!
تہہ زمین مہیب گڑگڑاتا زلزلہ گیا
لرز اٹھی تمام کائنات، آنکھ کھل گئی
کھلی جو آنکھ تیرگی ہی تیرگی تھی ہر طرف
شباب و حسن اور بہاریں سے کوئی بھی نہ تھا
رباب و چنگ بھی نہ تھے ——
دل و دماغ پر طلسمِ انقلاب چھا گیا
اتر گیا خمارِ بادۂ فسونِ انبساط ——
نگاہ رفتہ رفتہ تیرگی سے آشنا ہوئی
نقوش ہلکے ہلکے آگئے ابھر کے سامنے
وہ صورتیں جنھیں میں جانتا تھا، جانتا نہ تھا
جو میرے ذہن و فکر کی حدود سے بھی دور تھیں
نقاب اٹھا کے جلوہ گر تھیں اپنے اصلی روپ میں
نڈھال اور مضمحل ——
کہیں رگوں میں خونِ گرم کا نشان تک نہ تھا
پچک گئے تھے گال اور لبوں پہ تھیں سیاہیاں
سیاہیوں سے ہمکنار زردیاں تھیں موت کی!
یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں،

یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک لرزہ خیز خواب
یہ چیختی ہوئی فضائیں روز و شب حیات کی
یہ بلبلاتی آرزوئیں قلب کے مزار پر
سکون کا خون، بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ
یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدّعا سے تنگ
فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر ایک سمت جال
یقیں کے پاؤں اور بدگمانیوں کی بیڑیاں
ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے
تمام پردے، ایک ایک کرکے خود سرک گئے۔
حقیقتیں جو روشنی میں آنکھ سے چھپی رہیں
وہ ظلمتوں کا سینہ چاک کرکے جگمگا اٹھیں
کھُلا جو رازِ کائنات، دل میں ایک درد اٹھا
فرار کی تلاش رینگنے لگی دماغ میں
میں سونا چاہتا ہوں پھر ——— !

اپنی ہیئت اور مصرعوں کے دروبست کے اعتبار سے یہ جدید شاعر مجید امجد کی رواں دواں نظم "آٹوگراف" سے ملتی جلتی ہے ———

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے،
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بیخبر حسین لڑکیاں (مجید امجد)

محولہ بالا نظم "فرار" اگر آج ضیا فتح آبادی کے نام کے بغیر شائع ہو جائے، تو یہ بالکل اس دور کے کسی جدید شاعر کی فکر معلوم ہو۔

ہیئت کے اس تجرباتی دور میں آزاد نظموں کے علاوہ ضیا نے بہت سی پابند

نظمیں بھی کہیں اور غالباً ان کی شاعری کی ابتدا ہی نظم نگاری سے ہوئی ۔ ان کے اوّلین مجموعۂ کلام " نورِ مشرق " (۱۹۳۷ء) میں ۴۳ نظمیں، ۷ گیت اور ۹ سانیٹ شامل ہیں : طلوعِ سحر، انقلاب بہار، دعوت سیر، ابر بہار، گھٹائیں، بسنت کا ترانہ، بوندوں کا ساز، کرن، شاہکار فطرت، اے گل، صبح کا ستارا، گل نوشگفتہ۔ نظموں کے ان عنوانات، ان کے مواد اور لہجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیا کا رجحان "نیچرل شاعری" کی طرف رہا ہے۔ ان کی نظم "طلوعِ سحر" کا یہ آغاز دیکھیے :

ہوا طلوع افق پر ستارۂ سحری
ملی تمام جہاں کو نویدِ جلوہ گری
سفر کا حکم ملا کاروانِ انجم کو
سواریِ سحر آتی ہے، راہ صاف کرو

اور کئی مناظر فطرت کی عکاسی کے بعد شاعر کہتا ہے :

کسان بیل لیے دور جھونپڑے سے چلا
سحر کے نشّہ میں مخمور، جھونپڑے سے چلا
ہوئی بلند صدا مندروں سے گھنٹوں کی
اذاں موذّنِ مسجد نے دی، فضا جاگی

ایسا ہی نرم اور شگفتہ لہجہ اور فطرت سے دل دیدہ کا رشتہ، ضیا فتح آبادی کی دوسری نظموں میں بھی پایا جاتا ہے :

شعاعِ آفتاب، وہ افق پہ جلوہ گر ہوئی
تمام بزمِ کائنات جنّتِ نظر ہوئی
اٹھا یہ شور ہر طرف، سحر ہوئی، سحر ہوئی
لو آؤ سیر کو چلیں

پرندے بیخودی کے گیت گا رہے ہیں ہر طرف
فضاؤں میں پروں کو پھڑپھڑا رہے ہیں ہر طرف

فسانہ صبحِ باغ کا سنا رہے ہیں ہر طرف
لو آؤ، سیر کو چلیں، (نظم دعوتِ سیر)

ضیا کی اس نوع کی نظموں سے ایک رچا ہوا ذوق آشکار ہے۔ ان کے یہاں شعری جمالیات کا بھی احساس ملتا ہے اور ان کا لہجہ رومانی معلوم ہوتا ہے۔ وہ دور اسی انداز کی نظمیہ شاعری کا تھا۔ اگر اختر شیرانی اور مجاز رومانی شاعری کر رہے تھے، تو پنجاب کے نوجوان شعرا فطری شاعری۔ آہستہ آہستہ ترقی پسندی کے دور میں اردو کی نیچرل شاعری کم ہوتی گئی اور اب تو نیچرل شاعری کی طرف شعرا آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ہیں، حالانکہ نیچرل شاعری کا ایک بڑا درجہ ہے۔

ضیا فتح آبادی کے گیتوں میں ان کا لہجہ اور زیادہ خوبصورت اور دلنشیں ہو گیا ہے۔ اس نے "خالص ہندستانی آہنگ" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آس، کس اور، من کی بھول، بِرَہن کا گیت، من کا گیت، نہ رُک، پی بن۔ یہ گیت نہایت نرم و نازک اور آسان ہندی الفاظ میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں ہلکے ہلکے رومانی جذبے کی آنچ ہے۔ یہ مختصر سا گیت "کس اُور" دیکھیے:

بدری روئے شور مچائے
بجلی کو بھی چین نہ آئے

ناچیں کیوں کر مور
پپیہے! پیا گئے کس اُور

رات اندھیری، کچھ نہ سوجھے
پی بن کوئی بات نہ بوجھے

جائے کہاں چکور
پپیہے! پیا گئے کس اُور

پربت اونچا ہو کر دیکھے
اور ساگر پاتال میں ڈھونڈے

ندی مچائے شور
پپیہے! پیا گئے کس اور

ضیا کے مجموعۂ کلام "گرد راہ" کی نظموں میں تیاگ، یاد کی یاد، دیپاولی، برہن، الجھن اور پکار، کا نہ صرف لہجہ ہی خالص ہندستانی ہے، بلکہ ان نظموں کی فضا بھی ملکی ہے۔ تلمیحات و استعارات اور تلازمے تک دیسی ہیں۔ اپنے گیتوں کی طرح ان نظموں میں بھی انھوں نے نرم ہندستانی لفظیات سے کام لیا ہے۔

ضیا نے اپنی نظموں میں ہیئت کے کچھ تجربے اس دور میں کیے، جب حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور افسر میرٹھی وغیرہ نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ نظمیں لکھ رہے تھے۔ ایسی نظموں میں "گرد راہ" کی تفس، انسانِ بیدار، فکریں، یادکی یاد، عمیرا وطن، یوم آزادی اور "نورِ مشرق" کی نظمیں دعوتِ سیر، ابرِ بہار، بسنت کا ترانہ، کس طرح قرار ہو، مطربہ سے، تصویر، آئینے کے سامنے، دعوتِ نظر، روح کا پیمانہ، انسان اور فرشتہ، اے مرے ہندستان ——— اور تیسرے مجموعہ کلام "نئی صبح" کی نظمیں، جاگ اے انسان، برسات، ہندستان آزاد ہوا، ابدی سفر، سویرا، بغاوت، دانا، آزاد زندگی، راہی، اوشا، جواری اور ہنسی، ہیئتی تجربات کے ذیل میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہ سب نظمیں ۳۰-۳۵ سال پہلے کی ہیں۔ جدید نظمیہ شاعری کے تشکیلی دور میں ضیا پیش پیش رہے ہیں اور اس کی توسیع میں ان کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ انھوں نے زبان و بیان کے کلاسیکی انداز و اسلوب سے انحراف نہیں کیا، نہ کھردرا پن پیدا ہونے دیا۔ ان کے یہاں ابہام و اشکال بھی نہیں ——— آدابِ فن کو انھوں نے بہرحال محفوظ رکھا۔ ان کی نظمیں موجودہ دور کی جدت طرازیوں سے پاک ہیں (اور اس عہد میں جدت کا امکان تھا بھی نہیں) لیکن انھوں نے موضوعی تنوع کا خیال ہمیشہ رکھا ہے۔

ضیا کے تینوں مجموعوں میں [illegible] انداز کی بھی کچھ نظمیں ہیں، لیکن ان میں بھی فکر و نظر کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں کی بعض نظمیں اگر بہت گہری اور تہ دار نہیں

ہیں تو ایسی اُتھلی بھی نہیں، جنھیں ذوق قبول نہ کرے، یا جو آدابِ نظم سے عاری ہوں۔ ایک خوشگوار اور باشعور شاعر کی زائیدہ فکر یہ سب نظمیں ہیں۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، ضیا کا اپنا مزاج شاعری ان کی نظموں میں رچا بسا ہے۔

ضیا کی نظمیہ شاعری کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس کے باوجود کہ ضیا نظم سے غزل کی طرف آ گئے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ گذشتہ پندرہ بیس سال میں انھوں نے اور بھی نظمیں کہی ہونگی، مگر یہ نظمیں اس وقت میرے سامنے نہیں اور نہ ضیا کی بعد کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہی شائع ہوا ہے۔ یہ جائزہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۶۰ء تک کی نظموں کا ہے۔ یقیناً اس دور کے بعد کی نظموں میں ان کے فکر و فن میں مزید نکھار اور ابھار پیدا ہوا ہوگا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آزاد نظم سے آج بھی ان کی دلچسپی قائم ہے۔ رسالہ ''بیسویں صدی'' مئی ۱۹۷۷ء (کرشن چندر نمبر) میں ''افسانے کی موت'' کے عنوان سے ان کی ایک تازہ آزاد نظم نظر سے گذری ہے۔

ضیا فتح آبادی نہ حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق رہے، نہ ترقی پسندوں سے۔ اس کے باوجود ان کی نظمیہ شاعری قابلِ توجہ اور لائقِ انتخاب ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ضیا کی طرف سے ہمارے نقادوں نے غفلت برتی ہے اور خود ضیا نے بھی نظمیہ شاعری میں اپنے مقام کی تعیین کی کوشش نہیں کی۔ اردو شاعری کے پچھلے چالیس سالہ دور میں ضیا کا نام یقیناً قابلِ قدر و ذکر ہے۔

کوثر چاند پوری

ضیا فتح آبادی کی غزل سرائی

ضیا صاحب سنجیدہ، مخلص اور بہت شریف انسان ہیں۔ ان سب خصوصیات کو علم کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان کے پاس شخصیت ہے، مگر اس میں پیچیدگی نہیں اس پر بہت زیادہ غلاف بھی نہیں۔ صرف دو پرت ہیں؛ اوپری تہ میں شاعرانہ حسن و جمال جھلکتا محسوس نہیں ہوتا۔ ایک طرح کی خشکی محیط نظر آتی ہے، اور وہ صرف حساب و کتاب کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس پرت کو الٹ کر دیکھنے سے ان کی ذات میں شعر و ادب کی چنگاریاں سلگتی نظر آتی ہیں۔ ان میں دھواں نہیں، گرمی اور خفیف حدت ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں؛ اتنی ہی فطری بھی ہیں۔ ان کے خاندان میں کسی شاعر نے کبھی جنم نہیں لیا۔ ان کی تعلیم و تربیت اسی خشک ماحول میں ہوئی جس کے صلے میں بینک کی بے کیف مصروفیتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ مگر اندر رہی اندر فطرت اور اس کے رجحان کی پاکیزگی دل کی دھڑکنوں میں روشنی اور حرارت پیدا کر رہی تھی، جس کو شاعری کی اوس ہی تسکین دے سکتی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ضیا نے شعر و سخن کو اپنا فن بنا لیا۔ یہی ان کا اصل ذوق تھا، جس کو حسابی تعلیم کے مقابلے میں وہبی کہنا چاہیے۔ وہ تمام اصنافِ سخن میں

طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نظم، رباعی، گیت اور غزل، سب ہی کچھ کہتے ہیں۔ یہ ہمہ جہتی اکتسابی نہیں، قدرت کی دین ہے۔ نظموں میں جدید قدیم کا نہایت متوازن امتزاج ہے۔ رباعی کے متعلق سب ہی کو معلوم ہے کہ وہ نہایت نازک صنفِ سخن ہے۔ اسے چنبیلی کی کلی سمجھ لیجیے، جس کو ہر شخص چٹکیوں میں دبا کر سونگھ بھی نہیں سکتا۔ رباعی شارٹ ہینڈ میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ اس کے لیے بڑی خلاقی مہارت اور باریک بینی کی ضرورت ہے۔ ضیا کو یہ سب چیزیں قدرت نے عطا کی ہیں۔ اسی لیے وہ رباعی خوب کہتے ہیں، اور اس کے فنی تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی غزل پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں، اس لیے رباعی کے نمونے پیش نہیں کروں گا۔

ضیا کی غزلوں میں کہیں کہیں گیتوں کا ساز سنائی دینے لگتا ہے۔ گیت کا مزاج غزل سے ملتا جلتا ہے۔ درد، اثر، جذبہ اور تخیل کا سہارا لیے بغیر گیت کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ انھیں عناصر سے غزل کا خمیر بھی تیار ہوتا ہے۔ ضیا کے تخیل کی رو بہت آہستہ خرام ہے۔ اس میں بگولے کی سنسناہٹ اور زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ نہیں، نہ کسی اور تبسم کا شور و شغب ہے۔ وہی سنجیدگی، حلاوت، لہجے کی نرمی اور نزاکت ہر جگہ محیط ہے، جو اُن کی شخصیت کا حصّہ ہے۔ سوقیانہ اور سطحی جذبات ضیا کے احساس کو چھو بھی نہیں گئے؛ ان کے ہاں کھوکھلی رومانیت سے بھی گریز کی کوشش ملتی ہے؛ انسان دوستی اور انسانیت کی فلاح کا جذبہ اکثر اشعار میں مل جاتا ہے۔ ان کی محبت، انسان ہی کے گرد گھومتی ہے؛ ہجر و فراق اور حسن و عشق کے اظہار میں بڑا دھیما پن ہے۔ وہ محبت ہی کو رہنما سمجھتے ہیں، مگر اس محبت میں حرص و ہوس اور رقابت، رشک و حسد کی آنچ نہیں۔ ضیا اسی محبت کے سہارے تمام مراحلِ حیات سے گذر جانا چاہتے ہیں:

ہزاروں پیچ و خم ہر گام پر تھے راہِ ہستی میں محبت کو نہ میں رہبر بنا لیتا، تو کیا ہوتا!

ضیا کی محبت وہ نہیں، جو سوزِ فراق سے جنم لیتی ہے، بلکہ جیسا کہ ابھی کہا گیا، اس میں انسانیت کے فراق کے جذبات ہر جگہ مچلتے نظر آتے ہیں۔ ہجر و فراق کا بیان

ان کے یہاں ملتا ضرور ہے ؛ ایسا نہیں ہے کہ وہ حسن و عشق کی ازلی اور ابدی آویزشوں کے منکر ہوں۔ یہ تو وہ عناصر ہیں، جو شاعر کے فکر و خیال کو ندرتیں عطا کرتے ہیں، تخییل میں خوبصورتی اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ بات صرف انھیں عقل و شعور کے سانچے میں ڈھال لینے کی ہے۔ انھیں کھو کھلی رومانیت سے کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ وہ محبت کی شمع سے جلن اور نور پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں، جس کے سہارے انسان بہ آسانی مشکلاتِ حیات کی پرخار راہوں سے گذر جائے۔ وہ خود کہتے ہیں :

میری فکروں میں ہستی کارفرما　　　مرے شعروں میں انسانوں کی دنیا

یہ دعویٰ بے دلیل نہیں۔ یقیناً ان کے اشعار میں ایک ایسی کائنات آباد ہے، جس میں اہمیت صرف انسان کو حاصل ہے۔

ضیا محبت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں ؛ وہ اس کو کسی قیمت پر دینا نہیں چاہتے۔ اسی کے سوز و ساز پر ان کی زندگی کا مدار ہے :

مجھے محبت کا سوز دے دو، بہ ایٹموں کا جلال لے لو
حرارتِ خون کی آرزو ہے، شرارے کر میں کیا کرونگا

حرارت اور شرارے میں جو تفاوت ہے، وہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ حرارت حرکت و عمل کا جذبہ بیدار کرتی ہے ؛ اور شرارے لباسِ زندگی کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ شاعر جو انسانیت کا علمبردار بلکہ پیغامبر ہے، وہ نرم اور معتدل گرمی ہی کا طالب ہے، اسی سے تعمیر کا حوصلہ ملتا ہے۔ اسے شعلوں کی خواہش نہیں ؛ ان سے آبشاروں اور مرغزاروں میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔

ایک جگہ رات کی اندھیری کے مقابلے میں جو موت کی علامت ہے، صبح کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

سمیٹو رات کے پُر ہول سایے　　　سحر آ ہی گئی، اب سوچنا کیا !

وہ روشنی اور حرارت کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ انھیں پورا اعتماد ہے

کہ تاریکی دائمی نہیں، دوام صرف روشنی کو حاصل ہے:

زنداں کی دیواروں پر سورج کی کرنیں رقصاں ہیں
زنجیریں سوچا کرتی تھیں، اس گھر میں چراغاں کیا ہوگا!

ضیا کو جہدِ حیات سے گہری دلچسپی ہے۔ اس مشغلہ کو وہ رزمگاہ زیست میں فتح و نصرت کا وسیلہ خیال کرتے ہیں:

کشتی کیوں ساحل پر ڈوبی! موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

ضیا حسن و عشق کی مختلف خصوصیات کا اظہار بہت احتیاط سے کرتے ہیں:

بن گئی ہیں دورِ ساغر بزمِ رنداں میں ضیا
ان کی شرمیلی نگاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

غمِ جاناں میرے دل سے نہ کیا کی غمِ دہر نے تحریک بہت
ضیا تو مریض غمِ عشق ہے علاج اس کا اے چارہ گر! کچھ نہیں

ضیا محبت کو آدمی کی لازمی صفت خیال کرتے ہیں:

محبت ہے انسان کی آبرو بغیرِ محبت بشر کچھ نہیں

ہم کو کرنی ہے مرتب داستانِ حسن و عشق صبحِ دلی، شام نیشاپور کی باتیں کریں

ذکر جب ان کا آگیا، دل سے نکل گئی اک آہ
ہے تو خطا، مگر نہ تھی یہ مرے اختیار میں

ضیا ہر صورت میں پرچمِ انسانیت کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں؛ اسی خواہش کو انسانیت کی حنابندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

ختمِ عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں دورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں
دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائیں گے ہم! خونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

ضیا عداوت کے قائل نہیں؛ وہ اسے دوستی کے دامن میں پناہ دینے کو تیار ہیں۔ دشمنی کو ضیا! مل گئی سایۂ دوستی میں اماں

ضیا کے کلام میں پختگی، حسنِ تخیل اور ندرتِ اسلوب کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ زبان صاف اور شستہ ہے، اس میں اہلِ زبان کی سی روانی ہے۔ یہ سب باتیں دلیل اور ثبوت ہیں، ان کی طویل مشقِ سخن کا اور یہ کہ انھوں نے کسی پختہ کار رہنما کے نقوشِ قدم کو اپنا مشعلِ راہ بنایا ہے۔ اب غزل کے چند ایسے اشعار دیکھیے، جن میں گیت کی لے، نیز ہندی شاعری کی علامات اور تشبیہات ملتی ہیں:

صبح نے روشن تیر چلائے　　شب کا درپن ٹوٹا جائے
ماتھے پہ بِندی کا سورج　　آنکھوں میں کاجل کے سائے
بادل جھومے نیل گگن پر　　گوری نے گیسو لہرائے
کیا پریتم آنے والا ہے　　کاگا! تو کیوں شور مچائے

ضیا کی شعر گوئی کا ذوق جو ملازمت کی مصروفیتوں نے دبا رکھا تھا، نمایاں ہو کر رہا۔ اس نے ان کی ذاتی رفعت میں مزید بلندی پیدا کی۔ وہ شاعر نہ ہوتے تو ان کی زندگی اسی روز ختم ہو گئی ہوتی، جب وہ بینک کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے تھے۔ یہ شاعری کا طفیل ہے کہ ان کی حیاتِ مستعار کے ڈانڈے ابدی حدود سے مل گئے ہیں۔

جاوید وششٹ

ضیا فتح آبادی
کا
مذاقِ غزل

غزل، اردو شاعری کی بڑی البیلی صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اسے "نیم وحشی صنفِ شاعری" قرار دیا تو کسی نے اسے "اردو شاعری کی آبرو"۔

اردو اصنافِ شاعری میں صنفِ غزل بڑی نرم و نازک، لطیف و نفیس، مہذب و تراشیدہ صنف ہے۔ آتش لکھنوی کا قول کہ

شاعری بھی کام ہے، آتش! مرصّع ساز کا

پوری طرح سے اردو غزل پہ صادق آتا ہے۔ لیکن غزل کی اس "مرصّع سازی" نے جہاں غزل کی "خارجیت" کو نکھارا، وہیں غزل کی "داخلیت" کو مجروح بھی کیا۔ غزل کو سب سے آسان اور سب سے مشکل صنف بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ آسان اس لیے کہ مبتدی شاعر کی مشقِ سخن کے لیے یہ بہت ہی سہل صنف ہے۔ ہر مبتدی ردیف اور قافیہ سے شعر کا آغاز کر کے اس پر ایک مصرع لگا کر شعر کہہ سکتا ہے۔ اسی لیے بعض عروضیوں نے شعر کے دوسرے مصرع کو "مصرعِ اولیٰ" بھی کہا ہے۔ مبتدی شاعر غزل کہنے سے پہلے قوافی کی ایک طویل فہرست مرتب کرتا ہے، پھر قافیہ کے سہارے شعر کا نصاب پورا کرتا ہے۔ مگر حقیقی شاعری اس طرح نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا عروضی آج تک بڑا شاعر نہیں ہو سکا

البتہ مشقِ سخن کے بعد چند اچھے اشعار کا نکل آنا الگ بات ہے۔ ورنہ صحیح صورت یہی ہے کہ پہلے پہلا مصرع کہا جائے، بعد کو دوسرا اور وہ خود قافیہ کو بھی اپنے اندر لے لیگا۔ اس طرح محض قافیہ کی بنیاد پر شعر کھڑا نہیں ہوگا، بلکہ شاعر کا خیال خود قافیہ مانگ لیگا۔ لیکن یہ دوسرا طریقہ، ظاہر ہے آسان نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے۔ غرض جہاں عروضی کا طریقہ "مصرعِ اولیٰ" غزل کو آسان مگر سوقیانہ بنا دیتا ہے، وہیں عروضی کے "مصرعِ ثانی" کو پہلے کہنے کا طریقہ غزل کو دشوار تر کر دیتا ہے۔
غزل بڑی نازک مزاج صنف ہے۔ غزل کا آبگینہ ایک ایسا آبگینہ ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ غزل کو شاعر کے جذبات و احساسات کی "مقطر روح" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک غزل کا فن سخت مشکل فن ہے۔ غزل کا ساز بڑا لطیف اور نغمہ لطیف تر ہے۔ غزل ع "سورج کو لیے چونچ میں مرغا کھڑا رہا" یا "گھوڑا بھڑک گیا، یکہ پلٹ گیا" قسم کے بھونڈے انداز کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی جدید کوششیں مضحکہ خیز جدت طرازی ہی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ غزل کے شیش محل پر سنگ باری ہے۔ اس قسم کی جارحیت روحِ غزل کو مجروح کرتی ہے۔
غزل میں بے پناہ لچک بھی ہے۔ غزل جب صوفیوں کی خانقاہ میں پہنچی، تو اس نے "دنیا ہیچ و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" کا نعرہ لگایا اور "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کے قالب میں ڈھل گئی۔ جب شاہی درباروں اور راج محل میں داخل ہوئی تو "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا راگ الاپا؛ اور شاہد و شراب، خندہ و قہقہہ سے عبارت ہو گئی۔ "ریختی" کا روپ دھار لیا تو شہوانی جذبات کو ابھارنے کا آلۂ کار بن گئی۔ کتنا بڑا تضاد ہے! میدانِ جنگ میں پہنچی، تو رجز خوانی کرنے لگی۔ انقلاب کا نعرہ لگایا، اور سرفروشی کی تمنا کا کھلا ڈلا اظہار کیا۔ جب لکھنوی شعرا نے اردو غزل کو "چوما چاٹی" اور "چوٹی کنگھی" کی شاعری بنا دیا، تو سب سے پہلے الطاف حسین حالی نے غزل کی اصلاح

کا بیڑا اٹھایا اور "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھا۔ ترقی پسند تحریک نے تو اپنے منشور میں غزل کو گردن زدنی ہی قرار دے دیا۔ جگر مراد آبادی ایسا خالص غزل گو شاعر بھی کہہ اٹھا:

شاعر نہیں ہے وہ، جو غزل خواں ہے آج کل

وقتی طور پر ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید اب غزل مرجائیگی۔ مگر غزل ٹھہری سدا بہار اور سدا سہاگن صنف، اس نے فلم اور ریڈیو سے اپنا جادو جگایا۔ یہاں تک کہ پنجابی اور ہندی کوی بھی غزل کہنے لگے۔ ہر مشاعرے کے بعد یہ جملہ عام طور پر سنا جاتا کہ "غزل میں مجا آگیا"

غرض غزل اب "گفتگو با زنان" تک محدود نہیں ہے۔ اس وسیع کائنات کا ہر موضوع اب غزل کی گرفت میں ہے۔ زندگی کا ہر پہلو، ہر رنگ غزل میں جھلکتا ہے۔ "تنگنائے غزل" اصل میں ردیف و قافیہ کی پابندی ہے۔ ردیف غزل کی غنائیت کو قائم رکھتی ہے اور غیر مردّف غزل فکری عناصر کے لیے مخصوص ہے۔ غزل میں بڑی وسعت ہے۔ البتہ جدّت طرازی اور تنوّع پسندی کا تقاضا ہے کہ دیگر اصنافِ شاعری پر بھی توجہ دی جائے۔

غزل کا فن بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ بیشک "آمد" غزل کے شعر کو عالمِ وجود میں لاتی ہے، مگر "آورد" کی خراد پر چڑھا کر ہی اس کی تراش خراش کی جاتی ہے:

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

جذبہ و احساس کی "مضطر روح" کا دوسرا نام غزل ہے۔ لیکن جس لمحے شعر کی تخلیق ہوتی ہے، وہ ہرگز اس لمحے کی پیداوار نہیں ہوتا۔ وہ لمحہ تو صرف اسے خلوت سے جلوت میں لاتا ہے۔ شعر کا ابتدائی روپ جذبہ و احساس کی شدّت ہے۔ مدتوں یہ شدّت، ذہن کی گمنام تہوں کے پیچ و خم سے گزرتی ہے، شعور و لاشعور کی انجان وادیوں میں بھٹکتی ہے، زندگی کی آنچ میں تپتی ہے۔ اور ان تنے ہفتخواں طے کرنے کے بعد کہیں وہ شعر کی شکل اختیار کرتی ہے۔

اور تو اور، فی البدیہہ شعر بھی اس لمحے کی دین نہیں ہوتا، اس کے پیچھے بھی طویل تجربات و مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہوتی ہے۔ لمحۂ تخلیق تو صرف عروسِ سخن کی نقاب کشائی کرتا ہے، ورنہ ؎ پیشِ نظر ہے آینہ دائم نقاب میں۔
اس تمہید کے بعد، اب آئیے! ہم ضیا فتح آبادی تلمیذ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے مذاقِ غزل کا جائزہ لیں۔
ضیا فتح آبادی ایک کہنہ مشق غزلگو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں پر سرسری نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ روایتی غزل گوئی سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ ان کی بیشتر غزلوں پر روایتی کہنگی و مشاقی کا سایہ ہے۔ یہی غزل کی کٹھن منزل ہے۔ غزل میں طرفگی و تازگی پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ بیشتر مقامات پر ضیا صاحب اس ادگھٹ گھاٹی میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم ایک عمر کی مشق و مہارت آڑے آتی ہے۔ وہ "مذاقِ غزل" کی تکمیل کے لیے ایک "جرعۂ غم" کی تمنا کرتے ہیں:

مذاقِ غزل نامکمل ہے اس کا،
ضیا کو بھی اک جرعۂ غم خدا را!

ان کے چند مقطعے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ضیا صاحب ابھی "یقینِ محکم" کی منزل سے دور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "خود اعتمادی" پر ان کی گرفت ڈھیلی ہے۔
بعض مقطعوں میں "تعلّی" اور بعض میں اس کے برعکس "احساسِ کمتری" ایک نفسیاتی الجھن کی نشاندہی کرتی ہے مثلاً تعلّی دیکھیے:

سیکھ لی بلبلوں نے نغمہ گری — اے ضیا! میری خوش بیانی سے

اس تعلّی میں غالب کے اس شعر کی آوازِ بازگشت صاف سنائی دیتی ہے:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ایک اور مقطع ہے:

اشعارِ ضیا تم تو سُن لو، کہتے ہیں جو اُن کو کہنے دو!
اس شعر و سخن کی محفل میں، اب کوئی غزلخواں کیا ہوگا

("کہتے ہیں جو ان کو کہنے دو!" میں ان حریفوں کی طرف اشارہ ہے جو اشعارِ ضیا کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔)

یا یہ مقطع:

ابھرنے دو ادب کو، اے ضیا! ظلماتِ پستی سے
ستارہ بن کے چمکیگا یہی روشن کلام اپنا

(یہاں بھی "ظلماتِ پستی" کا احساس دامن گیر ہے۔)

ایک اور مقطع ملاحظہ کیجیے:

سکوں ذہن و خاطر کا بھی تو نے کھو دیا
ضیا! کیا ملا تجھ کو مشہور رہ کر

اب ذرا ان کا یہ اعتراف بھی دیکھیے:

جس پر محفل لٹ جاتی ہے
تجھ کو ضیا! وہ بات نہ آئی

اے مغنّی! غزل ضیا کی نہ چھیڑ
شاعری کا بھرم نہ کھل جائے

جانتا ہوں، مری نظموں کی، مری غزلوں کی
قدر پہچانینگے یارانِ سخن، میرے بعد

ناز تو ہے تجھے ضیا! اپنے کلام پر مگر
اہلِ سخن کی بزم میں میرا کوئی مقام ہے؟

غرض مشاعرہ لوٹنے کی تمنّا، شاعری کے بھرم کھل جانے کی بات، احساسِ ناقدر شناسی اور یہ سوال کہ ع اہلِ سخن کی بزم میں میرا کوئی مقام ہے؟ مجموعی

طور پر اس نفسیاتی کشمکش میں خود اعتمادی کی کمی اور پسپائی جھلکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ضیا ہمت نہیں ہارے، بلکہ "شاعرِ رنگ و نور" ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً

شاعرِ رنگ و نور ہوں، حُسن سے مجھ کو کام ہے
پھول ہیں مجھ سے ہم سخن، چاند بھی ہمکلام ہے

اور پھر تو نزولِ شعر ہونے لگتا ہے:

اے ضیا! شعر کا اس طور سے ہوتا ہے نزول
عرش سے جیسے کوئی حُور اُتر آتی ہے

تاروں کی چمک، کلیوں کی چٹک، موجوں کا ترنّم، حُسنِ جواں
ہم تجھ کو ضیا! اس عالم میں مدہوش و غزلخواں دیکھینگے

اور اس طرح ضیا "حسنِ اندازِ بیاں" پر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ "متاعِ فکر" کے زیادہ قائل نہیں۔ فرماتے ہیں:

اے ضیا! تیری متاعِ فکر کا قائل نہیں
حسنِ اندازِ بیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

ضیا کی غزل میں اندازِ بیاں کا حسن ہندی عناصر میں خوب نکھرتا ہے۔ ان کے یہ چند شعر دیکھیے:۔

اُن کو بنایا من اُدھیکاری — میں نے جیتی بازی ہاری
پریم کی بازی میں نے اکثر — ہار کے جیتی، جیت کے ہاری

کلجگ آیا، کلجگ آیا — رام دُہائی، رام دُہائی
گھونگٹ سے یوں اُس نے جھانکا — کوئی کلی جیسے مُسکائی

ماتھے پر بندی کا سورج — آنکھوں میں کاجل کے سایے
بادل جھومے نیل گگن پر — گوری نے گیسو لہرائے
ہر ذرّے میں سورج روشن — دھرتی سے آکاش لجائے

کس نے چھیڑا گیت ضیا کا؟
پیار کا ساگر امنڈ آئے

پریتم کا سندیسہ لے کر گھر آئے ہیں بادل کالے
بانہیں جیسے پھول کی شاخیں آنکھیں جیسے مد کے پیالے

اور اس قسم کے اشعار میں بلاشبہ ضیا صاحب نے "شاعرِ رنگ و نور" ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

شاعرِ رنگ و نور تاریکیِ حالات سے مایوس نہیں ہوتا، بلکہ اُسے ہر لمحہ امیدِ سحر ہوتی ہے:

سکوتِ یاس کے لب پر ہے نغمۂ امید
کرن سحر کی شبِ تار ہی میں پلتی ہے

اسی لیے ضیا اپنی غزلوں میں رجائیت پسند یا آشا وادی ہی نظر آتے ہیں:

پریشانیاں حاصلِ زندگی ہیں پریشان ہونے سے کیا فائدہ ہے
اجالوں کو ڈھونڈو، سحر کو پکارو اندھیروں میں رونے سے کیا فائدہ ہے
بنا نور ہی نور ہے اب وہاں تک نظر آ رہے تھے جہاں کل دھندلکے

رجائی اندازِ نظر ہی سے رموزِ حیات و کائنات کھلتے ہیں، مشاہدے میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ ضیا کی غزلوں میں ایسے اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ملینگے، جن میں حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مثلاً بشر شر سے عبارت ہے ؎

کوششِ امن تو بجا ہے مگر آدمی فطرتاً فسادی ہے

یہ دنیا ایک تماشا ہے، فریبِ نظر ہے، صرف محبت کے سہارے ہی انسان جی سکتا ہے۔

تماشا ہے سب کچھ، مگر کچھ نہیں سوائے فریبِ نظر کچھ نہیں
محبت ہے انساں کی آبرو بغیرِ محبت بشر کچھ نہیں

غم اک دولتِ بیدار ہے:

غم کی دولت پاکر خوش ہیں عشق و محبت کے سودائی

وقت بڑا معالج ہے:

وقت نے خود کی مسیحائی ضیا! ورنہ بھر سکتا تھا زخمِ دل کہاں!

فطرتِ اہلِ زمانہ اک معمہ ہے:

فطرتِ اہلِ زمانہ بھی معمّا ہے، ضیا!
چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

کم فرصتی:

بیت جائیں گے محبت کے یہ لمحاتِ حسیں
یاد ان لمحوں کی تا زیست مگر آئیگی

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آدمی تو ہے آج بھی زندہ حیف! انسان مر گیا کب کا!
آنکھ ملتے ہی لگ گئی چپ سی لب پہ آیا نہ حرفِ مطلب کا
بے مرا تجربہ مگر کچھ اور لوگ کہتے ہیں ہے خدا سب کا

عمر بھر کا لگا لیا ہے روگ
میہماں کر کے غم کو اک شب کا

ضیا صاحب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے

ختم عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں
دورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج
دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں

دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائینگے ہم!
عونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

ضیا صاحب کی نئی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں مثلاً

یوں حسرتوں کی گرد میں تھا دل اٹا ہوا
جیسے درخت سے کوئی پتّا گرا ہوا
ملتا سراغ خاک مجھے اپنے سایے کا
ہر سمت ظلمتوں کا تھا جنگل اُگا ہوا
باہر کے شور و غل ہی سے شاید وہ بول اٹھے
بیٹھا ہے کب سے چپ کوئی اندر چھپا ہوا
پہچانے کون خود کو کہ آئینہ خانے میں
ہر چہرے پر ہے دوسرا چہرہ لگا ہوا

ضیا صاحب کی نئی غزلیں اس بات کی صاف غمّازی کرتی ہیں کہ ان کا فن سے ارتقا پذیر رہا ہے، وہ کلاسیکیت سے جدیدیت کی طرف گامزن ہے۔ اور یہ ایک صحتمند علامت ہے۔ گویا ضیا صاحب روایتی پیکرِ غزل کے گرداب سے نکل آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں جمود کی کیفیت نہیں پیدا ہوئی۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ غزل کے روایتی انداز ہی میں الجھ کر رہ جاتے۔ ہمیں ان کی نئی غزلوں سے توقع ہے کہ وہ اُردو غزل کو ایک نیا رُخ دینگے، نئی حرکت و حرارت کے ساتھ زندگی اور سماج کے حقائق و رموز کا انکشاف کرینگے۔ اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے۔

اے زمیں! ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جُھکا دی ہے

ستیہ نند جاوا رشک

کلامِ ضیا : ضیا کے کلام

شعر الہام ہے۔ سینۂ فطرت کے پوشیدہ راز سب سے پہلے شاعر کے ذہن و قلب پر وارد ہوتے ہیں اور وہ انھیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ یا وہ نغمے بن کر اس کی زبان سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس حیثیت سے خدا اور رسول کے بعد پہلا درجہ شاعر کا ہے۔ الہام اسے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، اور نظر غائر ارض و سماء کے مطالعے سے۔ شاعری قانونِ وراثت کی پابند نہیں کیونکہ شعر بحیثیتِ الہام خدائی دین ہے۔ ضیا فتح آبادی کو شاعری ورثے میں نہیں ملی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے تخیّل اور احساسِ دل کی تخلیق کی ذمہ دار اس کی والدہ ہیں۔ لیکن اس تخیّل اور احساس کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ملکہ تو خداداد ہے۔ مجموعی طور پر ضیا کے کلام میں وہ سب کچھ ہے، جو ایک حقیقی شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔ جب وہ اس طرح کے اشعار کہتا ہے:

خمار آلودہ آنکھوں میں تمھاری
سمٹ آئی ہے ہے کوثر کی جوانی

جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے
بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے۔

موت دنیا پہ دیکھ کر طاری
میں کبھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے۔

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے

میری آنکھیں لگی ہیں تاروں سے
یہ بھی میری طرح ہیں سوز بجاں

میری ناکامیاں کوئی دیکھے
زندگی سے بھی خوف آتا ہے

تو اس کے کلام میں میر و فانی کے سوز و جذب، سادگی و حسنِ تغزّل کا احساس ہوتا ہے اور پھر جب اس کی نظم کی طرف توجہ دیں، تو اس کے کلام میں جو فطرت کی گلکاری اور مناظرِ قدرت کی نقاشی ہے، وہ آپ کو اقبال کے کلام کے دورِ اوّل سے ہمکنار کر دیگی "عورت کی تخلیق"، "بوندوں کا ساز"، "طلوعِ سحر" "دعوتِ سیر"، اور کئی اور نظموں میں وہی رنگ جھلک رہا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نشاط افروز شامِ رنگیں لطافتوں کو بڑھا رہی ہے
بجے ہوئے ساز بدلیوں کا شباب کے گیت گا رہی ہے
اگرچہ خورشید چھپ گیا ہے، مگر ابھی تک شعاعِ آخر
کہیں کہیں بادلوں میں منظرِ حسین و دلکش بنا رہی ہے
دلوں میں وحشت، سروں میں سودا، نگاہ مضطر، حواس غائب
گرج گرج کر سیاہ بدلی ہزار فتنے جگا رہی ہے

(بوندوں کا ساز)

چٹک چٹک کے ہر کلی پیام دے رہی ہے یہ
ہوا کی روح پروری پیام دے رہی ہے یہ
سحر میں چھپ کے زندگی پیام دے رہی ہے یہ
تو آؤ سیر کو چلیں

(دعوتِ سیر)

اقبال کا مفکرانہ انداز بھی آپ کو ضیا کی نظموں میں ملیگا۔ "حیات و موت"

میں کہتا ہے :

طوفان ہو یا سخت آندھی　　سرگرمِ سفر ہیں ماہ و خورشید
موجوں کو نہیں ہے فکرِ راحت　　ہر دم ہے روانیوں کی تجدید
فطرت کو قیام سے نہیں کام　　کرتا ہے زمانہ اس کی تائید
ہستی ہے سفر کا دوسرا نام　　منزل کا نظارہ، موت کی دید

وہی تیور ہیں، وہی دعوتِ عمل ہے، جو اقبال کی نظموں میں ملتی ہے۔ اور پھر ضیا کی پُر جرأت نظم "اگر خدا ہے" کے وہی "شکوۂ اقبال" والے انداز ہیں، وہی زورِ بیان ہے، وہی روانی ہے، وہی پُرخلوص شاعر کا شکوہ، وہی بغاوت کا لہجہ۔ ملاحظہ فرمائیے :

اگر خدا ہے، تو پھر زمانے میں رنج و اندوہ و درد کیوں ہے!
زبانِ بلبل پہ نالہ کیا ہے؟ یہ رُوئے گل زرد زرد کیوں ہے!
اگر خدا ہے، تو کیوں نہیں ہے بہارِ عالم کی جاودانی
ہر ایک شے بے ثبات اس کی، ہر ایک شے اس کی آنی جانی

اور وہی احساسِ حقیقت جو اقبال کو میسّر ہوا، ضیا کو بھی ہوتا ہے، اور اُسی زوردار انداز میں نویدِ صبح دیتا ہے۔

وہ دیکھ مشرق سے نور ابھرا، لیے ہوئے جلوۂ حقیقت
مجاز کی ترک کر غلامی کہ تو تو ہے بندۂ حقیقت

غرض ضیا ہم کو میر اور فانی کے سوز و جذبہ کے ساتھ ساتھ ایک مفکر کی طرح حقیقت سے روشناس کراتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سوز و ساز، فکرِ عالی، اور مناظرِ قدرت کے علاوہ ضیا کے کلام میں کہیں کہیں شراب کے رنگین چھینٹے بھی ہیں۔ خیّام کے خمریات سے بھی اس کا جام خالی نہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اس کی سادگی اور سلامت روی کو اس کی راہ کا پتھر قرار دیا، اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے شباب

اور موسم کے ساتھ خلوص نہیں رکھتا۔ لیکن اس سادگی اور سلامت روی کے باوجود ضیا کے پُرخلوص علم نے شباب اور موسم کے عین مطابق شعر کہے ہیں، جو اس کی عروس شاعری کو زیورِ حُسن سے آراستہ کر گئے ہیں اور کسی حد تک جوش کے گلے کی تلافی بھی ضیا نے کر دی ہے۔ اس میں لے بھی ہے اور موسیقی بھی، لیکن انداز نرالا ہے:

ساغر بھرے ہیں کوثر بھرے ہیں
میکش اٹھا لیں پی لیں، پلا لیں
ہے عام رحمت ہنگامِ عشرت
خالی نہ جائیں کافر گھٹائیں (گھٹائیں)

آؤ ہم پھر پئیں، پلائیں کہیں موسمِ نو کا لطف اٹھائیں کہیں
آؤ پھر چھیڑ دیں شباب کا ساز ہونے والا ہے سالِ نو آغاز
(سالِ نو)

جب مرا ساقی مجھے بھر بھر کے دیگا جام مے
بھول جاؤنگا کہ دنیا میں کوئی شئے غم بھی ہے

کام شام و سحر ہے مستی سے میں ہوں آزاد رنجِ ہستی سے
کیوں میں اے فکرِ باطلِ فردا! باز آجاؤں مے پرستی سے

لیجئے جوش کی شکایت کا ازالہ دو شعر کر گئے ہیں:

دور میں جامِ ارغوانی ہے صحبتِ عیش جاودانی ہے
کیا ڈراتا ہے مجھ کو، اے واعظ میں جواں ہوں، مری جوانی ہے

ضیا صرف کامیاب غزل اور نظم ہی نہیں لکھتا، وہ گیت کی لے پر بھی بار ہا گنگنایا ہے۔ گیتوں والا ضیا ہمیں غزلگو اور نظم سرا ضیا سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے گیتوں میں کسی الھڑ دوشیزہ کی سی سادگی ہے، کوئی تصنع نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔ پھر بھی ان میں بے پناہ کشش ہے۔ انسان اس کی

اصطلاحوں سے ماوا گیتوں کی موسیقی میں ڈوب جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے سطح آب پر رات کے وقت ایک بجرا بڑی آہستگی کے ساتھ تیر رہا ہے، اس میں ایک جوگن ستار لیے مدھم سروں میں کوئی دلکش نغمہ الاپ رہی ہے، اور یہ نور دسیقی کا کارواں سنسار بھر کو گیت کے ساگر میں ڈبو رہا ہے۔ یہی عالم ٹیگور کے گیت سُن کر ہوتا ہے۔ سنیے:

بیان ساگر بٹا اٹھیں ارے — گھور اندھیرا دور کنارے
من کی نیا پریم سہارے — واطن کی آس سکھی رے پیا من کی آس

اور ایک اور گیت کے بول ہیں:

رات اندھیری کچھ نہ سوجھے — پی بن کوئی بات نا بوجھے
جائے کہاں چکور — پپیہے! پیا گئے کس اُور!

برہن گیت میں لکھتے ہیں:

نیلا امبر کا لا بادل — جیسے ہو نینوں میں کاجل
من مورا ہے پریم کی کونپل — کھلتے ہی مرجھائے سکھی رے، پیتم ناہیں آئے

ہندی کے اس دور دورے میں ضیا کے گیتوں کی عام فہم، میٹھی زبان کسی جوانسال ہندی اردو شاعروں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے سادگی میں پرکاری اسی کو کہتے ہیں۔

ضیا نے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں اردو سانیٹ بھی لکھے ہیں۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ اردو کے اس دور میں جس میں وہ لکھے گئے ہیں انھوں نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔ سانیٹ کے سارے تقاضوں پر ضیا کے یہ سانیٹ پورے اترتے ہیں۔ 'جوانی'، 'محبت'، اور 'دل' کامیاب سانیٹ ہیں۔

فنی اصطلاحات اور تکلفات برطرف میر اور فانی کا سوز، اقبال کا تفکر، ٹیگور کے گیتوں کی موسیقی اور ان کا فلسفیانہ انداز، پنجاب کی بے لوث

سادگی، اتر پردیش کی کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان کا لوچ اور دہلی کے لطف محاورے یہ سب کچھ آپ کو ضیا کے کلام میں مل جائے گا۔
لیکن ضیا کے کلام میں جو ایک انسانِ صادق کا خلوص کارفرما ہے، وہ ہر شعر میں ضیا کی اپنی طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ ایک صحیح اور حقیقی شاعر کی حیثیت سے ضیا نے جو کچھ دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، سوچا ہے، سمجھا ہے، اور پایا ہے، اسے بڑی دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اسی خلوص نے اس کے کلام میں جو تاثیر پیدا کر دی ہے، وہ ایک غیر فانی کشش اور سچی کیفیت کی حامل ہے۔ شاعر، شعر اور شعریت میں اخلاص کی یہ نئی روح ضیا کو اس سنگلاخ وادی اور ناشائستگی کے کے دور میں بھی صحیح راہ پر بہت آگے لے گئی ہے۔

تاب نظر اگر ہو، تماشا کریں کلیم
اب ہر طرف ضیا ہی ضیا انجمن میں ہے

ضیا کے بارے میں جناب اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) نے صحیح لکھا ہے کہ اس نے ادب کے تمام نئے نظریات اور سارے بدلتے ہوئے رجحانات کو قبول کیا، لیکن اپنے سانچے میں ڈھال کر، اپنے ذاتی نظریات سے متوازن کر کے۔

ضیا نے پچھلے چند برسوں میں نظم و غزل کی صورت میں جو کچھ لکھا ہے، مندرجۂ بالا رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ غزل کے اپنے سانچے میں اس نے نئے افکار کو ڈھالا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پختگیِ فن تو خیر، طبعی بات ہے، لیکن جدتِ افکار سے بھی اس پختہ و سکارکشتہ سخنور نے نہ صرف نئی نسل کو چونکایا ہے بلکہ وہ اپنی انفرادیت اور آن بان کے ساتھ شعرائے جدید کے پہلو بہ پہلو رواں دواں ہے۔
وہ کہتا ہے:

سدا ہی پیکرِ غزل میں، بھرا ہے رنگِ جدید میں نے
ضیا! مرے شعر میں مہیا کوئی نئی بات ہی ملے گی

جذبِ غم اور اس قدر، یارو! کیوں نہ الفت کا ہو اثر، یارو!
بھول جاتے ہیں حادثے دل سے نہیں جاتی کسک، مگر یارو!

دل میں باقی ہے جرأتِ پرواز
کیا ضروری ہیں بال و پر، یارو!

ضیا کا ایک شعر ہے:

تنگ ہستی سے ہوں مرنا بھی ہے آساں، لیکن
کیا کروں رُوح سے لپٹی ہے بدن کی خوشبو

ایک نظم بعنوان "میری ساٹھویں سالگرہ" قدیم و جدید فکر و فن کا حسین امتزاج ہے۔ نظم کا پہلا بند ہے:

جگمگ جگمگ ساٹھ ستارے
توڑ کے گردوں کی ٹہنی سے
میں نے سجائے
آنگن کی دیوار میں اپنی

اور آخری بند ہے:

سوچ رہا ہوں
کیوں نہ میں ان کو
اپنی تجوری میں اب رکھ کر
تالا لگا دوں
اس پونجی کے سہارے ہی تو
مجھ کو ابھی زندہ رہنا ہے۔

ضیا اپنے کلام میں بدلتی ہوئی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا تازہ کلام

اس بات کا ثبوت ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اس کا اندازِ فکر بھی بدلا ہے۔ اس نے غزل کا نیا اسلوب بھی اپنایا ہے، جو اس کے دورِ اوّل کے اسلوب سے بہت مختلف ہے۔ ضیا نے جو کچھ آج کل لکھا ہے، اس کا انداز بیان نیا ہے۔ وہ ساٹھ سال کا ہو کر بھی فکرِ جوان رکھتا ہے۔

آخر میں اب اس کی غزلوں کے چند شعر دیکھیے:

آیا تھا کوئی حالِ وفا پوچھتا ہوا ۔۔۔ خاموش ہو گیا، یہ مرے دل کو کیا ہوا
اچھا ہوا کہ تو نے بھلا ہی دیا مجھے ۔۔۔ لیکن میں تجھ کو بھول گیا، یہ بُرا ہوا
تیری وفا جہاں کی وفا کی نوید تھی ۔۔۔ تو بیوفا ہوا، تو جہاں بیوفا ہوا

توڑ کر چل کل جو بھاگا تھا ۔۔۔ اس کے پاؤں میں کچّا دھاگا تھا
کھو لیا آنکھ کیا اندھیرے میں ۔۔۔ روشنی میں بھی میں نہ جاگا تھا
اے ضیا! مجھ سے میرا ہی سایا ۔۔۔ رکھ کے کل سر پہ پاؤں بھاگا تھا

یوں حسرتوں کی گرد میں تھا دل اٹا ہوا
جیسے درخت سے کوئی پتّا گرا ہوا
ملتا سراغ خاک مجھے تیرے سایے کا
ہر سمت ظلمتوں کا تھا جنگل اُگا ہوا
باہر کے شور و غل ہی سے شاید وہ بول اٹھے
بیٹھا ہے کب سے چپ کوئی اندر چھپا ہوا۔

گربچن چندن

ضیا فتح آبادی

سے ایک ملاقات

ایک اچھے شاعر کی تخلیقات اسے ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہیں، جہاں وہ ایک ماورائی شخصیت بن جاتا ہے۔ جب ہم اس کے کلام میں کوئی ایسا شعر پڑھتے ہیں۔

کرونگا جمع اک مرکز پہ ذرّاتِ پریشاں کو
نظامِ دہر کی بگڑی ہوئی قسمت بناؤنگا

تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی مخلوق ہے جس کی صلاحیت اور رسائی بے پناہ ہے، اور وہ انسان کو گھڑی بھر کے لیے اس کے مسائل اور مصائب سے نجات دلا سکتا ہے۔ لیکن مایوسیوں کو امیدوں کی جنّت عطا کرنے والا اور خوابوں کو الفاظ کے پیکر میں پیش کرنے والا شاعر بھی گوشت پوست کا ایسا ہی انسان ہوتا ہے، جیسے ہم آپ ہیں میری اور آپ کی طرح وہ بھی مسائل اور حوادث سے پریشان، اس انتظار میں رہتا ہے کہ

جانے کوئی رام کب آکر مجھے بھی دے نجات
ٹھوکروں میں ایک پتھر راہ کا ہے مجھے

کچھ ایسا ہی احساس مجھے مہرلال سونی ضیا فتح آبادی صاحب سے

ل کر ہوا۔
ضیا صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں، یہ اندازہ مجھے ان کے مطبوعہ کلام ہی سے ہو گیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میرا ان سے تعارف ان کے کلام کے ذریعے سے بس غائبانہ ہی رہا۔ میرے دوست کرشن موہن مجھ سے اکثر ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے، لیکن میری بدقسمتی کہ ان سے ذاتی ملاقات ایک زمانے تک نہ ہوئی اور پھر جب ایک دن ہماری ادبی مجلس کے ایک جلسے میں کرشن موہن نے انھیں مجھ سے ملایا، تو اس پہلی ملاقات ہی میں برسوں کا سفر طے ہو گیا۔ میرا اولین تاثر یہ تھا کہ وہ ایک صادق اور مخلص انسان ہیں، اور اپنی منکسر مزاجی پر شعری فوقیت کو غالب نہیں ہونے دیتے۔

اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں جس دن میں ضیا صاحب کا انٹرویو لینے کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوا، تو وہ اپنے صاحبزادے کی شدید علالت کے باعث بہت پریشان تھے۔ ان کے بعض احباب بھی وہاں موجود تھے۔ ایسے ماحول میں ان سے بات چیت کا امکان دشوار تھا، لیکن میں نے جب لڑکے کی علالت کے بارے میں کچھ استفسار کرنے کے بعد رخصت چاہی، تو اسے ان کی عالی ظرفی کہیے یا ان کا خلوصِ شعری کہ انھوں نے مجھے اس کی اجازت نہ دی اور میرے سوالوں کا جواب دینے پر تیار ہو گئے۔

ضیا صاحب ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو پنجاب کی سابق ریاست کپور تھلہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام مہر دین رکھا گیا تھا، جو بعد میں مہر لال ہو گیا۔ ان کا وطنِ مالوف فتح آباد (ضلع امرتسر، پنجاب) ہے مگر انھیں بیک وقت دو تین ماہ سے زیادہ کبھی وہاں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کے والد کو ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر جانا پڑا اور اہلِ خاندان سب ان کے ہم رکاب رہے۔ ابتدائی تعلیم اردو میں پائی۔ پہلے گھر

پر پڑھے۔ پھر تیسرے درجے سے پشاور چھاؤنی کے خالصہ مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ مہاراجہ ہائی اسکول بھے پور سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج، امرتسر سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے لاہور کے فورمین کرسچین کالج میں داخل ہو گئے یہاں سے ۱۹۳۳ء میں فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے، اور ۱۹۳۵ء میں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ریزرو بنک میں ملازمت مل گئی، جہاں سے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وہ جولائی ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں شادی کی، لیکن بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۴۲ء میں دوسری شادی کرنا پڑی۔

اردو شعر سے بچپن ہی سے فطری رغبت تھی۔ ۲۱ سال کی عمر میں (۱۹۳۲ء) ان کا اوّلین مجموعۂ کلام قطعات کی صورت میں "طلوع" کے عنوان سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "نورِ مشرق" کے عنوان سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو نظموں کا غالباً پہلا مجموعہ تھا جس میں گیت اور سانیٹ شامل کیے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں "ضیا کے سو شعر" چھپے [illegible] میں "نئی صبح" کے عنوان سے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ [illegible] ۱۹۶۳ء میں "گردِ راہ"، ۱۹۶۶ء میں "حسنِ غزل" اور [illegible] میں "دھوپ اور چاندنی" کے عنوان سے دوسرے مجموعے [illegible] ہوئے۔ ان سات مجموعوں کی اشاعت کے علاوہ قریب نصف صدی سے ملک کے برگزیدہ جرائد اور رسائل میں ان کا کلام چھپ رہا ہے۔

اب وہ بات چیت سنیے، جو شعر اور شاعر کے بارے میں میرے اور ضیا صاحب کے درمیان ہوئی:

سوال: ضیا صاحب! آپکی اولین شعری تخلیق کونسی ہے؟ یہ آپ نے کب اور کس ماحول سے متاثر ہو کہی؟

جواب: میں نے سب سے پہلے ۱۰ سال کی عمر میں ایک غزل کہی جس کا اب مجھے صرف مطلع ہی یاد ہے:

کیا ٹھہر سکتا فروغِ روئے جاناں دیکھ کر ہو گیا روپوش آخر مہرِ تاباں دیکھ کر

یہ پانچ سات شعر کی غزل تھی اور غالباً اختر کے ماہنامہ چمن کے اپریل ۱۹۲۹ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غزل میں نے جے پور میں کہی تھی اور اصغر علی صاحب حیا نے، جو مجھے گھر پر اردو پڑھاتے تھے، اس پر اصلاح دی تھی۔ میں نے شعر کہنا انہی سے سیکھا اور انھوں نے عطا تخلص عطا کیا تھا۔ امرتسر منتقل ہو جانے کے بعد میں جناب فرخ امرتسری کا باقاعدہ شاگرد بن گیا اور انھوں نے میرا تخلص بدل کر ضیا رکھ دیا۔ اسی زمانے میں میں نے چند غزلیں جناب فیروز طغرائی کو بھی دکھائیں - انھیں دنوں اتفاق سے شاعر، آگرہ کا ایک پرچہ میری نظر سے گذرا اور میں ایک خط کے ذریعے سے (شاعر) کے مدیرِ اعلیٰ جناب سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا مجھے علامہ مرحوم کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نہیں ملی اور سلسلۂ اصلاح بذریعہ ڈاک ہی جاری رہا، جو فارغ الاصلاح کر دیئے جانے کے بعد بھی ان کی وفات تک نہ ٹوٹا۔

س: آپ میں شاعری کی خداداد صلاحیت ہے لیکن سنا ہے کہ آپ نے ابتدا میں شعرگوئی چھوڑ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر دوبارہ کس چیز نے آپ کو شاعری کی طرف مائل کیا؟

ج: میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں، جن کے ہر ہر قدم پر دشمن زیادہ اور دوست کم رہے۔ خاموش طبع اور تنہائی پسند ہونے کے سبب میں اکثر الگ تھلگ رہتا تھا۔ خوشامد کرنے کی صلاحیت یا

عادت مجھ میں کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ طالبعلمی کے زمانے میں لاہور کے سرکردہ روزناموں میں میرا کلام چھپتا تھا، جس سے میرے بعض ہم جماعت بہت جلتے تھے۔ پھر مجھے اپنے ایف۔سی کالج کے میگزین کے اردو حصے کی ایڈیٹری ملی۔ اس سے بھی چند ہم جماعتوں کو، جو اس منصب کے آرزومند تھے، بہت جلن ہوئی۔ ان کے اپنے اپنے گروہ تھے، جن سے میں پرے پرے رہتا تھا۔ انھوں نے اسے میرا تکبر خیال کیا۔ اور طرح طرح سے میری مخالفت کی۔ کبھی اخباروں میں چھپنے والے میرے کلام میں کیڑے ڈالے اور کبھی کالج میں میرے خلاف پوسٹر تقسیم کیے۔ غرض انھوں نے میرے ذوقِ شعری کو مجروح کرنے کی پیہم کوششیں کیں۔ اس ماحول کا میرے نوخیز ذہن پہ بہت اثر ہوا اور مجھے اپنی شعری صلاحیت پر شک ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے سیماب صاحب کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی کو ایک خط لکھا کہ میں شعرگوئی ترک کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے شدت سے میری رائے کی مخالفت کی اور مجھے شعرگوئی جاری رکھنے کی تلقین کی۔

س : آپ نے نظم، غزل، قطعہ، رباعی، سانیٹ، گیت، ہر صنفِ سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کونسی صنف کو اپنے ذوق کے سب سے قریب پاتے ہیں، اور کیوں؟

ج : یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ میں نے اپنی شعرگوئی کے اس پہلو پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا۔ کچھ لوگوں نے میری نظموں کو پسند کیا، کچھ لوگوں نے غزلوں کو، اور کچھ نے دوسری اصناف کو۔ مجھے تو اپنی سبھی چیزیں پسند ہیں۔ میں نے سہرے اور تہنیت نامے بھی لکھے ہیں۔ میں نے کسی خاص صنف میں کوئی دشواری نہیں محسوس کی۔ شروع شروع میں میرے قطعات چھپے۔ اس زمانے میں قطعات کا بہت رواج تھا۔ چنانچہ میرا ذوقِ شعری ادھر مائل رہا۔ پھر مجھ پر ہمعصر شعراء کا اثر ہونے لگا۔ ان میں اقبال، حفیظ، اختر شیرانی اور احسان بن دانش

سرفہرست تھے۔ یہ اردو کے تمام رسالوں پر چھائے ہوئے تھے۔ میرے مجموعہ "نورِ مشرق" میں ان سب کے اثرات ملیں گے۔ 'انسان اور فرشتہ'، اور 'لالہ و گل' اقبال سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ گیتوں میں حفیظ اور راندرجیت شرما نے اور سانیٹ میں مجھے اختر شیرانی نے متاثر کیا۔ یہ ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۵ تک کا وہ زمانہ تھا، جب میں لاہور میں رہا اور میرے اس ابتدائی دور میں ہمعصروں کے گہرے اثرات ہیں۔ میں ۱۹۳۶ میں دلی آ گیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ آزاد اور معریٰ نظمیں کہی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی حدود میں رہ کر ترقی پسند نظمیں بھی کہیں۔ ویسے میں کسی تحریک یا اِزم سے وابستہ نہیں رہا۔ میں اپنی دھن میں مست ہوں۔ میں کس خاص صنف کا شاعر ہوں، اس کا فیصلہ ناقد ہی کر سکتا ہے۔ خود میں 'نئی صبح' کو اپنی شاعری کا عروجی نقطہ سمجھتا ہوں۔

س: زمانۂ شباب کی آپ کی بعض تخلیقات کچھ ایسے کردار پیش کرتی ہیں، جن کے بارے میں آج مزید جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تصویر (۱۹۳۰)، دعوتِ نظر (۱۹۳۵)، مطربہ سے (۱۹۳۵)، نہ جاؤ ابھی (۱۹۳۵)، اپنی میرا سے (۱۹۳۴)، اور حسنِ گمراہ (۱۹۳۲) جس میں ایک شوخ حسینہ آپ کو محبت کا پیغام دیتی ہے، لیکن آپ اس سے گریز کرتے ہیں۔ کیا آپ ان کرداروں پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔

ج: میں شروع ہی سے خلوت نشین اور کم آمیز رہا ہوں۔ اسی کم آمیزی کے سبب لاہور میں قیام کے دوران میں حفیظ، اقبال اور اختر شیرانی ایسے شعرا سے بھی کبھی نہ ملا۔ میرا ایک شعر ہے:

کہہ کر غزل تو لائے تھے ہم بھی ضیا مگر — اپنا کہیں شمار نہ تھا، دیکھتے رہے

میں نہ تو کسی گروہ میں شامل ہوا، نہ کبھی کافی ہاؤس کے ہنگاموں میں شریک ہوا۔ ایک خودداری سر پہ سوار رہی۔ میری زندگی میں کبھی ملاقاتوں کا سیلاب

بھی نہیں آیا۔ میرا ایک اور شعر بھی ہے:

کون ضیا سے ملنے جائے کم آمیزی ہے اس کی خُو

سنجیدگی میرے کردار کا جزو لاینفک ہے، لیکن اس امر سے مجھے کوئی انکار نہیں کہ شاعر فطرتاً حسن پرست ہے۔ اس کی فطرت کے ساتھ اس کے عنفوان شباب کو دیکھیے، تو اس کے سامنے حسن ہی سب سے عمدہ منظر اور موضوع ہے۔ میں بھی حسین چہروں سے مسرور ہوتا رہا۔ لیکن میرا سرور فکر و نظر کی تہوں میں بند رہا۔ مزاج کی سنجیدگی نے پیش قدمی نہیں کرنے دی۔ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج تو شروع ہو چکا تھا لیکن نسوانی آزادی زیادہ عام نہیں ہوئی تھی۔ کچھ شعرا نے تصوراتی پیکر تراش لیے تھے، جن میں اختر شیرانی کی سلمیٰ بہت مشہور ہوئی تھی۔ چلتے چلتے ایک دلچسپ بات سنیے۔ ہمارے کالج میں میرا نام کی ایک بنگالی لڑکی پڑھتی تھی۔ اس کے حسن اور غمزوں کا بہت شہرہ تھا۔ ہمارے مشہور ترقی پسند شاعر میرا جی نے اسی کے نام پر اپنا شعری نام رکھ دیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ لڑکی شاعر کے تیر نظر کا کبھی شکار نہیں ہوئی تھی۔ میرا ایک ہم درس اس لڑکی پر جی جان سے فدا تھا اور اکثر مجھ سے اس کی باتیں کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے رومانوی تخیل کا بھی ایک پیکر بن گئی۔ میری کئی نظموں میں اس کا نام آتا ہے۔ میرا سانیٹ "اپنی میرا سے"، اسی سے منسوب ہے۔ میری جن دیگر نظموں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان میں کوئی حقیقی کردار نہیں ہے۔ البتہ وہ سب میرے ان تصورات کے مرہون ہیں جو حقیقی کرداروں سے پیدا ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے کردار ہر شاعر کے تحت الشعور میں اس سے ہنستے کھیلتے رہتے ہیں اور پھر خود بخود اس کے اشعار میں سطح پر آجاتے ہیں۔

ا: ایف۔ سی کالج کے قیام کا ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں:
ہمارے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر مرحوم بھی اسی کالج میں پڑھتے تھے۔ جہاں

سینیر تھے، اور غالباً کالج میگزین کے انگریزی حصے کے ایڈیٹر تھے۔ ان دنوں وہ اکثر انگریزی ہی میں لکھتے تھے۔ ان کا اردو کا ایک افسانہ میں نے اپنے اردو حصّے میں چھاپا۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ کی بات ہے۔ اس افسانے کا عنوان "سادھو" تھا، اور میری دانست میں یہی ان کا اولین اردو افسانہ ہے۔

س: آپ ملک کے کئی مقامات پر رہے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ کس مقام کی بدولت آپ کے تخیل اور تصور کو کوئی خاص یا نئے گوشے ملے؟

ج: شاعر کا ذہن کسی خاص مقام کا محتاج نہیں ہوتا۔ بقول غالب اس کے مضامین تو غیب سے آتے ہیں۔ البتہ اس کا ماحول اور گردوپیش اس پر اپنا اثر ضرور کرتے ہیں۔ میرا ابتدائی تخلیقی عمل لاہور میں ہوا، جہاں میں چار سال رہا۔ وہاں سب پرچوں میں جن میں ادبی دنیا، ادب لطیف، ہمایوں اور نیرنگِ خیال شامل تھے، میرا کلام شائع ہوتا رہا۔ میری بیشتر کاوشیں ادبی دنیا میں چھپیں۔ نیرنگِ خیال نے مجھے اپنے ایک مضمون میں تین منتخب بااسلوب شعرا میں شامل کیا۔ دوسرے دو شاعر احسان بن دانش اور ساغر نظامی تھے۔ وقار انبالوی، احسان بن دانش، اپندر ناتھ اشک اور فہیم بیگ چغتائی سے میری اچھی راہ و رسم تھی۔ جوش ملیح آبادی سے بھی میں پہلی بار لاہور ہی میں ملا، جب وہ ۱۹۳۴ء میں وہاں طلبا کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کی صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے کی تھی۔ سروجنی نیڈو بھی اس میں شریک ہوئی تھیں۔

۱۹۳۶ء میں جب مجھے ملازمت مل گئی، تو میں دلّی چلا آیا۔ یہاں سب سے پہلے سنور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ جوش، شاہد احمد، گوپی ناتھ امن، اور دیوان سنگھ مفتون سے بھی اچھے مراسم رہے۔ دلّی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ میں نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "طلوع" کا ایک نسخہ، جس کا دیباچہ ساغر نظامی نے لکھا تھا، نیاز صاحب کو بھی بھیجا۔ انھوں نے نگار میں اس پر بہت سخت تبصرہ لکھا، جس میں ساغر صاحب کو ان ارشادات

کے لیے بہت کوسا۔ بعد میں نیاز صاحب کو ریزرو بنک میں مجھ سے کچھ کام پڑا، جو میں نے پورا کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں میرا دوسرا مجموعہ "نورِ مشرق" شائع ہوا۔ میں نے اس کا بھی ایک نسخہ نیاز صاحب کو بھیجا۔ انھوں نے نگار کی آیندہ اشاعت میں ایک ایسا ستایشی تبصرہ لکھا جو ایک قصیدے سے کم نہ تھا۔
میں نے قریباً دس افسانے بھی لکھے، ان میں سے اکثر یہیں دلّی میں لکھے گئے تھے۔ یہ بیسویں صدی، شعاعیں، راہنمائے تعلیم، اور دستگیر نامی دلّی کے جرائد میں شائع ہوئے۔ ان میں ایک افسانہ ملک کی تقسیم کے موضوع پر تھا؛ اس کا عنوان تھا: 'میں شرنارتھی ہوں'۔ میں افسانہ نویسی زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا کیوں کہ افسانہ بہت وقت چاہتا ہے۔
لاہور اور دلّی کے علاوہ مدراس میں بھی، جہاں میں سات آٹھ برس رہا، میرا تخلیقی عمل وافر رہا، لیکن بمبئی نے میرے وجدان میں زیادہ تحریک نہیں پیدا کی۔ میں وہاں چار سال رہا، اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہاں شعرا کاروباری زیادہ ہیں۔ وہاں کے ادبی ماحول پر فلمی صنعت سوار ہے۔ جو صالح ادب کے فروغ کے لیے سم قاتل ہے۔ ادب وہاں کی رنگارنگ منڈی میں ادیب کی تاجرانہ صلاحیت کے مطابق بکتا ہے۔ چند شاعروں نے اپنے اپنے حلقے میں دوسرے شاعر پال رکھے ہیں، جن سے وہ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت لکھوا لیتے ہیں۔ مراسلہ نگار کی حیثیت سے نام ایک صاحب کا ہوتا ہے لیکن کام کوئی اور صاحب کرتے ہیں۔ یہ سب چلتا ہے"کی گردان سے سیٹھ سیٹھ اور حلقہ در حلقہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں میرے جیسے کم آمیز شاعر کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

س: کیا کسی ایک زبان کے شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی شاعری کے اچھے مطالعے سے بہرہ ور ہو؟ آپ کا اپنا تجربہ کیا ہے؟

ج: مطالعے کی وسعت سے ذوقِ تخلیق وسیع ہوتا ہے۔ کوئی شخص

یل زمانے تک ایک ہی شہر میں مقیم رہے، تو اس کا نقطۂ نگاہ محدود ہوکر رہ
اتا ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص جو شہر شہر گھوما ہو اس کی نگاہ
ر خیالات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ ایجادات
ر مواصلات کی کثرت کے اس دور میں تو وسعتِ مطالعہ اور بھی
روری ہے۔ لیکن اس ضمن میں میرا اکتساب زیادہ تر انگریزی ادب
ہی سے رہا۔ کیونکہ میں نے اسی زبان میں ایم۔ اے کیا تھا۔ شیکسپیر، مارلو،
یٹس، شیلے، اور بائرن سے مجھے خاص دلچسپی رہی۔ گھر میں میری زبان پنجابی
ی، دفتر میں انگریزی، تحریر میں اردو اور عرصۂ روزگار میں بنک کا دامن
تھا۔ ان سب کے ساتھ میرے مزاج کی کم آمیزی ان تضادات کے
سبب میں ادب کے مندر میں پوری تندہی سے عبادت نہ کرسکا۔

ل: غزل کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ کیا یہ عورت اور مرد
کے عشقیہ معاملات ہی تک محدود ہے؟

ج: میں غزل کے بارے میں سیماب صاحب کا مؤید ہوں۔ انھوں نے غزل میں
عشقیہ مضامین کی حدود سے نکل کر سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی غزلیہ اشعار پیش
کیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل میں ہر قسم کے مضامین رقم ہو سکتے ہیں۔ فلسفہ اور تصوف
تک ان میں شامل ہیں۔ لہٰذا میں نے اپنی غزل میں سبھی موضوعات کو شامل کیا
ہے۔ میں غزل میں غالب سے زیادہ متاثر ہوں۔

ل: شاعر کی عظمت میں آپ نظم اور غزل میں سے کس کو زیادہ اہمیت دیتے
یں؟ کیا کسی بڑے شاعر کے تخلیقی کارناموں میں طویل نظم کا ہونا ضروری ہے؟

ج: عظمت کے لیے مصنف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر
یا کہنا چاہتا ہے، اور کیسے کہنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے،
و وہ بڑا شاعر ہے، کامیاب نہ ہو، تو اس کا مضمون یا موضوع خواہ کتنا ہی بلند
یوں نہ ہو، ہم اسے عظیم شاعر نہیں کہیں گے۔ میرے خیال میں بڑا شاعر بننے کے لیے

طویل نظم کہنا ضروری نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ کہا جائے، وہ بھرپور اور مکمل ہو۔ اگر اس میں کچھ تشنگی رہ جاتی ہے، تو شاعر عظمت کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر اس کے کامیاب اظہار کے لیے طوالت ضروری ہو، تو طوالت عین بجا ہے۔

س : شاعری کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ کیا یہ صرف لذتیت اور جمالیاتی کیف ہی کا ایک ذریعہ ہے، یا اسے انسان کے دکھ درد کا مرہم بھی ہونا چاہیئے۔

ج : شاعری کا کوئی نظریہ بتانا مشکل ہے، خاص طور پر مجھ جیسے شاعر کے لیے جس نے مختلف اوقات میں مشاہدات و تجربات اپنی نگارشات میں سموئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں تضاد بھی مل جائے۔ میری شاعری نہ تو نظریاتی شاعری ہے، نہ کسی ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہے۔ ویسے میں نظریاتی شاعری کا قائل بھی نہیں۔ ایسی شاعری زندگی کو اپنے مخصوص زاویے ہی سے دیکھتی ہے اور اس کے بقیہ رخوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ لذتیت کو میں اہمیت نہیں دیتا، لیکن جمالیاتی کیف کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ شاعری کو انسان کے دکھ درد کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ خود ہی انسان کے دکھ درد کا مرہم بن جاتی ہے۔ لیکن میں اسے کھلے طور پر اور عمداً مرہم بنا کر پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاعری قلب کو تسکین اور سکون نہیں پہنچاتی، تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہے۔ شاعری کے لیے ضروری ہے کہ وہ داخلیت اور خارجیت کا سنگم ہو۔ اسے ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کا ہو کر نہیں رہ جانا چاہیے، بلکہ توازن قائم رکھنا چاہیے۔

س : کیا شاعر کو اپنے کلام کا نقاد بھی ہونا چاہیے؟

ج : میں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ ایک فطری شاعر فن کے تمام نکتوں سے بھی واقف ہو۔ شعر گوئی اور شعر فہمی کو میں الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔ البتہ میرا خیال ہے کہ ہر شاعر کو شعر فہم بھی ہونا چاہیے۔ اپنے کسی مجموعے کی اشاعت

سے پہلے میں اپنے کلام سے انتخاب کرتا ہوں۔ گذشتہ ۴۸ سال میں میرا جو کلام چھپا ہے،
میں نے اس سے کہیں زیادہ کہا ہے۔ میرے مطبوعہ کلام سے کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا
کہ میں بسیار گو نہیں ہوں۔

س : ایک غیر ملکی ادیب نے کہا ہے کہ نظم ایک پہیلی کی طرح ہے، جس کا حل پڑھنے
والے کو نکالنا چاہیے! اس نظریے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : میں ابہام کو، جو جدید ادب میں نمایاں ہے، ادب کا جزو اعظم نہیں سمجھتا۔
کسی زمانے میں غزل کو اشاراتی کہا گیا تھا۔ پھر ہمارے ادب میں بھی ایک زمانہ
آیا، جب ابہام گوئی یا ذو معنی اظہار کو فن کی معراج سمجھا گیا۔ بعد میں ہم نے اس کو
ترک کر دیا۔ اب جسے جدیدیت کہتے ہیں، وہ ہمارے ماضی کی ایک صدائے
بازگشت بھی ہے چنانچہ ہم انھیں چیزوں کا اعادہ کر رہے ہیں، جنھیں ہم ایک
زمانے تک آزمانے کے بعد ترک کر چکے تھے۔ شعریت رمز میں ہے، بیانیہ طرز
میں نہیں۔ اسی لیے شاعری طبعاً رمزیاتی ہوتی ہے۔ لیکن اس رمز کو پہیلی
بنا دینے، یا خواہ مخواہ کا ابہام پیدا کر دینے ہی میں شاعری کی معراج نہیں ہے۔
وہ رمزیہ ہو یا ابہامی۔

س : اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے کردار اور مقام کے بارے میں
آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : میرے نزدیک یہ تحریک دراصل ایک سیاسی تحریک ہے۔ ہم نے اس
میں سیاست کو ادب سے گڈمڈ کر دیا ہے، یا ادب کو سیاست کا رنگ دے دیا
ہے؛ اور اس سیاست کو ہم افادی اور جدید کہنے لگے۔ ہمارے اردو شعرا
کی پرانی غزلوں میں بھی جابجا ایسے اشارے مل جاتے ہیں جنھیں ترقی پسند کہا
جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں سماجی اور
سیاسی حالات کے بارے میں کئی اشارے ہیں۔ ایسے اشاروں ہی کی بدولت
محققین نے غالب کی غزلوں کی تاریخیں مقرر کی ہیں۔ میرے خیال میں ادب پر

کوئی سیاسی یا سماجی قید و بند نہیں ہونی چاہیے۔ اسے ایسے تقاضوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کا کینوس جتنا وسیع ہوگا، ادب اتنا ہی عظیم ہوگا۔ ایک خاص مقصد سے وابستہ ہو جانے کے باعث ترقی پسند تحریک وسعت سے محروم ہو گئی۔ اس نے شاعری کو ایک ہنگامی شاعری بنا دیا، جس کی اہمیت اور معنویت کا حالات میں تبدیلی کے بعد کم ہو جانا لازمی تھی۔ البتہ اس تحریک کی بدولت یہ ضرور ہوا کہ غدر کے بعد خوف اور سراسیمگی کے سبب ہمارے ادب میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا، وہ بہت حد تک ٹوٹ گیا۔ کچھ تازہ ہوائیں آئیں۔ کئی نئے دریچے کھل گئے اور شعرا کو کئی نئے موضوعات مل گئے۔

س: اردو کے قدیم اور جدید شعرا میں سے آپ کن سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، یا کن کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج: قدیم شعرا میں میرے نزدیک سب سے اوپر میر اور غالب ہیں۔ ان کے بعد مومن ہیں۔ اگر یہ بھی غالب کی طرح اپنے کلام کا انتخاب پیش کرتے، تو ان کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا۔ میں انتخاب کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ میرے محبوب ترین شعرا میں اقبال، حالی، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، فانی بدایونی اور فراق گورکھپوری شامل ہیں۔

رام پرکاش راہی

"طلوع" سے "دھوپ اور چاندنی" تک

(ضیا فتح آبادی کا شعری سفر)

ضیا فتح آبادی کے یہاں زندگی کی ساتویں دہائی اور شاعری کی پانچویں دہائی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اور ان دو کی براہِ راست نسبت کو اگر نقد و نظر کے اعتبار سے ایک اکائی تصور کر لیا جائے، تو "طلوع" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) سے لے کر "دھوپ اور چاندنی" (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) تک کی تصنیفات کی روشنی میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ موصوف زود گو یا بسیار گو شاعر ہیں۔ البتہ پُرگوئی اور پختہ گوئی کچھ ایسے پہلو ہیں، جن کی بنا پر ضیا کو امتیازی مقام دیا جا سکتا ہے۔ ۴۲ سال سے زیادہ عرصے میں موصوف کی کوئی سات تصنیفات منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں سے صرف پانچ کسی حد تک مکمل کتابیں تسلیم کی جا سکتی ہیں اور ضیا ر کی ذہنی افتاد، تخلیقی تگ و دو اور فنی ارتقا کے مختلف گوشوں پر بتدریج روشنی ڈالتی ہیں۔

سب سے پہلے ان کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صنفِ سخن، ہیئت، موضوعات، معروضات اور تاثرات کے اعتبار سے ضیا ہمہ جہتی فنکار ہے۔ اس نے قطعہ، رباعی، غزل، نظم اور گیت پر انہماک سے طبع آزمائی کی ہے، اور چونکہ رباعی،

قطعہ اور نظم کی پہنائی میں موضوع کی بوقلمونیت کے امکانات بہت زیادہ ہیں، اس لیے ضیا نے اخلاقیات، حبِ وطن، فلسفۂ روحانیت، رومان، منظر نگاری، اور فطرت کی نقاشی جیسے گوناگوں موضوعات پر بڑی خود اعتمادی اور شایستگی کے ساتھ زورِ قلم کی گلکاریاں دکھائیں ہیں۔

ہر اچھے اور قابلِ ذکر شاعر کی طرح ضیا کا شعری سفر اور فنی ارتقا بھی ایک مخصوص پس منظر کے آیئنے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خداداد صلاحیت، لاہور کی عمدہ تعلیم، اور اساتذۂ دفت کا تبرک ـــــ ان سب کا سنگم، اس عمارت کا جونا گارا ہے، جسے ہم اردو شاعری کی منظم اور مستند روایت کا نام دیتے ہیں۔ روایت کی بنیاد پر ایستادہ اور ماحول کے تیشے سے تراشی ہوئی، ضیا میں چھپی ہوئی فنی شخصیت استقامت کی اس منزل پہ پہنچ گئی ہے کہ فصاحت، بلاغت، زبان و بیان پر قدرت اس کے صحتمند اور اٹوٹ انگ بن گئے ہیں، جن کے بل بوتے پر عمر کے انحطاطی دور میں بھی ضیا کی ذہنی دسترس، تخیلی جست، حیاتی لوچ، فکری اجتہاد اور جذباتی سرگرمی اس کی شاعری میں نت نئے رجحانات اور عصری میلانات سمو دینے کے درپے نظر آتے ہیں اور کسی حد تک خوب سے خوب تر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

ضیا فتح آبادی کو علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کا شرف تلمذ ۱۹۲۹ء ہی میں حاصل ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ، زیادہ تر خط و کتابت کی صورت میں استاد کی وفات تک جاری رہا۔ یوں آگرہ اسکول کا یہ دور افتادہ، مگر اہم رکن لمبے عرصے سے شعری کاوش میں مبتلا رہا ہے۔ یہ سفر واقعی طویل ہے، اور اس کی طوالت کا عمل اب بھی جاری و ساری ہے۔ اگر ماضی کے ماہ و سال کے تناظر میں دیکھا جائے، تو ریزرو بنک کی ملازمت کی چھاؤں میں یہ سفر اور بھی پُرپیچ، تہ دار، اور کہیں کہیں کٹا پھٹا اور غیر منطقی بھی لگتا ہے۔ زود گوئی اور بسیار گوئی کی کمی اسی لیے ناگزیر تھی کہ ملازمت، تبادلہ، سفر، فرض شناسی، اور فرماں برداری کی الجھنیں

شاعر کی آزادہ روی اور تخلیقی دوڑ دھوپ کے لیے اکثر سدِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ
معقول اور آبرومندانہ طرزِ معاش ایک ایسی نعمت ہے، جو شاعرانہ شخصیت
اور مزاج کے کئی پہلوؤں کو اطمینان کی فضا میں پروان چڑھنے کے مواقع فراہم
کرتی ہے اور شاعر کے لیے تخلیق رزمگاہ میں حوصلہ اور ہمت کا تازیانہ بن جاتی
ہے، جیسا کہ شیکسپیر نے کہا تھا۔ Thrift is a blessing if
men steal it not اور "روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر"
کے مصداق ایلیٹ کی یہ بات بھی معنی رکھتی ہے کہ "اگر تمھیں شاعری کرنا منظور
ہے، تو روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ اختیار کرو"۔ لہٰذا اعتماد اور عزت سے
بقیدِ حیات رہنے کے ذریعے کو برقرار رکھتے ہوئے ضیا نے شعری میدان میں
کتنی ریاضت کی ہے، اور کتنی وہ نہیں کر سکا، اس کی شاعری سے صاف ظاہر
ہے، خاص کر جب ہم ضیا کے شعری سرمایے کو علامہ سیماب اکبرآبادی کے بعض
دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی مختلف
پیرایوں میں جو کچھ بھی اس نے کہا ہے، ذاتی تجربے، حقیقی مشاہدے اور فطری
محسوسات کی بنا پر حتی المقدور سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ تلمذ کی گرفت کے باوجود
اس کی شاعری میں اس کا اپنا رنگ و آہنگ کارفرما ہے، جو اس کی انفرادیت کا
شروع سے آخر تک آئینہ دار ہے۔

انسانی تعلقات کی بنیاد محبت پر قائم ہے اور فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری
میں بھی، محبت کی بات چیت نے، غزل کا روپ دھارا ہے۔ تقریباً ہر اردو
شاعر غزل ہی سے ابتدا کرتا ہے کیونکہ حساس انسان کے لیے عالمِ طفلی اور عالمِ
جوانی جذباتِ محبت کے نشو و نما کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے:

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے   جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پای را

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ کا پہلا باب غزل ہے، اور غزل آج کے
جدید دور میں بھی اتنی ہی مانوس اور مرغوب ہے، جتنی آغاز میں تھی، نہ صرف کہنے والوں

کے لیے بلکہ سننے والوں کے لیے بھی۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے، کہ غزل کی سدا بہار دلہن ہر دور میں اپنے فطری حسن اور رنگ و روپ کو قائم رکھتے ہوئے، نئی پوشاک، زیورات اور دیگر لوازمات سے اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کرتی چلی آئی ہے۔ ضیا فتح آبادی کے یہاں بھی غزل نے وقتاً فوقتاً چولا بدلنے کی کوشش کی ہے، لیکن ماضیِ قریب تک وہ روایت سے کوئی خاطر خواہ گریز نہیں کر سکا، اور آخر میں اسے خود کہنا پڑا:

گھٹا بڑھا کے بھی دیکھا، مگر نہ بات بنی
غزل کا روپ، روایت پسند ہے، یارو!

دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ "نئی صبح" سے لے کر "دھوپ اور چاندنی" تک غزل کے میدان میں ضیا کا شعری معیار کم و بیش روایت کے تسلسل سے وابستگی، لب و لہجہ کی نرم آہنگی، احساس و فکر کا محتاط امتزاج اور غزل کے عام خد و خال کے تناسب اور موزونیت کا بیساختہ اور بے تکلف سلسلہ ہے۔ اس صورتِ حال پر اس کے تغزل سے لبریز یہ اشعار شاہدِ عادل ہیں:

وہ آئے ہیں، تو میرے منہ پہ رونق کیوں نہ آجائے
بہار آتی ہے گلشن میں، تو غنچہ مسکراتا ہے
یکایک بند ہو جائے نہ دھڑکن قلبِ مضطر کی
مجھے پھر چاندنی راتوں میں کوئی یاد آتا ہے

جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا جب ارادوں کی کائنات بنی
اُف مری مجبوریاں، محرومیاں، لاچاریاں حادثاتِ ناگہاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں
دلوں کی راہ میں سب کچھ روا ہے ضیا، تیری وفا، ان کی جفا کیا
مری رندی، مری ہستی کا حاصل تری آنکھوں کے پیمانوں کی دنیا
عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا چلے تھے جہاں سے، وہاں آگئے ہم

درد دوا فروش ہے، ناز نیاز مند ہے — عشق کا انتظار ہے، حسن ہے انتظار میں
محبت، آرزو، آنسو، تبسم، حوصلہ، کوشش — فرشتے کچھ نہ سمجھیں گے یہ مشتِ گل کی باتیں ہیں۔
رہ پر خار، بادِ تند، ہیبت ناک خاموشی — دلِ ناداں! یہی تو قربتِ منزل کی باتیں ہیں
ہزار بار ہی دیکھا ہے سوچنے کا مآل — ہزار بار ہی سوچا ہے، دیکھیے کیا ہو!
موت کا راز فاش تو کر دوں — زندگی کا بھرم نہ کھل جائے
جہاں سے قہقہے اٹھے تھے شاید — مرے آنسو بھی آئے ہیں وہیں سے
اُجالوں کو ڈھونڈو، سحر کو پکارو — اندھیروں میں رونے سے کیا فائدہ ہے
ہوش ہوتا ہے، نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے — ہائے، کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
اندھیروں سے دامن چھڑا تو لیا ہے — اجالوں سے بچ کر کہاں جائیے گا؟
فضا سہمی سہمی ہے، سانس اکھڑی اکھڑی — نہ اب آئیے گا، تو کب آئیے گا؟
مہ و مہر پر دام پھیلا رہا ہے — نزابندہ، تیرے ہی سانچے میں ڈھل کے
سمجھ سکے گی نہ دنیا دلِ خراب کی بات — خموش ہوں کہ مجھے ہمزباں نہیں ملتا

اگر ہم پچھلے پانچ چھ سال کی حدِ فاصل سے ادھر ضیا کی شاعری کے بننے سنورتے نقوش کو دیکھیں، تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے یہاں غزل کا مزاج ایک ایسے فن کو چھو رہا ہے جس میں جدیدیت کی ہلکی ہلکی ہفت رنگی کوششیں شوخ و شنگ دھنک کے منظم اور مستقیم روپ کی متلاشی ہیں۔ "دھوپ اور چاندنی" کی آخری اور مابعد کی غزلوں میں اس صورتِ حال کے جیتے جاگتے اور بولتے چالتے تیور ذیل کے اشعار میں موجود ہیں۔ ان شعروں میں موصوف کی عصری آگہی اور سماجی شعور کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ رویے میں ایک ایسا توازن ہے کہ اس میں روایت کی توسیع اور روایت سے گریز ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں:

منزل کا تو عرفان نہیں اتنی خبر ہے — جس سمت سے آیا تھا اسی سمت چلا ہوں
مدت ہوئی، گذرا تھا ادھر سے مرا سایہ — کب سے یونہی فٹ پاتھ پہ خاموش پڑا ہوں

تھا قیامت دلِ ذرہ کا ٹوٹنا آسماں جل گیا تھا کہ دل جل گیا

ہر طرف شور کی دیوار دکھائی دے ہے میری آواز بھی کب مجھ کو سنائی دے ہے
کھو چکا ہوں کسی تاریک گپھا میں خود کو ٹوٹ کر میری انا مجھ کو دہائی دے ہے
سایہ سایہ مرے پیچھے ہے کہیں دل کی نہ ہو یہ جو آواز ہمہ وقت سنائی دے ہے
ہوئی سحر تو کہاں کھو گیا اجالے میں جو رات بھر مرا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا
کیا پاؤں حادثات کے پتھراؤ سے نجات ہر سمت ہے محیطِ زمین آسمانِ وقت
پھاند کر جیل کل جو بھاگا تھا یا تو میں اس کے کچا دھاگا تھا
ہجومِ یاس، شبِ تیرہ، دردِ تنہائی سکون کجا، مجھے دل کا نشان نہیں ملتا
دھواں بھی نہ تھا کسترِ دل سے اٹھے فغاں کی صدا قہقہوں میں دبا دو
متھا تو ہے مجھ کو سمندر سمجھ کر کوئی زہر بھی آنسوؤں میں ملا دو

غزل کے بعد قطعات اور رباعی کے بحرِ بیکراں میں ضیا کی غواصی اور پیرا کی سعیِ مشکور کے مرادف ہے۔ موضوعات کی رنگا رنگی کو اس نے اپنے احساسِ برنائی، جمالیاتی شعور، واقعاتی تصور، فطرت شناسی اور رجائیت کی گوناگوں ترجمانی کے ذریعے شعری پیکر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل رباعیات توجہ کے قابل ہیں:

بادل کی جوانی ہے جوانی میری بوندوں کی کہانی ہے جوانی میری
سیلابِ حوادث کی قسم ہے مجھ کو موجوں کی روانی ہے جوانی میری

امڈا ہوا بادل، شبِ گیسو بہ نثار جذبات کا پھیلاؤ، جوانی کا ابھار
آنکھوں میں ٹپکتے ہوئے انگور کا رس گالوں پہ دمکتے ہوئے پھولوں کا نکھار

نکھری ہوئی زلفوں میں گُلِ تر کی مہک بہکی ہوئی آنکھوں میں ستاروں کی چمک
احساسِ شباب سے دھڑکتا ہوا دل بھیگی ہوئی ساری میں شراروں کی لپک

مہندی رچے ہاتھ، سرخ جوڑے کی کھنک ماتھے پہ حیا کے کھلتے پھولوں کی دمک
گھونگھٹ کیے کھڑی ہے گوری جل میں کہتی ہے، رہے سہاگ ہولیں جب تک

شفاف فضائیں، گنگناتی لہریں انگڑائیاں لیتی وہ کنول کی شاخیں
اک خاص حیا کے ساتھ رس کی پتلی اُتری ہے نہانے پاک سنگم جل میں

پلکوں کے طویل اور بوجھل سایے نینوں کے دیوں سے نور مستی پائے
وہ نرم بدن کا لمس، وہ حسنِ شباب سنگم کی ردا نیوں کو نیند آ جائے

ہر سمت ہے موت اپنے پر پھیلائے بڑھتے چلے جاتے ہیں ڈرانے سایے
کیا زیست کی قدر، وہ سمے آ پہنچا جب آنکھ میں فطرت کی بھی آنسو آئے

لاشوں کی سڑاند، جلتے ڈھانچوں کا دھواں سہمے ہوئے سینوں میں گھٹی آہ و فغاں
اُو منتظرِ حشر! قیامت ہے یہی پانی سے زیادہ خونِ انساں ارزاں

ہے فرش سے تا بعرش دیپوں کی قطار نکھرا ہوا رنگِ گل ہے، رقصاں ہے بہار
ظلمتکدۂ دل مرا روشن ہو جائے آجاؤ جو دیوالی کا تم بن کے سنگار

خورشید کی کرنوں کا رباب آزادی نغمات کی کلیوں کا شباب آزادی
صد رنگ سی شاعر کے تخیل کی دھنک کھوئی ہوئی جنت کا ہے جواب آزادی

آفات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے ظلمات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے
گردش میں زمیں و آسماں ہیں پیہم دن رات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے

تدبیر سے تقدیر بنانے والے انسان کو نئے موڑ پہ لانے والے
روندے ہوئے ذرّوں پہ پھسلتی سی نظر تاروں کی طرف پاتو بڑھانے والے

غزل میں ضیا کا ملکہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔ رباعی میں اس کی غواصی اور بھی عمیق اور معنی خیز ثابت ہوئی ہے۔ لیکن جب وہ نظم کہنے پر آتا ہے، تو اس کی شعری صلاحیت اور فنی دسترس اس صنفِ سخن کی متفرق جہات اور بسیط کینوس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ چنانچہ موضوعات کی بوقلمونیت، تاثرات کی بے پناہی، خیالات کا ارتقاء، مشاہدات اور محسوسات کی ترجمانی اور پیکر تراشی کے علاوہ نظم کے میدان میں ضیا کی بسیار گوئی بھی کسی حد تک نمایاں ہے۔ "نورِ مشرق" محض نظموں کا مجموعہ ہے۔ "نئی صبح" اور "گردِ راہ" میں بھی منظومات کا پلڑا بھاری ہے

گویا اس کی جملہ تصنیفات کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ نظم میں ضیا نے ہیئت کی رنگا رنگی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ پابند اور آزاد نظم کے علاوہ گیت میں بھی، اس نے بڑے وثوق اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ "نورِ مشرق" کی بیشتر نظمیں اس کے رومانی میلانات، مناظرِ فطرت کی تصویر کشی، وطن دوستی اور محبت کوشی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں "کس طرح قرار ہو"، "خوبصورت ارادے"، "طلوعِ سحر"، "دعوتِ سیر" "بوندوں کا ساز"، "ہندوستان"، "ہندوستانی نوجوان سے" اور "ڈیوک آف ونڈسر" ممتاز نظمیں ہیں۔ "نئی صبح" کی منظومات میں ترقی پسند عناصر کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ موضوعات کی تہ میں عزمِ عمل، فکرِ فردا، احساسِ آزادی، تلقینِ جد وجہد کی جذباتیت کارفرما ہے۔ "گردِ راہ" میں ضیا نے پھر اپنے پسندیدہ موضوعات کو ہیئت کی رنگا رنگی، زبان و بیان کی برجستگی اور لہجے کی غنائیت کو برقرار رکھتے ہوئے بڑے حسنِ تکرار سے نباہا ہے۔ "خشت و سنگ" کے شعری اندوختے میں سموئی ہوئی نئی نظمیں اس کی ان کاوشوں اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں، جن کی ترجمانی اس نے اپنی اس رباعی میں کی ہے:

میں حال کی زلفوں کے فسانے بُن لوں فردا کی ہواؤں کے ترانے سُن لوں
اے وقت! ذرا تھم کہ کنارِ دل سے بھولے ہوئے رنگین زمانے چُن لوں

"صبح کا تارا"، "ہجر"، "میں اور چاند"، "سایے"، "یاد کی یاد"، "جنگِ آزادی کے بینام شہید" اس قبیل کی نمایندہ نظمیں ہیں۔ چھٹی دہائی کی یہ نظمیں چوتھی اور پانچویں دہائی کی نظموں کے درمیان رکھ دی گئی ہیں۔ ترتیب کی یہ کمزوری نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔

نظم گوئی میں ضیا کا فن اور اسلوبِ اظہار پابند نظم میں اتنا دلپذیر نہیں ہے، جتنا کہ آزاد نظم میں۔ اس کا ایک سبب ہیئت کی تقلید بھی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی پابند نظم میں ضیا کی انفرادی جولانیاں روایت کی حدود میں لازمی

طور پر اس وقت کی کامیاب کوششیں ہیں۔ لیکن ضیا کا فنی معیار، اسلوبی اجتہاد، اور رعنائی اظہار اس کی آزاد نظموں میں اس قدر نمایاں ہے کہ گنتی کی یہ نظمیں اس کے ضخیم و کثیر پابند اندوختے پر سبقت لے گئی ہیں۔ "نئی صبح" کے مشمولات میں "آخری بار"، "شیریں تلخی"، "فرار" اپنا جواب آپ ہیں۔ ذیل کے اقتباسات ضیا کے گہرے رومانی تاثرات، اخلاقی بلندی، اور عصری آگہی کی عکاسی کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں:

آخری بار ذرا اپنے حسین ہونٹوں پر
مسکراہٹ کی شعاعوں کو بکھر جانے دے
میں اندھیروں میں یہی نور لوٹے جاؤنگا۔ (نظم آخری بار)

تیرے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی یہ چیز ہے کیا؟
میں ترے دامِ زر و مال میں آ سکتا نہیں
چاہِ ذلّت میں ترے ساتھ نہ کودونگا کبھی
حربۂ اشک بھی بیکار سا ہے
تیرا اقدام یہ تہذیب و تمدن کے خلاف
ناموافق بھی ہے، ناقابلِ تسلیم بھی ہے (نظم شیریں تلخی)

یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں
یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک، لرزہ خیز خواب
یہ چیختی ہوئی فضائیں، روز و شبِ حیات کی
یہ بلبلاتی آرزوئیں قلب کے مزار پر
سکوں کا خوں، بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ
یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدعا سے تنگ
فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر اک سمت جال
یقین کے پاؤں اور بدگمانیوں کی بیڑیاں

ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے (نظم فرار)

اسی طرح "گردِ راہ" کی آزاد نظمیں بھی گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں۔ سماجی قیود و بند، ماضی کی تلخ یادیں، دوسری جنگِ عظیم کی اندوہناک پرچھائیاں آزادی کے روشن افق سے پھوٹتی ہوئی امید کی کرنیں، ضیا کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ نظموں کے مندرجہ ذیل ٹکڑے موصوف کی ندرتِ خیال، تنوع اور جاذبِ نظر طرزِ اظہار پر روشنی ڈالتے ہیں :

درمیاں میرے ترے، دوست! جو حائل ہے خلیج
جسمِ خاکی کو ہم آغوش نہ ہونے دیگی۔
کیا تجھے دیکھ سکونگا میں دریچے سے مدام!
اینٹ چونے کی یہ دیوار ـــــ یہ مکروہ سماج! (نظم دریچے)

شبِ تاریک میں، ظالم اندھیرے میں
کبھی وہ وقت آجائیگا، جب خورشید بھی مشرق سے ابھریگا
نویدِ دورِ نو لے کر
کٹینگے بندِ مجبوری (نظم طوفان)

مجموعی طور پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ضیا کا کلام اس کی اسی شخصیت کا آئینہ دار ہے جس میں اخلاقیات، سچی ہندستانیت، لطیف اور صحتمند رومانی رجحانات، انسانی اقدار اور اخوت کے بلند معیار کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ موصوف کے انتخابِ موضوعات اور اسلوب بیان میں فطری ذہانت، دلی خلوص اور تجرباتی شائستگی کار فرما نظر آتی ہے۔ اردو ادب میں موصوف کا گرانقدر اضافہ اس بات کی دلیل ہے کہ ضیا کا دل و دماغ اب بھی وہی شاعر کا دل و دماغ ہے جسے عمر کے بڑھتے ہوئے مہ و سال سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہے تجھی میں بقائے عمر کا راز
اے غمِ عشق! تیری عمر دراز

زرینہ ثانی

ضیا فتح آبادی اور احساسِ حسن

ضیا فتح آبادی نے اپنی حالیہ غزل کے ایک مطلع میں کہا ہے :

بوڑھا درخت ہوں، مجھے جڑ سے اکھاڑ دو
میرا پھٹا ہوا ہے لباس، اور پھاڑ دو

تو یہ ان کی کم مایگی، بیبسی اور ناتوانی کا اظہار نہیں، بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ کھلا ہوا چیلنج ہے کیونکہ ان کا فن اتنا پائیدار اور مستحکم اور ان کی غزلوں اور نظموں کی جڑیں اردو شاعری میں اتنی دور تک اور اتنی گہرائی تک چلی گئی ہیں کہ ان کا اکھاڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے؛ اب ان کی شاعری کے پیراہن کا ایک تار بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا۔

ضیا فتح آبادی کی شاعری تقریباً نصف صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں قدیم طرز اور ترقی پسندی کے اثرات کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے صالح رجحانات بھی ملتے ہیں، اس لیے کہ زمانے کے تغیر کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں اور یہ ایک ناگزیر سی بات ہے۔ اس تغیر کی زد سے نہ کوئی شخصیت محفوظ رہ سکتی ہے، نہ فن۔

ضیا فتح آبادی مسلم تہذیب سے متاثر ہوئے اور اپنے مذہب سے وابستگی نے انھیں دیومالائی شعور عطا کیا۔ ان کے کلام میں جہاں آسمانوں کے تذکرے ملتے ہیں، اور ملکوتی محبت کا حسن موجود ہے، وہیں ارضیت، نغمگی اور رس کی بھی کمی نہیں۔ فارسی شاعری کی تخئیل آفرینی، ژرف بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ ہندی شاعری کی غنائیت، ترنم اور محویت نے بھی ضیا کی شاعری کو انوکھا رنگ روپ بخشا ہے۔

ضیا کسی دیدہ ور کی طرح حسن سے متاثر ہوتے ہیں ان کی نظم "شاعر سپنے میں" ان کی حسن پرستی کی بیّن دلیل ہے۔ حسن سے استفادہ کرنے کا رجحان حسن پرست طبیعت کی دین ہوتی ہے۔ وہ حسن کو دنیا کے ذرّے ذرّے میں دیکھتے ہیں۔ ان کا حسن کا نظریہ کیٹس کے نظریۂ حسن سے مماثلت رکھتا ہے۔ حسن صرف مسرّتوں، کامرانیوں اور شادمانیوں ہی میں مضمر نہیں، بلکہ غم و الم بھی اس حسن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہی احساسِ حسن شاعر کو جذب و سوز عطا کرتا ہے، جس سے ایسے نغمات کی تخلیق ہوتی ہے، جو آفاقی اقدار کے حامل ہیں۔ اور جب انسان میں احساسِ حسن پیدا ہو جائے، تو وہ بے نیازِ مستیِ جام و سبو ہو کر اپنی ہستی کو عظیم بنا لیتا ہے اور اپنی ذات کے انکشاف کے لیے مستعد۔ ضیا کے یہاں بھی ذاتی انکشاف کا رجحان ہے جو ہمیں فراق گورکھپوری کی یاد دلاتا ہے۔

اردو ادب میں ترقی پسند عناصر کی شمولیت ہمیں غدر کے بعد ہی سے ملنے لگتی ہے، اگرچہ ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اس نے ۱۹۳۶ء میں اختیار کی۔ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی۔ افراط اور تفریط کو نظر انداز کر کے ہم اس کے صالح عناصر کو مدّنظر رکھیں، تو پتا چلیگا کہ بحیثیت مجموعی یہ ادب کے لیے صحتمند تحریک ثابت ہوئی۔ ضیا کے یہاں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں، مگر یہاں بھی انھوں نے

اپنی صالح طبیعت کی بنا پر اس کے منفی پہلو سے چشم پوشی کی ہے۔ فرار، احساسِ شکست، لذتیت اور قنوطیت سے ضیا کا کلام پاک ہے مثلاً ضیا اپنے ہمعصر میراجی کے معترف ہیں، مگر ان کے کلام کے منفی پہلو سے برگشتہ خاطر بھی ہیں۔ آپ کو ضیا کی پوری شاعری میں تقدس، تازگی اور زندگی ملیگی، جو صحتمندی کی علامت ہے۔ انھوں نے ابہام اور جنس پرستی کو کہیں بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔

اہلِ ذوق و وجدان کی طرح انھوں نے بھی انسانی حسن سے اثر لیا ہے اور قدرتی مناظر کے حسن نے بھی انھیں اپنا شیدائی بنایا ہے۔ وہ قدرتی حسن اور انسانی جمال کو دیکھ کر بیقرار ہوجاتے ہیں۔ اس کی مثال ان کی نظم "کس طرح نزار ہو" میں موجود ہے۔ شاعر کو جہاں سرودِ آبشار، جلوۂ عروسِ بہار، صحنِ لالہ زار، طلوعِ صبح، شعاعِ ماہتاب، فضاؤں کی مستیاں بیقرار کرتی ہیں، وہیں محبوب کے تبسم کی ادا، اس کے لبوں کا رنگ، اور اس کا قد مرو قامت بھی بےچین کرتا ہے۔ اور جذبۂ عشق شدت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن ضیا کے شباب کے زمانے کی لکھی ہوئی نظموں سے بھی ضبط کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حسن کو دیکھ کر مچلتے ضرور ہیں، مگر ایک صحتمند اور توانا رجحان کے ساتھ۔ وہ حسن کے بے اعتبار اشاروں سے مسحور نہیں ہوتے، بلکہ جنوں کو ہمدوشِ خرد کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم "حسنِ گمراہ" میرے دعوے کی تصدیق کریگی، حسن اناتی سہی، مگر سرِ بزم حسن کی بیتابی اور بیباکی حسن کی تضحیک کے مرادف ہے۔ اس سے حسن میں وقار و عظمت باقی نہیں رہتی، جس سے تقدس اور توانائی عبارت ہے۔ حسن "حیا" سے جلا پاتا ہے، اور ایسے ہی حسن سے شاعر مسحور ہوتا ہے اور مستفیض بھی۔

ان کی نظم "کرن" حسنِ فطرت کا بہترین مظاہرہ ہے۔ اس نظم میں پہلے فطرت کے حسن کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح کرن حسنِ فطرت کے ہجوم

سے گزر کر تیرگی کو تہس نہس کرتی ہوئی آتی ہے۔ وہ فانی اور ناپائیدار ضرور ہے، مگر کلی کا سینہ اس کا منتظر رہتا ہے کیونکہ کلی کرن کے جلووں ہی سے پرنور اور معطر ہوتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے درون کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کرن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اے کرن! مجھ کو عطا کر ایک شعلہ نور کا
دے مرے ذوقِ نظر کو ظرف کوہِ طور کا
میرا دل مرکز بنے کیفیتِ مسرور کا
راز سارا کھول دوں میں ناظر و منظور کا
مادیت مطمئن ہو، روح تو کیا چیز ہے
میں بنا دونگا کہ سب ناچیز ہے، ناچیز ہے

"نورِ مشرق" کا شاعر حسن کا گرویدہ ہے، اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے حسن ہی کا سہارا لیتا ہے، یہاں تک کہ وہ کوئی فلسفیانہ بات بھی کہتا ہے، تو اسی پس منظر میں۔ ابرِ بہار، گھٹائیں، انجمنِ گل، نغماتِ عندلیب، کلی کی چٹک، مہر و ماہ کی چمک، سورج کا تاجِ زریں، شاعر کے تخیل کو مہمیز لگاتے ہیں، اور وہ شاعرانہ وجدان سے کام لیتے ہوئے بڑے پتے کی باتیں کہہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ "اے گل!" نظم اسی قبیل کی ہے۔ اس نظم میں شاعر دعوتِ غور و فکر دیتا ہے، پہلے وہ گل سے مخاطب ہو کر اس کی خامیاں گنواتا ہے۔ پھول، سوزِ لذت، حسنِ فطرت، گردشِ قسمت، وسعتِ عشق اور مسرت و یاس سے ناواقف ہے۔ اس لیے وہ اپنے رنگ و بو میں مست ہے، اور صبح و شام تبسّم ریز وہ خود نما اور خود پرست ہے گویا:

خود ہی ساقی، خود ہی میخانہ ہے تو خود ہی بادہ، خود ہی پیمانہ ہے تو

اس کے بعد شاعر کہتا ہے:

مشرق سے آفتاب نے ضیا پاشی شروع کر دی، چار سُو نور ہی نور ہے، غفلت

کا دور دورہ ختم ہو چکا۔ دنیا کو سمجھنے کا وقت ہے۔ فنا دنیا کی سرشت میں ہے۔ بہاریں جاوداں نہیں، اس لیے پھول کو اپنی فنا کا خیال کرنا ضروری ہے، تبسم اور مسرت غلط ہے۔ شرابِ عشق و جنوں ہی سے سرورِ جاوداں حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

دل میں کر مہمان اپنے سوز کو بھول جا فردا کو اور امروز کو

کیونکہ یہی سوز مضرابِ سازِ زندگی ہے؛ اسی سے بزمِ کائنات روشن ہے؛ دل اسی کی بدولت حرارت آشنا ہے، سارے جہاں کی تخلیق اسی کے تحت ہے؛ اسی سے سعیِ مسلسل جاری رہتی ہے، اور انسان کی کامرانی اور نشاطِ جاوداں کا راز اسی میں مضمر ہے:

میکشانِ درد کا ساقی ہے سوز حسن فانی ہے، مگر باقی ہے سوز

اس نظم کو تمثیلی نظم کہہ سکتے ہیں۔ پھول کے پیکر کو سامنے رکھ کر شاعر نے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں۔ اور انسان کو عشق کی نظر پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ کیونکہ تسخیرِ کائنات کے لیے عشق ضروری ہے اور تسخیرِ کائنات انسان کا منصبِ جلیلہ ہے۔

اسی طرح حسن سے متعلق اہم اور موثر نظم "صبح کا ستارہ" بھی ہے۔ قطرۂ شبنم صبح کے ستارے سے سوال کرتا ہے کہ تو ہستیِ شب کے لیے پیامِ اجل ہے اور تیرے وجود سے دوسرے ستاروں کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

ستارے کا جواب مدلل اور موثر ہے، وہ کہتا ہے:

میں دیکھتا ہوں کہ انجام شب کا کیا ہوگا
مآل عشرت و عیش و طرب کا کیا ہوگا
پیام دیتا ہوں خطرے کا دہر والوں کو
پھر اپنی نذر حسین صبح کے اجالوں کو

ضیا نے فن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے کیونکہ وہ بھی اقبال کی طرح خونِ جگر کے بغیر نقش کو ناتمام اور نغمے کو سودائے خام سمجھتے ہیں۔ انھوں نے فن کی جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھا ہے مگر وہ افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کر دیتے۔ جہاں ضرورت پڑی ہے، انھوں نے افادیت کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے؛ قوم میں بیداری پیدا کرنے کے لیے خطابی شاعری بھی کی ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ جوش کے لہجے والی گھن گرج یہاں نہیں ملتی، بلکہ ان کے یہاں دھیمی دھیمی آنچ ہے، جو دلوں کو پگھلا سکتی ہے، توڑ پھوڑ اور طوفان بن کر آگے بڑھنے والا جذبہ نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ رجحان ان کی حسن پرست طبیعت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

ضیا کی شاعری میں وہ تمام رجحانات اور میلانات، جو ملک میں جاری اور ساری رہے، پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جدید لہریں کروٹیں لیتی ہیں، مگر روایت کے احترام کے ساتھ۔ ان کے کلام میں بغاوت کی چنگاریاں ہیں، مگر تخریبی روش سے ہٹ کر اور جدت اور تازگی لیے ہوئے۔

ضیا خود اپنے مقام اور مقصد سے آشنا ہیں۔ اس کی وضاحت انھوں نے آج سے کوئی چالیس سال پہلے اپنی ایک نظم میں کی تھی۔ ان کے نزدیک شاعر کا نام لوحِ زندگی پر درخشندہ ہے۔ تخیل سے کام لے کر وہ زندگی میں مسکراہٹیں بکھیر دیتا ہے۔ اس کی طبیعت کی روانی دریاؤں کی روانی کو مات کرتی ہے۔ وہ اپنی تخییل کی آنکھوں سے خزاں کا انجام دیکھ سکتا ہے، بجلی بن کر سینوں میں آتشِ فروزاں کر سکتا ہے، اور نورِ آفتاب بن کر تاریکی میں اُجالا بکھیر دیتا ہے، جس سے حیاتِ انسانی کا شبستان منوّر ہو جاتا ہے۔ ضیا نے اپنی شاعری میں اس مقصد کو مدِ نظر رکھا ہے۔

راDھاکرشن سہگل

ضیا فتح آبادی : میرا دوست

اگر انسان کے دل و دماغ کی مکمل ترجمانی اس کی زبان کر سکتی، تو خیالات و جذبات کی تمام تر دنیا اس وقت تک شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے صفحۂ کاغذ پر آچکی ہوتی؛ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ انسان روزِ ازل سے سرگرداں و کوشاں ہے کہ کسی طرح وہ ایسا کر سکے، ایسا کرنے کے لیے موزوں الفاظ مہیا کر سکے، ان کا سرمایہ جمع کر سکے، اور ان کی ترتیب و نشست کا کام کر سکے؛ لیکن لگتا ہے کہ اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ خیالات و جذبات کے سمندر کو چھان کر سطحِ عام پر لانے کے لیے ایک اور سمندر کی ضرورت ہوگی، جو خیالات و جذبات سے بھی زیادہ اتھاہ، عمیق اور وسیع ہو۔ مگر ایسے سمندر کی تخلیق انسانی ذہن کی حدوں سے باہر رہیگی۔ جہاں مجبوری اور معذوری کا یہ عالم ہو، وہاں مجھ ایسے انسان کے لیے ضیا کے سے دوست کی شخصیت بیان کرنے کی غرض سے مناسب الفاظ کا فراہم کرنا، اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا اگر میں اس فریضے سے پوری طرح عہدہ برآ نہ سکوں، تو قارئین مجھے معاف فرمائینگے یہ سمجھ کر کہ میرا یہ اقدام نسیمِ سحری کے اس جھونکے کی طرح ہے، جس کا گزر ابھی ابھی پھولوں سے لدے کسی چمن زار میں ہوا ہو، جو اس کی کچھ نکہت تو لے اپنے سا تھ

اڑا لایا، مگر رنگ نہیں۔ نکہت و رنگ کو یکجا بیان کرنا قلم کی قلمرو کے باہر ہے۔
۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ ایک روز میرے لڑکے جواہر کے ساتھ اس کا ایک دوست ہمارے یہاں آیا، جسے اس نے رویندر رسوئی کہہ کر مجھ سے ملایا۔ بعد میں رویندر اکثر و بیشتر جواہر کے ساتھ آتا رہا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتا چلا کہ رویندر کو اردو علم و ادب سے لگاؤ ہے۔ مجھے بھی اردو شعر و شاعری کا بچپن سے شوق ہے، مگر اپنی دفتری مصروفیات کے باعث میں ایک زمانے تک اس شوق کی پوری پذیرائی نہ کر سکا۔ میں اپنے طور پر شعر کہتا رہا اور کبھی کبھی نجی اور نیم پبلک جلسوں میں پڑھتا اور داد بھی حاصل کرتا رہا۔ ایک روز باتوں باتوں میں کھلا کہ رویندر رسوئی، ضیا فتح آبادی کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ضیا کا کلام اخبارات و رسائل میں اکثر میری نظر سے گزر چکا تھا۔ قدرتاً ان سے ملاقات کی خواہش ذہن و دل میں ابھری۔ مگر یہ خواہش پوری نہیں ۱۹۶۹ء میں ہوئی، جب وہ بمبئی سے تبدیلی کے بعد دلّی تشریف لائے۔
ان سے ایک مرتبہ ملنے کے بعد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ اس وقت اور بھی بڑھ گیا، جب انھوں نے راجوری گارڈن، نئی دلّی میں "بزم سیماب" کی بنا ڈالی اور اس کے ارکانِ انتظامیہ میں مجھے بھی شامل کر لیا۔ ان دنوں میں بزم کا ایڈیشنل سکریٹری ہوں۔ یہ ضیا کی ہردلعزیزی اور ادب نوازی کا ثبوت ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں ہم نے نہ صرف ایک یادگاری تقریب "یومِ سیماب" کی صورت میں منائی، بلکہ ایک ادبی تخلیق بھی بعنوان "شعر اور شاعر" بزم کی اولین پیشکش کی شکل میں شائع کر چکے ہیں۔ ضیا کے قریب آ کر مجھے ان کے کردار اور فن کے سمجھنے اور پرکھنے کے بیشتر مواقع ملے۔
میں نے عام طور پر کسی شخص سے مرعوب ہونا نہیں سیکھا۔ اسی لیے مجھے ضیا ایسے مشہور و معروف فنکار سے ملنے میں کچھ تامل ضرور تھا۔ مگر ان سے پہلی ہی ملاقات میں گویا تمام حجابات اٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوا، جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے کو بخوبی جانتے پہچانتے ہیں۔ ضیا اکثر کہتے ہیں اور یہ ہے بھی ایک آفاقی حقیقت کہ فنکار دل

ہیں ایک طرح کا روحانی رشتہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، وہ ایک دوسرے سے کبھی ملیں یا نہ ملیں، وہ ایک دوسرے سے واقف ضرور ہیں۔ ضیا کی شخصیت اور ذہانت اور ان کے حسنِ سلوک اور ان کے علمِ شعری گہرائی سے میں اس حد تک متاثر ہوا کہ میں ان کو استاد سمجھنے لگا۔ بیشک عمر میں وہ دو چار برس مجھ سے چھوٹے ہیں، لیکن شاعری میں انھوں نے جو مقام حاصل کر لیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے بعد میں ان کا شاگرد بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب میں نے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، تو یہ جان کر مجھے اچنبھا ہوا کہ وہ نہ استاد بنتے ہیں، نہ کسی کو شاگرد بناتے ہیں۔ ضیا صاحب کہنے لگے کہ استاد بننے کی جو روایتی صفات ہیں، وہ ان میں موجود نہیں۔ سب سے ضروری صفت جس کی طرف انھوں نے اشارا کیا، عروضدانی ہے، لیکن میں اس کا مطلب یہ سمجھ سکا کہ اس سے ان کی مراد "عروضدانی کے لوازمات" سے ہے کیونکہ ایسا تو نہیں کہ وہ عروض سے واقعی نابلد ہوں۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے فارسی آنرز کا امتحان پاس کیا، تو اس کے لیے باقاعدہ عروض کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ ازاں بعد غیر ادبی پیشہ اختیار کر لینے پر انھوں نے اس علم پر کوئی خاص توجہ نہیں کی، اور شعر کہنے میں اپنی موزونِ طبعی ہی کو کافی خیال کیا۔ بہرحال میرے اصرار پر انھوں نے مجھے مشورہ دینا منظور کر لیا، اور میں نے تھوڑے ہی عرصے میں دیکھا کہ ان کی ہدایت اور رہبری میں میرے سوچنے اور شعر کہنے کا ڈھنگ بدلنے لگا ہے۔ اور آج خود مجھے اپنی کامیابی پر حیرت ہوتی ہے۔ ضیا کے نزدیک کوئی ادبی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ شعر مدلّل اور بامقصد ہونا چاہیے، خیال خواہ نیا ہو یا پرانا۔ غور سے دیکھا جائے، تو کوئی خیال کلیتہً نیا ہوتا بھی نہیں۔ ہاں، اگر اندازِ بیان اچھوتا ہو، تو خیال بھی نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ضیا معاملاتی شاعری پر واردتی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اشارے اور کنایے سے شعر کی زیب و زینت میں اضافہ ضرور ہو جاتا ہے، مگر ابہام عیب ہے! الفاظ موزوں اور مناسب ہوں تو شعر کا اثر خود بڑھ جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں اور مجھے ان سے کامل اتفاق

ہے کہ زبان جامد نہیں ہے، نہ کسی کی جاگیر؛ زمانے کے تقاضوں کے مطابق زبان میں ردّ و بدل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ لیکن جان بوجھ کر کوئی زبانی غلطی کرنا ترقی پسندی ہے، نہ جدیدیت پرستی۔ ضیا ادب اور شعر کو ایسے خانوں میں محصور کرنے کے حق میں نہیں جہاں کسی نئے خیال کا گزر نہ ہو سکے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ادب اپنے زمانے کی اپج اور ادیب کی ذہنی اور ادبی کیفیتوں کا آئینہ دار رہے ہے اور وہی ادب ادب کہلانے کا مستحق بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم میر کا غالب سے یا غالب کا داغ سے موازنہ کر کے کوئی حکم لگا سکیں۔ یا علیحدہ علیحدہ اسکول قائم کریں۔ ضیا کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، علم و ادب کے کئی راز مجھ پر منکشف ہوئے اور مجھے اس اعتراف حقیقت میں کوئی باک نہیں کہ ان کی رہبری میں میری شاعری نے چند ہی برس میں وہ ترقی کی ہے جو اس سے پہلے نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا موضوع ضیا کی شاعری یا فن نہیں، بلکہ ان کی شخصیت ہے۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت کو اس کے فکر و فن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کوشش علم نفسیات کی رُو سے تو غلط ہے ہی، شاعر کی ذات سے بھی ناانصافی ہے، اور اسے صحیح طور پر سمجھنے کی راہ میں ایک رکاوٹ بھی ہو سکتا ہے کہ مندرجۂ بالا سطور اسی عقیدے کے زیر اثر لکھی گئی ہوں۔ تاہم ضیا کی شخصیت سے متعلق یہ خاص بات میرے تجربے میں آئی کہ وہ قریب ہوتے ہوئے بھی دور رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے دوست نہیں بنائے یا کوئی ان کا دوست نہیں ہے، بلکہ واقع یہ ہے کہ وہ دوستی اور خلوص کو زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہیں جب ان کا کوئی دوست کسی وجہ سے خفا ہو جاتا ہے یا ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیتا ہے، تو انھیں انتہائی ذہنی اور دلی کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "ایک بار دوست، ہمیشہ دوست" ان کا اصول ہے۔ لیکن سادہ لوح اتنے ہیں کہ بیشتر اوقات نامہربان کو مہربان اور دشمن کو بھی دوست سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کہینگے کہ اس صورت میں وہ قریب آکر دور کیونکر رہ سکتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ وہ دوستوں میں پوری طرح سے گھل مل نہیں جاتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بیتکلفی نہیں برتتے، وضعداری کے قائل ھیں۔

منور لکھنوی نے ضیا سے متعلق ایک بار فرمایا تھا:

ہے مری مانند کچھ اس میں بھی خودداری کی بُو
بندۂ اخلاص کی رہتی ہے اس کو جستجو

اور خود ضیا نے بھی کہا ہے:

کون ضیا سے ملنے جائے کم آمیزی ہے اس کی خو

نظر تاً وہ گھر گھسنے آدمی ہیں۔ جب تک ملازم رہے، گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر ان کا معمول رہا۔ اب ریٹائر ہو جانے کے بعد صرف "گھر" رہ گیا ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ معالجین کے مشورے اور دوستوں کے اصرار پر صبح کی سیر شروع کی تھی، لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔ دن شطرنج اور شام ٹیلی وژن کی نذر ہو جاتی ہے، یا پھر ہر وقت کسی عزیز اہلِ سخن کو مشورۂ سخن دینے کے لیے تیار ہیں۔
استغنا و بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اپنی ۶۵ سالہ زندگی میں یہ چیز بہت کم دوستوں میں دیکھنے کو ملی ہے۔ پسِ پشت کسی کی برائی نہیں کرتے، چغلی سننا پسند نہیں کرتے۔
ضیا مہمان نوازی اور رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ جس خلوص اور عقیدت سے شریمتی ضیا اور ان کے لڑکے رویندر اور گھر کے دوسرے افراد مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، اس کی مثال آپ کو آج کی بدلتی قدروں کے زمانے میں بہت کم ملیگی۔ اس پر ضیا کا ایک شعر یاد آ گیا:

آؤ تو ذرا یہ پوچھ ہی لیں، ہر روز بدلتی قدروں سے
انساں نہ ملیگا جب کوئی، وہ عالمِ انساں کیا ہوگا!

گھر کا تمام کام کاج شریمتی ضیا کے ذمّے ہے، یہاں تک کے ضیا کے ملبوس کا انتظام و اہتمام بھی وہی کرتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کبھی دخل نہیں دیا، ان کا مستقبل بنانے کی فکر بھی نہیں کی۔ کہنے کو تو کہتے ہیں کہ تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے، مگر تقدیر ہی پر پورا وشواش رکھتے ہیں، شاید یہ علم جیوتش میں دسترس اور یقین کے باعث ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ میں جیوتش کا قائل نہیں، اس لیے اس مضمون پر

ہمارا کم ہی تبادلہ خیالات ہوتا ہے۔ ضیا اپنے خیالات یا عقیدہ کسی پر تھوپنا نہیں جانتے۔ طبیعت میں آرام طلبی کو زیادہ دخل ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی بیشتر لیٹ کر کرتے ہیں۔ آج کل علامہ سیماب پر کام کر رہے ہیں۔ استاد کے لیے دل میں بے پناہ عقیدت ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ سیماب کے ادب نواز اور باصلاحیت تلامذہ اور لواحقین میں سے کسی نے سیماب کے ادھورے کاموں کے پورا کرنے میں مناسب دلچسپی نہیں لی۔

ادھر دو چار برس سے ضیا کی بینائی کمزور ہوگئی ہے؛ وہ اچھی طرح لکھ پڑھ نہیں سکتے مگر ڈاکٹر کو آنکھیں دکھا کر نئی عینک بنوانے کی نوبت نہیں آتی۔ دنیا کو بھی آنکھیں کم ہی دکھاتے ہیں؛ ایک مرتبہ تیس میں ضرور اتفاق ہوا تھا ایک منچلے نوجوان کو انھیں آنکھیں دکھانے کا؛ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا کہ کس جرأت اور حوصلے سے وہ اس سے الجھ گئے تھے۔

کھانسی اور نزلہ کا زور جب حد سے بڑھ جاتا ہے، تو انھیں زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ ورنہ جو دوا شریمتی ضیا دے دیں، وہی استعمال کر لیتے ہیں۔ خود عمر بھر شراب اور سگریٹ کو منھ نہیں لگایا، اس کے باوجود ان نعمتوں کے دلدادوں سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک برائی اور بھلائی کے معنی کچھ اور ہیں؛ خوراک میں بعض دالیں اور ترکاریاں اور دہی کھاتے ہیں؛ پھلوں میں آم اور خربوزے کے بیحد شوقین ہیں؛ مٹر اور آلو بھی پسند کرتے ہیں، مرچ، بینگن اور لوکی سے نہ جانے کیوں نفرت ہے؛ حتی الامکان کھانا وقت پر کھانے کے عادی ہیں۔ چائے دن بھر پیتے رہتے ہیں؛ چائے نوشی گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے لیکن وہ چائے کے غلام نہیں؛ نہ ملے، تو ان کے سر میں درد نہیں ہوتا، نہ جسم ہی ٹوٹنے لگتا ہے لیکن مل جائے تو کیا بات ہے پیالی کو ہونٹوں سے اس طرح لگاتے ہیں گویا برسوں کے بچھڑے ملے ہوں۔

تمام عمر روپیہ کمایا۔ ان کی زندگی ریزرو بنک میں گزری ہے۔ ریزرو بنک کی

روایت کے مطابق دیانتداری ان کی فطرت کا اہم جزو بن گئی۔ اپنے ڈالر کے پاس بھی انھوں نے لاکھوں دیکھے۔ لیکن ان میں سے انھیں کچھ نہ ملا۔ اگر وہ چاہتے، تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے استغنا سے کام لیا۔ وہ اپنی ذاتی استعداد سے بنک میں اسسٹنٹ چیف آفیسر کے عہدے تک پہنچے اور جب ریٹائر ہوئے، تو ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔ انھوں نے اپنی کمائی سے سہ منزلہ مکان تعمیر کیا اور زندگی کو آسودہ بنایا۔ ایسا نہیں کہ انھیں زمانے کی نامساعدت سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ لیکن انھوں نے اپنی تکالیف کی تشہیر نہیں کی ! وہ شور مچانا نہیں جانتے۔

مجھے معلوم ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب ان کے صاحبزادے رویندر سوری گوناگوں مصائب کا شکار تھے، تو انھوں نے اپنی تکالیف کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کیا، گویا وہ غم کی "شیرینی" سے تنہا ہی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

ضیا کی ایک بری عادت کی طرف اشارہ کر کے میں اس مضمون کو ختم کروں گا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی ضیا بحث میں کھو جاتے ہیں، تو وہ دوسروں کو اظہارِ خیال کا موقع بہت کم دیتے ہیں، بس اپنی کہے جاتے ہیں۔ شاید وہ اسے بری عادت نہ سمجھتے ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں۔ میرا ایک شعر ہے :

روئے جاناں پہ تل اگر ہے، تو کیا !
چاند میں بھی تو داغ ہوتا ہے

رفعت سروش

تصویر کی تلاش

میری تصویر
مری نظم کا عنوان عجیب
آپ یہ نظم سنیں گے، تو پریشاں ہونگے
کیونکہ یہ نظم تو ہے
نظم کا موضوع بھی ہے
لیکن اس نظم کے فنکار کی ـــــ یعنی میری
دستِ نقاش نے کھینچی ہی نہیں
کوئی تصویر ہنوز
میں نہیں ہونگا جب اس دنیا میں
میری اس نظم کو پڑھ کر احباب،
کسی فردوسِ تخیل میں پہنچ جائینگے
اور صد رنگ تصور کی قلمکاری سے
اپنے اس صفحۂ دل پر کوئی
میری تصویر بنا ہی لینگے

میری تصویر مری نظم کے ہر لفظ میں ہے۔
مجھے اس نظم کے خالق کی تصویر کی تلاش ہے، ہرچند کہ میں نہ نقاد، نہ قلمکار۔ میں تو ایک حسن پرست ہوں، اور حسن کی تلاش ہی میں فردوسِ تخیل میں پہنچنا چاہتا ہوں۔
اس تصویر کی تلاش مجھے ماضی کے نہاخانوں میں لے جاتی ہے اور اس شاعر کے تخیل کے سہارے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔
ہندستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ آزادی کی جدوجہد جاری ہے ملک میں بےچینی اور بغاوت کے آثار ہیں۔ چھوٹے بڑے سب حب الوطنی کے نشے میں سرشار ہیں۔ اس نشے میں سرشار صحافی، شاعر، افسانہ نگار، ہر قلمکار آزادی کی تصویر بناتا ہے، اور اپنے اپنے تخیل کے رنگ اس خیالی تصویر میں بھرتا ہے۔ ملک انقلاب کے لیے تیار ہے۔ راوی کے کنارے مکمل آزادی کی قرارداد منظور ہو چکی ہے۔ راوی کی فضاؤں سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہنے والے شاعر کے نغمے بلند ہو کر ملک بھر میں گونج رہے ہیں، اور یوں شاعرِ مشرق کی صدائے بازگشت ہندستان کے کونے کونے میں سنائی دے رہی ہے۔ ہر نیا شاعر اس کی آواز میں آواز ملانا چاہتا، اس کے رنگ میں شعر کہنے کو طرۂ امتیاز سمجھتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اس کے الفاظ کی لے سے لے تو نہیں ملائی، تاہم اس کے جذبِ دروں کو اپنا کر ایک الگ لہجہ اختیار کر لیا؛ یوں چراغ سے چراغ جلنے لگے۔
میر انیس کی سرزمین سے ایک اولوالعزم شاعر کمالِ جوش سے نغمے الاپتا ہوا سربلند ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے افقِ شاعری پر چھا جاتا ہے۔ تاج محل کی روپہلی چھاؤں سے نغمگی لے کر ایک شخص سیماب صفت محفلِ شعر میں آتا ہے اور اپنے نغموں کا جادو جگا دیتا ہے۔
اور اس میخانۂ نظم میں اقبال اور جوش اور سیماب حب الوطنی کی صہبا چھلکاتے ہیں۔ اسی سہ رنگ صہبائے نظم کا رنگ اول اول اس شاعر کی تصویر کے پسِ منظر

میں ملتا ہے جس کی تصویر کی مجھے تلاش ہے اور میں "نورِ مشرق" کی مشعل لے کر اس کے خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بیس بائیس سال کا یہ نوجوان ضیا فتح آبادی کس جرأت سے اور کس قوت اعتماد سے کائنات کو پکارتا ہے:

اے زمیں! اے آسماں! اے زندگی! اے کائنات!
اے ہوا! اے موجِ دریا! اے نشاطِ بے ثبات!
اے پہاڑوں کی بلندی! اے سرودِ آبشار!
اے گھٹا جھومی ہوئی! اے نغمہ برلب جوئبار!

اور اسی طرح وہ کائنات کی ہر شے کو پکارتا ہے اور آخیر میں کہتا ہے:

اے خمارِ بادۂ دولت میں بیہوش و حواس!
اے کہ تم سے ذرّہ ذرہ زندگی کا ہے اداس!
بے نیازِ مستی ہر جام و سبو کر دو مجھے
اپنے کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے
میں تمہارا بن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں
دل سے وہ نغمے اٹھیں، جن کے لیے شاعر بنوں

آخری شعر مجھے چونکا دیتا ہے کیونکہ اس نوخیز نوجوان نے کائنات کے حسن اور دولت کے نشے میں سرشار لوگوں کو، جن کے وجود سے دنیا اداس ہے، ایک ہی انداز سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ نہیں، شاید وہ بیخیالی میں کہہ گیا ہے:

میں تمہارا بن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں

وہ ان دولت پرستوں کا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ابھی اس کی تصویر ادھوری ہے، خیال ناپختہ ہے، اور میں ورق گردانی کرتا ہوں:

مژدہ، اے دل! پھر گلستاں میں بہار آنے کو ہے
از سرِ نو لالہ و گل پہ نکھار آنے کو ہے

انقلابی صور پھونکا جارہا ہے دھر میں
غم زدہ دل کو عشرتِ غم سازگار آنے کو ہے
چاندنی سوئی ہوئی ہے وادیِ گلپوش میں
کوہ سے گاتا ہوا اک آبشار آنے کو ہے

جب شاعر یہ مژدہ سناتا ہے، تو نوجوان انقلابی کی تصویر ابھر آتی ہے۔
۱۹۳۶ء کی یہ نظم یاد دلاتی ہے کہ اسی سال ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی اور اس سے شاعری کی تصویر کا دھندلا سا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ اگرچہ وہ ترقی پسند مصنفین کا رکن نہیں؛ مگر عین جوانی میں اس تحریک کی روح سے اپنے ذہن کو بچانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں۔

پھر کہیں بہار، کہیں بسنت، کہیں کہسار، کہیں ابرِ بہار کی منظر کشی، کبھی مطربہ سے گفتگو، کبھی کسی کی شوخ تصویر سے باتیں، کہیں وہ اپنی تلاش میں آیینے کے سامنے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ کہیں کسی مغرور کو نہایت شوخی اور بانکپن سے دعوتِ نظر دیتا ہے:

سحر کے آفتاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
لطافتِ گلاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
حیاتِ کامیاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم

میری طرف بھی دیکھ لو

مگر میں یہ رنگِ سخن دیکھ کر مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان شعروں میں مجھے شاعر کی وہ سچی تصویر نہیں ملی، جس کے خد و خال کی تلاش میں، میں نے اپنا ذہنی سفر شروع کیا ہے۔ ہاں، شاعر کے ذہن کا ایک ہلکا سا پرتو ان اشعار میں ملتا ہے، جو وہ اپنے محبوب شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وہ عندلیبِ خزاں دیدہ نگاہ ہے شاعر　　قضا بہار کے نغموں سے جس کے ہے مسحور
زمانہ میں جس کے زبانِ کلیم ہے گویا　　ہے جس کے سینے میں روشن چراغِ محفلِ طور

اور

مثالِ بانگِ درا رازدارِ منزل ہے
ہے ایک ذرّۂ پامال منزل اس کے حضور
اسی کے گیت کا طاری ہے مجھ پہ کیف و سرور
اسی کے گیت میں پنہاں ہے ہستیِ جمہور

یہ اشعار پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ضیا فتح آبادی اقبال کے مدح خواں ہیں۔ اور ان کے ذہن کی تصویر کا ایک رنگ واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ اقبال ہی کے انداز میں وہ خدا کے مختلف مظاہر سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتے ہیں:

کلی سے یوں کہا بادِ سحر نے تجھے پالا ہے آغوشِ قمر نے

یا

اے گل، نو واردِ اقلیمِ حسن سوز کی لذّت سے تو واقف نہیں
مست تو اپنے ہی رنگ و بو سے ہے حسن کی فطرت سے تو واقف نہیں
خود ہی ساقی، خود ہی میخانہ ہے تو
خود ہی بادہ، خود ہی پیمانہ ہے تو

گلِ نو شگفتہ سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں:

تو ہے اک جامِ شگفتہ چشمِ ظاہر کے لیے اور ابہامِ مجسم قلبِ شاعر کے لیے

یا

ستارہ صبح کا بامِ فلک پہ جب چمکا تو ہمکلام ہوا اس سے قطرہ شبنم کا
کہ تو پیامِ اجل بہرِ ہستیِ شب ہے تری نمود سے لرزاں وجودِ کوکب ہے

یہ مطالعہ اس شاعر کے ذہن کے خوبصورت عکس پیش کرتا ہے جس کی تصویر کی مجھے تلاش ہے۔ میں ایک گونہ مطمئن ہو کر اس نوجوان شاعر سے بہت سی امیدیں وابستہ کرتا ہوں، جو یہ بلند آہنگ نظمیں کہتے وقت چوبیس سال سے زیادہ کا نہیں

کیونکہ "نورِ مشرق" ۱۹۳۷ء میں طبع ہوئی اور ضیا صاحب ۱۹۱۳ء میں عالمِ وجود میں آئے۔ اس مجموعے کی بعض نظمیں تو ۱۹۳۰ء کی تخلیق ہیں۔

میری امیدیں اور مستحکم ہو جاتی ہیں، جب میں "نورِ مشرق" کے دیباچے میں جوش ملیح آبادی کے یہ الفاظ دیکھتا ہوں: "ان کا کلام غزل گوئی کی غیر فطری مسخرگی سے قطعاً پاک ہے" اور ہر وہ شخص جس کا دماغ اس سے زیادہ سن رسیدہ ہو، قابلِ محبت و عقیدت ہوا کرتا ہے۔

اور حکیم آزاد انصاری کا قلم "نورِ مشرق" کی تعریف میں یہ جملہ لکھتا ہے: "اور اس کی اکثر نظمیں بلند تر نظمیں کہلانے کی مستحق ہیں"

لیکن ضیا فتح آبادی کی شاعرانہ شخصیت کی تصویر کے جو خدوخال "نورِ مشرق" کی ضیا پاشیوں سے اجاگر ہوتے ہیں، وہ وقت کے دھندلکے میں گم ہوتے محسوس ہوتے ہیں، یہاں تک کہ "نئی صبح" بھی "نورِ مشرق" کی گرد کو نہیں چھو سکی۔ "نئی صبح" کی تاریخ اشاعت درج نہیں، لیکن مبشر علی صدیقی کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے بعد کی ہے کیونکہ مبشر علی صدیقی نے فروری ۱۹۵۰ء میں شاعر کے سالنامے میں ضیا صاحب کی ایک نظم فنکار دیکھ کر اعجاز صدیقی سے پوچھا ہے کہ یہ ضیا فتح آبادی کون ہیں؟ اور اعجاز صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ سیماب اسکول کے معزز رکن ہیں۔ اور میں ان انکشافات کو عبرتناک سمجھتا ہوں۔ اول، اس لیے کہ "نورِ مشرق" کا شاعر اس قدر جلدی بھلا دیا گیا، تو کیوں؟ دوسرے، اس لیے کہ "نورِ مشرق" کی اشاعت کے وقت بھی ضیا صاحب، سیماب اسکول کے رکن تھے! "نورِ مشرق" میں سیماب مرحوم کے بیٹے منظر صدیقی کا مضمون بھی شامل ہے اور باہمی خط و کتابت کی تاریخ ۱۹۲۹ء لکھی ہے، جب ضیا صرف ۱۶ سال کے ہوں گے، اور سیماب اسکول کے اس رکن کا ۱۹۳۷ء میں قابلِ رشک عروج دیکھیے، اور پھر ۱۹۵۰ء یا اس کے بعد کی مطبوعہ "نئی صبح" کی نظمیں۔ ان میں نہ وہ پروازِ خیال ہے، نہ وہ آہنگ، نہ وہ سوز اور جذبِ دروں:

بہت جا چکی ہے شب تیرہ ساماں اجالوں کے سایے افق پر ہیں رقصاں
وہ تارا، یہی تو ہے تارا سحر کا یقیناً نہیں اس میں دھوکا نظر کا
نہیں دور، اب تو نظر آرہی ہے اٹھو، دوستو! وہ سحر آرہی ہے

میں "نور مشرق" کی نظموں کے بعد ضیا صاحب سے ان اشعار کی بہ نسبت زیادہ رواں دواں اشعار کی توقع کرتا ہوں۔ یا یہ شعر

تدبیر کے ہاتھوں، انساں کی تقدیر بدلنے والی ہے
فنکار بدلنے والا ہے، تصویر بدلنے والی ہے
ذہنوں نے نئی انگڑائی لی، زنجیر جہالت ٹوٹ گئی
لکھنے پڑھنے والوں کی قسم، تحریر بدلنے والی ہے

"نئی صبح" کی نظمیں پڑھ کر مجھے اس تصویر کے لیے اور رنگ نہیں ملتے، جس کے خدوخال ضیا صاحب کی ابتدائی نظموں میں نظر آتے تھے۔ "نئی صبح" میں بقول جوش "غزل کی مسخرگی"، بھی موجود ہے۔ میں غزل کو مسخرگی نہیں سمجھتا۔ اقبال کے یہاں کامیاب غزل کے نمونے موجود ہیں، اور ان کے مخصوص رنگ و آہنگ ہی میں۔

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا!
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا!

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا، مہ کامل نہ بن جائے

اسی طرح غزل کو مسخرگی کہنے والے شاعر جوش کے یہاں بھی ان کے رنگ و آہنگ کی غزل موجود ہے:

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں وہ ستونِ محکم، انھیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری شباب تیرا
سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا   جا، تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

ضیا فتح آبادی نے اپنی نظم "انقلابِ بہار" میں بھرپور اشعار کہے ہیں:

غرق مے ہونے کو ہے کچھ۔ عالمِ امکاں تمام
ساقیِ مخمور سوئے جوئبار آنے کو ہے
گونجتے ہیں سازِ پیمانہ پہ نغماتِ شراب
میکدے کی سمت پھر پرہیزگار آنے کو ہے
پھر نظر کے سامنے ہے جلوہ زارِ روئے دوست
روح کو آرام اور دل کو قرار آنے کو ہے

نظم میں ایسے رواں دواں اور شعریت سے بھرپور اشعار کہنے والا شاعر جب غزل کی وادی میں پہنچتا ہے، تو اس کا رنگ و آہنگ کس قدر بدل جاتا ہے:

انتظارِ دوست کا غم، کھا گئیں کیا!   ہم فریبِ آرزو میں آگئیں کیا!
چٹکیاں لیتی ہے دل میں یادِ یار   اشک اپنی آنکھ میں بھر لائیں کیا!
دن وہی ہیں، اور راتیں بھی وہی   ہم دلِ مایوس کو بہلائیں کیا!
تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی   زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی جاتی رہی

ان سے ہم، اور ہم سے وہ، کچھ اس طرح گھل مل گئے
وہ ملاقاتوں میں سب بیگانگی جاتی رہی

ضیا فتح آبادی کی بیشتر غزلوں میں مجھے اس تصویر کے خدوخال نہیں ملتے جس کی تلاش میں، میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

مجموعی طور پہ یہ احساس ہوتا ہے کہ "نئی صبح"، ضیا فتح آبادی کا ایک دھندلا سا نقش پا ہے اور اس امر کا ثبوت کہ انھوں نے شانہ [illegible] سے بہر طور عہدِ وفا نبھایا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبۂ سخن سے کہہ رہے ہیں:

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن میں ابھی نہیں تھکا ہوں اور اس تصویر کی تلاش میں ہوں، جس کے خدوخال کہیں نہ کہیں ضیا کی نظموں میں ضرور ملینگے۔

"نور مشرق" کی وادی سے نکل کر اور "نئی صبح" سے کسی قدر مایوس ہو کر میں اس تصویر کی تلاش میں پھر سرگرداں ہوں۔

آزادی کے بعد زندگی کی رفتار بدلی۔ اس کی اقدار بدلیں۔ اور غیر محسوس طور پر فکر و نظر کے پیمانے بھی بدل گئے۔ زندگی گانوؤں اور قصبوں سے نکل کر شہروں اور کھیتوں سے نکل کر ملوں اور کارخانوں میں آگئی۔ پُرسکون شاموں کی خوش گپیوں کو مشینی دور کے ہنگاموں نے نگل لیا۔ پھر کہاں الفاظ کے نگینے تراشنے کا ہوش اور کہاں کا محفل آرائی کا یارا! اب تو شہری زندگی کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ بیربط لفظوں اور بے ردیف و قافیہ معری نظموں ہی میں زندگی کی تصویر نظر آجائے، تو غنیمت جانیے۔

اور اب مجھے آہستہ آہستہ ضیا کی نئی تصویر کے خد و خال نظر آنے لگے ہیں:

یہ رسوم اور روایات کی زنجیر و قیود
نام والوں کی یہ بیکار سی اک فکرِ نمود
وسعتِ عشق ہے اس دور میں کتنی محدود!

اس دور میں وسعتِ عشق محدود ہے۔ مگر زندگی کے مسائل لامحدود ہیں اور ضیا کی پریشان حال تصویر اپنی ترچھی لکیروں سے تشکیل پا رہی ہے؛ زندگی نے انہیں بے خانماں کر دیا ہے:

اے دیارِ حسن شہرِ آرزو و دلّی اسلام — تیری گلیاں چھوڑ کر سوے دکن جاتا ہوں میں
رہگذارِ زندگی میں آگیا ہے وہ مقام — اک مسرت کھو رہا ہوں، اک خوشی پاتا ہوں میں

اور وہ دکن جا کر مدراس کے سمندر کی لہروں سے الجھنے لگتا ہے؛ اور ان طوفان خیز ہواؤں سے اس کے اندر کا سویا ہوا شاعر جاگ اٹھتا ہے۔ کرب زندگی کی کتنی

خوبصورت تصویر ہے:

چلا آیا ہوں میں مدراس قسمت کے اشارے پر
کھڑا ہوں ایک طوفانی سمندر کے کنارے پر
یہ ہیبتناک عظمت آب کی، دیکھی نہیں جاتی
مسلسل کشمکش میں زندگی دیکھی نہیں جاتی
ہواؤں سے سمندر کی رگیں کھنچتی مچلتی ہیں
فلک کو چھو ہی لیںگی اس طرح موجیں اچھلتی ہیں

ہماری اور آپ کی طرح ضیا بھی اس بے ہنگم ہجوم میں ایک گمشدہ سا انسان ہے۔ یہ گمشدگی روایتی نہیں، بلکہ نئی زندگی کی تلخیوں کی سوغات ہے:

سورج کی پہلی ہی کرن نے سارا افسوں توڑ دیا ہے
دن کے ہنگاموں کی لگن میں انساں خود کو بھول گیا ہے

اب وہ عرفانِ ذات کی سرحدوں میں داخل ہوتا جارہا ہے اور اپنے وجود کو آوازوں کے شہر میں تلاش کرتا ہے۔ وہ تو آوازوں کے گنگ شہر سے ڈرتا ہے۔ مگر میرے ذہنی سفر کے لیے یہ شہر نشانِ منزل ہے اس شاعر کی تصویر کے کئی رنگ مجھے یہاں نظر آتے ہیں:

آوازوں کا شہر

سازٹوٹے ہوئے مطرب خاموش
گیت مقتول، تو نغمے بسمل
ٹھمریاں بیٹھی ہیں سر لٹکائے
پائلیں بے حس و حرکت، مظلوم
تھاپ بِن طبلہ وجودِ بےسود
قلقلِ مینا کہیں کھوئی ہوئی
گم فضاؤں میں کھنک جاموں کی۔

نہیں کلیوں کے چٹکنے کی صدا
بلبلیں مہر بلب، محوِ سکوت
چلتی ہے ڈرتی، دبے پانو نسیم
کسی مسجد سے نہیں اٹھتی اذاں
شورِ ناقوس بھی مندر میں نہیں
سیٹیاں، ہارن، بگل چپ سادھے
موٹریں چلنے کی آواز نہیں
حادثے، فتنے، سرافراز نہیں
اور کیا ہے، یہ اگر راز نہیں؟
کوئی بولے، تو میں اس سے پوچھوں
کیا یہی شہر ہے آوازوں کا
مجھے لے آئی ہے تنہائی کہاں!
ایک سنّاٹا ہے طاری ہر سُو
میری آواز ڈراتی ہے مجھے
کھڑکیاں بند پڑی ہیں کب سے
اپنا بیگانہ یہاں کوئی نہیں

کیوں نہ اب خود ہی پکاروں خود کو!
کوئی آواز تو کانوں میں پڑے
یہ مرا شہر ہے آوازوں کا۔

ضیا کی نئی نظموں کی سیر کرتے کرتے کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ایک بوڑھا سورج ہے۔ اور اس احساس کو بھی اس کی تصویر میں سجا لیتا ہوں۔ یوں رفتہ رفتہ تصویر مکمل ہوتی جا رہی ہے:

خلشِ وقت

وقت کی لمبی، ختم نہ ہونے والی ڈگر پر
چلتے چلتے، کھویا کھویا
کرنوں کے روشن گھوڑے پر بیٹھا،
بوڑھا سورج سوچ رہا ہے،
دیکھ رہا ہے
کل کا قطرہ آج ہے دریا
صحرا کا ہر ذرّہ ذرّہ
جوشِ نمو سے تنگیِ داماں کا شاکی ہے؛
پھیل کے، بڑھ کر کوہِ گراں بنتا جاتا ہے
اور یہ بوڑھا سورج کب تک اپنی آگ میں جلتا رہیگا
کب تک ننھے دمکتے تارے اس کی پوجا کرتے رہینگے
کب تک خود سورج نہ بنینگے
بوڑھا سورج سوچ رہا ہے

"بوڑھا سورج" ضیا کی تجربہ کار زندگی کی خوبصورت تصویر کا پُر وقار نام ہے۔ جب اس نے اس سورج کے گرد عمر کے ساٹھ جگمگاتے ستارے سجائے، تو یہ خوبصورت نظم تخلیق کی:

جھلمل جگمگ ساٹھ ستارے
توڑ کے گردوں کی ٹہنی سے۔
میں نے سجائے
آنگن کی دیوار پہ اپنی
طاق کی زینت ساٹھ دیے ہیں۔
یہ نظم اس یقین کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

مجھ کو ابھی زندہ رہنا ہے۔
اپنی ساٹھویں سالگرہ پر اس قدر پُر زور نظم آج کے پر آشوب دور میں وہی کہہ سکتا ہے، جس کا دل غنی ہو، اور جسے سکون اور اطمینان میسّر ہو، پُروقار، چمکدار، بوڑھے سورج کی طرح۔ بوڑھے سورج کے سینے میں ضیا کا اپنا دل دھڑکتا ہے، جب وہ سوچتا ہے:

کب تک ننھے دمکتے تارے
اس کی پوجا کرتے رہینگے!
کب تک خود سورج نہ بنینگے!

تو اس کی آواز جوان ہو جاتی ہے، اور اس کی آنکھ کا تارا سچ مچ سورج بن جاتا ہے اور ضیا سے شادی جیسی خوبصورت نظم کہلواتا ہے۔ وہ نظم جس سے اس تصویر کی تکمیل ہوتی ہے، جس کی تلاش میں، میں نے اپنا ذہنی سفر شروع کیا تھا:

اپنے آنگن میں جو لگایا تھا ایک پودا گلاب کا میں نے
بیس اور نو برس میں وہ بڑھ کر میرے قد کے قریب آپہنچا
روشنی گھر کے گوشے گوشے میں اس کے حسن و جمال کی پھیلی
لے اڑی نکہت اس کی بادِ بہار اور معطر ہوا تمام چمن
رکھ دیا زندگی کا نام چمن

تنویر احمد علوی

ضیا صاحب — ایک تاثر

فتح آبادی سے میں براہِ راست ابھی چند سال پیشتر متعارف ہوا، جب ششی چندر
ب دہلوی مرحوم کے یہاں ایک ادبی محفل میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا
ذہن کے کسی گوشے میں پہلے سے محفوظ تھا اور یہ خیال بھی کہ وہ ایک اچھے شاعر
اور سیماب مرحوم کے دبستانِ فکر سے وابستہ ہیں۔
ان سے ایک دو بار ملنے کا اتفاق ہوا اور بات چیت کا موقع ملا، تو معلوم ہوا کہ
سنجیدہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں، رفتار و گفتار میں ایک خاص سلیقہ
برتتے ہیں، اور خوش ذوقی ان کے ذہن اور زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔ ان کے
لہجے میں ہلکی سی پنجابیت ضرور ہے اور بعض الفاظ کا تلفظ بھی وہ پنجابی انداز سے کرتے
ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی بالکل نستعلیق آدمی ہیں اور زبان کی صحت کا بڑا خیال
رکھتے ہیں۔ اردو سے انھیں غیر معمولی تعلقِ خاطر ہے اور کئی اعتبار سے اردو زبان
ہی ان کا مزاجِ زندگی بن گئی ہے۔ اردو سے ان کا ذہنی رشتہ اور تہذیبی تعلق
ایک اہم ادبی روایت کے تاریخی تسلسل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
پچھلی ایک صدی میں، اردو زبان و ادب کے فروغ میں سرزمینِ پنجاب نے
بیحد اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور محققوں

میں وہ نام بہت ممتاز ہیں، جو پنجاب کے مردم خیز خطّے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ملک کے مختلف علاقوں اور مرکزی شہروں نے اس زبان کی ترقی و توسیع میں حصہ لیا ہے۔ اس میں پچھلی صدی کے ربعِ آخر سے لے کر موجودہ صدی کے ربعِ ثالث تک دلّی اور لکھنؤ جیسے ادبی مرکزوں سے کچھ زیادہ ہی پنجاب بالخصوص شہر لاہور کا حصہ رہا ہے جس نے اردو خدمات کے سلسلے میں ایک بڑے مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اہلِ پنجاب کی طرف سے علمی و ادبی خدمات کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس سلسلۃ الذہب سے بہت سی اہم علمی اور ادبی شخصیتیں وابستہ ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں لسانی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس سے مختلف لسانی گروہوں کی تقسیم اور واضح صورت میں سامنے آگئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا زبان کے ساتھ ذہن بھی بٹ گئے ہیں۔ پنجاب جس کے سر سے بٹوارے کی موجِ خون گزری ہے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی اہلِ پنجاب نے اپنے ادبی رشتوں اور تہذیبی روابط کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ پنجاب میں ہنوز ذولسانیت کا رجحان موجود ہے، اور یہ اس کے تہذیبی خمیر اور لسانی شعور کا حصہ ہے۔

پنجاب کے لوگ اپنے گھروں میں اور آپس کی بات چیت میں بجا طور پر اپنی مادری زبان ہی کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں؛ لیکن تہذیب و ادب سے ان کا لگاؤ اور وسعت، تمدنی دائرے سے وابستگی کے باعث وہ اس چھوٹی وفاداری کو بڑی وفاداری میں بدل دینے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری سرحدی ریاستوں کے مقابلے میں پنجاب کا مزاج یہ ہے کہ وہ پھیلاؤ چاہتا ہے، سکڑنا اور اپنی علاقائی حیثیت میں مگن رہنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لیے دوسری زبانوں سے اپنے ادبی اور تہذیبی تعلق کے معاملے میں پنجاب کے لوگ کچھ زیادہ لچکدار ذہن رکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب والوں نے آکر دہلی کو آباد کیا۔ آج اس کی نئی کالونیاں دراصل پنجابی بولنے والے لوگوں کی آبادیاں ہیں۔ اہلِ پنجاب نے اپنی تعداد اور قوتِ عمل سے دلّی کے انتظامی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کے ساتھ یہاں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی فضا پر بھی اثر ڈالا ہے جس کے نتائج اس عظیم شہر کے مختلف شعبہائے زندگی میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

دلّی میں اردو کی ساکھ بڑی حد تک ان اہلِ پنجاب کی وجہ سے دوبارہ قائم ہوئی اور وہ خلا پُر ہوا، جو دلّی کے مسلمان ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے ترکِ وطن سے پیدا ہو گیا تھا۔

ضیا صاحب کے ذکرِ خیر میں یہ جملۂ معترضہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا، لیکن اس کے بغیر خدمتِ ادب کی اس شعوری کوشش اور لسانی رویہ کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہوگا، جس کے نمایندے ضیا صاحب ہیں۔ ضیا صاحب کی شاعری ایک تاریخی روایت کے تسلسل کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی گیرائیوں کا احساس دلاتی ہے۔ وہ ان متعدد شاعروں، زباندانوں اور فن سے وابستگی رکھنے والوں کے ایک ممتاز نمایندے ہیں، جو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ستایش کی تمنّا اور صلے کی پروا کیے بغیر پُرخلوص اور خاموش طریقے سے اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی کا ایک انفرادی دائرہ ہوتا ہے، جس کی حدود میں رہتے ہوئے وہ کوئی کام یا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔

وہ لوگ بھی قابلِ قدر ہیں، جو ادب یا فن کی خدمت سے پیشہ ورانہ حیثیت میں وابستہ ہیں اور اپنے متعلقہ کام کو نہایت نیک دلی سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن ان سے کچھ زیادہ ہی وجہِ اعتبار ان لوگوں کا خلوص رہا ہے، جو محض تہذیبی رشتوں کی استواری اور فن کی قدرشناسی کے طور پر اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار خدمتِ لوح و قلم کی صورت میں کرتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا محرک وہ تہذیبی شعور ہوتا ہے جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا اور انھیں زبان وادب کی خدمت پر

آمادہ کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تخلیقی جوہر کی فطری طور پر موجودگ
اور اس کی مخلصانہ تربیت ان لوازمات میں سے ہے جن کے بغیر یہ مرحلۂ شوق
طے نہیں ہوتا۔

ضیا صاحب اب اپنی عمر کی ۶۵ ویں منزل میں ہیں، اور ذوقِ شعر گوئی تقریباً
نصف صدی سے ان کا شریکِ سفر ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش
۹ فروری ۱۹۱۳ء کو صبح کے وقت ہوئی۔ نام مہر دین رکھا گیا، جو بعد میں مہرلال
ہوگیا۔ مہر کے معنی سورج کے بھی ہیں اور محبت کے بھی ضیا صاحب کی شخصیت
میں ان دونوں معانی کا پرتو موجود ہے؛ ضیا تخلص بھی اسی معنوی مناسبت کی
طرف اشارہ کر رہا ہے؛ اسے حُسنِ اتفاق بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ان کے خاندان میں دور دور تک ذوقِ شعری کا پتا نہیں ملتا۔ یہ ضروری بھی نہیں
کہ کوئی شخص خاندانی طور پر شاعر ہو، لیکن ان کی تربیت جس ماحول میں ہوئی، اس
میں وہ مخفی اثرات موجود تھے، جنھوں نے ان کے شعورِ شعری کو متاثر کیا۔ انھوں
نے ایک جگہ لکھا ہے:

> یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے ذوقِ شعر کی تربیت و پرورش میں
> میری والدہ شنکر دیوی کی حسّاس طبعی اور نرم دلی کا بہت
> زیادہ دخل ہے۔

ضیا صاحب کے دل کی گرمی، ان کے لہجے کی نرمی اور ان کے گدازِ طبیعت میں،
جو ان کی حسیاتِ شعری کا حصّہ ہیں۔ ان کی والدہ کی حسّاس طبعی اور نرم دلی
کا عنصر مرئی اور غیر مرئی طور پر شریک نظر آتا ہے۔ مزید برآں ان کے والد
کو موسیقی سے گہرا تعلق تھا۔ شاعری اور راگ ودیا میں جو قریبی رشتہ ہے، اس
کا اثر بھی ضیا صاحب کے فنّی شعور نے کم و بیش قبول کیا ہے۔

ان کے والد لالہ منشی رام سونی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے زمانۂ تعلیم میں
شعر گوئی سے دلچسپی لیں اور اس طرح اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔ لیکن طبیعت

کے فطری تقاضوں کو کون قابو میں رکھ سکا ہے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضیا صاحب نوعمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مگر انھوں نے شعر گوئی سے فطری لگاؤ اور اس کی طرف اپنی طبیعت کے قدرتی میلان کے باوصف اپنے سلسلۂ تعلیم کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ موزونیتِ طبع کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں "توازن" کا عنصر بھی فطری طور پر موجود ہے جس کی وجہ سے انھوں نے ایک کے لیے دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہی توازن ان کے یہاں ماضی و موجود اور قدیم و جدید کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے اور اسے خوبصورتی سے نبھانے کی کوشش میں ملتا ہے۔

ان کی سیرت و سوانح کے مطالعے میں اس پہلو کو بھی شاید نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ایسے مختلف مقامات سے وابستہ رہا، جو اپنے اپنے دائرے میں ایک تہذیب اور ایک تاریخ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان سب کو اگر ایک نظر میں دیکھا اور ایک بڑے دائرے میں مرتکز کیا جا سکے تو یہ قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے اور الگ ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

> ملازمت کے سلسلے میں والد کو مختلف مقامات پر جانا پڑا، اور ہم سب ان کے ہمرکاب رہے۔ بچپن سابق ریاست الور (راجستھان) میں گزرا۔ جب میری تعلیم کا آغاز ہوا، تو ہم پشاور پہنچ چکے تھے۔ پشاور چھاؤنی کے خالصہ مڈل اسکول میں دو تین سال پڑھنے کے بعد ہم جیپور (راجستھان) پہنچ گئے۔ یہاں مہاراجا ہائی اسکول سے میں نے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج، امرتسر سے ایف اے کا امتحان پاس کر کے، میں فورمین کرسچین کالج، لاہور میں داخل

ہو گیا، جہاں سے میں نے ۱۹۳۳ء میں (بی اے آنرز فارسی میں)
اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے (انگریزی) کے امتحان پاس کیے۔
ان مرکزوں میں ایک طرف لاہور اور امرتسر ہیں، تو دوسری طرف الور اور جیپور، اور ان سے مختلف پشاور۔ ہندستان کے تہذیبی جغرافیہ کی یہ رنگا رنگی ان کے فکر اور فن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ ضیا صاحب کا شعری مزاج بھی اس دلآویز حقیقت کے خوش آیند اثرات سے کیسے الگ رہ سکتا تھا! انھوں نے فارسی آنرز کے ساتھ انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا؛ اس نے ان کے ذہن اور زندگی میں مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج پیدا کر دیا۔
اسی کے ساتھ وہ ایک سے زیادہ اساتذہ کے حلقۂ سخن سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ وابستگی سچ پوچھیے، تو ان کے تلونِ طبع کی نہیں، اس مضطرب اور متجسس مزاج کی آینہ دار ہے جس کے لیے حالی نے کہا تھا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!

اپنے مختلف اساتذۂ سخن کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

> اردو شعر سے فطری رغبت بچپن ہی میں محسوس ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اصغر علی صاحب جو مجھے گھر پر اردو پڑھانے آتے تھے، شعر بھی کہتے تھے اور رحیا تخلّص کرتے تھے، تو میں نے شعر کہنا انھیں سے سیکھا اور انھوں نے مجھے عطا تخلّص عطا کیا۔ امرتسر منتقل ہو جانے پر میں جناب فرخ امرتسری کا باقاعدہ شاگرد بن گیا اور انھوں نے میرا تخلّص بدل کر ضیا رکھ دیا اور آج تک مجھے دنیائے شعر اسی نام سے جانتی ہے۔ اسی زمانے میں چند غزلیں جناب فیروز طغرائی صاحب کو بھی دکھائیں۔ اتفاق سے شاعر آگرہ کا ایک پرچہ میری نظر سے گزرا، اور ۱۹۳۰ء میں خط کے ذریعے میں اس کے مدیر اعلیٰ علامہ سیماب اکبر آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ مجھے

علامہ مرحوم کے قدموں میں رہنے کی سعادت نہیں ملی اور سلسلۂ اصلاح
بذریعۂ ڈاک جاری رہا، جو فارغ الاصلاح کر دیے جانے کے بعد
بھی ان کی وفات تک نہیں ٹوٹا۔ یہ علامہ مرحوم کا مجھ پر خاص
کرم تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضیا صاحب کو اپنے اساتذہ سے کس قدر عقیدت اور محبت رہی ہے اور آج تک ہے۔ حسرت نے اپنے بارے میں کہا تھا:

طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اس کا اطلاق ضیا صاحب پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے فکری اور فطری رجحان کے تحت جس صاحبِ کمال سے عمر بھر اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے، وہ علامہ سیماب اکبر آبادی ہی ہیں، جو خود اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ علامہ سیماب کا کافی گہرا اثر ضیا صاحب کے ذہن، زبان اور زندگی پر ہے۔ ان کے یہاں شروع سے اخیر تک جو نستعلیق انداز ہے، اس میں ان کی اپنی سلامت روی اور توازن پسندی کے ساتھ اس سلسلۂ تربیت اور دائرۂ فکر و فن کو بھی بہت دخل ہے، جس سے وہ وابستہ رہے ہیں، اور آج بھی یہ رشتہ اسی طرح قائم ہے۔ دلّی میں ضیا صاحب کی قائم کردہ، بزمِ سیماب کے زیرِ انتظام ادبی اور شعری نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ ضیا صاحب نے اپنے استاد کی یاد میں بڑے شاندار مشاعرے بھی کیے ہیں۔

مشاعرے کا تربیتِ اہلِ سخن اور احساسِ تکمیلِ فن سے جو تاریخی رشتہ ہے ضیا صاحب نے کبھی اسے نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ علامہ سیماب بھی شاعری میں فنی اقدار کے احترام کو ضروری سمجھتے تھے، بلکہ اس پر زور دیتے تھے، ان کا سلسلۂ اصلاح اسی وجہ سے جاری تھا، اور ان کی زندگی تک جاری رہا۔ سیماب صاحب زبان کی صحت پر جو دھیان دیتے تھے، اس کے معنی خود ان کی شاعری میں یہ نہیں تھے کہ وہ شعر کو ہر نوع کے روایتی حدود کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں گوناگوں تجربے بھی کیے ہیں اور اچھے تجربے کیے ہیں جنھیں جذبے

کی صداقت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ زبان کا رکھ رکھاؤ زیادہ مدنظر رکھنے کی وجہ سے ان کے یہاں زبانِ شعر میں معمولی انحراف اور جدت بھی ناپسندیدہ تھی۔ ضیا کے یہاں بھی معیارِ شعر گوئی یہی ہے۔ وہ شعر کی عیار گیری اور قدر شناسی میں کبھی زبان و بیان کو دوسرا درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتے اور سچ تو یہ ہے کہ شعر کے آرٹ کو زبان کے آرٹ سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے!

ضیا کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نظمیں بھی ہیں، اور بعض بڑی اچھی نظمیں، جن کے تخلیقی افکار پر کہیں کہیں اقبال کی چھاپ بھی نمایاں طور پر موجود رہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے، اس وقت سبھی اقبال سے متاثر تھے، لیکن اپنی شعوری کوششوں میں ضیا اپنے استاد کی ڈگر سے نہیں ہٹے، انھیں ہٹنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ زبان کے معاملے میں اہلِ پنجاب کی عمومی روش یہ رہی ہے کہ وہ مستند طریقِ ترسیل اور معتبر روایت کی تقلید کو محکِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ بالعموم وہ اہلِ ادب جو خود صاحبِ زبان نہیں ہوتے، یہی روش اختیار کرتے ہیں، اور لغت و قواعد اور اہلِ زبان کی اچھی اور اونچے درجے کی ادبی تخلیقات کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔

آج پنجاب اور ملک کے بہت سے دوسرے علاقوں میں ایسے مراکز کی کمی ہے اور کہیں کہیں بالکل فقدان، جن سے وابستگی کے ساتھ اردو زبان کو سیکھا اور اس کی فکری اور فنی نزاکتوں کو سمجھا جا سکے۔ اب یہ کام ایسے ہی اشخاص و افراد کے ذریعہ سے ممکن ہے، جو اپنی ذات سے ایک انجمن بن سکیں، اور اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بہ نگاہ تربیت اپنے حلقۂ سخن میں شامل کر سکیں۔ بزمِ سیماب کے وسیلے سے جس کی روح و رواں وہ خود ہیں، ضیا صاحب اردو زبان و ادب کی ایسی [illegible] انجام دے رہے ہیں۔ دلّی کی نئی بستیوں میں اردو کا فی الجملہ کوئی

چلن نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کچھ لوگ اس کے جاننے اور کچھ سمجھنے والے مل جائیں، ضیا صاحب کے قائم کردہ مشاعروں میں ایک دو بار جانے کا اتفاق ہوا تو پتا چلا کہ ان ادبی نشستوں کے ذریعے کس طرح اردو کا چرچا ہوتا ہے۔ ان محفلوں میں شریک ہونے والے کس طرح اردو کے لب و لہجہ، اس کے طرزِ سخن، اور شعری روایات سے واقف ہوتے ہیں اور اس کلچر سے شعوری یا نیم شعوری طور پر وابستگی اور ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، پچھلی چند صدیوں میں اردو جس کی ایک علامت بن کر ابھری ہے۔

ضیا صاحب کا شعورِ زیست اور سفرِ حیات جن مرحلوں اور منزلوں سے گزرا ہے، اس میں حزم و احتیاط اور نظم و ضبط کو ایک موثر و کارفرما ذہنی رویے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں والہانہ طرزِ اظہار کی مثالیں نسبتاً کم ملتی ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ تہ نشیں سمندر کی لہر کی طرح ابھرتا ہے، لیکن سطح پر اس کا تموج کبھی شور انگیز مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے جذبے کی تہ داریوں سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔

ان کا انداز رومانیت کے مقابلے میں کلاسیکیت سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں ایک نوع کی انتخابیت بھی ہے۔ وہ مختلف اساتذۂ سخن کی شعری زمینوں میں شعر کہتے ہیں؛ یہ مشاعروں کے لیے اختیار کی گئی زمین اور مصرع ہائے طرح پر کہی گئی غزلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اسی رنگ و آہنگ میں شعر کہیں، جو خود صاحبِ طرح کا ہے۔ غالب کی زمینیں انھوں نے بار بار اختیار کی ہیں۔ مگر غالب کی قدر شناسی تو ممکن ہے، ان کے مزاجِ سخن سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہو، وہ اصغر و فانی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اصغر کی سنجیدگیِ ادا اور متانتِ فکر ان کا پسندیدہ ادبی معیار ہے۔ فانی سے انھوں نے احساسِ غم لیا ہے، مگر کبھی اس کی شدت میں نہیں ڈوبے،

بالخصوص مریضانہ غم پسندی سے وہ ارادی طور پر دور رہے ہیں۔
انھیں حالی کی دلسوزی بھی پسند آئی اور جذبۂ خدمت و اصلاح کی سرشاریاں
بھی کچھ وقت کے لیے ان کے حصے میں آئیں مگر نہ وہ مصلح تھے، نہ مبلغ۔ اس راہ
میں حالی کا ساتھ دیتے، تو کتنی دیر تک، اور کتنی دور تک! اسی کے ساتھ ان
کے گیت، سانیٹ، قطعہ، رباعی، نظم اور غزل غرض کہ مختلف مروّج اصنافِ شعر
کے نمونے اور بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس میں مشقِ سخن کو بھی دخل
ہے اور عشقِ سخن کو بھی۔ وہ کبھی جذبات سے مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں، تو بعض
مواقع پر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ ان پر طاری نہیں ہوا بلکہ انھوں نے
جذبے کو اپنے اوپر طاری کرلیا ہے۔ عمر بھر شاعری سے وابستگی کے ساتھ دھوپ
چھاؤں کا یہ سلسلہ یوں ایک قدرتی مظہر کی حیثیت سے سامنے آنا بھی چاہیے۔
شاعری کا معاملہ بھی کچھ عجیب سا ہے، کبھی یہ شعر اچھا لگتا ہے کبھی وہ، کبھی زبان
کا چٹخارا لطف دے جاتا ہے، تو کبھی کوئی خوبصورت تشبیہ اور معنی آفریں اشارہ ذہن
کی سطح پر اپنی پرچھائیاں چھوڑ جاتا ہے؛ کہیں جذبے کی صداقت گہرے طور پر متاثر
کرتی ہے، کہیں تجربے کی صحت؛ کہیں خیال کی گیرائی اور کہیں احساس کی شدت۔
یہی سبب ہے کہ ہر شخص کی شاعری سے اور ہر شعر سے ہمہ وقت لطف نہیں اٹھایا
جاسکتا۔ قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد بھی ہوتا ہے، اور خود آفریدہ بھی۔

زبان کے معاملے میں وہ اساتذۂ قدیم کے پیرو ہیں، اور یہ بھی کلاسیکیت سے ان
کی گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ان کے یہاں مشکل الفاظ بھی اچھی خاصی تعداد میں
ملتے ہیں، اور کہیں کہیں تو اس کے باعث ان کا لہجہ غزلیت کے دائرے سے نکل کر
نظم کے شعری آہنگ سے قریب آجاتا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اس کے لیے
اقبال کی غزلوں میں وجہِ جواز تلاش کی ہو۔ خود ان کے استاد سیماب اکبرآبادی
کے یہاں بھی یہی کیفیت جگہ جگہ ملتی ہے

انھوں نے اپنے مختلف مجموعہ ہائے شعر کے سنینِ اشاعت دینے کا اہتمام تو کیا

ہی ہے، مختلف شعری تخلیقات کے سنین اور وہ مقامات بھی درج کر دیے ہیں جہاں ان کی شعری تشکیل عمل میں آئی۔ یہ بات بعض دوسرے اہلِ سخن کے مجموعوں میں بھی ملتی ہے اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا مجموعہ "دھوپ اور چاندنی" ان کے اپنے خوبصورت اور استادانہ خط میں سامنے آیا ہے۔ بحور و اوزان کے بعض استادانہ تجربے اور ردیف و قوافی کی فنکارانہ نشست کے دلچسپ نمونے ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں نظر آشنا ہوتے ہیں۔ تلاش کے عناصر سے بھی ان کا شعری مزاج بیگانہ نہیں ہے لیکن اس میں انھوں نے ہمیشہ توازن اور خوش آہنگی کو باقی رکھا ہے۔ جو شاعری میں ان کی ثقہ روش اور سلامت روی کی دلیل ہے۔

عشق و تصوّف کی چاشنی سے ان کا کلام آشنا ہے مگر یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو لیے دیے رہے اور کبھی دوسروں کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے دل کے قریب کوئی برقِ بلا کوند رہی ہے حُسن میں ان کے لیے بے پناہ کشش ہے۔ لیکن ان کے لہجے کا دھیما پن اور لفظ و بیان کی سادگی ان کی خودی کو چھپنے نہیں دیتی۔ ایسے لمحوں ہی میں ان کی آواز اپنے اندر سمٹ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم میر کی آواز سن رہے ہیں، مگر یہ آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔ ایک تربیت یافتہ ذوقِ سخن کے بغیر اس لہجہ میں شعر کہنا بھی مشکل ہے اور اس سے لطف اٹھانا بھی آسان نہیں۔

رگِ احساس میں نشتر ٹوٹا ہاتھ سے چھوٹ کے ساغر ٹوٹا
اشک پلکوں سے گرا یوں جیسے خشک ٹہنی سے گلِ تر ٹوٹا

تھا مرا درد آشنا صحرا ہر قدم پر مجھے ملا صحرا
خود بخود ٹوٹتی ہے ہر زنجیر دے رہا ہے مجھے صدا صحرا
نظر آتا ہے اے ضیا! دیکھو دور سے کتنا دلربا صحرا

پیارا سنگھ

ضیا فتح آبادی کی شاعری میں حب الوطنی

ہندستان میں تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوئی تھی حصولِ آزادی کے لیے مختلف انجمنوں نے اپنے تن، من، دھن کی قربانی دے کر طوقِ غلامی اتار پھینکنے کے لیے بیحد جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں فنکاروں نے بھی اپنی نگارشات سے، تخلیقات سے، نغموں سے، ہندستان کی فضا میں ایسی گونج پیدا کی جس سے غیر ملکی حکمرانوں کے کلیجے دہل گئے۔

جہاں ہندستان کی دوسری زبانوں میں اپنے وطن کی محبت کا ادب تخلیق ہوا، اردو ادیب، فنکار، شاعر بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اردو ادب کا نام لیتے ہی جن شاعروں کا نام زبان پر آتا ہے، ان میں جوش ملیح آبادی، سرور جہان آبادی، سیماب اکبر آبادی، چکبست، اقبال اور محروم کے نام پیش پیش ہیں۔ ان شاعروں نے جہاں شاعری کی دوسری صنفوں میں شعر کہے ہیں، وہیں اپنے وطن کے نغمے بھی اتنے پیار سے، اتنی عقیدت سے، اتنے جوش سے الاپے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دل جھوم جھوم جاتے ہیں۔ وہ اقبال کے لفظوں میں خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا اور ہندستان کی مکتی پریت میں سمجھتے ہیں؛ وہ اہلِ چمن کو بار بار متنبّہ کرتے ہیں کہ اگر وہ نہیں سمجھے تو مٹ جائینگے۔ زندگی

تگ و دو میں ہے، دو ڑنے میں اور بیداری میں ہے۔ یہ احساس صرف حب الوطنی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی جذبہ قوموں کی زندگی بدلنے کے لیے سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ بیشک ہندستان میں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن راہِ نجات صرف اسی بات میں مضمر ہے کہ ان میں اتحاد ہو، یکجہتی ہو، باہمی رواداری قائم رہے۔ اس سلسلے میں ضیا فتح آبادی کی کوششیں بھی کسی سے کم نہیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

سب کعبوں سے بڑا کعبۂ وطن ہے۔

ضیا کو اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت ہے۔ اس کے موسم ہوں کہ پھول بوٹے، اس کے شہر ہوں کہ مسجد و مندر، اس کے ہوں کہ ادیب۔ وہ ان سب سے متاثر ہو کر انھوں نے شعر کہے ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی مٹی سے بیحد پیار ہے۔ وہ اپنے وطن کو خراب آباد نہیں کہتے۔ اپنے وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

وقت ہے، اب بھی سنبھل، اے کاروانِ منتشر
حال ماضی سے بھی نازک تر ہے، کچھ تو غور کر
ساغرِ نو میں شرابِ کہنۂ اسلاف بھر
اٹھ قدامت کو مٹا
وضع کر آئین نیا
قومِ خفتہ کو جگا
جگمگا دے نورِ شمعِ عشق سے کون و مکاں
پھر وہی جذبات ہوں ہر قلبِ مردہ میں جواں
اے مرے ہندوستاں
اس طرح کب تک رہیگا تو اسیرِ یاس و غم!
تابکے مل کر نہ بیٹھینگی تری قومیں بہم!

تابکے شیخ و برہمن، تاکجا دیر و حرم!
یہ عداوت تاکجا!
یہ جہالت تاکجا!
بغض و نفرت تاکجا!
اس طرح تو اور بھی بڑھ جائینگی ناکامیاں
اتفاقِ باہمی سے ہے نشاطِ جاوداں
اے مرے ہندوستاں!

ان کا پیغام محبت جہاں تک پہنچ سکتا ہے، وہ اسے وہاں تک پہنچانے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ وہ وطن کو آزاد دیکھنے کے متمنی تھے ہیں۔ یہ نظم انھوں نے دیوبند میں ۱۹۳۳ء میں کہی، جب ملک ہر طرح کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خدا سے بھی مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اگر خدا ہے، تو کیوں نہیں ہے تمام دنیا، وفا کی حامی!
کہیں حکومت ہے مست و سرخوش، تڑپ رہی ہے کہیں غلامی

وہ اپنے وطن کی دیرینہ عظمت کی یاد میں کھو جاتے ہیں اور یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

ہوئی مدت کہ اک تارا فلک پر جگمگاتا تھا
سرور و کیف میں ڈوبے ہوئے نغمے سناتا تھا
بلندی سے شعاعیں پھینکتا تھا اہلِ عالم پر
رموزِ عیش کرتا تھا نمایاں بزمِ ماتم پر
زر و سیم و جواہر دہر والوں میں لٹاتا تھا
نشان تاریکیوں کا نور سے اپنے مٹاتا تھا
کیا کرتا تھا صبح و شام سجدے آفتاب اس کو
دیا کرتا تھا بوسے بزمِ گردوں کا شباب اکثر

ضیا صاحب وطن کو بار بار مخاطب کرکے اور اس کی دیرینہ عظمت کے گن گا گا کر اپنے فن کی جولانی دکھاتے ہیں، لیکن ان کا اصلی مقصد ہندستانی قوم کو جگانا اور اس قوم کے متوالوں کی رگوں میں خون محبت کا دوڑانا ہے۔ ان کی نظم "ہندستانی نوجوان سے" سنیے:

ہیں جواں چہرے پہ کیوں آثارِ ناامیدی عیاں ؟
کیا پسند آئی نہیں تجھ کو بہارِ گلستاں ؟
جلوہ زارِ گل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں؟
نغمۂ بلبل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں؟
کیا رگوں میں ہو گیا ہے منجمد خونِ شباب؟
کیوں نہیں ہے تو جوانی میں بھی مجنونِ شباب؟
سوچتا کیا ہے مآلِ گردشِ شام و سحر
تو زمیں پر ہے، مگر افلاک پر تیری نظر
چشمِ بینا ہے تو کر نظارۂ بزمِ جہاں
یوں جوانی میں نہیں زیبا مآل اندیشیاں
تو نے دیکھے ہیں کہاں اب تک بلند و پستِ دہر
کیا کرے گا اے غلط اندیش! بند و بستِ دہر
تو جواں ہے، مست رہ، دنیا کی کچھ پروا نہ کر
خوف کیسا مشکلوں کا سامنا کر بےخطر
دور ہے منزل ابھی، دشوار راہوں سے گذر
قوتوں سے کام لے، ذوقِ عمل پر رکھ نظر
دے جہاں والوں کو تو بھی زندگانی کا ثبوت
زندگانی کا ثبوت، اپنی جوانی کا ثبوت

یاس و غم کا اپنے چہرے سے اٹھا بھی دے نقاب
جلوہ گر پردوں سے ہو نیرا یہ خورشید شباب
گل تبسم ریز ہیں، سامان رستخیز کر
خونِ گرم زندگی اپنی رگوں میں تیز کر

ضیا صاحب کی حب الوطنی کے جذبات سے بھری نظمیں پڑھ کر سونے اور رونے کو جی نہیں چاہتا، بلکہ بیداری کی کسک سینے میں پیدا ہوتی ہے، با عمل رہنے کا جذبہ ابھرتا ہے، اور حصولِ آزادی کی تمنا من میں سرسراتی ہے:

وہ دیکھو مشرق سے نور ابھرا، لیے ہوئے جلوۂ حقیقت
مجاز کی ترک کر غلامی کہ تو تو ہے بندۂ حقیقت

ان کی حب الوطنی میں تنگ نظری نہیں، وہ آفاقی رنگ میں رنگی ہے۔ وہ انسان دوستی کے پیامبر ہیں اور اسے دنیا کی راحت کا موجب سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

کافر بنا دیا کہ مسلماں بنا دیا
اللہ کا شکر کر تجھے انساں بنا دیا

جب لوگ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی بننے کے بجائے انسان بنتے ہیں، تو انھیں زندگی خوشگوار نظر آتی ہے، اندھیروں کی جگہ روشنی دکھائی دیتی ہے، نفرت کے جذبے محبت میں بدل جاتے ہیں۔ یہی احساسِ بیداری ان کی شاعری کی جان ہے۔ یہی لائحۂ عمل ان کی تگ و دو کا نصب العین ہے۔ جب وہ گوبند وال کو چھوڑ کر لاہور آتے ہیں، تو انھیں اپنا گاؤں یاد آتا ہے؛ لکھتے ہیں:

وطن میں رہنے والوں کو وطن کی قدر و قیمت کیا
جو مہجورِ وطن ہیں، کچھ انھیں ہے اس کا اندازہ
مرے دل کو وطن کی قدر ہے، سن ماجرا میرا
وطن سے دور ہوں لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

نہ دن کو چین حاصل ہے، نہ شب بھر نیند آتی ہے
خزاں مجھ کو رُلاتی ہے، نہ فصلِ گل ہنساتی ہے
وطن کی یاد آ آکر مجھے وحشی بناتی ہے
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

ابھی تک یاد ہے مجھ کو وطن سے جب ہوا رخصت
عزیز و اقربا کی، آہ کیسی غیر تھی حالت
بدل ڈالوں، اگر قابو میں ہو میرے مری قسمت
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

جہاں میں نے سُنا، میرے وطن سے کوئی آیا ہے
وہیں سینے سے اس کو دوڑ کر میں نے لگایا ہے
وہیں بدقسمتی نے روز و شب مجھ کو رُلایا ہے
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

۱۹۴۷ء کے بعد جب آزادی کی دیوی ہندستان میں جلوہ نما ہوتی ہے، تو وہ گلی گلی میں لہراتے ہوئے ترنگے کو دیکھ کر سرمست ہو جاتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

آج ہمالہ کی چوٹی پر
لہراتا ہے جھنڈا سُندر
اُونچا ہے اب اپنا بھی سر
روشن اپنا نام، اپنے جھنڈے کو پرنام

اپنا جھنڈا سب سے پیارا
بھارت کی آنکھوں کا تارا
ہم نے اس پر تن من وارا
ہم کو اس سے کام، اپنے جھنڈے کو پرنام

اس کی جھاڑی میں آزادی
اس کی گود میں سکھ او شادی
آشا کی بگیہ مسکا دی
یہ جیون آرام، اپنے جھنڈے کو پرنام

وہ وطن کے آزاد ہونے پر اتنا خوش ہوئے کہ انھیں آزاد ہند کی دیوالی بہت پیاری لگتی ہے:

رات اندھیری شمعیں روشن — دل مسرور و شاد ہے اپنا
جھلمل جھلمل حال کا درپن — بھارت اب آزاد ہے اپنا
ماضی کا کیوں ذکر کریں ہم
مستقبل کی فکر کریں ہم
آج کی رات ہے کتنی پیاری — جیسے من پر پریم کہانی
دھرتی اور آکاش پہ ساری — مدرا کی سرمست جوانی
لوٹیں آکر لٹ جائیں آؤ
جیون کا سکھ پائیں آؤ

آزادی کے ایک سال میں وہ حصولِ آزادی کے سلسلے میں اپنے ہموطنوں کی قربانیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ہم نے آزادیِ وطن کے لیے — کھو کے سب کچھ ذرا گلہ نہ کیا
آخرکار بڑھتے طوفاں کو — اپنی جانیں گنوا کے روک دیا

وطن سے ان کی محبت جب ترانۂ آزادی بن کر ابھرتی ہے، تو ان کے احساسات جذبات ارمان نغمہ بن کر بکھرتے ہیں:

آزادی کے ہم دیوانے — آزادی کے ہم پروانے
جانیں دے کر بھی ہیں شاد
ہندستان آزاد ہمارا ہندستان آزاد

گاندھی نے وہ راہ دکھائی   منزل خود لینے کو آئی
دشمن آپ ہوئے برباد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد

آزادی کے نغمے گائیں   جگ میں سب کو دھیان لائیں
بھولیں ہم نالے فریاد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد

نفرت کی بنیاد ہلا دیں   پریم کو ہر سینے سے لگا دیں
ایک ہیں اب صید و صیاد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد

گنگا جمنا اور ہمالہ   مسجد مندر اور شوالہ
رہتی دنیا تک آباد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد

آزاد وطن میں جب ۲۶ جنوری آتی ہے، تو ان کا من خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔ وہ اپنی مستی اور دیش باسیوں کی خوشی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

ہر سر میں خود سری ہے   ہر دل میں بیخودی ہے
ہر سو نئی خوشی ہے   ہر سمت روشنی ہے
مسرور زندگی ہے
چھبیس جنوری ہے

اے موسم بہاراں!   اے نکہتِ خراماں!
اے شاخِ گل بداماں   اے طائرِ خوش الحاں!
اک نغمۂ صد عنواں
چھبیس جنوری ہے

دیوار و در ہیں رقصاں   برگ و ثمر ہیں رقصاں

قلب و نظر ہیں رقصاں　　شمس و قمر ہیں رقصاں
شام و سحر ہیں رقصاں
چھبیس جنوری ہے

دل گنگنا رہا ہے　　جھولے جھلا رہا ہے
خوشیاں منا رہا ہے　　شمعیں جلا رہا ہے
ہمت بڑھا رہا ہے
چھبیس جنوری ہے

ہم محرمانِ الفت　　ہیں ناشناسِ نفرت
بھارت ہے ارضِ جنت　　تھا خواب اب ہے حقیقت
پیغامِ عیدِ عشرت
چھبیس جنوری ہے

اے گنگ، اے ہمالہ!　　شبنم ہو یا ہو شعلہ
اب دل میں ہے ارادہ　　اونچا رہے ہمیشہ
ہر حال میں ترنگا
چھبیس جنوری ہے

وہ جہاں وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، وہیں وہ اس پاسبانِ وطن کو بھی یاد رکھتے ہیں، جو سردی ہو یا گرمی، میدان ہو یا پہاڑ، سمندر ہو یا خشکی، دن ہو کہ رات ہر وقت کمربستہ رہ کر وطن کی آزادی، وطن کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے سینہ سپر رہتا ہے۔ وہ ہے محافظِ وطن، دیش کا سپاہی:

سمن کو تجھ پہ ناز ہے　　چمن کو تجھ پہ ناز ہے
وطن کو تجھ پہ ناز ہے　　تیری زمیں تیرا گگن
مرے سپاہیِ وطن
وطن کی آن تجھ سے ہے　　وطن کی شان تجھ سے ہے

وطن مہان تجھ سے ہے مہان تیرا علم و فن

مرے سپاہیِ وطن

وطن سے تجھ کو پیار ہے وطن پہ تو نثار ہے

وطن کا غمگسار ہے نہ فکرِ جاں، نہ فکرِ تن

مرے سپاہیِ وطن

جفا سے تجھ کو دشمنی وفا سے تیری دوستی

شکوہ و شانِ آدمی غرور و نازشِ وطن

مرے سپاہیِ وطن

ہے یارِ غارِ امن تو نگاہدارِ امن تو

نشاط کارِ امن تو سکون نوازِ انجمن

مرے سپاہیِ وطن

اور وطن کے سپاہی کے علاوہ ضیا صاحب نے وطن کے جاں نثار دل کی یاد کو بھی اپنے ہموطنوں کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اپنی نظم "امر پروانہ" میں لکھا ہے:

رات کی ظلمت سے گھبرا کر

ایک دیوانے پروانے نے

خود اپنے ہی سوزِ دروں سے

روشن کر دی شمعِ محفل

پھیلایا ہر سمت اجالا

خوابیدہ دنیا کو جگایا

وقت کے دھارے کا منھ موڑا

دی اندھوں کو چشمِ بینا

گونگوں کو تابِ گویائی

بہروں کے کانوں میں پھونکی

پھر آزادی کی شہنائی
پھر سورج کی پہلی کرن نے
مشرق کے روزن سے جھانکا

دیوانے پروانے نے پھر
خود ہی خود کو آگ لگائی
اپنی جلائی شمع کی لَو پر
جل کر راکھ ہوا دیوانہ

امر ہوا مر کر پروانہ

اور اسی سلسلے میں وہ مہان پُرش مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

موت کو بھی تو نے دیکھا، زندگی کے رُوپ میں
واقعی تو دیوتا تھا، آدمی کے رُوپ میں
کیا برہمن، کیا ہریجن اور کیسی جات پات
ایک ہی منزل کی جانب ہیں رواں گنگ و فرات
تو نے کھادی اور چرخے سے لیا درسِ حیات
یہ وہی محور ہے جس پر گھومتی ہے کائنات

تو نے ثابت کر دیا تدبیر سے تحقیق سے
پھُولتا پھلتا نہیں انسان کبھی تفریق سے

کر دیئے ہموار تو نے کیا نشیب اور کیا فراز
اور مٹایا ہندو و مسلم میں جھوٹا امتیاز
رام دھن کی بانسری میں بھر دیا سوز و گداز
تو ہی تھا دورِ جہالت میں فقط دانائے راز

تیری امیدیں تھیں وابستہ نئے انسان سے
پریم گیتا سے، تو تجھ کو عشق تھا قرآن سے

اب بھی تیرے نام پر آگے بڑھے جاتے ہیں ہم
اب بھی تیرے حوصلوں سے زندگی پاتے ہیں ہم
ہم نے دیکھا ہے تجھے قسمت پہ اتراتے ہیں ہم
آج پھر ایمان تیری ذات پر لاتے ہیں ہم

تو نے جو ہم کو دکھایا روشنی کا راستہ
عہد کرتے ہیں چلیںگے اس پہ ہم صبح و مسا

ضیا صاحب جو کچھ بھی لکھتے ہیں موضوع میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ یہی حب الوطنی انھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ انسان دوستی کے وقار کے نغمے سنائیں۔ "انسان بیدار" میں وہ یوں نغمہ سرا ہیں:

جا رہی ہے تیرگی   چھا گئی ہے روشنی
مسکراتی ہے کلی   ہے فضا نکھری ہوئی
طائرانِ خوش نوا
نغمہ ہائے دلربا
مستیوں کا سلسلہ

گنگناتی ہے حیات   رقص میں ہے کائنات
باخبر ہشیار ہے   آدمی بیدار ہے
رشکِ گردوں ہے زمیں   ہے یہ دورِ بہترین
غم کسی دل میں نہیں   ہمت و عزم و یقیں

رہنما و راہبر
ٹھوکروں بن رہگذر
ختم ہونا ہے سفر
ظلم و استبداد کا   اب زمانہ ہو گیا
باخبر ہشیار ہے   آدمی بیدار ہے

صبح نو آ ہی گئی   نور پھیلا ہی گئی
باغ پر چھا ہی گئی   کیف برسا ہی گئی
پتی پتی اک گلاب
قطرہ قطرہ موجِ آب
ذرّہ ذرّہ آفتاب
راز افشا ہو گیا   خواب سچا ہو گیا
باخبر ہشیار باش   آدمی بیدار ہے

اور وہ انسانیت کا درس دینا ہی اپنا ایمان سمجھتے ہیں:

دو دھرم کو آواز نہ انسان کو پکارو
انسان کی ضرورت ہے اب انسان کو پکارو

آزادی وطن ہو کہ حب وطن، بھارت کی گلی کوچے ہوں کہ تاج محل، وطن کے معمولی باشندے ہوں کہ اس کے قائد چھوٹے سے چھوٹا موضوع بھی ضیا صاحب کو نظم کرنے کے لیے بھڑکاتا ہے۔ اس کو وہ وجدانی کیفیتوں میں کیا کچھ نہیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے خیالات قومی زندگی، یکجہتی، حب الوطنی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ جس قدر خود نیک اور خوش خلق ہیں، اتنی ہی ان کی شاعری ان کے قول و فعل کا آئینہ ہے۔ شدّتِ احساس کے باوجود وہ صراطِ مستقیم سے بھٹکتے نہیں۔ جہاں وہ خود نیک اور سیدھے رستے پر چلنے کے قایل ہیں، وہیں اپنے ہموطنوں کو میل، محبت، خلوص، رواداری و ایثار کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہی وہ جذبات ہیں جو انسان کے دل میں خدمت وطن کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کی نظموں میں جہاں ہندستان کے ماضی کی عظمت کے ترانے چھیڑے ہیں، اب وہ ہمیں اچھے مستقبل کے لیے کمر بستہ ہونے کے لیے کہتے ہیں۔ دیش سے بیکاری، ناداری، نفرت کو دور کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ وطن کے لیے ایثار، قربانی، شہادت دینے والوں سے عقیدت پیدا کرتے ہیں۔ جان نثار وطن کے سپاہی کے ترانے گا کر دلوں میں جذبۂ حرّیت پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے ہموطنوں کی کمزوریوں سے واقف ہیں، وہیں وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہمیں بری باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ نفرت، نفاق سے دور رہنا چاہیے۔ شاعری ایک پیغام ہے، نعرۂ بیداری ہے۔ لیکن ان کا رنگ شاعری اپنے پیشروؤں اور اپنے ہم عصروں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس میں میٹھا میٹھا احساس ہے، شیرینی ہے، جو لذت کام و دہن پیش کرتی ہے۔

سرتاج عالم عابدی

ضیا کے قطعات
اور
رُباعیات

آج سے ۱۴-۱۵ سال پہلے موسم سرما کی ایک خنک شب کو اپنے محبِ صادق ادم پرکاش بجاج کے ہمراہ میں مان نگر نئی دہلی کے ایک سرکاری مکان میں ایک مخصوص ادبی نشست میں شرکت کے لیے گیا۔ وہاں ایک اکہرے جسم کے مجسمۂ اخلاق سے بہ حیثیت میزبان کے ملاقات ہوئی۔ یہ تھی میری جناب ضیا فتح آبادی سے پہلی ملاقات ـــــ اس محفلِ شعر و سخن میں جناب طالب دہلوی، منوّر لکھنوی، خوشتر گرامی، علیم اختر مظفر نگری اور نوجوان شعرا میں جناب شہر یار پرواز۔ ادم پرکاش بجاج وغیرہ شریک تھے۔ پہلا دور کوئی دس بجے تک چلا۔ میری نگاہیں ضیا صاحب پر مرکوز رہیں، جو اپنے مہمان شعرا کے کلام پر کھلے دل سے داد دے رہے تھے۔ معمولی شعر پر اخلاقی مسکراہٹ اور عمدہ شعر پر دلی تعریف۔ اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ ضیا صاحب منصفانہ مزاج کے مالک ہیں انھیں سخن فہمی و نکتہ رسی میں خوب دسترس حاصل ہے۔ اس محفل کے درمیانی وقفے میں ضیا صاحب نے شعرا کے لیے پر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ میز پر گوشت اور ترکاریاں دونوں طرح کے کھانے چنے گئے تھے اور شرکا اپنے اپنے مذاق کے مطابق سیر ہو رہے تھے۔ رات گئے دوسرے دور کا اختتام ہ

اس کے بعد ضیا صاحب کا کلام گاہے بگاہے بیسویں صدی اور دوسرے رسائل میں نظر سے گذرتا رہا اور پھر ۱۹۷۲ء میں راماکرشن پورم کے "حلقۂ تشنگانِ ادب" کی ماہانہ نششتوں میں ان سے تجدیدِ ملاقات ہوتی رہی۔ اب ضیا صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے اور پرکھنے کا ہر ماہ موقع ملتا رہا۔

بس اس مختصر مضمون میں ضیا صاحب کی رباعیات اور قطعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالونگا اور جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، اس کے مطابق اظہارِ خیال کرونگا۔ ضیا صاحب کے تین شعری مجموعوں میں رباعیات اور قطعات، دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ شامل ہیں۔ ان کو اگر تاریخی اعتبار سے ترتیب دیں، تو ذیل کی شکل سامنے آئیگی: -

(الف) طلوع (۱۹۳۴ء)؛ (ب) نئی صبح (۱۹۵۲ء)؛ اور (ج) گردِ راہ (۱۹۶۳ء)

یہ حقیقت ہے کہ عمر کی مناسبت سے تجربات حاصل ہوتے ہیں، اور شاعر کے کلام میں بھی شعور کی یہ پختگی جھلکنے لگتی ہے "طلوع" کی رباعیات اور قطعات کا جائزہ لیا جائے، تو قاری کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ضیا صاحب کی نظر کتنی وسیع ہے۔ ان کی رباعیات میں لطیف احساسات، ہمتِ مردانہ، عزمِ جواں، خودداری، خوداعتمادی، دعوتِ عمل، تصوّف، معرفت اور حسنِ زندگی جیسے اجزا مل جائینگے۔

اب ہم ان کی رباعیوں میں مذکورہ بالا عناصر کی تلاش کرتے ہیں۔ اس رباعی میں احساسِ لطیف جو کسی مہربان اور دردمند دل کا حصّہ ہوتا ہے، کس قدر واضح ہے:

چھٹپٹا وقت، ٹھنڈی ہوا آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خرید لیتی ہے ایسے عالم میں بانسری کی صدا

دعوتِ عمل، بلند حوصلگی اور جرأتِ رندانہ کی مثال ملاحظہ ہو:

ہے مخالف اگر جہاں، پھر کیا تیغ بر سر ہے آسماں، پھر کیا
پانو میرے نہ ڈگمگا ئینگے سخت مشکل ہے امتحاں پھر کیا

کام دیتی نہیں ہے کچھ تقدیر   ساتھ جب تک نہ اس کے ہو تدبیر
ہے مرا تجربہ کہ دونوں میں   ایک پر ہے تو ایک نوکِ تیر

فائدہ کیا تمہارے ڈرنے سے   رات دن آہِ سرد بھرنے سے
ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہو   کچھ نہیں ہوتا کچھ نہ کرنے سے

دست و پا تو ہلائیے حضرت!   کچھ مشقت اٹھائیے حضرت!
وقت باتوں کا اب نہیں باقی   کام کر کے دکھلائیے حضرت

خود اعتمادی اور خودداری کی کیسی جامع تصویر کھینچی ہے:

شمعِ احساس جلتی رہتی ہے   آگ دل میں اُبلتی رہتی ہے
لب پہ آتا نہیں مگر شکوہ   چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے

مفلسی کا گلہ کروں، توبہ!   بے بسی کا گلہ کروں، توبہ!
بیوطن ہوں، وطن سے کوسوں دور   پھر کسی کا گلہ کروں، توبہ!

ذیل کے قطعات میں اعترافِ تخلیقِ یزداں و معرفتِ حق ملاحظہ کیجیے:

ہے انسان مجسم کمالِ الٰہی   امینِ صفات و جلالِ الٰہی
نگاہِ بصیرت سے کر غور، غافل!   تجھی میں چھپا ہے، جمالِ الٰہی

سرسبز ہے گلزارِ جہاں ابرِ کرم سے   ہر پھول یہاں کا ہے حسین باغِ ارم سے
بے جسم بھی، با جسم بھی ہے، تیری تجلی   یہ راز کھلا سیرِ کلیسا و حرم سے

کتنا خوبصورت شاعرانہ استدلال ہے:

دیکھ کر بے نقاب جلوۂ نور   ہو گیا تھا سیاہ دامنِ طور
اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں   ظلمتیں بھی ہیں نور میں مستور

باوجود اپنی تلخیوں اور مصائب کے زندگی میں ایک حُسن ہے جسے ضیا صاحب کی شاعرانہ نگاہ نے پا لیا ہے:

ناامیدی ہے، بیقراری ہے   دن پہاڑ اور رات بھاری ہے
لیکن اس پر بھی لطف یہ ہے ضیا!   زندگی جان سے بھی پیاری ہے

ساحر لدھیانوی نے کیا خوب کہا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا تھا، وہ لوٹا رہا ہوں میں
ایک شاعر اپنے تجربات کو جو آپ بیتی بھی ہوتے ہیں اور جگ بیتی بھی، جن کو نثر ہی شکل میں پڑھا جائے، تو وہ بالکل بے کیف و بے رنگ نظر آئینگے، شعری سانچے میں ڈھال کر طلسمی تاثر دے دیتا ہے۔ ضیا صاحب نے "نئی صبح" میں کبھی جوانی اور وصال و فراق کے نغمے گائے ہیں، کہیں تابعینِ مذہب کی تنگ نظری پر ملامت کی ہے، اور کہیں فرسودہ روایات کی غلامانہ پیروی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔
اب ان موضوعات کو واضح کرنے والی چند رباعیات اور قطعات دیکھیے۔
شباب کے موضوع پر دس رباعیات ہیں۔ ان میں یہ بھی ہیں:

پھولوں کا نکھار، ہے جوانی میری کہسار ہے بہار، ہے جوانی میری
اے بادِ صبا! تیری لطافت کی قسم مستی بکنار، ہے جوانی میری

گلشن میں غزلخواں ہے جوانی میری کہسار پہ رقصاں ہے جوانی میری
ساحل بھی ہوئے ہیں اس کے آگے پامال اک موجۂ طوفاں ہے جوانی میری

ضیا صاحب کی انسانیت نواز نظر کو مذہبی تعصب سخت ناگوار ہے:

اپنے ہیں پرائے، دوستی دھوکا ہے ہر سر میں یہی جنوں، یہی سودا ہے
مذہب ہی وہ کیا جس کی ہو ایسی تعلیم انسان کو انسان سے ڈر لگتا ہے

علامہ اقبال کے انداز میں دعوتِ عمل ملاحظہ ہو:

پھیلا کے نرے حضور باہیں، یا رب! لیتا ہے مقدر کی پناہیں، یا رب!
انسان ابھی تک، ہے جہالت کا شکار دے اس کو بصیرت کی نگاہیں، یا رب!

عرصۂ فراق کو شعرا نے نہایت کریہہ اور جانسوز باندھا ہے۔ ضیا صاحب نے منفرد انداز سے اس کو نظم کیا ہے:

بیخودی میں اسیر رہتا ہوں غم کو شادی سمجھ کے سہتا ہوں
لوگ جس کو فراق کہتے ہیں میں اسی کو وصال کہتا ہوں

اشجار کی شاخوں سے نورِ قمر کے چھن چھن کر آنے کو کیسے دلکش پیرایے میں نظم

کرتے ہیں:

کنجِ خلوت میں، نرم پتّوں سے — چاندنی یوں نکھر کے آتی ہے
جیسے سمٹی ہوئی عروسِ نو — سر سے پا تک سنور کے آتی ہے

ضیا صاحب کی حریت پسند طبیعت روایات کی اسیری قبول نہیں کرتی:

جدھر بھی موڑ دے رُخ وقت کی رفتار، برحق ہے
یہاں بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں، لکیری کی فقیری ہے
مری آوارگی دراصل ہے پیغامِ آزادی
کہ پابندی اصولوں کی بہ اندازِ اسیری ہے

ضیا صاحب نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا ہے۔ گویا انھوں نے کسبِ خیالات و احساسات مشرقی اور مغربی دونوں ادبی سرمایوں سے کیا ہے۔ ان کے کلام میں شیلے کی اڑان اور ورڈس ورتھ کا عشقِ فطرت ہے۔ اگر کیٹس نے بلبل، خزاں اور یونانی کاسۂ خاکستر کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، تو ضیا صاحب نے گردِ راہ میں صبرِ ذاتی، قوتِ عزائمِ انسانی، تسخیرِ نجوم، دیوالی، آزادی، اردو زبان، ساقی، حسن و شراب اور حبِ وطن کے ترانے گائے ہیں۔ دیکھیے، یہ رباعیات کتنی خوبصورت ہیں۔ صبرِ ذاتی کی اس سے بہتر تشریح کیا ہو سکتی ہے! آخری مصرع کتنا فنکارانہ ہے!

سخت اشکوں سے دھونا بھی نہ آیا مجھ کو — دامن کو بھگونا بھی نہ آیا مجھ کو
بیدادِ بہار سہہ گیا ہنستے ہنستے — روتا ہوں کہ رونا بھی نہ آیا مجھ کو

جب انسان سچی لگن سے کسی کام کی تکمیل کا عزم کرتا ہے، تو محالات بھی امکانات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس کا یہی جذبہ اسے کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ رباعی اسی عزمِ صمیم کو آشکار کرتی ہے:

چلتا ہے، تو آندھیوں پہ بن آتی ہے — رکتا ہے تو کائنات رک جاتی ہے
یہ تیرا ہی جذبۂ عمل ہے اے دل! — تدبیر جو تقدیر سے ٹکراتی ہے

تسخیرِ نجوم صرف ایک انسانی خواب تھا لیکن یقینِ محکم اور عملِ پیہم نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر بھی کر دیا اور سطحِ قمر پر انسانی قدموں کے نشان بنے۔ ضیا صاحب نے انسان کے اس جذبے کو سراہا ہے:

سانچے ہیں خلا کے ہم نے گیندیں ڈالیں ۔۔۔ مہر و مہ و انجم پہ کمندیں ڈالیں
دھرتی نے، فلک نے، نور نے، ظلمت نے ۔۔۔ انسان کے ارتقا کی قسمیں کھالیں

تدبیر سے تقدیر بنانے والے ۔۔۔ انسان کو نئے موڑ پہ لانے والے
روندے ہوئے ذرّے در پہ چھپاتی سی نظر ۔۔۔ تاروں کی طرف پاؤں بڑھانے والے

ان کے ہاں دیوالی کے موضوع پر چار رباعیاں ہیں۔ ان میں سے ایک ملاحظہ کیجیے:

ہے فرش سے تا بہ چرخ دیپوں کی قطار ۔۔۔ نکھرا ہوا رنگِ گل ہے، رقصاں ہے بہار
ظلمت کدۂ دل مرا روشن ہو جاتے ۔۔۔ آجاؤ جو دیوالی کا تم بن کے سنگھار

آزادی اور اردو زبان کی تعریف میں بھی چار چار رباعیاں ہیں، جن میں سے دو نقل کرتا ہوں:

میخانۂ ہستی کا سرور آزادی ۔۔۔ انسان کی عظمت کا شعور آزادی
معلوم ہوا، ضیا! یہ ہو کر آزاد ۔۔۔ ہے خوئے غلامی کا غرور آزادی

تابندہ و روشن ہے جبینِ اردو ۔۔۔ خورشیدِ ادب، ماہِ مبینِ اردو
گہوارۂ ارتقائے تہذیب و ادب ۔۔۔ انداز و ادائے دلنشینِ اردو

ضیا صاحب کے کلام کی تفصیلی سیر اور مندرجۂ بالا اقتباسات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ انھوں نے شوکتِ الفاظ کا سہارا نہیں لیا، بلکہ اس میں شدّتِ احساس کی گرمی اور تجربات کی سچائی ملتی ہے اور بقول اقبال:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔۔۔ پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

جس طرح ایک ناول نگار اپنے سامنے کائنات کی ہر شے کو دیکھتا ہے اور کوئی چیز اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ ان اشیا کو مناظر اور کردار دل کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ناول کے لیے مواد مہیا کرتا ہے، اسی طرح ایک شاعر

نہایت باریک بین اور وسیع المشاہدہ ہوتا ہے۔ وہ اشعار کی شکل میں اپنے محسوسات اور تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ ضیا صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو عروج بخشا۔ ان کی رباعیات وقطعات میں عزم انسانی، دعوتِ عمل، آزادی، حسن وعشق، شراب وشباب، ساقی، اردو پرستی، حبِ وطن، خودداری، معرفتِ الہی، فراق ووصال وغیرہ کی مضمون آفرینی ملیگی۔ الفاظ کے دروبست اوران کے محلِ استعمال، خوبصورت تشبیہات اور شاعرانہ استدلال نے ان کے کلام کو بیحد دلکش اور دلنشیں بنا دیا ہے۔

اندر موہن مہتہ

ضیا فتح آبادی میری نظر میں

شری ادم پرکاش بجاج نے باتوں باتوں میں جب ضیا صاحب فتح آبادی کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں ان کے کلام سے متعلق بھولے بسرے تاثرات تازہ ہو گئے اور میں نے اسی وقت ان سے تقاضا کیا کہ وہ مجھے ضیا صاحب کے کلام کے مجموعوں کو فراہم کر دیں

ہندستان کی تقسیم سے پہلے مجھے اکثر ساقی، شاعر اور دوسرے رسالوں میں ضیا صاحب کا کلام پڑھنے اور اس سے محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا۔ مگر اس کے بعد زندگی کی مجبوریوں نے مجھے کچھ ایسی راہوں پر ڈال دیا تھا کہ ادبی حلقوں اور ادیب دوستوں سے میری رسم و راہ یکسر منقطع ہو گئی۔ ایک مدت بعد حسنِ اتفاق سے یہ یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ چند دن ہوئے ایک عزیز نے مجھے ضیا صاحب کے کلام کے تینوں مجموعے "طلوع"، "نورِ مشرق" اور "نئی صبح" لا کر دیئے، جس سے مجھے ضیا صاحب سے متعلق یہ چند سطریں لکھنے کی ترغیب ہوئی۔

میں شاعر ہوں، نہ نقّاد۔ میں تو صرف ضیا صاحب کا ایک نادیدہ مدّاح ہوں۔ ان سے ذاتی طور پر متعارف بھی نہیں البتہ ان کا کلام مجھے پسند ہے۔ ایک شاعر

کی حیثیت سے میرے نزدیک ان کا رتبہ اس لیے بھی بلند ہے کہ انھوں نے نہ صرف انگریزی ادب سے حاصل کردہ تاثرات کو اردو شاعری کے قالب میں ڈھالا، بلکہ انگریزی کی صنفِ سخن سانیٹ میں بھی کامیاب تجربے کیے اور اسے مشرقی جذبات سے مزین کیا۔ اختر شیرانی کے بعد مجھے ضیا ہی کے کلام میں ایسے سانیٹ ملے ہیں، جو فن اور فکر کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں؛ ان کا اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا، اور الفاظ کا انتخاب بہت پیارا ہے۔

ضیا آگرہ سکول سے متعلق ہیں۔ اس لیے فن اور زباندانی ان کی گھٹی میں داخل ہیں۔ اس پر ایف سی کالج، لاہور کی تعلیم نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ غزل ہو یا نظم، رباعی ہو یا قطعہ، گیت ہو یا سانیٹ۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں ادب بھی ہے اور زندگی بھی، فکر کی آزادی بھی ہے اور فن کی پابندی بھی، ادبی روایتوں کا احترام بھی ہے اور زندگی کی نئی قدروں کا احساس بھی۔ وہ وقت کی نبض کو پہچانتے ہیں اور انھیں انسان کی عظمت پر کامل یقین ہے۔ دیکھیے، انھیں جذبات کو تغزل کی چاشنی دے کر کس خوبی سے ادا کیا ہے:

تاروں کو درخشاں دیکھ چکے، ذرّوں کو درخشاں دیکھینگے
اے سوزِ محبّت! ہم تجھ کو ہر شے میں نمایاں دیکھینگے

میرے نزدیک 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زندگی ادب کی محرک ہے، تو ادب زندگی کا آئینہ دار۔ شاعری نام ہے شاعر کے تاثرات اور تجربات کو چاہے ان کا محرک خارجی ہو یا داخلی، موزوں الفاظ میں نظم کرنے کا۔ ضیا صاحب کا کلام اس معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ ان میں جب شعری شعور بیدار ہوا، اس وقت ہندستان غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی جدّوجہد میں مصروف تھا۔ اس سیاسی دور کا احساس ان کی بیشتر نظموں، اور بعض جگہ غزل کے شعروں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ان کی ایک نظم "اے مرے ہندوستاں" وطنیت کے جذبات سے پُر ہے، جس میں وہ صرف عظمتِ دیرینہ ہی کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ وقت کے نئے تقاضوں کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

وقت ہے اب بھی سنبھل اے کاروانِ منتشر!
حال ماضی سے بھی نازک ہے، ذرا تو غور کر
ساغرِ نو میں شرابِ کہنۂ اسلاف بھر
اٹھ قدامت کو مٹا
وضع کر آئین نیا
قومِ خفتہ کو جگا
جگمگا دے نورِ شمعِ عشق سے کون و مکاں
پھر وہی جذبات ہوں ہر قلبِ مردہ میں جواں
اے مرے ہندوستاں!

ضیا صاحب نے جہاں اپنے سیاسی اور سماجی ماحول سے متاثر ہو کر پُر از جذبات نظمیں کہی ہیں، وہیں قدرت کے دلفریب مناظر نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں "بسنت کا ترانہ"، "لو آؤ سیر کو چلیں"، "انقلابِ بہار" اور "بوندوں کا ساز" قدرت کے مناظر اور شاعر کے موڈ کی بہت اچھی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے اسلوبِ بیان میں موسیقی ہے، اور الفاظ میں روانی۔ نمونے کے لیے ان کی رومانی نظم سے ایک بند پیش کرتا ہوں۔ عنوان ہے "دعوتِ نظر":

تمھاری اک نظر کا انتظار مدتوں سے ہے
دلِ الم نصیب بیقرار مدتوں سے ہے
مری نگاہِ شوق اشکبار مدتوں سے ہے
مری طرف بھی دیکھ لو!

آپ نے اندازِ بیان کی شگفتگی اور الفاظ کی موسیقیت ملاحظہ کی۔ شعر پڑھ کے

اسے گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک اور نظم 'روح کا پیمانہ' کا ایک بند پیش کرتا ہوں:

آیا ہوں میں دور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
کیفیت اور نور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
نور وہ، جس سے روشن دل کا کاشانہ ہو جائے
کیف وہ، جس میں ڈوب کے ہستی میخانہ ہو جائے
زیست جسے کہتی ہے دنیا، مستی کا ہے نام
بھر دے میرا جام

اسی نوع کی بہت سی بلند پایہ اور موسیقی ریز نظمیں ضیا صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ "کرشن" میں انھوں نے گیتا کے دقیق فلسفہ کو چند شعروں میں بند کر دیا ہے۔ 'محبت' ان کا بہت پیارا سانیٹ ہے، جس میں انھوں نے ایک وسیع مضمون کو اپنے مختصر اور محبوب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں "ڈیوک آف ونڈسر" اور "گاندھی" بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

انسان ازل سے نیکی اور بدی کی کش مکش میں مبتلا ہے، اور ابد تک رہیگا۔ یہ مضمون بہت پامال ہے، اور ہر دور میں شعرائے کرام نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ضیا صاحب کی وجدانی کیفیت اور اسلوبِ بیان نے جو فضا پیدا کر دی ہے، اس سے اس قطعہ کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے:

اک طرف خارزارِ عصیاں کا
اک طرف باغ دین و ایماں کا
کارگاہِ جہاں میں شام و سحر
امتحاں ہو رہا ہے انساں کا

جہاں نظم میں تفصیل اور تجزیے کا ہونا لازمی ہے، وہیں غزل کی کچھ اپنی خوبیاں ہیں، جن کی آمیزش سے تغزل پیدا ہوتا ہے اور وہ ہیں، اختصارِ بیان اور الفاظ کا

مخصوص لب ولہجہ۔ ضیا صاحب کی غزل میں، جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں،
ام اوصاف موجود ہیں۔ وہ اس صنفِ سخن کے مزاج شناس ہیں۔ غزل کے
یتی مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف مضمون تنگنائے غزل میں باندھے
مگر تغزل کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ آخر میں چند اشعار غزل کے
ہیں:

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے
کوئی مندر، کوئی مسجد، بس، مصروف پرستش ہے
نہیں پایا ابھی تک تیرے بندے نے مقام اپنا
گھر کے آتا ہے، برستا ہے، چلا جاتا ہے ابر
اور پہروں آسمان کو دیکھتا رہتا ہوں میں
غم سے نجات کیا ملے، غم جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے
بسے دل میں آنکھوں سے مستور ہو کر
قریب اور بھی آگئے دور ہو کر

منیر احمد اعظمی

ضیا فتح آبادی کے گیت

گیتوں کی کہانی نئی نہیں؛ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ہر زبان میں گیتوں کی تخلیق؛
ہندی میں تو اس کے موضوع انگنت رہے ہیں، اور ان انگنت موضوعات کو سا
رکھ کر لوک گیتوں کی تخلیق ہوئی۔ یہ وطن کی محبت کے گیت ہوں، یا حق خود ارا
کی مانگ ہو؛ پربھو بھگتی ہو یا فطرت کی پوجا؛ عورت کے من کی پکار ہو یا کسی کو
محبوبہ کا انتظار، دل سے اٹھنے والی آواز ضرور گیت میں ڈھل گئی ہے۔
گیتوں کی کہانی ویدوں سے شروع ہوتی ہے۔ سام وید گیتوں ہی کا مجموعہ ہے۔گیا
کے لفظ کو عام شاعروں نے عورت کے گیتوں تک محدود کر دیا۔ اردو میں ا
حد کو پھاندنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویدک ادب کے بعد بودھ ادب کی جگہ
ان میں بیراگ کے جذبات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔
اردو کے شاعروں کو میرا بائی کے گیتوں نے متاثر کیا؛ انھوں نے اپنی تخلیقات
ان گیتوں کو نمونہ بنایا۔ لیکن ہے یہ کہ میرا کے سامنے بھگوان کرشن کا چتر تھا، چر
تھا۔ ملاحظہ ہو:

میرے تو گردھر گوپال، دوسرا نہ کوئی
جا کے سر مور مکٹ، میرو پتی سوئی

چھاندی کل کی کالی کہاں پھرے کوئی
سنتن ڈھنگ بیٹھ، لوک لاج کھوئی
میں تو سانورے کے رنگ راچی
ساجی سنگار باندھی پگ گھنگھرو لوک لاج تج ناچی
میراں شری گردھر لال سوں بھگتی رسیلی جاچی
ہے ری، میں تو درد دیوانی، مورا درد نہ جانے کوئے
گھائل کی گتی گھائل جانے، کی جن لائی ہوئے
جوہر کی گت جوہری جانے، کی جن جوہر ہوئے
سولی اوپر سیج ہماری، سوؤں کس بدھ ہوئے

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو گیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اردو گیتوں کی ترویج کے سلسلے میں ابوالاثر حفیظ، ساغر، تاثیر، میراجی، اندرجیت شرما، آرزو لکھنوی، قیوم نظر، حفیظ ہوشیار پوری، مجروح سلطانپوری، ضیا فتح آبادی، امرچند قیس، مقبول حسین احمد پوری، وقار انبالوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جدید اردو شعرا میں سب سے پہلے گیت کتابی صورت میں ضیا فتح آبادی نے پیش کیے۔

گیت عورت کے جسم کا اظہار ہے، اس کے دل کی پکار ہے، اور مزاجاً نسوانیت کی روح۔ اردو گیت کاروں کی اکثریت نے یہی نصب العین سامنے رکھ کر گیت رچے ہیں۔

زندگی امید پر قائم ہے۔ یہی امید انسان کو جینے پر اکساتی ہے۔ اگر زندگی ناامیدی کے اندھیروں میں بھٹکتی رہے، تو کسی کو جینے کی تمنا نہ رہے۔ اسی لیے ضیا صاحب فرماتے ہیں:

جیون ساگر ٹھاٹھیں مارے
گھور اندھیرا، دور کنارے
من کی نیا پریم سہارے۔ پیا ملن کی آس سکھی ری، پیا ملن کی آس

کوئی پھول چڑھانے آئی
کوئی گیت سنانے آئی
میں بھی پریم جتانے آئی

پریم ہی میرے پاس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

پریم کی جوت جرے جس من میں
وہ من بھی رہتا ہے تن میں
کوئل کوک رہی ہے بن میں

پھولوں میں ہے باس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

کیونکر روؤں، شور مچاؤں
پریمی منوا کو بہلاؤں
ان کے نینن سے گر جاؤں

مُورکھ ہوت اداس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

عام طور پر گیتوں میں کسی الھڑ عورت کے جذبات ہوتے ہیں، جن میں پختگی کا شائبہ نہ ہوتا۔ 'جس تن لاگے سوئی جانے' والی بات ہے۔ اس کا احساس صرف اسی کو ہے جس کے من پر چوٹ لگتی ہے، اور پھر جذبات خود بخود پکار بن کر ابھرنے لگتے ہیں، سندیسے بن کر پھیلنے لگتے ہیں۔ سندیس لے جانے کو کاگا ہو یا کوئل، بادل ہو یا کوئی سہیلی، یا اختر شیرانی کا ننھا پیامی — عورت اپنا حُسن، اپنی آواز، اپنے جسم کا لوچ اور درد سب کچھ گیت کی مالا میں پرو دیتی ہے، اور پھر انتظار کرنے لگتی۔ اپنے اس پردیسی کا، جو وعدہ کر کے ابھی نہیں لوٹا اور جدائی میں، تنہائی میں پپیہے کہتی ہے:

پی کے گیت، مدھر، من موہن
ان سے اجیارا جگ جیون
یہ ہیں پریم کا سندر درپن
پی کے گیت سنا
پپیہے، پی کے گیت سنا
کس سے کہوں میں من کے دکھڑے!
پی پر دیس میں جا کر بھولے
لیکن میں بھولوں گی کیسے
تو ہی مجھے بتا
پپیہے، پی کے گیت سنا
میں بھی پاپن، تو بھی پا پی
پریم کے ہم دونوں ہیں پجاری
من میں لگی ہے آگ برہ کی
اور اسے بھڑکا
پپیہے، پی کے گیت سنا

طویل مسافت سے گھبرائی ہوئی محبوبہ پپیہے سے التجا کرتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا اس ہجر میں میری مدد نہیں کر سکتا، تو تو ہی آ اور اپنے مدھر سُر میں گیت سنا، اس کے پریم کے، تاکہ من سے پریم کی اگنی بجھنے نہ پائے۔ دونوں ایک ہی بان کے گھائل ہیں، اس لیے دونوں مل کر جدائی کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے ایک دوسرے کے جلیس رہیں۔

ضیا کبھی پریت کرنے کے لیے کہتے ہیں، تو من میں پیار کے اچھے پہلو اجاگر کرتے ہیں، بنجر من میں پریم کے پھول کھلاتے ہیں۔ پھر ان کو خوشبو سے مہکاتے ہیں:

آؤ، ہم تم پریت کریں

پریم ہی جیون جوت ہے، پیارے!
پریم سے روشن چاند ستارے
پریم کو اپنے من میں بسا کر
جیون سپھل کریں
آؤ، ہم تم پریت کریں
ہم ہوں، تم ہو، ہوں پیار کی باتیں
اپنے دن ہوں، اپنی راتیں
جیون کے اس بھید کو پا کر
مرنے سے نہ ڈریں
آؤ، ہم تم پریت کریں
چھائی ہوں گھنگھور گھٹائیں
نیا طوفان میں لے جائیں
سب دنیا کی آنکھ بچا کر
دونوں ڈوب مریں آؤ، ہم تم پریت کریں

اس گیت کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ضیا صاحب کے من میں تذبذب کا عنصر ہے۔ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ پریم کو من میں بسا کر جیون کو کامیاب بنائیں، اور دوسری طرف اس گیت میں جرأت کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اور پھر اتنے کامیاب پریم جیون کو وہ ڈوب کر ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

نفسِ مضمون کے علاوہ گیت کی جان اس کے ترنم میں ہے۔ ضیا کے گیت، موسیقی اور سراپا نگاری کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ اردو شاعری میں اظہارِ محبت کے لیے مردوں کی طرف سے بھی گیت لکھے گئے ہیں جن میں عورت کے حسن و شباب اور ناز و ادا کا ذکر ہے۔ مثلاً مطلبی فرید آبادی نے جنگِ آزادی

کے لیے دیہاتوں میں گیت گائے ہیں۔ عظمت اللہ کے ہاں یہ نسوانی رنگ روپ کی تعریف کے لیے آئے ہیں:

ہائے، وہ صورت پیاری پیاری | بڑی بڑی آنکھیں کالی
چکنے چکنے بال بھی کالے

ستھری ستھری میٹھی میٹھی | بانسری کی سی آواز
نفیس چڑھاؤ، نفیس اتار

سندر صورت، دل میں سمائے | دل کو بھائے دل میں آئے
تجھ بن جگ ہو خالی خالی

قتیل شفائی کے ہاں یہ گیت دھن میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی دھن کا احساس ضیا کے گیتوں میں بھی ملتا ہے:

برکھا میں خوش نر اور ناری
برکھا سب کو من سے پیاری
ڈالی ڈالی، کیاری کیاری

جوبن پر اترائی
سجنی، برکھا کی رت آئی

آم کے پیڑ پہ کوئل بولے
دوار پریم مندر کے کھولے
تو بھی سجنی پریم کی ہو لے

میں بھی ہوں سودائی
سجنی، برکھا کی رت آئی

کہیں مرد کی طرف سے محبت کی یہ دعوت اندھیرے اور بجھے ہوئے من میں پیار کی آگ دوبارہ جلاتی ہے۔ کہیں وہ پکار بن کر اپنے بالم کو پکارتی ہے: "بالم! آبھی جاؤ"۔ کہیں الجھن کا روپ دھارن کر کے وہ کہتے ہیں:

مایا جال میں پھنس کر دنیا بھولی پریم کہانی
الٹی گنگا بہتی ہے، اب اگیانی ہے گیانی
کس سے کہوں میں من کا دکھڑا، کون سنے یہ باتیں!
کون سنے یہ باتیں، سجنی! کون سنے یہ باتیں!

سُندر سپنے دیکھ رہے ہیں سورج چاند ستارے
مست ہیں اپنی اپنی دُھن میں، دھرتی کے متوارے
اپنے اپنے دن ہیں سب کے، اپنی اپنی راتیں
کون سنے یہ باتیں، سجنی! کون سنے یہ باتیں!

ضیا نے گیتوں میں تین نئے موضوع "اوشا"، "جواری" اور "ہنسی" میں اپنائے ہیں، جن سے ان گیتوں میں وسعت پیدا ہوگئی اور موضوعات کی یک رنگی ٹوٹی ہے۔ ضیا صاحب نے عورت کی پکار کی جگہ "انسان کی پکار کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے:

ہنسی

آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا
ہنس کر ہنس کر، دنیا میں جیونگا
پریم کی مُدرا آج پیونگا
آج پیونگا، آج جیونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

میں کیوں روؤں، نیر بہاؤں
آشاؤں میں آگ لگاؤں

رونے کا میں نام نہ لونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

کلیاں کھل کر، پھول بنی ہیں
غم کی باتیں بھول گئی ہیں

میں بھی اپنا دُکھ کھو دونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

موضوع دکھی انسان کو امید کی کرن دکھاتا ہے۔ ایک معمولی پریمی کے روپ میں دکھی انسان ہے۔ درد کا شکار آدمی غالب کا یہ شعر پڑھ پڑھ کر تسکین حاصل کرتا رہا ہے:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ضیا نے اس گیت میں علامتی رنگ میں دکھی انسان کو اپنے دکھوں سے لڑنے کا سبق دیا ہے۔ یہی انداز "جواری" میں ہے۔ "ادشا" میں وہ بند کے ماتوں کو جگاتے ہیں۔ ضیا صاحب کے گیت اردو گیتوں کی ان تمام روایتوں کے حامل ہیں، جن پر اردو شاعری فخر کر سکتی ہے۔ ان میں اختر شیرانی کے گیتوں کی حلاوت ہے، حفیظ جالندھری کے گیتوں کی سپردگی، میراجی کے گیتوں کی جدت اور حسین الفاظ کا انتخاب ہے۔ ان میں رس ہے، لوچ ہے، سادگی ہے، الھڑپن ہے، بے ساختگی ہے۔ ان میں بناوٹ کا شائبہ نہیں۔ یہ دل سے نکلی ہوئی پکار، من کی دُبدا کا اظہار، پورا درد لیے ہوئے ہیں۔

ریوتی سرن شرما

ضیا فتح آبادی کی شاعری

ضیا صاحب سے میری ملاقات حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک مجلس میں ہوئی۔ یہ تقسیمِ ہند کے دنوں کی بات ہے۔ تہذیبی اور ادبی اداروں کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور صاحبِ ذوق حضرات ایک جگہ سے اجڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جو لوگ اس طوفان کی یورش سے بچ گئے تھے، وہ بڑی تندہی سے ادبی سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے نئے اور پرانے اراکین کو یکجا کرتے پھر رہے تھے۔ دلّی کالج میں حلقۂ اربابِ ذوق کی مجلسوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا گیا اور جن چند اصحاب نے اس کے از سرِ نو قیام میں دلچسپی لی، ان میں ضیا صاحب بھی تھے۔ ضیا صاحب باقاعدگی سے ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے مجلس کے پروگراموں کو رنگین بناتے تھے۔ انھیں مجلسوں میں مجھے ان کے کلام سے رُوشناس ہونے کا موقع ملا۔

میں نے ضیا صاحب کے کلام اور ان کی ذات میں ایک خاص مناسبت پائی ہے۔ خیالات اور جذبات کی جو پاکیزگی ان کی شخصیت کا خاصہ ہے، وہی ان کے کلام میں اُتر آئی ہے۔ مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے ان کی شاعری بڑی پاکیزہ ہے، جس کا قارئین پر بڑا صحتمند اثر ہوتا ہے۔ زبان بڑی شستہ

اور پاکیزہ ہے۔ لیکن ان کی زبان میں وہ روکھا پھیکا پن نہیں، جو اکثر پاکیزگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو جذبات میں ڈبو کر موضوع کے مطابق کہیں رنگین اور کہیں پُرشکوہ بنا لیا ہے۔ جب وہ قطعات میں مجلسی واردات بیان کرتے ہیں، تو ان کی زبان میں وہ لوچ اور وہ سوز اور وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو دل پر سیدھا اثر کرتی ہے:

جھٹپٹا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خرید لیتی ہے — ایسے عالم میں، بانسری کی صدا

لیکن جب وہ انسان کو جاگنے کی ترغیب دیتے ہیں، تو ان کے الفاظ میں بجلی جیسی کڑک اور گھن گرج پیدا ہو جاتی ہے:

نظمِ رنگ و بو بدل — بادہ و سُبو بدل
وقت کی پکار سُن — بے درنگ تو بدل
آفتاب آگیا — انقلاب آگیا
اب ہے امتحان جاگ — جاگ، اے انسان جاگ

ضیا صاحب کسی سیاسی پارٹی کے ڈھنڈورچی نہیں۔ پھر بھی انھوں نے انسان کی بیداری، اس کی آزادی، اور اس کی نجات کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ انسان کو بیعمل اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا دیکھ کر ان کا دل رو اٹھتا ہے:

جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے — بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے
موت دنیا پہ دیکھ کر طاری — میں بھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے

لیکن ان کی آواز آنسوؤں میں گھٹ کر نہیں رہ جاتی۔ انھیں اپنے ارادوں کی بلندی اور قوتوں کی بیداری کا احساس ہے۔ اس لیے وہ کہہ اٹھتے ہیں:

بیدار میری سوئی ہوئی قوتیں ہیں آج
رُخ سیلِ حادثاتِ زمانہ کا موڑ دوں

اور بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ ہر اس طاقت سے ٹکر لینے پر تیار ہو جاتے

ہیں، جو انسان کی بیداری اور اس کے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے روکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ انسان تو انسان، خدا سے بھی منحرف ہو جانے کو تیار ہیں:

طوفاں کو اپنے عزم کے ہاتھوں سے دوں شکست
چھوڑا ہے ناخدا کو، خدا کو بھی چھوڑ دوں
آج میں تجھ سے بغاوت پہ اتر آیا ہوں
میرا معبود کوئی ہے، تو ہے لیلائے حیات
میں تجھے آج بھلا ہی دونگا
نام ترا سحر و شام لیا ہے میں نے
میں نے پوجے ہیں بنا کر ترے بت ہائے حسین
تجھ کو نذرانۂ صد ہوش دیا ہے میں نے
میں تجھے آج بھلا ہی دونگا

ضیا کے اشعار میں غمِ جاں کا رونا کم اور غمِ دوراں کا اظہار زیادہ ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ضیا نے شاعری کے دل کو اپنے غم سے نہیں، بلکہ انسانیت کے درد سے دھڑکایا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی شام کو روشن کرنے کی کوشش نہیں کی، انسانیت کی وسیع و عریض محراب کو منوّر کرنے کے لیے اشعار کی کرنیں پھینکی ہیں۔ یہ کرنیں کمزور ہو سکتی ہیں، کم ہو سکتی ہیں، لیکن یہ کرنیں ہیں روشنی کی کرنیں؛ ظلم، بے انصافی، گمرہی کے اندھیروں کی دشمن!
اور جو ادیب کرنوں کو جنم دیتا ہے، رات کی تاریکی کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ادب کا بہت بڑا تقاضا پورا کرتا ہے۔
لیجیے، ایک غزل کے کچھ اشعار سنیے

تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی
زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی، جاتی رہی

ان سے ہم، اور ہم سے وہ، کچھ اس طرح گھل مل گئے
وہ ملاقاتوں میں سب بیگانگی جاتی رہی
وہ تو رخصت ہو گئے، چھا کر دماغ و قلب پر
یاد ان کی دم بدم آتی رہی، جاتی رہی

ضیا کی شاعری نے وقت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ انھوں نے اپنے مقررہ معیار سے انحراف نہیں کیا، بلکہ عروسِ سخن کو نکھارا، سنوارا اور اُبھارا ہے۔ ان کی تازہ ترین تخلیقات اس بات کی گواہ ہیں۔ "گردِ راہ" اور "دھوپ اور چاندنی" سے صرف چند اشعار پیش کرونگا، جس سے آپ اندازہ کر سکینگے کہ ضیا کی شاعری نے کبھی ندرت، جدّت اور رفعتِ بلندی کا دامن نہیں چھوڑا، وہ وقت کے تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرتی رہی ہے:

در و دیوارِ قفس پر ہیں لہو کے چھینٹے — مرغِ پربستہ کو شوقِ چمن آرائی تھا
کوئی انسان، نہ انسانوں کی بستی میں ملا — کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی تھا

ہم جو ناکام ہیں، تو کیا غم ہے! — امتحاں کامیاب ہے، پیارے!
آ گیا ہوں توڑ کر زندانِ جسم — اب بتا، اے زندگی! کیسا لگا

وطن کی یاد ستاتی ہے اب تو غربت میں — یہ تم سے کس نے کہا تھا، وطن سے بھاگ چلو
نیا زمانہ، نئی روشنی، نئے دستور — قدیم رسم و رواجِ کہن سے بھاگ چلو
بٹھائے جاتے ہیں پہرے زبانِ حق گو پر — غلط سیاستِ دار و رسن سے بھاگ چلو

جلتی رہیں امید کی شمعیں تمام رات — مایوس دل میں کچھ تو ضیا! روشنی رہی

صبح نے روشن تیر چلائے — شب کا درپن ٹوٹا جائے
اس انساں کا جینا ہی کیا! — جو انسان کے کام نہ آئے
ہر ذرّے میں سورج روشن — دھرتی سے آکاش لجائے

ضیا کی شاعری میں نور کی کرنیں مدھم نہیں ہوئیں۔ وہ غمِ انساں کے پیکر دکھاتا ہے، ان کے غموں کا مداوا بتاتا ہے۔ اس کے پاس خیال بھی ہیں اور بیان کی بے پناہ صلاحیت بھی۔ یہی اس کی شاعری کی کامیابی اور حسن کی دلالت ہیں۔

ضیائے کلام

(انتخاب)

کافر بنا دیا کہ مسلماں بنا دیا
فطرت کا شکر کر، تجھے انساں بنا دیا

خون روتا ہوں کہ انساں بھی نہیں ہے انساں
کیا بڑی بات تھی، انساں اگر انساں ہوتا

کشتی ساحل پہ ڈوبی ہے
موجیں ہوتیں، دریا ہوتا!

فصلِ خزاں جو آئی، تو مرجھا کے رہ گئے
پھولوں کو اپنے حسن پہ کتنا غرور تھا

روشِ میکدہ بدل دیتا
کوئی ایسا نہ ہوشیار آیا

اس نے بھلا دیا تجھے، تھی یہ بھی مصلحت
لیکن تو اس کو بھول گیا، یہ بُرا ہوا

گمرہی میں ہے ایک لطف، ضیا!
جاؤ ہیں راہ پر نہیں آتا

جس نے سمجھ لیا کہ زیست نام ہے اضطراب کا
اس کو سکون مل گیا، گردشِ روزگار سے

مجھے دیوانگی کا درس دے کر
خفا کیوں ہو، مرے دیوانہ پن سے

رونا اس بات پہ آتا ہے کہ سوچا کیا تھا
اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہونا کیا ہے

منزل سے بے نیاز رہیں اہلِ کارواں
یہ فرضِ کارواں ہے کہ ہر دم رواں رہے

آیا نہ شاخِ گل پہ کبھی بلبلوں کو چین
گل ہیں کہ نوکِ خار پہ بھی شادماں رہے

طے کر چکا ہوں منزلیں آغازِ شوق کی
اب انتظار ہے، نہ شبِ انتظار ہے

زندگی ہے بذاتِ خود اک موت
موت کا انتظار کون کرے!

کون پامالِ روزگار نہیں
شکوۂ روزگار کون کرے!

ہماری نا امیدی میں بھی ہے امید کا پہلو
کہ سعیِ رائیگاں سے ہم ہیں، سعیِ رائیگاں ہم سے

چاند بھی کہہ کے چھپ گیا، شمع بھی کہہ کے بجھ گئی
حسنِ ازل کی داستاں، قصۂ نا تمام ہے
دل جو نہیں، تو غم نہیں، غم جو نہیں، تو کچھ نہیں
زیست مجھے وبال ہے، موت مجھے حرام ہے

حیاتِ تازہ کے نغموں سے گونجتی ہے فضا
نئی امنگ نئی کروٹیں بدلتی ہے

ملولِ یاس کے لب پہ ہے نغمۂ امید
کرن سحر کی، شبِ تار ہی میں پلتی ہے

سکوں پذیر بہت روز سے ہے جانِ ضیا
نقاب رخ سے الٹ دو نظر سنبھلتی ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غم کیا چیز ہے
خود نہیں سمجھے، انھیں سمجھائیں کیا!

تم چلے آئے، تو ساری بیکلی جاتی رہی
زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی، جاتی رہی

وہ تو رخصت ہو گئے، چھا کر دماغ و قلب پر
یاد ان کی دم بدم آتی رہی، جاتی رہی

محبت کو تم ہی کہو، میں کہوں کیا!
اسی نے ڈبویا، اسی نے ابھارا

ترا شکریہ، اے فریبِ محبت!
تمناؤں میں مجھ کو الجھا کے مارا

میری خلوت میں ترے حسن کی یاد
آ نہ سکتی تھی، مگر آتی ہے

تیری صورت میں اب، اے دوست مجھے
اپنی صورت ہی نظر آتی ہے

غمِ عشرت ہو کہ ہو عشرتِ غم
آنکھ ہر بات پہ بھر آتی ہے

موت کے روپ میں ہر بار ضیا!
نئی ہستی کی خبر آتی ہے

پروانہ جل کے راکھ ہوا، شعلہ حیات
مغموم و سوگوار نہ تھا، دیکھتے رہے

تم پریت نبھاؤ تو جانیں
ورنہ باتیں ہی باتیں ہیں
سلجھا نہ سکیگی عقل انھیں
الجھی ہوئی دل کی باتیں ہیں

امواج پہ لرزہ طاری ہے، گرداب میں ہلچل پیدا ہے
ساحل کی تمنا کون کرے! اب زورِ طوفاں دیکھینگے
آزاد فضاؤں میں ہونگے، ہم بھی محوِ پرواز اک دن
اجڑا ہوا زنداں دیکھینگے، آباد گلستاں دیکھینگے
تاروں کی چمک، کلیوں کی چٹک، موجوں کا ترنم، حسنِ جواں
ہم تجھ کو ضیا! اس عالم میں مدہوش و غزلخواں دیکھینگے

عالمِ وجد و بیخودی میں تجھے — ہم نے آواز بارہا دی ہے
اے زمین! ہم نے تیرے قدموں پر — آسماں کی جبیں جھکا دی ہے
کوششِ امن تو بجا، لیکن — آدمی فطرتاً فسادی ہے
اے خدا! تو نے اپنے بندوں کو — زندگی کی کڑی سزا دی ہے
اے ضیا! قلب عشق پرور میں — حسن نے آگ سی لگا دی ہے

جنت کھو کر دنیا پائی — دیکھی انسان کی چترائی
غم کی دولت پا کر خوش ہیں — عشق و محبت کے سودائی
بیٹھ گئے منزل کو پا کر — ہم نے جہاں بھی ٹھوکر کھائی
آگ سے کھیلا، لپکا، بہکا — پروانے نے جان گنوائی

اے دلِ دردآشنا! اجڑی ہوئی بہار دیکھ
باغ خزاں شکار میں، پھول نہیں، تو خار دیکھ
تو نے کہا تھا، زندگی صرف فریبِ ہوش ہے
مجھ کو جہانِ زیست پر آ گیا اعتبار، دیکھ
کیا ہے مآلِ ذوقِ عشق، حسن کی کائنات ہیں
اے دلِ بیقرار! سوچ، دیدۂ اشکبار! دیکھ
گلکدۂ حیات میں، آج خزاں کا راج ہے
بس کی طرف بھی گاہ گاہ، فتنہ گرِ بہار! دیکھ

تیرے بغیر زندگی تشنگیِ دوام ہے
روح بھی بیقرار ہے، دل بھی ہے سوگوار دیکھ
آ ہی گیا فریب میں حسن کے تو بھی، اے ضیا!
سجدے میں ہے سرِ نیاز، اپنا مآلِ کار دیکھ

باقی اک رہ جائیگا نقشِ ضیائے الفت کا
دنیا بھی مٹ جائیگی اور ہم بھی مٹ جائینگے

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائنات عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے
امیدیں جاں بلب، کچلی ہوئی دل کی تمنائیں
میں ہنستا ہوں کہ اک اندازِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے
ٹپکتا ہے جو آنکھوں سے ترے دردِ جدائی میں
چمکتا ہے وہ آنسو بن کے شبنم، یوں بھی ہوتا ہے

غم سے نجات کیا ملے، غم نہ جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے
نورِ حیات تجھ سے ہے، کیفِ حیات تجھ سے ہے
دن ہے نہ دن ترے بغیر، اور نہ رات رات ہے
درسِ جنوں ہے گمرہی، خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام، اور سفر حیات ہے
چاند نے جگمگا دیا، شمع نے گنگنا دیا
عشق نہیں، تو زندگی ایک اندھیری رات ہے
حسن فریبِ ذوقِ دید، عشق طلسمِ سوزِ قلب
حسن نہیں ہے پائیدار، عشق بھی بے ثبات ہے

ان کو بنایا من ادھیکاری میں نے جیتی بازی ہاری

پریم کی بازی میں نے اکثر ہار کے جیتی جیت کے ہاری
عشق میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے پھر بھی دنیا ہے بیوپاری
دامنِ ضبط میں سکون پا یا شورِ رنجیدن سے جب نجات بنی
جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا جب ارادوں کی کائنات بنی

نہیں شام وسحر کے درمیاں دل شادکام اپنا
اسی کا نام دنیا ہے، تو دنیا کو سلام اپنا
وقارِ ضبط کیسا! ہمتِ ایذا طلب کیسی!
وفاؤں میں الجھ کر رہ گیا ہے ذوقِ خام اپنا
کبھی مندر، کبھی مسجد میں مصروفِ پرستش ہے
نہیں پایا ابھی تک تیرے بندے نے مقام اپنا

منزلِ مقصود ہوتی ہے قریب راستے سے جب بھٹک جاتا ہوں میں
چھیڑتی ہے صبح جب سازِ حیات وجد میں آکر غزل گاتا ہوں میں
راہ کے پیچ وخم، وہ کیا جانے! جس نے کھائی نہیں کبھی ٹھوکر

ہزاروں پیچ وخم ہر گام پر تھے راہِ ہستی میں
محبت کو نہ میں رہبر بنالیتا، تو کیا ہوتا!

مجھے محبت کا سوز دے دو، یہ ایٹموں کا جلال لے کر
حرارتِ خون کی آرزو ہے، شرار لے کر میں کیا کرونگا
طویل راتوں کی ظلمتوں میں ضیا! میں اکثر یہ سوچتا ہوں
گراں ہے بارِ غمِ محبت، یہ بار لے کر میں کیا کرونگا!

جو جینا ہے، تو جینے کی طرح جی پھر و سازندگی میں موت کا کیا!
پوچھ ضیا! یہ اہلِ دل سے پیار نہ ہوتا تو کیا ہوتا!

اے ذوقِ طلب! اے پاسِ وفا! اے لذتِ غم! اے مجبوری!
سمجھا نہ جسے دل نے اب تک، اس درد کا درماں کیا ہوگا

آؤ تو ذرا یہ پوچھ ہی لیں، ہر روز بدلنے قدروں سے
انساں نہ ملیگا جب کوئی، وہ عالمِ انساں کیسا ہوگا!
دریائے جنوں میں ہر دل ہر دم ہچکولے کھاتا رہتا ہے
کشتی نہ ابھی تک ڈوب سکی، اے موجۂ طوفاں کیا ہوگا!
دل کی رگ رگ میں رواں تھا جن سے خونِ زندگی
ان تمناؤں کو، چاہوں کو نہ جانے کیا ہوا۔

ان سے میں دور رہوا، خوب ہوا — آگئے وہ مرے نزدیک بہت
غمِ جاناں مرے دل سے نہ گیا — کی غمِ دہر نے تحریک بہت
نہ جنت، نہ دوزخ، نہ ہے دین و دنیا — بتا، اے محبت! کہاں آگئے ہم؟
عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا — چلے تھے جہاں سے، وہیں آگئے ہم
محبت کی یہ محویت، کیا کہوں! — وہ آئے، تو اپنی خبر کچھ نہیں
محبت، ہے انسان کی آبرو — بغیرِ محبت، بشر کچھ نہیں

ختم عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں
دورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج
دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں
ہم کو کرنی ہے مرتب داستانِ حسن و عشق
صبحِ دلی، شامِ نیشاپور کی باتیں کریں

فردا کی فکر، حال کا غم، اضطرابِ شوق — دیوانے تنگ دہر کی محفل سے آئے ہیں
دے تو چکے تھے پاؤں جواب، اے ضیا! مگر — منزل تک اپنے حوصلۂ دل سے آئے ہیں

مل ہی جائیگی منزل کہیں — جادہ پیما رہے کارواں
کہہ سکا میں، نہ وہ سن سکے — غم میں ڈوبی ہوئی داستاں
دشمنی کو، ضیا! مل گئی — سایۂ دوستی میں اماں

خدا جانے امیرِ کارواں کے دل پہ کیا گذری
نہ وہ راہوں کے قصے ہیں، نہ وہ منزل کی باتیں ہیں

محبت، آرزو، آنسو، تبسم، حوصلہ، کوشش
فرشتے کچھ نہ سمجھینگے، یہ مُشتِ گِل کی باتیں ہیں

رہِ پرخار و بادِ تند و ہیبتناک خاموشی
دلِ ناداں! یہی تو قربتِ منزل کی باتیں ہیں

نئے رہرو، نئی منزل، نیا دل نئی راہیں دکھانا چاہتا ہوں
ہزار بار ہی دیکھا ہے سوچنے کا مآل ہزار بار ہی سوچا ہے: دیکھیے کیا ہو!

صبح نے روشن تیر چلائے شب کا درپن ٹوٹا جائے
مجھ کو ملا، وہ دیوانہ دل اشکوں سے جو آگ بجھائے
ماتھے پہ بیندی کا سورج آنکھوں میں کاجل کے سایے
بادل جھومے نیل گگن پر گوری نے گیسو لہرائے
کوئی لگائے آگ دلوں میں کوئی دلوں کی آگ بجھائے
اس انساں کا جینا ہی کیا جو انسان کے کام نہ آئے

مجبورِ غمِ دنیا، دل سے تو کوئی پوچھے احساس کی رگ رگ میں ہے خارِ غمِ جاناں کا!
بغض و حسد و نفرت، ناکامی و محرومی انسانوں کی بستی میں، کیا ہے کوئی انساں کا!

غمِ دنیا و دیں ان کو، نہ فکرِ نیک و بد ان کو
محبت کرنے والے بے نیازِ بیش و کم نکلے

عشرتوں کے متلاشی! غم سے کیوں گریزاں ہے
تیرگی کے پردے میں روشنی کا ساماں ہے

کیجیے رہبروں کا کیا شکوہ گمرہی کا بھرم نہ کھل جائے

دنیا مری نظر سے تجھے دیکھتی رہی پھر میرے دیکھنے میں، بتا، کیا کمی رہی
کیا غم، اگر قرار و سکوں کی کمی رہی خوش ہوں کہ کامیاب مری زندگی رہی؟

آئی بہار، جام چلے، مے لٹی، مگر — جو تشنگی تھی مجھ کو، وہی تشنگی رہی

اک درد تھا جگر میں، جو اٹھتا رہا مدام — اک آگ تھی کہ دل میں برابر لگی رہی

دامن دریدہ، لب پہ فغاں، آنکھ خونچکاں — گر کر تری نظر سے مری بیکسی رہی

جواں ہے ہمت، ہے عزم محکم، نظر اٹھائیں تو اہلِ دانش
الم کے تاریک افق پہ روشن شعاعِ امید بھی ملیگی

کہہ دیا ان سے، جو نہ کہنا تھا — اور کہنا جو تھا، وہ کہہ نہ سکے

زندگی کے ہزاروں وار سہے — موت کا ایک وار سہہ نہ سکے

وہ بھی کیا قربتِ محبت تھی — دور رہ کر بھی دور رہ نہ سکے

آزمائش اگر جفا سے نہ ہو — امتحانِ وفا نہیں کچھ بھی

وادیِ غم میں لا کے چھوڑ دیا — اب کھلا، رہنما نہیں کچھ بھی

ہوش ہوتا ہے، نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے — ہائے، کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

ابر ہو سایہ فگن، یا ہو جھلستی ہوئی دھوپ — زندگی اپنی بہر حال بسر ہوتی ہے

یقیں کے پاؤں میں لغزش نہ آئے — بدل جاتی ہیں تقدیریں یقیں سے

ماضی کی مجھ کو فکر، نہ فردا کا کوئی غم — سر چڑھ کے بولتا ہے، یہ جادو ہے حال کا

ہوتے ہیں پھر طلوع مہ و مہر جام سے — پرتو پڑا ہے کیا عرقِ انفعال کا!

یہ شب کی تیرگی، یہ المناک خامشی — اچھا ملا جواب ہمارے سوال کا!

دنیا گنوائی، دین بھی کھویا، ملا نہ کچھ — انجامِ کار دیکھ لیا دیکھ بھال کا!

جن کے لیے دنیا ہے مجبور دعاؤں پر — یارب! کبھی ان کو بھی احساسِ خدا ہوگا!

کھولونگا میں جب آنکھیں، آغوشِ محبت میں — دنیا ہی نئی ہوگی، عالم ہی نیا ہوگا

کرنوں سے سنواریگا جب چاند گلستاں کو — بربط پہ جوانی کے دل نغمہ سرا ہوگا

افسانۂ غم میرا کانٹوں کی زباں پر ہے — کلیوں نے سنا ہوگا، دل تھام لیا ہوگا

عشرت کی دعا مانگی، اور دولتِ غم پائی — سوچا تھا، ضیا! میں نے، میرا بھی خدا ہوگا

ولولوں کے چہچہے، حوصلوں کے قہقہے — کیا پیامِ موسمِ نو بہار آ گیا!

اب تو چھیڑ دو کوئی گیت سازِ موج پر — قید آبشار تھی، آبشار آگیا!
زباں پہ آج ہے شکوہ گلا کیا — تیرے بندوں کو یا رب ہو گیا کیا
زمانے میں کوئی کس کا ہوا ہے! — زمانے میں کسی کا آسرا کیا!
مری ناکامیوں، بربادیوں میں — تمھارا ہاتھ بھی شامل نہ تھا کیا
دل دیا، درد لیا، ہوش سے بیگانہ ہوا — لوگ اڑاتے ہیں مذاق آپ کے دیوانے کا
غمِ زندگی یا غمِ بندگی ہو — ہمارا مقدر رہو دل کا پینا
انسانیت کا نام بھی لینا گناہ ہے — جیسے کوئی زمانے میں انساں نہیں رہا
گل سینہ چاک، بلبلیں چپ، آشیاں اداس — تم کیا گئے، بہار کا ساماں نہیں رہا
کرشمہ سازیٔ اہلِ خرد کو دیکھتا ہوں — میرے جنوں میں کمی آگئی، تو کیا ہوگا!
ہیں دو چار ہوں اندھیروں سے اے ضیا! مانوس
نظر فریب سحر کھا گئی، تو کیا ہوگا!
ان کے آتے ہی درد بھول گیا — واہ رے، میرے قلبِ خانہ خراب!
داستاں قیس کی کہتے کہتے — کہہ گیا کوئی ترے پیار کی بات
وہ آتے نہیں، وہ آتے ہیں، جب پاؤں — نہ دے دھوکا مجھ کو تاروں کی آہٹ
کبھی زندگی آدمی پر فدا تھی — فدا آدمی آج ہے زندگی پر
اے میرے دلِ ناکام! سنبھل، نومید نہ ہو، مایوس نہ ہو
امید پہ دنیا قائم ہے، امید نہیں، تو کچھ بھی نہیں
منزل کی لگن دل میں ہو اگر، رستے بھی خراماں ہوتے ہیں
شمعوں کی طرف اٹھتے ہیں قدم، ظلمت سے گریزاں ہوتے ہیں
جن پر انساں ایمان لائے، دین و دنیا منکر جن سے
ایسے بھی کافر ملتے ہیں، ایسے بھی مسلماں ہوتے ہیں
کامراں ہوں نہ ہوں، ضیا! لیکن — آرزو کا فریب کھا بیٹھے
پردے اٹھا رہا ہوں تری ذات سے مگر — خود میری ذات کیا ہے مجھے کچھ خبر نہیں

تدبیرِ زندگی پہ بھروسا ہے، اے ضیا! قسمت کی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

ڈرتا ہوں آگہی سے، کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے شام و سحر کے بیچ اہم جو کڑی ہے رات

تم ملے تو خوشی ملی، ورنہ میں تو سمجھا تھا غم ہی میرا ہے

گھر جلا کر ہی روشنی کر لیں ہر گلی، کوچے میں اندھیرا ہے

میں ہی دریا، میں ہی ساحل، میں ہی طوفاں، میں ہی موج
بادباں، چپّو، سفینہ، ناخدا کہیے سب مجھے
جانے، کوئی رام کب آکر مجھے بھی دے نجات
ٹھوکریں دیں، میں ایک پتھر راہ کا کہیے سب مجھے

نہ پوچھ رک گئیں کیوں گردشیں زمانے کی بنے وہ دوست، تو دنیا سے دشمنی نہ رہی

دردِ دل کی ہو دوا کوئی، یہ ممکن ہی نہیں ہائے عجب دستِ دعا بھی نہ اٹھایا جائے

کیا کم ہے مری ترکِ تمنا کی تمنا ارمان نہ ہونے کا یہ ارمان بہت ہے

مجھے خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں مجھ کو مرے سوا بھی کوئی ہوشمند ہے، یارو!

نہ جانے توڑ کے اڑ جائیگی کہاں اک دن حصارِ جسم میں جو روح بند ہے، یارو!

زمین پہ رہتا ہے، اڑتا ہے آسمانوں پر ضیا کی پستی بھی کتنی بلند ہے، یارو!

رہگزارِ زندگی کی دین ہے، جس کو ملے اِن جلتی دھوپ میں یہ سایۂ دیوارِ دوست

وطن کی یاد ستاتی ہے اب تو غربت میں یہ تم سے کس نے کہا تھا، وطن سے بھاگ چلو

نیا زمانہ، نئی روشنی، نئے دستور قدیم رسم و رواجِ کہن سے بھاگ چلو

یہاں تو سانس بھی لینا ہے، اے ضیا! مشکل دھواں دھواں ہے فضا، اس گھٹن سے بھاگ چلو

منزل کا تو عرفاں نہیں، اتنی خبر ہے جس سمت سے آیا تھا، اسی سمت چلا ہوں

اب بھی جاتا ہے اسی کوچۂ وحشت کو، نہ پوچھ لاکھ ہم نے دلِ نا فہم کو سمجھا دیکھا

سنتے آئے تھے، آج دیکھ لیا بیکسوں کا خدا نہیں ہوتا

اتنے صدمے سہے کہ اب دل کو اعتبارِ وفا نہیں ہوتا

عمر بھر جس پہ جبہہ سائی کی وہ تو پتھر ہوا، خدا نہ ہوا

جگر چھلنی، دلِ پُرخوں، نگاہیں حسرت آلودہ
ہوا یہ دوستی میں، دوستی کے بعد کیا ہوگا

جبینِ شوق کے سجدوں میں ہے رسوائیِ الفت
تو پھر، اے بندہ پرور! بندگی کے بعد کیا ہوگا

کھو چکا ہوں کسی تاریک گپھا میں خود کو / ٹوٹ کر مری انا میری دہائی دے ہے

پتّوں کی طرح ٹوٹا، مٹی میں ہوا مٹی / شاخوں کی طرح مجھ کو جھکنا نہ مگر آیا

سوتے میں تری یادیں کیا کیا نہ دکھاتی تھیں / جب آنکھ کھلی، مجھ کو کچھ بھی نہ نظر آیا

ہوئی سحر، تو کہاں کھو گیا اجالے میں / جو رات بھر میرا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا

بہت ملال تھا تنہا روی کا اپنی ضیا / کسی کے ساتھ چلا بھی، تو ڈگمگاتا رہا

تمھارے نقشِ پا پر گامزن ہوں / مگر یہ راہ جاتی ہے کہاں تک؟

ہے یہی عالم، تو لفظوں کا لباس / دل کے ارمانوں کو ہم پہنا چکے

بوڑھا درخت ہوں، مجھے جڑ سے اکھاڑ دو / میرا پھٹا ہوا ہے لباس، اور پھاڑ دو

تم تو اہلِ نظر ہو، کر دو گے / میری کوتاہیاں نظر انداز

شریکِ رنگِ چمن پھول بھی ہے کانٹا بھی / کسے یگانہ کہوں، اور کس کو بیگانہ

ڈوبنی ہی تھی ایک دن کشتی / ناخدا کو سمجھ لیا تھا خدا

جاگتی گلیوں کی آوارہ خرامی، کچھ نہ پوچھ / پانے والے کھو گئے کیا کھونے والے پا گئے

مرا وجود ننگِ چمن، بارِ شاخِ گل / ہوں برگِ زرد و خشک، زمیں پر گرا مجھے

نہ ہاتھ جامہ دری سے اٹھائے وحشت نے
نہ اپنا چاک گریباں ہوا رفو اب تک

جفا شعاری کا بھی اپنی جائزہ لے لے
نہ پوچھ مجھ سے، وفا کیوں ہے میری خو اب تک

پایا جو خود کو، ہم پہ کھلا آدمی کا راز
مدت سے آرزو تھی، کوئی آدمی ملے

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ادارہ ہے، جس کی بنیاد بھارت سرکار نے ۱۹۵۴ء میں رکھی تھی۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کا اہم مقصد ہے، ہندستانی زبانوں کی ادبی ہلچل میں تال میل اور ترقی کرنا، اور ترجموں کے ذریعے کسی ہندستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساہتیہ اکاڈمی نے ایک لمبی چوڑی پبلیکیشن اسکیم ہاتھ میں لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کی اہم اردو مطبوعات:

نمبر	کتاب	قیمت
۱۔	ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد (چار جلدیں) فی جلد	22-00
۲۔	خطبات آزاد "	18-00
۳۔	غبارِ خاطر "	15-00
۴۔	ہیملٹ (ڈراما) شکسپیر، مترجم فراق گورکھپوری	10.00
۵۔	پریم چند پرکاش چندر گپت، مترجم ل۔ احمد اکبرآبادی	2.50
۶۔	تاریخ بنگلہ ادب سُکمار سین، مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ	25-00
۷۔	آدم خور (ناول) نانک سنگھ، مترجم پرکاش پنڈت	15-00
۸۔	گورا (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم سجاد ظہیر	10-00
۹۔	کلموہی (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم عابد حسین	7-50
۱۰۔	اپنی کہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن	12.50

ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون نئی دلّی-۱۱۰۰۰۱

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر : امرت لال ؛ مترجم : رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے ، وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر۔ آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا جڑا ہے ، اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۲۸/۷۵ روپے

ہندی کے یک بابی ڈرامے : مرتبہ چندر گپت ودیالنکار ؛ مترجم ڈاکٹر محمد حسن

زیر نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈراموں کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے۔ اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈرامانگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔ قیمت ۱۲/۵۰ روپے

میلا آنچل : بھونیشور رینو ؛ مترجم : سلمیٰ صدیقی

یہ ہے "میلا آنچل" ایک مقامی رنگ لیے ہوئے۔ اس میں پھول بھی ہیں ، اور کانٹے بھی ؛ دھول بھی ہے اور گلال بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگاران میں سے کسی سے بھی دامن بچاکر نہیں نکل پاتا۔ میلا آنچل عالمی ناول کہا جاسکتا ہے۔ قیمت ۱۸/۷۵ روپے

راگ درباری : شری لال شکلا ؛ مترجم راشد سہسوانی

"راگ درباری" کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے۔ یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے۔ مختلف طرز کے پلاٹ ، ایک نئی تکنک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول قیمت ۱۵/۵۰ روپے

تقسیم کار :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر ، نئی دلی ۲۵

بہترین تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ

تحریر

علمی مجلس دِلی کا تماہی رسالہ

(۴۲)

مرتب : مالک رام

جلد ۱۱ | اکتوبر / دسمبر ۱۹۷۷ء | شمارہ ۴

چندہ سالانہ — ہندستان : پندرہ روپے — فی شمارہ
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ۸ ڈالر (امریکی) — پانچ روپے

پرنٹر و پبلشر قل عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپوا کر علمی مجلس، ۴۲۹ اچھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلّی ۶ سے شائع کیا۔

ملاحظات

۱۹۷۷ء کی آخری ماہی کا پرچہ حاضر ہو رہا ہے اور اسی شمارے کے ساتھ تحریر اپنی زندگی کے گیارہ سال بھی پورے کر رہا ہے۔ فالحمد للہ!

اس سال میری صحت بہت نا تسلی بخش رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تحریر کی ترتیب و تہذیب پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ اگرچہ احباب نے شکایت نہیں کی، اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کیا، لیکن میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ مجھے اس کا دلی افسوس ہے۔ دعا کیجیے کہ توفیق الٰہی ۱۹۷۸ء میں بھی ہمارے شاملِ حال رہے اور ہم بھی بُری بھلی خدمت جاری رکھ سکیں۔ وما توفیقنا الّا باللہ العظیم۔

تحریر ۱۹۶۷ء میں جاری ہوا تھا۔ ان گیارہ برس میں طباعت و اشاعت کے اخراجات اگر زیادہ نہیں تو ضرور تگنے ہو گئے، لیکن ہم نے چندے میں اضافہ نہیں کیا۔ اگر احباب توسیع اشاعت پر توجہ کرتے، تو اخراجات کی یہ زیادتی کسی حد تک پوری ہو جاتی۔ افسوس کہ یہ بھی نہ ہوا۔ بعض دوستوں کا یہ مشورہ ہے کہ سالانہ چندہ پندرہ کی جگہ بیس روپے کر دیا جائے۔ اس سے نقصان تو کیا پورا ہوگا، لیکن بیشک کچھ عافیت ضرور ہو جائیگی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دوست اس پر غور کریں، اور اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔ شکریہ

مالک رام

لطیف حسین ادیب

مکاتیب امتیاز علی خان عرشی

اکبر میاں (اکبر علی خاں عرشی: ادیب) عرشی صاحب کی تحریریں جمع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے عرشی صاحب کے مکاتیب بھی حاصل کیے اور ان کو جرائد میں طبع کرایا۔ انھوں نے مجھ سے بھی مکاتیب طلب کیے۔ اور میرا ارادہ ان کو مکاتیب دینے کا تھا مگر بعد کو میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ میں نے خود ہی عرشی صاحب کے مکاتیب کا انتخاب کیا اور ان کو مرتب کر دیا۔ عرشی صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ خط و کتابت کا آغاز ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ میں اس زمانے میں رتن ناتھ سرشار پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا اور سرشار کی تصنیفات کا متلاشی تھا۔ چنانچہ میں نے عرشی صاحب سے بھی رجوع کیا اور یہی امر ان سے پایدار تعلق کا سبب بن گیا۔ مکاتیب کا انتخاب کرتے وقت میں نے صرف وہ خطوط منتخب کیے، جو میری نظر میں اہم ہیں۔ وہ تمام خطوط جن کا شمار نجی خطوط میں کیا جاتا ہے، یعنی جن میں شادی بیاہ جیسی باتوں پر اور دیگر گھریلو معاملات پر گفتگو بربنائے تعلق ہوتی ہے، منتخب نہیں کیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام خطوط جو عرشی صاحب کی طرف سے اکبر میاں یا عابد رضا بیدار نے تحریر کیے، وہ بھی منتخب نہیں کیے۔ میں نے بعض دو سطری یا تین سطری خطوط بھی، جن میں میرے رامپور جانے کے سلسلے میں وقت کے تعین

کا مذکور ہوا، نظر انداز کر دیے ہیں۔
عرشی صاحب سے میرا تعلق چوتھائی صدی کی مدت کو محیط ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں جوان سے ادھیڑ ہو گیا، اور وہ ادھیڑ سے بوڑھے۔ میں ان کے اور اپنے باہمی تعلق پر کن الفاظ میں اظہار خیال کروں، یہ خطوط ہی اس کا بہترین ثبوت ہیں۔ خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ زندہ سلامت رہیں اور میں ان کی شفقت و علمی بصیرت سے مستفید ہوتا رہوں۔

لطیف حسین ادیب

خط نمبر ۱

رضا لائبریری، رامپور ۔ ۱۸ دسمبر ۶۵۲ء
مکرمی، تسلیم

ہمارے یہاں سرشار کی ان کتابوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں، جو آپ کو مطلوب ہیں "طوفان بے تمیزی" کے نام سے پنڈت رتن ناتھ در کی ایک کتاب ہے۔ میں انہیں سرشار ہی خیال کرتا ہوں۔ اس لیے یہ کتاب موجود ہے۔
اودھ اخبار کے پرچے جنوری ۲۸ء سے دسمبر ۲۹ء تک نہیں۔
اودھ پنچ مئی ۱۹۰۸ء سے دسمبر ۱۲ء تک؛ اور پھر جنوری ۱۹ء سے دسمبر ۲۹ء تک موجود ہیں۔
دوسری کتابیں اور اخبار نہیں ہیں۔ والسلام　　　　احقر عرشی

خط نمبر ۲

رضا لائبریری، رامپور ۔ ۵ مارچ ۶۵۴ء
مکرمی، تسلیم

ہمارے یہاں "سیر کہسار" ہے "خدائی فوجدار" نہیں۔ اور "سیر کہسار" کا پہلا ایڈیشن جولائی ۱۸۹۰ء میں مطبع اودھ اخبار لکھنو میں چھپا تھا۔ والسلام

مخلص عرشی

خط نمبر ۳

رضا لائبریری رامپور — ۹ دسمبر ۶۵۵

مکرمی ادیب صاحب کی خدمت میں سلام کے بعد عرض ہے کہ ہمارے یہاں " اسرار محبت[۳] " اور " طلسم ہیضا " کے مخطوطے محفوظ ہیں ۔ " ہشت گلزار " نہیں ۔

فہرست ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے ۔ چھپیگی تو انشائ [اللہ] بقیمت مل سکیگی ۔

خدا کرے آپ کا سرشار پر مقالہ اعلیٰ نمبر حاصل کرے ۔ والسلام

احقر عرشی

خط نمبر ۴

رضا لائبریری ، رامپور — ۳ اپریل ۶۵۶

مکرمی ۔ تسلیم مع التکریم

آپ کا کارڈ ۲۶ مارچ کو رامپور پہنچا ۔ دفتر کی تعطیل تھی ۔ پھر ۲۸ کو میں اردو کنونشن میں شرکت کے لیے جے پور چلا گیا ۔ وہاں سے کل واپس آیا ، تو کارڈ پایا ۔ بروقت جواب ندینے کا باعث یہ تھا ۔

اب آپ کب آئینگے ؟ ہمارے یہاں اتوار کے علاوہ تعطیلیں کلکٹری کے مطابق ہوتی ہیں ۔ لہذا کوئی ایسی تعطیل مناسب رہیگی ، جو محکمۂ تعلیم میں ہو اور کلکٹری میں نہ ہو ۔

میں بحمد اللہ بخیر ہوں اور آپ کی خیریت کا خواہاں ۔ والسلام

احقر عرشی

خط نمبر ۵

رضا لائبریری ، رامپور — ۲۴ مئی ۶۵۷

ادیب صاحب کو ڈاکٹریٹ کی مبارکباد ۔ اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر کام کی توفیق عطا فرمائے ۔

میری خدمت کا تذکرہ کر کے مجھے کیوں شرمندہ کیا ۔ مجھے تو ہمیشہ اپنی کوتاہیِ کار کا احساس ستاتا رہتا ہے ۔

کیا کروں بس نہیں چلتا، ورنہ اہلِ علم کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھاؤں ۔ والسلام
احقر عرشی

خط نمبر ۶

رضا لائبریری، رام پور - ۶ فروری ۵۷ ء
مکرمی ادیب صاحب - تسلیم کے بعد عرض ہے کہ کارڈ ملا - آپ "اسرارِ محبت" کی نقل کے لیے ایک درخواست کلکٹر صاحب رام پور کے نام روانہ فرما دیجیے - وہ اس لائبریری کے سکرٹری بھی ہیں، اور اجازتِ نقل کا اختیار انھیں کو حاصل ہے - س کے بعد کام شروع ہو سکیگا -
آج کل کتاب خانہ قلعۂ معلّی کی ایک اور بلند و وسیع عمارت میں منتقل کیا جا رہا ہے - ہم سب اسی کام میں لگے ہوئے ہیں - اس لیے نقل کا کام اس سے فارغ ہو کر ہی کیا جائیگا - آپ تاخیر کو معاف فرمادیں -
والسلام والتفکر -
مخلص عرشی

خط نمبر ۷

رضا لائبریری، رامپور (یوپی) مورخہ ۲۷ فروری ۶۲ ء
عرشی نوازا، سلام و رحمت -
شہیدیؔ مرحوم کا نعتیہ دیوان ہمارے یہاں بھی نہیں ہے - نہ مطبوعہ ذخیرے میں، نہ قلمی میں - باقی آپ کی آمدِ رام پور کے لیے اور بھی بہانے ہو سکتے ہیں - والسلام -
مخلص عرشی

خط نمبر ۸

رضا لائبریری، رام پور (یوپی) مورخہ ۱۰ اپریل ۶۲ ء
محترمی، تسلیم

رکبا د سے زائد ممنون ہوں، ان ہمت افزا کلمات کا جو آپ نے میرے کام کے بارے میں تحریر فرمائے
۔ خدا آپ کو اس سے بڑھ کر ہمت و شہرت و عزت عطا فرماتے۔ آمین! والسلام۔
دعاگو عرشی

خط نمبر ۹

رضا لائبریری، رام پور (یو پی) مورخہ ۲۴ جون ۶۳ء
مکرمی و محترمی، تسلیم مع التکریم۔
دہلی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے پرسوں واپس آیا، تو آپ کا مکرمت نامہ دیکھا۔ تاخیرِ جواب کی معذرت
کرتے ہوئے عرض پرداز ہوں کہ
(۱) کتابخانہ جمعرات کو بند رہتا ہے۔ اوقاتِ کار صبح ساڑھے دس بجے سے ساڑھے چار بجے سہ پہر
تک ہیں۔
(۲) محمد یار خاں امیرؔ کا دیوان یہاں نہیں ہے۔
(۳) "یادگارِ ضیغمؔ" یہاں نہیں ہے۔
(۴) بیمارؔ کا قلمی دیوان محفوظ ہے۔
(۵) قائمؔ کا تذکرہ[۱۱] یہاں ہے۔ قدرت اللہ شوقؔ کا تذکرہ شعرا[۱۲]ے اردو نہیں ہے۔ فارسی گو شاعروں
کا تذکرہ[۱۳] محفوظ ہے۔
(۶) دیوانِ شہیدی کے ہمارے یہاں ۳ نسخے ہیں۔ ان میں سے ایک کے صفحات ۲۱۲ ہیں۔ یہ
غالباً کلیات ہی ہے۔
ہمارے یہاں نواب احمد حسن خاں[۱۴] جوشؔ کا صرف ایک دیوان مسمّیٰ[۱۵] "چمنستانِ جوش" ہے۔
بیمار کو شاگرد مصحفی بتایا ہے، امیر مینائی مرحوم نے انتخابِ یادگار میں۔ چونکہ یہ اسی سلسلے کے شاگرد ہیں،
اس لیے یقین ہے کہ اپنے استاد اسیرؔ[۱۶] سے ایسا سنا ہوگا۔

والسلام مع الاکرام
مخلص عرشی

خط نمبر ۱۰

رامپور رضا لائبریری، رام پور- تاریخ ۷ فروری ۶۴ء

مکرم- میں نے آپ کا مقالہ[16] پڑھا تھا- ماشاء اللہ خوب لکھا ہے- مگر کیا آپ کے خیال میں مجھے آپ سے خوب تر کی توقع نہ تھی؟ جناب، آپ بھی انھیں چند اصحاب میں ہیں، جن کو میں اس نئی نسل کا تحقیقی نمائندہ جانتا ہوں۔

والسّلام

دعا گو عرشی

خط نمبر ۱۱

رامپور رضا لائبریری، رامپور- تاریخ ۵ جولائی [illegible]

مکرمی، سلام مسنون

مودت نامہ ملا- آج کی ڈاک سے معارف[17] کا تازہ پرچہ بھی آگیا تھا- اسے پڑھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں- آپ نے نواب محبت خان پر بڑا اچھا مقالہ لکھا ہے- مجھے اشعار کا انتخاب بہت ہی بھایا- ان کا دیوان[18] ابھی تک پورا نہیں پڑھا تھا، اس لیے یہ خیال نہ تھا کہ اس میں اتنے اچھے شعر اس بہتات کے ساتھ ہونگے-
آپ نے ان کی ایک تصنیف[19] کے وجود سے انکار کیا ہے، جو فنِ لغت پر ہے- میں آپ کو مژدہ دیتا ہوں کہ وہ لغت ہمارے یہاں موجود ہے- چونکہ یہ پشتو فارسی لغت ہے، اس لیے آپ کی نظر اس پر نہیں پڑی-
انشاء اللہ آپ پدمادت کے سلسلے میں تشریف لائینگے، تو اسے بھی ملاحظہ فرمائینگے-
عشرت بریلوی کی پدمادت ہمارے یہاں موجود ہے، مگر یہ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی تھی- نولکشور ایڈیشن ہمارے پاس نہیں- والسّلام-

مخلص عرشی

خط نمبر ۱۲

رضا لائبریری، رام پور

یوپی (انڈیا)- مورخہ ۲۸ ستمبر ۶۴ء

مکاتیب امتیاز علی خاں عرشی

مکرم و محترم ۔

پہلے[20] تو معافی چاہتا ہوں آپ کے مودت نامے کے جواب میں نامناسب تاخیر کی۔ مگر یقین فرمایئے کہ اپنی مصروفیت کے پیش نظر بہت جلد جواب دے رہا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے خط پڑھ کر سوچا کہ کام جو ہاتھ میں تھا، اسے پورا کر کے آج ہی جواب لکھوں گا۔ بس یہ طے کر کے خط کو ہاتھ سے رکھا تھا کہ آج تک یاد نہ آیا۔ اب جو اپنی میز کو دیکھا، تو دوسرے خطوط کے ساتھ فوری جواب طلب خط بھی یونہی رکھا ہوا ملا۔ بعد شرمندگی معذرت خواہ ہو کر یہ جواب لکھ رہا ہوں ۔

(۱) میر غلام علی عشرت کی تاریخ وفات ۱۲۳۶ھ ہی ہے مثنوی کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ وفات درج ہے، وہ غلام اخی بلگرامی نے انھیں کی وفات پر لکھا ہے۔ کاتب نے حاشیے پر سرخی سے جو عنوانات لکھے ہیں، ان میں اس قطعۂ تاریخ سے پہلے لکھا ہے " تاریخ فوت ناظم " "۱۲۳۶ھ" خود قطعۂ نگار کے آخری دو شعر ہیں -

پس از ماتم او ، اخی رُونہاد	سُوی فکرِ تاریخِ آں خوش نہاد
بدیں حال از طبعِ نیکو سرشت	شنیدم کہ شد جای او در بہشت

اس کی تائید امیر مینائی کے اس بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے انتخاب یادگار ص۲۲۸ میں درج کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :" بارہ سو چھتیس ہجری میں انھوں نے انتقال کیا۔ مولوی عبدالملک[21] ممتاز نے "ہای میر عشرت" مادۂ تاریخ کہا "

۱۲۳۶

شیفتہ کا انداز دوسری جگہ بھی اسی قسم کا ہے ۔ اس کے لفظوں سے حیات ثابت نہیں ہوتی ۔ غلام علی عشرت کے بارے میں کریم الدین نے اپنے تذکرے[22] میں لکھا ہے (ص۳۰) "عشرت غلام علی عشرت ۔ اس نے ایک مثنوی دکنی زبان میں لکھی ہے ۔ اس کتاب میں حال پدماونت کا مندرج کیا ہے ۔ یہ قصہ بہت پسندیدہ ہے ، جس کا نام اور حال درمیان بیان حال جائسی کے لکھینگے ۔ عشرت آپ بیان کرتا ہے کہ اس نے اس تاریخ کو اپنے ملک کی زبان میں اس لیے لکھا ہے کہ وہ بہت دلپسند اور دلکش قصہ ہے ۔ اس کی عبارت صاف اور سلیس اور بہت خوب ہے" اس کے بعد ص۳۵۵ پر لکھا ہے :

عشرت تخلص میر غلام علی بریلوی کا ہے ۔ اس نے مرزا علی لطف سے اصلاح شعر کی

بھی ملی ہے، جو کہ مرزا رفیع کا شاگرد تھا ... دیوان ہے - یہ شعر اس کے ہیں -

لسانِ جامِ خالی بھی تھا لا لوقِ چشم پر خوں کو نہ دیکھوں گر مرا 3 ہوا را س مخمور کی گردن الخ

اس کے بعد شعر اور نقل کیے ہیں - آخری شعر سے پہلے لکھا ہے :

یہ غزل بہت مشہور ہے اور قوال بھی اور کنچنیاں بھی گاتی ہیں - یہ شعر بھی اسی کا ہے :

غیروں سے بنا وہ جو مرے سامنے عشؔ کچھ بس نہ چلا دیکھ کے آنسو نکل آئے

پہلے نوٹ میں کریم الدین نے دھوکا کھایا ہے - وہ یہ نہ جان سکا کہ پدِ مادر (یعنی) اسی زبان میں ہے، جس میں دیوانِ عشرت ہے، اور یہ دونوں ایک ہی [۲۴] شخص کی تالیف ہیں - والسلام -

مخلص عرشی

خط نمبر ۱۳

رامپور رضا لائبریری، رام پور - مورخہ ۴ جون ۶۵ ء

مکرمی، تسلیم -

مودّت نامہ ملا - میں نے عشرت پر آپ کا مقالہ [۲۵] پڑھا تھا - اور آپ کو داد بھی دی تھی اور دعا بھی کہ آپ اپنے وطن کے نیم فراموش شدہ اربابِ ادب کو پھر سے یاد دلا کر ہم سب کا فرض ادا کر رہے ہیں - خدا اور توفیقِ کار عطا کرے - آمین !

میں نے طباعت و کتابت کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا تھا، یہ تو ہماری ناگریز مصیبت ہے - والسلام

مخلص عرشی

خط نمبر ۱۴

رامپور رضا لائبریری، رام پور - تاریخ ۲۳ اپریل ۶۶ ء

صدیقِ محترم، سلام مسنون -

مبارک باد کا دلی شکریہ عرض کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ خدائے کریم آپ کو پہلے سے زائد توفیقِ کار عطا فرمائے - آمین -

آپ کی علالت کی اطلاع سے تشویش ہوئی - آپ کو چاہیے کہ مطالعہ کم کریں، اور آرام زیادہ، نیز غذا میں باقاعدگی برابر رہے - انشاء اللہ آرام اور ہلکی باقاعدہ غذا اس اعصابی ضعف کو دور کر دیگی -
اپریل کا مہینا ختم پر ہے - آپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا - بوالہوس بتا یہے کہ کیا امر مانع رہا - خدا نخواستہ پھر مزاج ناساز تو نہیں ہو گیا ! والسلام -
مخلص عرشی

خط نمبر ۱۵

رامپور رضا لائبریری، رامپور - تاریخ ۲۳ مئی ۶۶ء
مکرمی - تسلیم مع التکریم -
(۱) نوابین رامپور کے سنِ جلوس اور سنِ وفات کا نقشہ نقل کرا کے کل یا پرسوں بھیجونگا -
(۲) نفائس اللغات کا مصطفائی والا نسخہ یہاں ہے -
(۳) نادر بریلوی[27] کا دیوان یہاں نہیں ہے -
آپ کا عزیز بریلوی[28] پر مقالہ میں نے پڑھا تھا اور یاد پڑتا ہے کہ کسی خط میں اس کی داد بھی دی تھی - آپ جو کام کر رہے ہیں، وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں - ایسے دلجمعی اور محنت سے کام کرنے والے ہم میں کتنے ہیں - خدا آپ کو صحت و عافیت عطا کرے اور کام کی مزید توفیق عطا فرماتے ! والسلام -
مخلص عرشی

خط نمبر ۱۶

رضا لائبریری، رامپور -
یوپی (انڈیا) تاریخ ۳ جنوری ۶۷ء
صدیقی الاعز، سلمک اللہ تعالےٰ !
سالِ نو کی مبارک باد کا شکریہ - خدا آپ کو بھی شادکام و بامراد زندگی سے نوازے !
شیو چرن سوز[29] صاحب نے اپنے قیامِ رامپور میں مجھے اپنی بیاض دی تھی - میں نے اسے اول سے آخر تک

پڑھ کر انھیں بتادیا تھا کہ اردو اصولِ فن کے لحاظ سے اس میں کیا کیا اور کہاں کہاں کوتاہی ہے۔ کہیں کہیں لفظ بھی بدل دیے تھے۔ یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ وہ ان غزلوں وغیرہ پر نظرِ ثانی کر کے طبع کرائیں۔ مگر جیسا کہ انھوں نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے، کسی وجہ سے اسے بغیر ترمیم و اصلاح کے شائع کرنے پر مجبور ہو گئے۔

رہا اس پر تبصرے کا سوال، تو میری دانست میں یہ غیر ضروری ہے۔ آپ صرف ایک خط میں انھیں یہ مشورہ دے دیجیے کہ آیندہ ایڈیشن میں وہ بھرپور ترمیم کر دیں تاکہ یہ کلام اصول وضوابط کے ماتحت آجائے۔ اگر سعادت مند ہوں گے، مانیں گے، نہیں تو وہ جانیں اور ان کا کام۔ میں اور آپ اس بدذوقی کو کہاں تک روکیں گے۔

بیمار پر آپ کا پُرمغز و پُراطلاع مقالہ پڑھ لیا اور آپ کے لیے دعا کی۔ حقیقت[۳۱] پر مقالہ مرتب ہو کر چھپا تو اس سے بھی استفادہ کروں گا۔ خدا کرے آپ کے ذریعے حقیقت کے تذکرہ شعرا[۳۲] کا پتا معلوم ہو جائے ورنہ ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی حل کرنا ہے کہ کیا اس کا نام تذکرۂ احبا تو نہیں تھا جس کا ذکر ترجمہ مخزنِ نکات میں ہے۔

رمضان میں اس قدر سردی مجھے پہلے یاد نہیں آتی۔ رات عشا کی نماز کے لیے میں وضو کرنے کمرے سے صحن میں آیا۔ سارا بدن ایسا کانپنے لگا کہ میں نے خوف کے مارے تجدیدِ ایمان تک کر لی۔ خدا رحم کرے۔ جن غریبوں کے پاس سردی سے بچنے کا کافی سامان نہیں ہے، ان کی حالت سوچ کر دل ڈھلتا ہے۔ والسلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۱۷

رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ تاریخ ۲۷ جون ۶۷ء

محترمی۔ تسلیم۔

ہمارے یہاں حقیقت کی مثنوی ہیر امن طوطا نہیں ہے۔

ابھی تک تذکرۂ احبا کا پتا بھی نہ لگ سکا۔ جب بھی کچھ معلوم ہوگا، آپ کو بتاؤں گا۔ والسلام

مخلص عرشی۔

خط نمبر ۱۸

رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ تاریخ ۱۷ اکتوبر ۶۷ء

محترمی، تسلیم

آپ کا مقالہ معارف[۳۳] کے شمارۂ ماہ اگست میں بعنوان "بریلی کے خاندانِ مفتیان کی شاعری" شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے پاس ہنوز یہ پرچہ نہ آیا ہو تو اعظم گڈھ کو لکھیے۔

سراج الحسن[۳۴] صاحب سے ملنے اکبر علی سلمہٗ کو بھیجونگا، اور آپ سے اور موصوف سے قبل از وقت پروگرام طے کرا لوں گا۔

خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو! والسلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۱۹

رامپور رضا لائبریری، رام پور۔ تاریخ ۱۱ مارچ ۶۸ء

مکرمی۔ تسلیم۔

عید مبارک!

نشتر[۳۵] ہمارے یہاں ہے۔ آپ تشریف لاکر ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کا مقالہ[۳۶] پڑھ کر اپنی رائے ظاہر کرونگا۔ ویسے آپ کے مقالے پڑھتا رہا ہوں۔ اس لیے یقین رکھتا ہوں کہ خوب ہوگا۔

الحمدللہ کہ آپ بخیر ہیں! خدا صحت و سلامتی کے ساتھ توفیقِ کارِ مزید عطا فرمائے! والسلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۲۰

رضا لائبریری، رامپور۔

یوپی (انڈیا)۔ تاریخ ۳ مئی ۶۸ء

مکرمی، تسلیم مع التکریم!

فہرست تذکرۂ کہات دیکھی۔ میری دانست میں آپ نے مختلف اوقات میں جو یادداشتیں لکھی تھیں انھیں کہیں یکجا کر لیا ہے۔ ورنہ ایسی فہرست کسی رسالے میں تو شائع ہوئی نہیں۔

خدا کرے، تذکرۂ احبا کہیں دستیاب ہو جائے۔ یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو گا۔ ویسے مجھے آپ کی رائے سے گونہ اتفاق ہے کہ تذکرۂ امام بخش، تذکرۂ احباب سے الگ کتاب ہے، جس کی ترتیب کا خیال حقیقۃً کو بعد میں آیا ہوگا۔ باقی یہ ممکن ہے کہ اس میں اور تذکرۂ امام بخش میں بہت کچھ حصہ مشترک ہو۔

اکبر سلمہ اب اچھا ہے۔ ایک دہلی کے ڈاکٹر ہیں؛ ان کا علاج ہے۔ والسّلام۔

مخلص عرشی

[پس نوشت]

محسن کے ترجمۂ مخزن نکات کا کچھ حصہ اور مل گیا ہے۔ عرشی

خط نمبر ۲۱

رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ تاریخ ۱۰ ستمبر ۶۹ء

محترمی، تسلیم مع التکریم۔

عرصے کے بعد زیارت ہوگی۔ آپ جب مزاج چاہے تشریف لائیے۔ یہاں تمام وہ سہولتیں ملینگی جو آپ برتتے چلے آرہے ہیں۔

تذکرۂ امام بخش کشمیری تو عنقا ہے۔ بیچارے صاحب شعر الہند کہاں سے دیکھ لیتے۔ انھوں نے فہرست میں اس کا نام اس طور پر نہیں دیا ہے کہ وہ اسے پڑھ چکے ہیں۔ آپ دوبارہ شعر الہند ملاحظہ فرمائیں۔

اکبر سلمہ دلی گئے ہوئے ہیں۔ آئینگے تو آپ کا سلام کہونگا۔ میں تقریباً ایک سال پھر درد دل میں مبتلا رہا۔ اب اچھا ہوں۔ والسّلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۲۲

رضا لائبریری، رامپور۔
یوپی (انڈیا) مورخہ ۱۹ مارچ ۷۰ء
مکرمی، سلام مسنون
عرصے سے آپ کا کوئی مکتوب نہیں ملا۔ یہ آپ کے علم میں ہوگا کہ میں مسلسل ڈیڑھ برس سے قلب کی شکایت میں مبتلا ہوں۔ اب بحمد اللہ پہلے سے بہت فرق ہے۔
کئی ماہ پہلے مفتیان بریلی پر آپ کا گرانقدر مقالہ پڑھا تھا۔ ماشاء اللہ خوب دادِ تحقیق دی تھی۔
آج معلوم ہوا کہ مفتی سید احمد خاں کے نام غالب کا فارسی مکتوب مکمل شکل میں آپ کے پاس ہے۔ اس خط کا ایک حصہ تذکرۂ "شمیم سخن" کے حوالے سے مجھے ملا تھا اب اس اطلاع سے خوشی ہوئی۔ از راہِ لطف وکرم اس کل خط کی نقل سے مجھے بجواب نوازیے۔ یہ نقل مجھے زیرِ ترتیب خطوطِ فارسی اور غالب کے خطوط کے اردو ترجمے کے لیے درکار ہے (ترجمہ اکبر سلمہٗ نے کیا ہے اور آج کل پریس میں ہے)
اس خط کے علاوہ بھی اگر آپ کے علم میں غالب کا کوئی نادر خط اردو یا فارسی اور کچھ کلام اردو یا فارسی ہو، تو حوالے سے اطلاع دیجیے۔ مختصراً مکتوب الیہ کا نام بھی لکھ دیجیے گا۔
خط کی نقل کا انتظار رہیگا۔
آج کل آپ کا مزاج کیسا ہے؟ والسلام
مخلص عرشی

یہ تحریر حاشیے پر ہے:
کیا اس خط کی اصل بخطِ غالب آپ کے سامنے ہے' یا نقل؟ حوالہ مکمل عنایت ہو۔

خط نمبر ۲۳

رامپور رضا لائبریری، رامپور۔ تاریخ ۲۵ مارچ ۷۰ء
مکرمی، تسلیم۔
ابھی ابھی لفافہ اور اس میں ملفوف غالب کے فارسی خط کی نقل ملی۔ اس لطف کے لیے شکرگزار

ہوں۔ جوابی لفافہ اس لیے رکھ دیا تھا کہ آپ اسی وقت جواب دے دیں۔ یہ معلوم نہ تھا کہ میں پتا بھی غلط لکھ رہا ہوں۔ خیر خط آپ کو مل تو گیا۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد اور آپ کے حوالے کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ جن صاحب نے یہ خط شائع کرایا ہے، ان کے پاس اس کی اصل بھی ضرور ہوگی۔ قرائن یہی بتاتے ہیں۔ کیا آپ کے ان سے کچھ مراسم ہیں کہ اصل خط کا ایک عکس مل جائے۔ جو خرچ ہوگا، حاضر کر دیا جائیگا۔ یہ عکس بھی اکبر سلمۂ کی ایک زیر ترتیب کتاب جس کا نام ہے: " بخطِ غالب تحریروں کا البم " کے لیے درکار ہے۔ اور اگر مل جائے، تو بہت اچھا ہو۔ اگر یہ صاحب یعنی ابرار[۴۱] علی صدیقی پاکستان میں ہوں، تو وہاں سے عکس حاصل کرنے کی تدبیر فرمائیں مع نیگیٹو کے۔ یہ ضروری ہے تاکہ حسبِ ضرورت انلارج کرا لیا جائے۔

اکبر سلمۂ کا ترجمہ خطوطِ غالبِ فارسی جیسے ہی شائع ہوگا، اطلاع دی جائیگی۔

آپ کی اچانک علالت کا علم ہوا۔ خدا کا شکر ہے، آپ صحت یاب ہوئے۔ اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے! میں آپ کے حسنِ ذوق اور محنت دونوں کا مدّاح ہوں اور مزید توفیقِ کار کے لیے دعا کرتا ہوں۔

شکور[۴۲] صاحب کے انتقال کا مجھے بھی صدمہ ہوا۔ میرے بھی ان سے مخلصانہ مراسم تھے۔ آج ان کی صاحبزادی[۴۳] کو تعزیت نامہ بھیجا ہے۔ خدا مغفرت فرمائے! والسّلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۲۴

رضا لائبریری، رامپور۔
یوپی (انڈیا)۔ تاریخ ۲۸ نومبر ۷۶ء

محترمی، تسلیم

مکرمت نامے کا شکریہ۔ ہمارے یہاں ضیا نخشبی کی حسب ذیل کتابیں محفوظ ہیں:

(۱) چہل ناموس اکبر (۸۶۰)
(۲) سلک السلوک (۸۶۲)

(۳) رسالۂ عشقیہ (۸۶۴)
(۴) طوطی نامہ (۳۰۴۰)
میں بحمد اللہ بخیر ہوں، اور آپ کی خیریت کا خواہاں - والسلام -
مخلص عرشی

خط نمبر ۲۵

رضا لائبریری، رامپور -
یوپی (انڈیا) - تاریخ ۱۰ جنوری ۷۴ ء
مکرمی ومحترمی، سلام مسنون کے بعد سالِ نو اور بکر ید کی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر وعافیت ہونگے -
میری جس تالیف کا نسخہ آپ نے طلب فرمایا ہے، اس کا نام ہے، " اردو میں پشتو کا حصّہ " یہ کتاب پشتو اکاڈمی، پشاور نے ۱۹۷۰ ء میں شائع کی تھی - سوءِ اتفاق سے اس کا ایک ہی نسخہ مجھے ملا اور وہ میں نے لائبریری میں داخل کر دیا بعد ازاں چند احباب کو ایک ایک منگا کر بھی دیا - انھیں میں مسعود حسین خاں[۲۴] صاحب بھی شامل ہیں - اب حالات بدل گیے، ورنہ پشاور سے آپ کو بھی منگا دیتا - اگر اس[۲۵] کتاب کی آپ کو ضرورت ہو، تو کسی اتوار کو تشریف لے آیئے اور اسے دیکھ جایئے - آپ کے کام کے ساتھ ہمارا کام بھی ہو جائیگا -
اکبر سلّمہٗ سلام عرض کرتا ہے - والسلام -
مخلص عرشی

خط نمبر ۲۶

پھلواڑ، رامپور - ۱۸ اپریل ۷۴ ء
محترمی، سلام مسنون -

ھ میں نے اس خط کا درمیانی پیرا نقل نہیں کیا ہے -

آپ کا تہنیت[۲۷] نامہ ملا۔ اس لطف وکرم کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ پروردگار آپ کو بلند ترین اعزاز سے نوازے۔
امید ہے کہ آپ کی تازہ تالیف طباعت کے مرحلے سے گزر کر بازار میں آگئی ہوگی۔ خدا اسے حسنِ قبول عطا فرمائے! والسلام۔

مخلص عرشی

خط نمبر ۲۷

رام پور رضا لائبریری، رامپور۔ تاریخ ۲۴ جولائی ۷۴ء

صدیق محترم، سلام مسنون۔

آپ کا مودت نامہ اور جگر پر تصنیف کردہ کتاب دونوں ملے۔ اس لطف وکرم کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے پوری کتاب دو نشستوں میں پڑھ ڈالی۔ ماشاء اللہ بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ ایک ہموطن کا واقعی انداز میں بہترین تعارف بھی کرا دیا اور حق و انصاف کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپ کی زبان جیسی شستہ و پاکیزہ ہے، ویسا ہی دلنشیں بیان بھی ہے۔ اللہ مزید توفیقِ کار عطا فرمائے۔ میں اچھا ہوں، مگر دن بدن کمزوری بڑھ رہی ہے۔ حضرت فاروق اعظم کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال پر کام شروع کر دیا ہے۔ دعا فرمائیے کہ ان کی تکمیل کی مہلت مل جائے!
اکبر سلام عرض کرتے ہیں۔ والدعا۔

احقر عرشی

توضیحات

۱۔ سیر کہسار (ناول) دو جلد۔ از رتن ناتھ سرشار۔

۲ - خدائی فوجدار رتن ناتھ سرشار - یہ ڈان کی زوٹ کا اردو ترجمہ ہے۔
۳ - مثنوی اسرارِ محبت ۱۱۹۷ ہجری - از نواب محبت خاں محبت (متوفی ۱۲۲۴ ہجری)
۴ - طلسم بیضا از شیخ علی بخش بیمار (متوفی ۱۸۵۴ء) - بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ۔ طلسم بیضا کا نسخۂ رام پور ۱۲۷۱ ہجری کا ہے۔
۵ - اس وقت شاید عرشی صاحب کو یہ خیال تھا کہ میں محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں محکمۂ تعلیم سے کبھی وابستہ نہیں ہوا۔
۶ - پی ایچ ڈی (آگرہ یونیورسٹی)۔ موضوعِ تحقیق: "رتن ناتھ سرشار اور ان کی خدمتِ ادبِ اردو"۔ یہ مقالہ بعد نظرِ ثانی انجمن ترقی اردو، کراچی سے بعنوان "رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔
۷ - مبارک باد بہ سلسلۂ ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ ۱۹۶۱ء
۸ - نواب محمد یار خان امیر (متوفی ۱۷۷۵ء) شاگرد قائم چاند پوری - برادرِ خوردِ نواب فیض اللہ خان ریاست رامپور۔
۹ - یادگارِ ضیغم (تذکرۃ الشعرا) از محمد عبداللہ خان ضیغم - (مطبع قادری حیدر آباد دکن، ۱۳۰۲ ہجری)۔
۱۰ - شیخ علی بخش بیمار (متوفی ۱۸۵۴ء)
۱۱ - مخزن نکات (۱۱۶۸ ہجری)
۱۲ - طبقات الشعرا (۱۷۹۶ء)
۱۳ - تکملۃ الشعرا (۱۸۰۴ء)
۱۴ - اندانِ روہیلہ بریلی کے نامور شاعر - ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۲ - ۱۸۸۳ء) میں بعمر ساٹھ سال انتقال کیا۔
۱۵ - مظفر علی خان اسیر لکھنوی (متوفی ۱۸۸۱ء)
۱۶ - کرامت علی خان شہیدی۔ (مطبوعہ معارف اعظم گڈھ - جنوری، ۱۹۶۴ء)
۱۷ - معارف اعظم گڈھ - جون، ۱۹۶۴ء

۱۸- دیوان اردو مشتمل بہ غزلیات (قلمی) مخطوطہ رامپور۔

۱۹- لغت کا نام ریاض المحبت ہے۔ میں نے اپنے مضمون " محبت خاں محبت اور ان کا کلام " (مطبوعہ معارف اعظم گڈھ مئی و جون، ۱۹۶۴ء) میں اس لغت کا شمار محبت کی تلف شدہ کتابوں میں کیا تھا۔ عرشی صاحب کی نشاندہی پر یہ لغت دستیاب ہو گئی اور مضمون میں مناسب تبدیلی کردی گئی۔ یہی مضمون میری کتاب "چند شعرائے بریلی" (۱۹۷۶ء) میں شامل ہوا جس میں "ریاض المحبت" کا تعارف کرادیا گیا ہے۔

۲۰- میں میر غلام عشرت کے سالِ وفات کے سلسلے میں الجھ گیا تھا۔ بالآخر میں نے اپنی الجھن عرشی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور انھوں نے اس کو دور کر دیا۔

۲۱- ۱۸۵۷ء سے پہلے بریلی کے ایک شاعر۔

۲۲- مطلب یہ ہے کہ "گلشن بیخار" میں جو انداز شیفتہ نے عشرت کے متعلق اختیار کیا، وہی انداز دیگر شعرا کے متعلق بھی اختیار کیا ہے۔ اس بات کا اظہار اس وجہ سے ہوا کہ میں نے عشرت کے سنہ وفات پر بحث کرتے وقت شیفتہ کا حوالہ دیا تھا۔ میری دیگر الجھنوں میں سے شیفتہ کی تحریر بھی ایک الجھن تھی۔

۲۳- طبقات الشعرائے ہند۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

۲۴- پدماوت (۱۷۹۶ء) میر ضیاء الدین عبرت (متوفی ۱۷۸۸ء) اور میر غلام علی عشرت (متوفی ۱۲۳۶ ہجری) کی مشترکہ تصنیف ہے۔ عبرت نے ابتدائی حصہ لکھا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد اس کی تکمیل عشرت نے کی۔

۲۵- " میر غلام علی عشرت " مطبوعہ قومی زبان۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۷ء

۲۶- مبارک باد "نذر عرشی" کے سلسلے میں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی، جس کے زیرِ اہتمام "نذر عرشی" کی تدوین ہوئی اور اس کے بعد یہ یادگار جلد عرشی صاحب کو ان کی خدماتِ ادب کے صلے میں پیش کی گئی۔ اسے مالک رام اور مختار الدین احمد نے مرتب کیا تھا۔

۲۷- مرزا عباس بیگ نادر تلمیذ آتش لکھنوی۔ بریلی کے معروف شاعر گذرے ہیں۔ نواب باندہ کے ملازم تھے۔ بغاوت کے الزام میں صرف چالیس سال کی عمر میں ۱۸۵۸ء کے پر آشوب دور میں

دار پر کھینچے گئے۔ الزام کا باعث یہ شعر تھا ؎

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے ۔ گوروں کے پاؤں اکھڑ گئے کالوں کے سامنے

تختۂ دار پر چڑھنے سے پہلے یہ شعر پڑھا تھا، جو ضرب المثل بن چکا ہے :

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہونگے ۔ چرچے یہی رہینگے، افسوس، ہم نہ ہونگے

۲۸۔ "نواب عبدالعزیز خان عزیز اور ان کا کلام" مطبوعہ معارف اعظم گڑھ۔ اپریل ۱۹۶۶ء

۲۹۔ شوچرن لال سوز بریلوی نے اپنا مجموعۂ کلام "صدائے سوز" (مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں ۱۹۶۶ء) مجھے بھیجا تھا۔ "صدائے سوز" کے دیباچے میں لکھا گیا تھا " میں بہت کرتگیہ ہوں جناب عرشی رامپوری کا جنھوں نے میری تک بندی کو سدھارنے میں کئی بہومولیہ باتیں بتائیں۔ پرنتو میں ان کی رائے کے انوسار صحیح صحیح سدھار نہیں کر پایا ہوں"۔ (ص ۳) ان کی زبان شعر کا اندازہ مذکورہ زبان نثر سے کر لینا کافی ہوگا۔ لہذا عرشی صاحب کے مکتوب گرامی کو ان سطور کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

۳۰۔ "شیخ علی بخش بیمار" مطبوعہ معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

۳۱۔ میر حسین شاہ حقیقت (متوفی ۱۲۴۹ ہجری)۔ بریلی کے ایک نامور شاعر۔ ان کے حالات اور جملہ تصنیفات پر میرا مقالہ بعنوان "میر حسین شاہ حقیقت" معارف اعظم گڑھ۔ جولائی و اگست ۱۹۶۸ء میں طبع ہوا تھا۔

۳۲۔ تذکرۂ احبا

۳۳۔ معارف، اعظم گڑھ

۳۴۔ بریلی کے ایک پرانے کارکن۔ جارج فلنتون مولف تذکرہ شعرائے رام پور (نسخہ رضا لائبریری رامپور) آپ کے جد تھے۔ بریلی میں ایک محلہ فلنتون گنج ان کے نام پر ہے۔ ان کے متعلق تحقیق کرنے کے لیے اکبر علی خان کو سراج الحسن صاحب سے ملاقات کرنی تھی۔

۳۵۔ از سید محمد حسن ضبط۔ زبان فارسی۔ موضوع ایک سچی عشقیہ کہانی۔ تاریخ تصنیف ۱۷۹۰ء میر حسین شاہ حقیقت نے اس کا اردو ترجمہ بعنوان "جذب عشق" ۱۷۹۷ء میں کیا۔ سید محمد حسن ضبط، میر حسین شاہ حقیقت کے برادر کلاں اور جرأت کے شاگرد تھے۔

۳۶ - دیکھیے مذکورہ بالا سلسلہ نمبر ۳۱ -

۳۷ - حقیقت، امام بخش خان کشمیری کے منشی تھے - امام بخش خان کشمیری سے ایک تذکرۃ الشعرا منسوب ہے، جس کا حوالہ صاحبِ شعر الہند نے دیا ہے - مصحفی کا خیال تھا کہ جرأت کی سازش سے ان کے خام تذکرۃ الشعرا (تذکرۂ ہندی) سے امام بخش خان کشمیری نے سرقہ کیا۔ جس کے الزام میں جرأت اور حقیقت دونوں شریک تھے کیونکہ حقیقت، امام بخش کشمیری کے منشی تھے اور ان کو یہ ملازمت جرأت کی سفارش پر ملی تھی۔ لہذا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اصل ملزم کون ہے، امام بخش خان کشمیری مؤلفِ تذکرۂ امام بخش کشمیری، یا میر حسین شاہ حقیقت مولفِ تذکرۂ احبا - فیصلہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ تذکرۂ امام بخش خان کشمیری اور تذکرۂ احبا فراہم ہوجائیں اور ان کا موازنہ مصحفی کے تذکرۂ ہندی سے کرلیا جائے -

تذکرۂ امام بخش خان کشمیری کی اطلاع مجھے ایک فہرست تذکرہ جات سے ملی، جو میرے قلم سے تیار کی ہوئی تھی مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں نے مذکورہ فہرست کہاں سے نقل کی ہے - لہذا میں نے عرشی صاحب کو اس خیال سے بھیج دی کہ ممکن ہے وہ کوئی حوالہ بتادیں -

بعد کو معلوم ہوا کہ میں نے یہ فہرست شعر الہند سے نقل کی تھی -

تذکرہ امام بخش خان کشمیری اور تذکرۂ احبا ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں - حقیقت صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے - ان کے علم و فضل کے پیشِ نظر یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مصحفی کے خام تذکرے سے سرقہ کیا ہوگا - مزید برآں یہ امر ہنوز متنازعہ ہے کہ مصحفی کا الزام صحیح ہے بھی یا نہیں - جب تک دونوں تذکرے فراہم نہ ہوں، مصحفی کے بیان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا -

۳۸ - دیکھیے مذکورہ بالا سلسلہ نمبر ۳۷ -

۳۹ - " بریلی کے خاندانِ مفتیان کی شاعری کا مختصر جائزہ " مطبوعہ معارف اعظم گڈھ — اگست ۱۹۶۷ء

۴۰ - عرشی صاحب کو یہ اطلاع اسلامیہ کالج، بریلی کے غالب نمبر سے ملی تھی، جس کو ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی لکچرار اردو کالج ہذا نے مرتب کیا تھا -

۴۱ - مذکورہ مکتوب غالب، مفتی سید احمد خان سید (متوفی ۱۸۵۸ء) کے نام ہے - مفتی صاحب

قاضی عبدالجمیل جنوں (متوفی ۱۹۰۰ء) کی اہلیہ کے حقیقی ماموں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے الزام میں انڈمان بھیجے گئے۔ بعد رہائی بھی خاکِ وطن نصیب نہیں ہوئی۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے فوت ہوگئے ان کا نام ایک مکتوبِ غالب ابرار علی صدیقی نے "آئینۂ دلدار" (جو مولانا دلدار علی مذاقؔ بدایونی متوفی ۱۸۹۴ء تلمیذِ ذوقؔ کے حالات پر مشتمل ہے) میں نقل کیا ہے۔ "آئینۂ دلدار" کراچی میں چھپی تھی (اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۶ء) اور ابرار علی صدیقی بھی کراچی میں رہتے ہیں۔ کوششِ بسیار کے باوجود اصلی خط یا اس کا عکس نہ مل سکا۔

۴۲ - دیکھیے مذکورہ بالا سلسلہ نمبر ۴۱

۴۳ - پرنسپل عبدالشکور - آپ کی وفات ۸ امارچ ۱۹۷۰ء کو ہوئی۔

۴۴ - محترمہ راشدہ شکور، حالیہ لکچرار اردو، بریلی کالج بریلی۔ (روہیلکھنڈ یونیورسٹی)

۴۵ - ملا ضیاء الدین نخشبی - ان کا مولد نخشب تھا - خود فرماتے ہیں۔ ؎

ضیاؔ ز نخشب وشکر ز مصر و سعدی از شیراز ز ہر شہرے و ہر جائے متاعِ قیمتی خیزد

کمسنی میں اپنے والد کے ساتھ بدایوں تشریف لائے۔ شاعر تھے، فاضلِ اجل تھے، علمِ موسیقی کے ماہر تھے، زاہد و متقی تھے۔ صاحبِ نسبت درویش تھے اور حضرت شیخ قاضی حمیدالدین ناگوریؒ (متوفی ۶۴۳ ہجری مطابق ۱۲۴۵/۱۲۴۶ء) کے پوتے حضرت مولانا شیخ فریدؒ کے مرید تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ دس کتابوں کے نام میرے علم میں آئے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سلک السلوک۔ (۲) عشرۂ مبشرہ (۳) کلیات وجزئیات (۴) طوطی نامہ۔ (۵) شرح سورۂ فاطلبی تجدلی (۶) چہل ناموس (۷) لذت النساء (۸) گل ریز (۹) رسالۂ عشقیہ (۱۰) شرح دعاء سریانی۔

نخشبی نے سنسکرت شکا سپ ستی کی ۷۰ کہانیوں میں سے ۵۲ کہانیوں کا انتخاب کر کے فارسی میں ترجمہ کیا (۷۳۱ ہجری مطابق ۱۳۳۰/۱۳۳۱ عیسوی) اور اس کا نام طوطی نامہ رکھا۔ نخشبی کے طوطی نامے کا منظوم ترجمہ بزبانِ دکنی غواصی نے ۱۰۴۹ ہجری مطابق ۱۶۳۹/۱۶۴۰ عیسوی اور ابن نشاطی نے ۱۰۷۱ ہجری مطابق ۱۶۶۰/۱۶۶۱ عیسوی میں کیا۔

نخشبی کی وفات ۷۵۱ ہجری مطابق ۱۳۵۰ عیسوی میں ہوئی۔ "مجذوب" مادۂ تاریخ رحلت ہے

۲۴ رمضان تاریخ عرس ہے۔ بدایوں میں ان کا پختہ مزار تکیہ کمال شاہ میں اندرون درگاہ حضرت شیخ حسن مکی (یعنی پیر مکہ چشتی) بالائے چبوترہ شہاب الدین مہمرہ واقع ہے۔
نخشبی کے حالات فارسی شعرا کے تذکرات مثلاً کلمات الشعرا، نتائج الافکار، سفینۂ ہندی وغیرہ اور تذکرۃ الاولیا مثلاً عظمت الاولیا، باقیات الصالحات، خزینۃ الاصفیا وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ ان کی کتب بھی مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں ۔ شاید ان کی حیات اور کارناموں پر ابھی تک کوئی کتاب نہیں چھپی ہے، جس کی ضرورت ہے۔
۴۶۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو" (طبع چہارم ۱۹۷۰ء۔ سرسید بک ڈپو، علیگڑھ) میں صفحہ ۱۴۱ پر یہ فٹ نوٹ دیا ہے: " مولانا عرشی نے اس موضوع پر (روہیلکھنڈ کی شستہ اور کھری اردو جس کی ساخت و پرداخت میں نوواردپٹھانوں کا ہاتھ ہے) ایک جامع تصنیف کی ہے، جس میں تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ پشتو کے ساتھ اردو کے روابط بھی قائم کیے ہیں۔ تصنیف مذکورہ کی بعض تفصیلات مثلاً مشترک محاورات وغیرہ، دلچسپ اور اہم ہیں۔ لیکن مصنف نے تقابلی مطالعہ کرتے وقت اس لسانیاتی تقسیم کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے۔ جو روہیلکھنڈ سے لے کر پشاور تک کے علاقے میں نظر آتی ہے" یہ فٹ نوٹ پڑھنے کے بعد عرشی صاحب کی کتاب پڑھنے کی آرزو پیدا ہوئی اور یہ بات خط لکھنے کا محرک بنی۔
۴۷۔ بہ سلسلۂ انعام خصوصی مبلغ پانچ ہزار از طرف حکومت اترپردیش، لکھنؤ۔
۴۸۔ "جگر بریلوی، ایک تعارف"۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۳ء۔

ضیاء الدین احمد ڈیسائی

استدراک

"اردو شعرا کے سنینِ وفات" پر

ماہی "تحریر" کے شمارہ (۳۹) میں جناب ڈاکٹر محمد منصور عالم کا گرانقدر مقالہ بعنوان "اردو شعرا کے سنینِ وفات" نظر سے گزرا سرسری مطالعہ کے دوران کچھ مقامات محلِ نظر محسوس ہوئے۔ مزید غور سے دیکھا تو متعدد مقامات استدراکی نوٹ کے محتاج نکلے۔ مضمون کی افادیت اور مضمون نگار کی محنت اور عرق ریزی کے بارے میں شک نہیں۔ اہلِ نظر حضرات بالخصوص اس سعی حاصل کی داد دینگے۔ لیکن جن اصحاب کو تحقیق سے کبھی واسطہ پڑا ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس قسم کے مضامین میں تسامحات یا فروگذاشتوں کی کافی گنجایش رہتی ہے، یہ مضمون بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔

موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، جو تسامحات یا فروگذاشتیں مجھے نظر آئیں، ان کو یکجا پیش کر رہا ہوں تاکہ قارئین اور محقق حضرات کو سہولت ہو اور فاضل مضمون نگار اور فہرست کے مرتب بھی ان میں جو باتیں انھیں صحیح نظر آئیں، ان سے اپنی فہرست پر نظرِ ثانی کرتے وقت اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔

سب سے پہلے یہ عرض کردوں کہ میں مضمون مشارٌ الیہ کے سب کے سب مآخذ نہیں دیکھ سکا؛ جن مقامات میں مجھے شبہہ ہوا، یا جو مقامات وضاحت طلب تھے میں نے صرف انہی کے بارے میں

مآخذ کی طرف رجوع کیا ہے ؛ اس میں بھی دو چار تذکرے اور عطا کاکوی صاحب کے جملہ تلخیص کردہ تذکرے میرے پیشِ نظر نہیں تھے۔ بہر حال کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان شعرا کے سنینِ وفات کی صحیح تعیین ہو سکے۔

مضمون مشارٌ الیہ میں صرف ۱۳۰۰ھ تک کے اردو شعرا کا ذکر مقصود ہے، لیکن دو ایک ایسے شاعر بھی مثلاً (شمارۂ ۲۷ ، ۱۴۱) جن کا انتقال سنۂ مذکور کے بعد ہوا ہے، درجِ فہرست ہو گئے ہیں۔ نیز مضمون صرف اردو شعرا سے متعلق ہے، لیکن کم از کم ایک شاعر (شمارۂ ۱۹۰) کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اردو میں ایک بھی شعر نہیں کہا۔ ممکن ہے ایسے کچھ اور شعرا بھی رہے ہوں، بالخصوص وہ شعرا جو محض نتائج الافکار یا صبح گلشن کے حوالے سے فہرست میں درج ہوئے ہیں؛ ان کی نشاندہی تحقیق طلب ہے اور اس کے لیے وقت درکار ہے۔ اسی طرح دو تین مقامات ایسے ہیں، جہاں ایک ہی شاعر فہرست میں دو جگہ مذکور ہے (ملاحظہ ہو شمارہ ۸ ، ۲۶۷؛ ۸۸ ، ۱۷۶؛ اور ۲۸۶ ، ۲۸۷)

کچھ مثالوں میں تاریخی مادّوں سے برآمد سال اور مرتّب کے یا ان کے مآخذ میں دیے ہوئے سنین میں تطابق نہیں ہے۔ اس قسم کی اغلاط کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو املا کی غلطی ہے، جسے سہوِ کاتب یا مرتّب کے سہوِ قلم پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے (اور یہ مرتّب کی سہل انگاری ہے) کہ انھوں نے تاریخی قطعوں کا صرف ایک ہی مصرع، بلکہ بعض مقامات پر صرف جزو نقل کرنا مناسب سمجھا ہے۔

فاضل مرتّب نے بالعموم التزام کیا ہے کہ شاعر کے نام کے آگے اس کا متعینہ سنۂ وفات درج ہو، لیکن وہ ہر جگہ، نہ معلوم کیوں، اس کی پابندی نہیں کر سکے۔

فہرست کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ مرتّب نے کئی تذکروں سے رجوع نہیں کیا۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں، جو مطبوعہ ہیں اور وہ بآسانی مہیا ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر سیّد عبد الوہاب افتخار کا تذکرۂ بے نظیر یا تحفۃ الشعرا، مولفہ قاقشال یا مخزن الشعرا، مولفہ قاضی نور الدین حسین خان فائق وغیرہ۔ پھر ان کے دیکھے ہوئے طورِ کلیم، گلشنِ بیخار (جس کا ایک حوالہ "شیفتہ" کے نام سے (شمارہ ۲۸۷ ہے) مسرت افزا وغیرہ تذکروں میں سے کئی شعرا جن کا سنۂ

وفات ان میں درج ہے، اس فہرست سے خارج ہیں۔ لفاظ دیگر ان مآخذ سے بھی کما حقہ استفادہ نہیں کیا گیا۔ مرتب کا زیادہ دار و مدار پروفیسر عطا کاکوی کے تلخیص کردہ تذکروں کی تعلیقات پر رہا ہے، جو بلاشبہہ مفید ہیں لیکن جن سے رجوع کم از کم بعض مقامات پر ناگزیر نہیں تھا۔

نیز جہاں متفق علیہ تاریخِ وفات نہیں ملی، وہاں "جو تاریخیں ملیں، "وہ پیش کرنے" کا التزام بھی نہیں کیا گیا۔

بہرحال جن تسامحات اور فروگذاشتوں کی اصلاح ضروری سمجھی گئی، انھیں کو یہاں قلمبند کیا گیا ہے، تاکہ ان سے مرتب کے حسب منشا محققین کو سہولت حاصل ہو۔

۲

(نوٹ: میرے سامنے نتائج الافکار کا بمبئی ایڈیشن اور تذکرۂ مسرت افزا کا اردو ترجمہ رہا ہے۔)

(۳) آرزو، سراج الدین علی خان۔

چمنستانِ شعرا، تذکرۂ بینظیر وغیرہ میں مہینا ربیع الثانی کی بجائے جمادی الثانی ہے۔

(۴) آزاد، فقیر اللہ (یا محمد فاضل)

۱۱۸۴ھ تاریخی مادہ "باغِ معانی" نقل کیا گیا ہے، لیکن اس سے ۱۱۷۴ھ حاصل ہوتے ہیں۔

(۸) آفتاب

تخلص کے بعد التزام کے برعکس نام نہیں دیا گیا ہے۔

یہ وہی آصف جاہِ ثانی نواب نظام علی خان والیِ حیدر آباد ہیں، جن کا ذکر شمارہ (۲۶۷) کے تحت بعنوانِ "نامؔ" موجود ہے۔ یہ تسامح اس لیے ہوا کہ بعض تذکروں (مثلاً سرورؔ آزاد: ۱۸۴؛ نتائج الافکار: ۴۷) میں نواب مشارٌ الیہ کا تخلص آفتاب درج ہے اور دوسروں (مثلاً چمنستان شعرا: ۳۱۴) میں نام مذکور ہے۔ تحفۃ الشعرا (ص ۶۳) میں بھی نام ہے۔

(۱۲) ابوالحسن، مرزا ابوالحسن۔

استدراک

نتائج الافکار کے حوالے سے ۱۲۰۰ھ درج ہے، حالاں کہ وہاں (ص ۶۵۸) درعشرۂ سادس مأیۃ ثانی عشر ہے، یعنی بارھویں صدی کا چھٹا دھا۔ ۱۱۵۱ھ اور ۱۱۶۰ھ کے درمیان ہونا چاہیے تھا،

(۱۴) احسن، احسن اللہ۔

نام کے آگے سنہ وفات درج نہیں ہے۔

بقول صاحبِ مسرت افزا (ص ۴۹) جس کا مرتب نے حوالہ نہیں دیا ہے، احسن نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں وفات پائی۔ اس لحاظ سے احسن کا انتقال ۱۱۶۱ھ یا اس سے پہلے ہوا ہوگا۔ تذکرۂ ریختہ گویاں کے اس بیان "سالی چند پیش ازین" سے ایک دو نہیں، بلکہ کئی سال مراد ہیں، جیسا کہ فہرستِ ہذا میں کئی جگہ کیا گیا ہے۔ بہر حال احسن کے نام کے آگے قبل از ۱۱۶۱ھ تحریر ہونا چاہیے تھا۔

اسی طرح شمارہ (۱۹) اشتیاق کے ضمن میں نام کے بعد ۱۱۵۰ھ یا ۱۱۶۱ھ مذکور ہونا چاہیے؛ ۱۱۵۰ھ صبح گلشن سے منقول ہے، جب کہ مخزن نکات سے نقل شدہ عبارت (ہفت سال شد) سے سالِ وفات ۱۱۶۱ھ قرار پاتا ہے۔

(۲۰) اشک، مولوی ہادی علی

حوالہ بہ صبح گلشن (ص ۲۵) کی عبارت میں اشک کے سالِ وفات کے ساتھ ماہ و روز۔ ۲۰ رمضان کی تخصیص ہے۔

(۲۴) افصح، شاہ فصیح۔

افصح کے سالِ وفات ۱۱۹۲ھ کے لیے تذکرۂ عشقی کا حوالہ دیا ہے، لیکن مطبوعہ نسخے (دو تذکرے: ۱۵) میں ۱۱۹۰ھ درج ہے۔

(۲۶) امامی، خواجہ امامی۔

امامی کا نام خواجہ امامی محلِ نظر ہے۔ بزمِ سخن یا سخن شعرا[ہ] اس وقت سامنے نہیں، اس لیے اس بارے میں اثبات و نفی ممکن نہیں ہے ہ لیکن اگر یہ خواجہ امام بخش متخلص بہ امامی (مسرّت افزا

ہ سخن شعرا (ص ۴۴) میں نام "خواجہ امامی مرثیہ گو ولد خواجہ آثمی دہلوی" (بقیہ ۲۹ پر)

۵۰) ہیں تو وہ اس تذکرے کی تالیف کے وقت یعنی ۱۱۹۲ھ میں بقیدِ حیات تھے جب کہ بزمِ سخن اور سخن شعرا دونوں میں امامی کا سنہ وفات ۱۱۷۷ھ بتایا گیا ہے۔
مسرت افزا میں بھی امام بخش امامی کو امام حسین کے عاشق اور مرثیہ گو اور پرسوز آواز میں مرثیہ پڑھنے والے بتایا ہے۔ ۱۱۹۲ھ میں وہ پٹنہ میں تھے۔

(۲۷) امان ، نواب محمد امان اللہ خان -
ان کی وفات ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ اس لیے فہرستِ ہذا میں ان کا شمول بیجا ہے۔
شاد کے کہے ہوئے تاریخی قطعے میں تاریخ کی توضیح میں ہندسے دیے ہیں۔ ان سے غلط فہمی کا امکان ہے۔ تاریخی مادے سے حاصل شدہ (۱۳۰۲) میں "سرِ درد" (دال کے) چار عدد ملانے سے (۱۳۰۶) حاصل ہونگے۔
قطعۂ تاریخ کے تیسرے شعر میں تمانش بے معنی ہے۔ غالباً ہمپایش ہونا چاہیے۔ آخری شعر میں "نوتش بگو" کی جگہ "نوقش گو" ہونا چاہیے؛ یہ کتابت یا نقل کی غلطیاں ہو سکتی ہیں،

(۳۲) امید ، قزل باش خان
تاریخ وفات کے قائل "میر" سے مرادِ میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں ان کی تصنیف سروِ آزاد (ص ۲۱۰) میں پورا قطعۂ تاریخ درج ہے، مسرت افزا (ص ۲۸) میں بھی امید کا ترجمہ موجود ہے۔

(۳۴) انجام ، امیر خان
ان کا سنۂ وفات ۱۱۵۹ھ بتایا گیا ہے۔ لیکن چمنستانِ شعرا (ص ۳۰) کے حوالے سے نقل شدہ تاریخی مادّے (جان دادا میر خان انجام) سے ۱۰۶۰ برآمد ہوتے ہیں۔ صاحبِ چمنستان نے خود یہ تاریخ کہی تھی اور انھوں نے ایک عدد زاید کو حسنِ کلام سے ساقط کر کے تاریخ نکالنے کا دعویٰ کیا ہے۔ پورا قطعۂ تاریخ یہ ہے۔

آں عمدۂ معنی آفریناں — در خلدِ بریں نمودہ آرام

(بقیہ ۲۸ کا) لکھا ہے، اگرچہ آخر میں لکھتے ہیں کہ بعض صاحبِ تذکرہ نے ان کا تخلص املائی لکھا ہے۔" وفات ۱۱۷۷ھ ہی لکھی ہے۔ (تحریر)

استدراک

رفت آں یکتا و گشت تاریخ جان داد امیر خان انجام

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی مادہ "جان داد امیرِ خانِ انجام" نہیں بلکہ "رفت آں یکتا" ہے جس کے (۱۱۶۲) عدد ہیں۔ ان میں سے تخرجہ سے "جانِ انجام" یعنی جیم کے ۳ عدد ساقط کرنے سے صحیح تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

(۳۵) النسان ' اسدیار خان

نام کے آگے ۱۱۵۸ھ درج ہونا چاہیے، "ربیع الاول ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۵ اپریل" مہمل نہیں، تو مبہم ضرور ہے۔

النسان ۱۷ ماہ صفر ۱۱۵۸ھ کو راہیِ ملک بقا ہوئے تھے۔ سیر المتاخرین مصنفہ غلام حسین خان طباطبا (ص ۸۵۶) میں یہ تفصیل ہے اور ان کا مفصل ذکر بھی۔ ان کے علاوہ مذکورۂ بالا انجام اور دیگر مغل امرا اور سرداروں وغیرہ کا بھی سیر المتاخرین میں بہ تفصیل ذکر ملتا ہے۔

(۴۶) انصاف ، محمد یحیٰ

سالِ وفات سفینۂ ہندی مولفہ بھگوان داس ہندی کے حوالے سے دیا ہے، لیکن سنہ ہجری کے آگے سنۂ عیسوی کا اضافہ مرتب کا اپنا ہے۔ جو ان کے خلافِ معمول ہے ، مآخذ (ص ۱۴) میں انصاف کی تاریخِ وفات کا مادۂ تاریخ ("بردالله مضجعہ") بھی دیا ہے۔

(۴۷) بھوپت رائے ' بھوپت رائے

بھوپت رائے غالباً تخلص نہیں ہے ، نتائج الافکار کا حوالہ ہے اس میں (ص ۱۱۲) پورا نام وغیرہ بھوپت رائے بیغم ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ بیغم تخلص ہے۔ روز روشن (ص ۱۱۶) میں بیغم تخلص ہی کے ذیل میں بھوپت رائے کا ذکر ہے۔

(۴۹) بیتاب ، شاہ علیم اللہ

روز روشن کا حوالہ ہے، لیکن اس میں بیتاب کے ضمن میں ان کا ذکر نہیں ملا۔

(۵۰) بیخبر ، میر عظمت اللہ

سفینۂ خوشگو (ص ۱۰۳) میں ۲۴ ذی القعدہ کی تخصیص ہے۔

(۵۲) بیدل ، میرزا عبدالقادر

استدراک

یہاں سفینۂ خوشگو سے تاریخ براہ راست نقل نہیں ہوئی بلکہ "تحقیقی مقالے" مصنف عطا کاکوی کے حوالے سے ہے، حالاں کہ تقریباً سب تذکروں میں ان کا حال ملتا ہے سفینۂ خوشگو (ص ۱۴۳) میں روز وفات ۴ صفر ہے، جب کہ سرو آزاد (ص ۱۵۰)، مسرت افزا (ص ۵۳)، تذکرۂ بے نظیر (تلخیص ص ۲۷) وغیرہ میں ۳ صفر ہے۔

(۵۵) بیگ، حکیم بیگ خان

نتائج الافکار کا حوالہ ہے، لیکن وہاں (ص ۱۹۶) بیگ تخلص کی تشخیص یا صراحت نہیں ہے، بلکہ نام حکیم بیگ خان حاکم لاہوری لکھا ہے جس سے حاکم تخلص ہونے کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔

(۵۶) پروانہ، راجہ جسونت سنگھ عرف کاکاجی

ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ " پروانہ بمرد و شمع ہم وا ے بمرد " سے ۱۲۲۸ھ نہیں، جو درج ہے، بلکہ ۱۲۳۴ حاصل ہوتے ہیں۔ ظاہراً مصرعۂ مذکور میں واو عطف زائد ہے، اگرچہ خوش معرکۂ زیبا کے مطبوعہ نسخے میں بھی اسی طرح ہے۔

نیز یہاں قطعۂ تاریخ میں دوسرے شعر کا پہلا لفظ کنہ کی جگہ کہ نہ ہونا چاہیے اور آخری شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں " اور " کی جگہ " و " زیادہ موزوں ہے، اس مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اس قطعے میں دو تاریخیں ہیں ایک مصرعۂ ماقبل (" آج منزل نشین حسرت ہے ") اور دوسری اس شعر کے مصرعۂ ثانی میں،

(۶۳) تمکین، مولوی رحمت اللہ

سالِ وفات ۱۲۰۰ھ نتائج الافکار کے حوالے سے درج کیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ وہاں (ص ۱۳۱) پر دراوسط مآیۂ ثانی عشر ہے یعنی ۱۱۵۰ھ یا اس کے لگ بھگ انھوں نے وفات پائی،

(۶۸) جرأت، یحییٰ امان قلندر بخش

۱۲۲۵ھ کی جگہ ۱۲۲۴ھ چاہیے چونکہ مرتب نے اسی کو صحیح تاریخ قرار دیا ہے صفحہ ۴۴ کی پانچویں سطر میں ۱۲۴۴ھ سہو کتابت ہے۔

پہلے قطعۂ تاریخ میں میاں ناسخ کی جگہ میاں جرأت چاہیے۔ نیز مصحفی کے قطعے کے تاریخی مصرعے

میں "گئی" کا املا "گیی" ہوگا۔

(۷۰) جعفر، میر جعفر

نام کے آگے ۱۷۱۳ء مذکور ہونا چاہیے بلکہ سنہ ہجری دینا چاہیے: یہ مشہور میر جعفر زٹلی ہیں۔

(۷۳) حزیں، شیخ محمد علی

اس مشہور و معروف فارسی شاعر کا درج کردہ سنۂ وفات ۱۱۰۴ھ سراسر غلط ہے حزیں نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ کو انتقال کیا خزانۂ عامرہ (مولفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۲۰۰) شمع انجمن (مصنفہ نواب صدیق حسن خان، ص ۱۲۱) میں بھی یہی سال ہے۔ غالباً حزین نے اردو میں کبھی شعر نہیں کہا ہے؛ لہذا ان کا اس فہرست میں شمول کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

(۷۴) حزیں، محمد باقر

نہ سالِ وفات درج ہے نہ قرائن؛ پھر فہرست میں اندراج کے کوئی معنی نہیں؛ یہی حال شمارہ ۸۹ اور ۹۹ کا ہے۔

(۸۰) حسن، میر حسن

نام طور کلیم (ص ۲۹) میں میر غلام حسن ہے۔

(۸۱) حشمت، محمد علی

دیوان تاباں کے ایک مرثیے کے حوالے پر اکتفا کیا ہے۔ ان کے قطب الدین محمد خان کی طرف سے علی محمد خان روہیلہ کی فوج کے ساتھ لڑائی میں مراد آباد میں مارے جانے کا حوالہ بھی ہماری زبان کے ایک شمارے کا ہے۔ حال آں کہ مسرت افزا (صفحہ ۷۹) میں جس سے مرتب نے کافی حوالے دیے ہیں، حشمت کا ترجمہ موجود ہے؛ اس لڑائی کا مفصل حال مع تاریخ سیر المتاخرین (ص ص ۸۷۳ — ۸۷۴) میں درج ہے۔ صبح گلشن (ص ۱۲۹) میں بھی تاریخ ہے۔

(۸۶) حیدر، سید حیدر علی شاہ

نام کے آگے سالِ وفات درج نہیں۔ عہدِ احمد شاہ میں ان کے وفات پانے کا ذکر ہے۔ اس لیے ۱۱۶۱ — ۱۱۶۷ھ درج ہونا چاہیے تھا۔

(۸۸) خان دوران، امیر الامرا صمصام الدولہ

مسرت افزا (ص ۲۴۲) میں ان کا تخلص صمصام لکھا ہے، جو صحیح ہے۔ یہ اور (۱۷۶) والے عاصم ایک ہی ہیں؛ خواجہ عاصم ان کا نام تھا۔

(۹۰) خسرو، حضرت امیر خسرو

قطعۂ تاریخ پر سوالیہ نشان غلط ہے؛ دونوں تاریخی مادے صحیح ہیں۔ اصل میں یہ قطعہ پانچ شعر پر مشتمل ہے، اور بقول صاحبِ ہفت اقلیم اور نفائس المآثر خواجہ حسن کا کہا ہوا ہے۔ یہی قطعہ میر شہاب معمائی ہروی کے خط میں کندہ کیے ہوئے اس کتبے میں درج ہے، جو امیر خسرو کے مزار واقع درگاہِ حضرت نظام الدینؒ دہلی پر لگا ہوا ہے (ایپیگرافیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۱۵ — ۱۹۱۶، ص ۵، عکس I اے)

(۹۳) خلیل، نواب ابراہیم خان

عشقی سے منقول تاریخِ وفات ("شد بہ جنت مقیم ابراہیم") سے ۱۲۱۳ حاصل ہوتے ہیں نہ کہ ۱۲۰۸؛ ظاہرا "بہ جنت" کی جگہ "بجنت" چاہیے۔

(۹۵) خورشید، میر خورشید علی بلگرامی

نام کے آگے سنۂ وفات درج نہیں ہے۔ نتائج الافکار کے حوالے سے اواخر مآیۃ ثانی عشر میں انتقال ہونے کا ذکر ہے، پس نام کے آگے ۱۱۹۹ھ یا اس سے کچھ قبل درج ہونا چاہیے۔ فہرست میں نتائج الافکار کے حوالے سے اواخر مآیۃ ثانی عشر میں وفات پانے والے شعرا کے آگے عموماً ۱۲۰۰ھ لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ اس کی بجائے ۱۱۹۹ھ یا درحدود ۱۱۹۹ھ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ان شعرا کا ذکر شمارہ ۱۰۴، ۱۷۵، ۱۷۸، ۱۸۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۸، وغیرہ کے تحت پایا جاتا ہے۔

(۱۰۰) داؤد، میرزا داؤد اورنگ آبادی

سنۂ وفات ۱۱۵۷ھ چمنستان شعرا کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ چمنستان میں سنہ الفاظ میں دیا ہے، لیکن مرتبِ تذکرۂ مذکور کے مصنف کی کہی ہوئی تاریخ کے مصرعے کا جو جزو نقل کیا ہے (اس میں داوَ، داؤد کی جگہ کتابت کی غلطی ہے) اس سے ۱۱۶۸ برآمد ہوتے ہیں۔ دیوان داؤد اورنگ آبادی (حیدرآباد ۱۹۵۸ء) کی مرتب خالدہ بیگم (صفحہ ۶) لچھمی نراین شفیق

بی کے قول سے داؤد کے ۱۱۸۰ھ میں وفات پانے کا ذکر کرتی ہیں۔

(۱۰۳) درد، میر کریم اللہ خان

سالِ وفات مذکور نہیں۔ لیکن مرتب نے گلزار ابراہیم کا قول نقل کیا ہے کہ درد احمد شاہ کے دورِ سلطنت میں مرہٹوں کے ساتھ لڑائی میں مارے گئے۔ اس لیے ان کا سنۂ وفات ۱۱۶۷ھ قرار پائیگا، یہی تاریخ صحفِ ابراہیم میں درج ہے۔ مخزن نکات (ص ۴۵) میں نام کرم اللہ خان دیا ہے۔

(۱۰۵) دیوانہ، رائے سرب سنگھ

نام سرب سکھ ہے، سرب سنگھ نہیں تذکرۂ ھندی (ص ۷۲-۷۳) میں صحیح نام اور قطعۂ تاریخ ہے، جس سے سنۂ کے علاوہ ماہ و روز چہار شنبہ نوزدھم ماہ صیام یعنی رمضان) کی تخصیص ہے

(۱۰۷) ذوق، محمد ابراہیم

سخن شعرا کے حوالے سے سال وفات ۱۲۷۱ھ مذکور ہے، لیکن خود صاحب سخن شعرا کی کہی ہوئی جو تاریخ نقل کی ہے (انتقالِ شاعرِ کامل ہوا) اس سے صرف ۱۲۵۶ حاصل ہوتے ہیں غالبًا قطعۂ تاریخ میں کچھ عدد بڑھانے کا ذکر ہوگا یا پھر شاید مصرع تاریخ یوں ہو: "انتقال شاعر کامل ہوا ہے"

(۱۰۸) ذوقی، میر عبدالواحد

سرو آزاد (ص ۲۴۲) میں قطعۂ تاریخ بھی ہے،

(۱۰۹) راسخ، غلام علی

سنۂ وفات ۱۲۳۸ھ درج ہے، بحوالہ طورِ کلیم و سخن شعرا۔ ان کے علاوہ مسرت افزا (ص ۱۰۸) اور گلشن بیخار (ص ۲۲۲) میں بھی ذکر ہے، مؤخر الذکر تذکرے میں سالِ وفات ۱۲۴۰ھ دیا ہے،

(۱۱۰) راغب، جعفر پانی پتی

صرف نتائج الافکار کا حوالہ ہے۔ بقول مسرت افزا (ص ۱۱۲) راغب ۱۱۷۰ھ تک دہلی میں تھے۔

(۱۱۲) رسا ، میرزا محمد تقی

گلشن ہند کے حوالے سے ۱۲۲۳ھ اور نتائج الافکار کے حوالے سے ۱۲۳۳ھ درج ہے۔ لیکن نتائج الافکار مطبوعہ بمبئی میں ۱۲۲۳ھ ہی ہے (الفاظ اور ہندسہ دونوں میں)

(۱۱۳) رسوا ، آفتاب رائے

نام کے آگے ۱۱۶۷ھ یا ۱۱۶۸ھ یا اس کے لگ بھگ درج ہونا چاہیے۔

(۱۱۴) رسوا ، مہتاب رائے

بحوالہ گلزار ابراہیم رسوا کا بعہد محمد شاہ انتقال ہونا لکھا ہے۔ پس نام کے آگے ۱۱۳۱ – ۱۱۶۱ھ درج ہونا چاہیے۔

(۱۱۶) رنج ، میر محمد نصیر مُہدی

سنۂ وفات ۱۲۶۱ھ درج ہے ، سخن شعرا کا حوالہ ہے جو پیش نظر نہیں۔

لیکن تعجب ہے کہ طور کلیم (ص ۴۶) میں جو قطعۂ تاریخ رنج کی وفات کا درج ہے ، مرتب نے اسے مومن خان کی وفات کا قطعہ قرار دے کر مومن خان کے ترجمے (شمارہ ۲۵۵) میں بایں الفاظ قلمبند کیا ہے کہ (رنج کو) مومن خان سے قرابت بھی تھی اور نسبت دامادی بھی ، ان کی وفات پر ایک قطعہ کہا ، جس کا آخری شعر یہ ہے الخ

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ فارسی عبارت طور کلیم کی یہ ہے : مومن خان کہ با وی نسبت خویشی و دامادی داشت ، در تاریخ وفات او قطعہ گفت :

شیخ زماں شند ز دہر و زپے سال وفات — فکر بلندم رہ جنّت ماوا گرفت

گفت بہ مومن ملک خواجہ محمد نصیر — در قدم ناصر و درد نکو جا گرفت

یہی قطعہ شمارہ ۲۵۵ میں درج ہے

غور طلب امر یہ بھی ہے کہ جب رنج کا ۱۲۶۱ھ میں انتقال ہو چکا تھا تو وہ مومن خان متوفی ۱۲۶۸ھ کی تاریخ کیونکر کہہ سکتے تھے ! ویسے بھی خود قطعے سے مومن خان کا اس کا قائل ہونا اور رنج کا انتقال پانا ظاہر ہے۔

(۱۱۹) رنگین ، نورالدین حسین خان۔

سنۂ وفات ۱۱۷۲ھ درج ہے لیکن اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ چمنستان شعرا (ص ۵۱۸) میں تاریخ لفظوں میں ۱۱۷۲ھ ہے اور مہربان کا کہا ہوا قطعہ درج ہے۔ لیکن قطعۂ مذکور میں (رانجل رفت ازجہان رنگین) سے ۱۱۱۳ عدد نکلتے ہیں، دونوں تاریخوں میں اس طرح ۵۹ سال کا فرق ہے،

اس کے ساتھ رنگین کا سنۂ وفات مع ماہ و روز ۲۴ جمادی الثانی ۱۱۷۰ھ روز جمعہ اور مقام وفات شہر ایلچپور وغیرہ بغیر کسی حوالے کے نقل کیا ہے، بلکہ جس کتاب یا تذکرے سے یہ تفصیلات نقل ہیں، اس کے مؤلف کا کہا ہوا رنگین کا قطعۂ تاریخ بھی درج ہے، جس سے ۱۱۷۰ حاصل ہوتے ہیں، لیکن کتاب یا تذکرۂ مذکور کا نام درج نہیں ہے یا درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

(۱۲۳) سامان، میر ناصر

صرف صبح گلشن میں سالِ وفات (۱۱۴۷ھ) مذکور ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں (ص ۱۹۴) نام میر محمد ناصر دیا ہے۔ مسرت افزا (ص ۱۲۸) میں البتہ میر ناصر ہے۔

(۱۲۴) سبقت، میرزا مغل

نام کے آگے سالِ وفات درج نہیں ہے۔ ایک طرف ناسخ سے منسوب قطعۂ تاریخ سے ۱۲۲۹ھ نکلتے ہیں اور دوسری طرف سخن شعرا سے ۱۲۳۵ھ درج ہے۔ اس اختلاف کے بارے میں مرتب خاموش ہیں،

(۱۲۵) سحر، سید ناصر علی

خوش معرکۂ زیبا کی عبارت کی نقل صحیح نہیں: "دل احباب اس کے مرگ سے خوناب۔" (نہ کہ "ناخوب")

شیخ سے مراد ناصر کے استاد ناسخ ہیں، جنھوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ مرتب نے خوش معرکۂ زیبا سے اس کی نقل میں بھی بے احتیاطی برت کر کچھ گنجلک پن پیدا کر دیا ہے، انھوں نے قطعۂ مذکور کی بیتِ آخر یہ بتائی ہے:

سیدِ عالی نسب ناصر علی — پنجشنبہ زیں جہاں رحلت نمود

جو تاریخ کی حامل کہی جائیگی، حالانکہ یہ قطعے کی پہلی بیت ہے۔ تاریخ دوسرے شعر میں ہے،

چنانچہ خوش معرکۂ زیبا (ص ۵۰۳) میں قطعہ یوں ہے۔

سیّدِ عالی نسب ناصر علی — پنجشنبہ زیں جہاں رحلت نمود

گفت ہاتف سالِ تاریخِ وفات — حیف روزِ اوّل ذیقعدہ بود
۱۲۴۹ھ

اس سے وفات کے ماہ و سال کا بھی پتا چلتا ہے۔

(۱۲۸) سرور، اعظم الدولہ

گلشنِ بیخار کا حوالہ نہیں ہے وہاں (ص ۲۴۶) ان کا نام نواب میر محمد خان دیا ہے، اور ماہِ وفات شوال کی تخصیص بھی ہے۔

(۱۳۰) سعادت، میر سعادت علی

نام کے آگے "درحدودِ ۱۱۶۸ھ" درج ہونا چاہیے۔

(۱۳۴) سلام، نجم الدین

نام کے آگے سنۂ وفات درج نہیں ہے۔ ماخذ میں قرینہ مذکور ہے کہ نواب صفدر جنگ کے لشکر کے ہمراہ پورب میں گئے اور وہاں انتقال ہوا۔ صفدر جنگ ماہ ذیقعدہ ۱۱۵۵ھ میں عظیم آباد گئے تھے (سیر المتاخرین: ۵۲۰) مخزن نکات میں بھی سلام کا انتقال کتاب کی تالیف سے پہلے ہونا مذکور ہے۔

پس سلام نے درحدودِ ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی ہوگی۔

(۱۳۷) سلیمان، میرزا سلیمان شکوہ

مقبرۂ اکبر سکندرہ، آگرہ میں واقع ان کے مزار پر قطعۂ تاریخ کندہ ہے، جس میں ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ لفظوں میں درج ہے۔ تاریخ وفات مندرجۂ فہرست یعنی "رحمتِ خدا" اسی قطعے کا جزو ہے (اینوئل رپورٹ آن انڈین اپیگرافی برائے ۱۹۶۵ — ۱۹۶۶ - ضمیمہ ڈی - نمبر ۱۴۴۱)

(۱۳۹) سودا، میرزا محمد رفیع

نقل شدہ قطعۂ تاریخ کے پہلے شعر کا مصرعۂ دوم یوں ہونا چاہیے

کہ او بہارِ سخن بود و حاسدانش دَے

استدراک

خوش معرکۂ زیبا سے منقول تاریخ وضاحت طلب ہے؛ " واوین " کے درمیان والے جزو کے اعداد ۱۱۹۹ ہوتے ہیں۔ مصرعِ ماقبل میں پائے عناد یعنی حرف دال کے ۴ عدد کم کرنے سے صحیح تاریخ حاصل ہوگی۔

منقول عنہ دوسرے قطعے میں آخری مصرع جو تاریخی ہے، (سود الجا وآن سخنِ دلفریب کو) سے نہ صرف تاریخ نہیں نکلتی، بلکہ اس سے مرحوم کی مدح نہیں بلکہ ذم کا پہلو نکلتا ہے، صحیح "سخنِ دلفریبِ او" ہے،

(۱۳۹) سوز، میر محمد

سالِ وفات باختلافِ مآخذ ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۱۳ درج ہے۔ خوش معرکۂ زیبا سے منقول ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ (شاعرِ بے مثال، واویلا) سے (۱۲۰۸) برآمد ہوتے ہیں؛ شاید "واویلا" کی جگہ " واویلاہ " ہو۔ بہرحال صحیح تاریخ غالباً ۱۲۱۳ھ ہے کیونکہ خوش معرکۂ زیبا (ص ۱۷۷) میں جرأت سے منسوب جو تاریخ (داغ اب سوز کا لگا دل کو) درج ہے اس سے بھی سالِ وفات ۱۲۱۳ قرار پاتا ہے۔

(۱۴۴) شورش، میر غلام حسین

۱۱۹۵ھ مسرت افزا (ص ۱۳۴) میں شعبان کے عشرۂ اولی کی تخصیص ہے۔ گلشن بیخار (ص ۲۸۰) میں ۱۱۹۰ھ دی ہے؛ یہ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔

(۱۴۹) شہید، میر رستم علی (۱۱۵۵ھ)

مندرجہ مادۂ تاریخ

از سرِ گریہ سالِ نوشتش را   آن رستم علی شہید بگو

میں نقل یا کتابت کی غلطی ہے، "آن" کی بجائے "آہ" پڑھنے سے مصرع موزوں بھی ہوگا اور صحیح تاریخ بھی حاصل ہوگی۔ البتہ یہاں سرِ گریہ کے گاف یعنی کاف کے ۲۰ عدد ملانے کا اشارہ ہے۔

(۱۵۴) صانع، نظام الدین احمد

نتائج الافکار کے حوالے سے ۱۱۷۸ھ تاریخِ وفات قرار دی ہے، لیکن کتابِ مذکور

استدراک

(ص ۔۳۴) میں اوائلِ مائة ثانی عشر ہے یعنی ۱۲۰۰ھ یا اس کے اوپر کچھ سال ۔
پھر گلشنِ ہند کے اس قول کو نقل کر کے کہ "سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتہ میں ایام زندگی بسر کرتے تھے ۔ آخر سنہ ہجری میں ملکِ وجود سے رخت سفر کا باندھو کے" الخ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "اس حساب سے سنہ بائیسویں جو صانع کا سال مرگ ہے ۱۱۹۵ھ قرار پاتا ہے"۔
عبارتِ مندرجہ بالا کا یہ مطلب نہیں ہے ۔ سنہ بائیسویں جلوس (۱۱۹۵ھ) کی قید صرف قیام مرشد آباد اور کلکتہ کی حد تک ہے ، گلشن ہند کے بیان کے دوسرے جزو کا اس سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے سالِ وفات کی سنہ ہجری میں جگہ خالی چھوڑی تھی ، تاکہ وہ معلوم ہونے پر اسے درج کرینگے ، گلشن ہند (مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور ، صفحہ ۱۶۹) میں بھی قلمی نسخے میں سنہ وفات کی عدم موجودگی کا ذکر ہے ۔

(۱۵۷) صید ، مولوی عبد الباری ۔
۱۲۷۴ ۔ نساخ سے منسوب نقل شدہ تاریخ میں "میرے" کی جگہ "مرے" چاہیے ۔

(۱۵۹) ضمیر ، سید ہدایت علی خان
زمانۂ وفات کے حدود منقولہ قرائن کے پیشِ نظر متعین کیے جا سکتے تھے (یعنی بارھویں صدی کا اواخر)

(۱۶۰) ضیا ، میر ضیاء الدین
۱۱۹۴ھ ۔ طورِ کلیم کا حوالہ ہے وہاں (ص ۶۶) "۱۱۹۴ھ یا ۱۱۹۶ھ" ہے ۔

(۱۶۳) طالع ، میر شمس الدین
منقولہ بیان کی روشنی میں طالع کو ۴۷ ، ۸۹ اور ۹۹ کی طرح خارج از فہرست ہونا چاہیے ۔

(۱۶۴) طپان ، مرزا احمد بیگ خان
مندرجہ سالِ وفات ۱۸۳۴ھ سہو کتابت یا نقل کی غلطی ہے ۔ بزمِ سخن اور سخن شعرا [۵] مجھے دستیاب نہیں ورنہ تصحیح کی جاتی ۔

(۱۶۶) ظاہر ، خواجہ محمد جان

---

۵ یہ کتابت کی غلطی ہے سخن شعرا میں وفات ۱۲۳۴ھ درج ہے (ص ۳۰۲) (تحریر)

نام کے آگے قرائن کے پیشِ نظر سنۂ وفات کی جگہ "بعد از ۱۱۵۱ھ" درج ہونا چاہیے۔
نیز تذکرۂ ریختہ گویاں سے نقل شدہ عبارت کا ٹکڑا ("میرزا مظہر بگفتار آمدہ بود") بےمعنی ہے۔ ظاہرا مظہر کے شاگرد تھے اور صاحب تذکرہ ریختہ گویاں یہ کہہ رہا ہے کہ "طوطیِ طبعش بہ آیینہ داریِ میرزا مظہر بگفتار آمدہ بود"
تذکرۂ مذکور کے مطبوعہ نسخے (ص ۱۰۳) میں نام محمد جان ہے۔

(۱۶۸) ظل اللہ ، محمد قلی قطب شاہ

ظل اللہ محمد قلی قطب شاہ کا نہیں، بلکہ اس کے برادر زادے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا تخلص ہے۔ اگرچہ صبح گلشن کے مطبوعہ نسخے میں محمد قلی قطب شاہ ہی لکھا ہے، لیکن یہ غلط ہے، اگر مطبوعہ نسخہ کی عبارت صحیح ہو، تو صاحب صبح گلشن کو سہو ہوا کیونکہ یہ محمد قلی قطب شاہ ہی تھا جس کی وفات ۱۰۲۰ھ (نہ کہ ۱۰۲۱ھ جیسا کہ الفاظ میں صبح گلشن میں مذکور ہے) میں ہوئی۔
سلطان محمد قطب شاہ المتخلص بہ ظل اللہ کی وفات ۱۳ ماہ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو واقع ہوئی (جیسا کہ اس کے مزار کے کتبے میں مذکور ہے۔ (دیکھیے اپیگرافیا انڈو مسلیمیکا ، 16 - 1915 صفحہ ۳۲)
خود محمد قلی قطب شاہ کا تخلص قطب شاہ تھا۔

(۱۷۱) عاجز ، عارف الدین خان

۱۱۷۸ھ یہ تاریخ نتائج الافکار میں ہے۔ تذکرۂ بے نظیر (تلخیص ص ۲۸) میں ۱۱۷۰ھ ہے۔

(۱۷۴) عاشق ، علی اعظم خان

سنۂ وفات درج نہیں۔ چونکہ عاشق گلزارِ ابراہیم" کی تالیف (۱۱۹۸ھ) سے چند سال قبل وفات پا چکے تھے، اس لیے تاریخ اندازاً "درحدود ۱۱۹۰ھ" متعین ہو سکتی تھی۔

(۱۷۶) عاصم ، صمصام الدولہ خان دوران

یہ شمارہ ۸۸ والے خاندوران ہی ہیں۔

(۱۷۷) عاصمی ، خواجہ برہان الدین۔

نام کے آگے سنۂ وفات مذکور نہیں ہے؛ "غالباً ۱۱۶۶ھ" درج ہونا چاہیے تھا۔

(۱۷۹) عباس مرزا ، سید اظہار حسین

استدراک

۱۲۹۰ھ - شاد کی کہی ہوئی تاریخ وفات میں تاریخی مصرع ("باد حشرش بہ علم دار حسین") میں "بہ علم دار" کو "بعلم دار" پڑھنے سے تاریخ نکلتی ہے - مصرع ماقبل میں "من" شاید کتابت کی غلطی ہے "سن" ہونا چاہیے (من کی جگہ)

(۱۸۰) عرشی ، میر احمد حسین

حوالہ بزم سخن پیش نظر نہیں ، لیکن طور کلیم (صفحہ ۷۰) میں نام میر احمد حسن ہے یہ نواب صدیق حسن خان (والدِ مولفِ تذکرۂ مذکور) کے بھائی تھے ؎

(۱۸۶) عیش ، طالب علی خان

صرف صبح گلشن کا حوالہ ہے ؛ صحیح تخلص عیشی ہے - گلشن بیخار (ص ۳۲۷) اور دیگر تذکروں میں عیشی ہی ہے ؛ یہ بھی غالباً کتابت کی غلطی ہے -

(۱۸۹) غلام ، میر غلام نبی

۱۲۶۳ھ (نتائج الافکار) - غالباً یہ سہو کتابت ہے - نتائج الافکار (ص ۵۲۰) میں ۱۱۶۳ھ ہے اور مندرجہ قرائن کے پیشِ نظر یہی صحیح ہے -

(۱۹۰) غواصی ،

۱۰۰۰ھ - نتائج الافکار کا حوالہ ہے وہاں (ص ۵۰۹) "اوسط مآیۂ عاشر" ہے یعنی ۹۵۰ھ یا حدود ۹۵۰ھ

نیز یہ غواصی دکنی نہیں ، بلکہ غواصی یزدی ہے اور کبھی ہندستان نہیں آیا اس کا اردو گو ہونا بعید از قیاس ہے -

(۱۹۱) فاطمہ ، فاطمہ بیگم

۴ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ - شاد سے منسوب قطعۂ تاریخ میں پہلے شعر میں "شمیم" (بالکسر اول و بالفتح دوم) اور "زہرام" ہم قافیہ نہیں قرار دیے جا سکتے ، "زہرایم" ہونا چاہیے ، لیکن اس املا سے تاریخ ۱۳۰۹ھ ہوگی ،

؎ ٹھیک نام احمد حسن ہی تھا - ان کے تفصیلی حالات تلامذۂ غالب (۲۹ - ۲۳۳) میں دیکھے جا سکتے ہیں - ان کی وفات ۹ جمادی الاول ۱۲۷۷ھ (۲۳ نومبر ۱۸۶۰ء) کو ہوئی تھی (تحریر)

استدراک

(۱۹۲) فائز، صدالدین محمد خان

صفر ۱۵۱۱ھ۔ گلشن سخن کا حوالہ ہے، لیکن گلشن سخن مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) میں ان کا ترجمہ نہیں ملا۔

(۱۹۴) فراق، مرتضیٰ قلی خان

ان کا سالِ وفات درج نہیں، لیکن اس کی تعیین چنداں مشکل نہیں اس قرینے سے کہ ان کی وفات راجہ شتاب رائے کی قید میں ہوئی اور یہ مخزن نکات (ص ۵۲) کی تصنیف کے وقت (۱۱۶۸ھ) زندہ تھے، چونکہ راجہ مذکور کا انتقال ۱۱۸۷ میں ہوا اور وہ ۱۱۷۹ھ میں دیوان بن کر بہار آیا تھا (سیر المتاخرین :۷۹۱) لہذا فراق سنہ ۱۱۷۹ھ اور ۱۱۸۷ھ کے درمیان وفات پائی ہوگی۔

(۱۹۱) فغان، اشرف علی خان

سنۂ وفات طبقات الشعرائے ہند کی طرح گلشن بیخار (ص ۱۵۳) میں بھی ۱۱۹۶ھ ہے، لیکن صحیح ۱۱۸۶ھ ہی ہے جیسا کہ فہرست میں درج ہے۔

(۱۹۸) فقیر، میر شمس الدین

نام کے آگے سالِ وفات ۱۱۸۳ھ درج نہیں ہے۔

جب مرتب نے فقیر کے سنۂ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے اختلاف کی تفصیل دیتے ہوئے نتائج الافکار کی تاریخ ۱۱۸۳ھ کو صحیح گردانا ہے، (اور یہی صحیح ہے) تو نام کے آگے یہی سنہ درج ہونا چاہیے تھا،

لیکن آزاد بلگرامی کی کہی ہوئی تاریخ بھی انھوں نے اصل مآخذ کی نشاندہی کیے بغیر معاصر (۸) کے حوالے سے درج فہرست کی ہے، اس تاریخ (گو آہ فقیر شمس الدین ہائے) سے ۹۲۳ برآمد ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اصل میں تاریخی مصرع یوں ہوگا:

"گو آہ فقیر میر شمس الدین، ہائے"

(۲۰۱) قبول، عبدالغنی بیگ

حوالہ واضح نہیں ہے۔ اکثر تذکروں میں ان کا حال درج ہے۔ سرو آزاد (ص ۱۹۸) میں

استدراک

قطعۂ تاریخ بھی درج ہے، جس کا مادۂ تاریخ "گنج معنی بود کرد افلاک در زیر زمین" ہے۔

(۲۰۳) قتیل، میرزا محمد حسن

۱۲۳۳ھ۔ قتیل کی تاریخ وفات والے شعر۔

خود آں کافر بگفت (بگفتا) از سر کفر قتیلِ کافر ایمانے نہ دارد

سے تاریخ مندرجہ نہیں نکلتی۔ دوسرے مصرعے سے ۱۲۱۷ حاصل ہوتے ہیں اور اگر "نہ دارد" کی جگہ "ندارد" لیا جائے، تو ۱۲۱۲؛ اس میں سر کفر (کاف) کے ۲۰ عدد ملانے سے ۱۲۳۲ حاصل ہوں گے۔ اگر ۱۲۳۳ھ صحیح بھی ہے تو فنِ تاریخ گوئی میں ایک عدد کی کمی بیشی کو روا رکھا گیا ہے۔

(۲۱۵) لسان، میر کلیم اللہ

سنۂ وفات درج نہیں ہے، بعہدِ احمد شاہ وفات پانا لکھا ہے۔ اس لیے ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۷ھ کے درمیان تاریخِ وفات کا تعیّن ہو سکتا ہے۔ لسان تذکرۂ ریختہ گویاں (ص ۱۳۰) کے مؤلف کے ساتھیوں میں سے تھے۔

(۲۱۹) محبت، میر غلام نبی بلگرامی

تخلّص ان کا محب ہے، شاید کاتب نے محب کی جگہ محبت لکھ دیا ہو۔ سروِ آزاد (ص ۳۳۸) میں بھی یہی تخلّص ہے اور (ص ۳۳۹) میں خود آزاد بلگرامی کے کہے ہوئے قطعۂ تاریخ میں "بہشت محفلِ محب" ہے۔

(۲۲۱) محرور، خواجہ نبی بخش

۱۸۶۱ھ۔ "محرور" محلِ نظر ہے۔ سخن شعرا پیشِ نظر نہیں ہے ۔ ۱۸۶۱ھ کتابت کی غلطی ہو گی کیونکہ نقل شدہ نسّاخ سے منسوب تاریخ (جوان سخت ماتم) ۱۲۶۱ برآمد ہوتے ہیں۔

(۲۲۲) محزون، غلام حسین

۱۹ محرم ۱۱۸۵ھ۔ مسرت افزا کا حوالہ ہے۔ لیکن اس میں (ص ۲۰۸ اور تلخیصِ مسرت افزا ۔ سخن شعرا میں تخلّص "محرور" ہی ہے چونکہ وہ خود نسّاخ کے شاگرد تھے، اس لیے یہ تخلّص صحیح ہونا چاہیے۔ نسّاخ کی کہی ہوئی تاریخ ٹھیک نقل نہیں ہوئی یہ "مرگ جواں ماتم سخت" ہے، جس سے (۱۲۶۱) برآمد ہوتے ہیں۔ (تحریر)

استدراک

(۱۰۵) نام مولانا محمد حسین ہے۔ تاریخ و ماہ وفات مسرت افزا (ص ۲۲۰) میں ۱۹ ذی الحجہ ہے اور یہی خود بقول مرتب قاضی عبد الودود صاحب نے بحوالہ مسرت افزا لکھا ہے۔ پھر مرتب کا ماہ وفات کے بارے میں عطا کاکوی صاحب کی تلخیص (ص ۱۰۸) پر انحصار کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۲۲۶) محمد شاہ بادشاہ

۱۱۶۱ھ۔ کتب تاریخ سے ماہ و روز دریافت کیے جا سکتے تھے، مثلاً سیر المتاخرین (ص ۸۶۴) میں ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ درج ہے۔

نقل شدہ تاریخی شعر کے مصرع اول میں لفظ "آہ" کو "واوین" میں لکھنا چاہیے تاکہ قاری کی توجہ اس امر کی طرف فوراً مبذول ہو کہ یہاں کچھ تخرجہ وغیرہ مقصود ہے۔

وزیر سے مراد محمد شاہ کے وزیر قمر الدین اعتماد الدولہ ہیں۔

(۲۴۰) مصحفی، شیخ غلام ہمدانی

۱۲۴۰ھ۔ "کہ آتش مصحف حرام آمدہ" سے ۱۲۵۰ حاصل ہوتے ہیں۔

(۲۴۱) مصیب، شاہ غلام قطب الدین

مسرت افزا (ص ۲۰۶) میں صاف "ماہ ذیقعدہ کے آخر" میں وفات پانا لکھا ہے، یکم ذیقعدہ نہیں، جیسا کہ فہرست ہذا میں اسی تذکرے کے حوالے سے درج ہے؛ البتہ تلخیص عطا کاکوی (ص ۱۰۴) میں "یکم" ہے۔

مخزن نکات کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن پیش نظر نسخے (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) میں ان کا ذکر نہیں ملا۔

(۲۴۳) مظہر، میرزا مظہر جان جاناں

۱۱۹۵ھ۔ سودا سے منسوب تاریخ ("ہائے جان جاناں مظلوم") سے ۱۱۹۱ برآمد ہوتے ہیں؛ اس میں روبے "درد" (دال) کے ہم عدد ملانے سے تاریخ حاصل ہو گی۔

(۲۵۵) مومن، حکیم مومن خان

ملاحظہ ہو مندرجۂ بالا شمارہ (۱۱۶)

(۲۵۸) مہدی، میر محمد مہدی

تعیین زمانہ کے لیے معاصر (۱) کا حوالہ دیا ہے، لیکن تعیین شدہ سنہ درج ہونے سے رہ گیا۔

استدراک

(۲۶۱) میر، محمد تقی

۱۲۲۵ھ - مصحفی سے منسوب مادۂ تاریخ (موانظیری آج) سے ۱۲۲۱ برآمد ہوتے ہیں۔ اس تاریخ کے بارے میں تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے مرتّب کا جو نوٹ صفحہ ۱۰۳ - ۱۰۴ پر ہے، مرتب فہرست ہذا کی نظر سے شاید نہیں گذرا، یا ان سے نظرانداز ہوگیا ہے۔

(۲۶۲) میر بخشی، سیّد لطف علی

۱۲۶۹ھ - شاد سے منسوب قطعۂ تاریخ کے آخری شعر میں "سالِ وفات" غالباً کتابت کی غلطی ہے "تاریخ وفات" چاہیے

(۲۶۶) ناسخ، شیخ امام بخش

۱۲۵۴ھ - رشک کی کہے ہوئے دوسرے قطعہ میں تاریخی مصرعے (دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے") میں گوئی اور "لکھنو" املا ہونے کی صورت میں تاریخ برآمد ہوگی۔

(۲۶۷) ناصر، نواب نظام الدولہ بہادر

دیکھیے مندرجۂ بالا شمارہ (۸)

(۲۶۹) نالان، میر وارث علی

قطعۂ مذکور کے پانچویں شعر کے آگے سوالیہ نشان بےمحل ہے۔ شعر کے معنی صاف ہیں "فہم گر" ایک لفظ ہے۔غالباً "دیکھ" کی جگہ "دیکھیے" بہتر قرأت ہے، گو دیوان جوشش کے مطبوعہ نسخے (ص ۲۴۰) میں "دیکھ" ہی ہے۔

(۲۷۱) نجات، مرزا عتیق اللہ

۱۰ شوال ۱۱۷۵ھ - اس تاریخ کے لیے حوالہ چمنستانِ شعرا کا ہے، لیکن اس کتاب (ص ۲۲۴) میں غرۂ شوال یعنی یکم شوال ہے۔

کامیاب والے قطعۂ تاریخ کے نقل شدہ مصرع (نجات یافت زدام زمانۂ صیّاد) سے ۱۲۰۵ حاصل ہوتے ہیں حالاں کہ ماخذ (ص ۳۲۵) میں درج شدہ شعر کے مصرع اول (اشکست کلک دلِ خویش وزدر رقم تاریخ) میں صریح اشارہ ہے ۳۰ عدد کم کرنے کا۔

(۲۷۶) نوروز، سید نوروز حسین۔

دوسرے شعر کے مصرع دوم میں "قفنائے" بمعنی ہے "قفائے" بمعنی پشت، پیچھے ہونا چاہیے

(۲۸۶) ہدایت ، ہدایت اللہ خان ۱۲۱۵ھ
(۲۸۷) ہدایت ، ہدایت علی ۱۲۱۵ھ

یہ دو مختلف شاعر نہیں بلکہ ایک ہی شخص ہیں۔ شمارہ ۲۸۷ میں ہدایت علی سہو قلم ہے کیونکہ منقول عنہ ماخذ گلشن بیخار (ص ۵۲۶) میں نام ہدایت خان ہے، لیکن یہاں درمیان میں کاتب سے سہواً لفظ "اللہ" چھوٹ گیا ہے اس لیے کہ گلشن بیخار ہی میں ایک دوسرے مقام (ص ۳۵۰) پر نام ہدایت اللہ خان مرقوم ہے۔ تذکرۂ مسرت افزا (ص ۲۵۷) میں بھی ہدایت اللہ خان ہے، ذکا کا تذکرہ پیش نظر نہیں ہے۔

نیز ۲۸۶ (ہدایت) کے طورِ کلیم میں منقول اشعار اور ۲۸۷ (ہدایت) کے گلشن بیخار میں منقول اشعار کے مطالعے سے بھی دونوں کا ایک ہی شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۲۹۰) یٰسین ، شاہ یٰسین نذر بادی

سنۂ وفات ۱۲۳۲ھ جو حسبِ تاریخ میر غلام علی آزاد بلگرامی برآمد ہوتا ہے، نام کے آگے درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

مرتب نے چمنستان شعرا سے مہربان کی کہی ہوئی یہ تاریخ نقل کی ہے۔

ہاتفے از چشم خود سیارہا افشاند و گفت سالِ تاریخ "آیۂ یٰسین را تا مرسلین"

یہ وضاحت طلب ہے۔ مصنف نے اس پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ مصرع دوم میں مادۂ تاریخ کی یہ نشاندہی ہے کہ یہ سورۂ یٰسین کی آیت مرسلین تک ہے، یعنی یٰسین ○ والقرآن الحکیم ○ انک لمن المرسلین ○ اس سے ۱۲۳۹ برآمد ہوتے ہیں جو مذکور شاہ یٰسین کے سال وفات سے (۷) زاید ہے، اس بارے میں صاحب چمنستان نے وضاحت کی ہے کہ مہربان نے یہ تاریخ لکھی اور سات زاید اعداد حسن تعمیہ سے نکالے (ص ۱۴۹) شعر بالا میں مصرع اول میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس تعمیہ کے طریقے کی نشاندہی سردست ممکن نہیں لیکن "ہاتف سیارہا از چشم خود افشاند" والی عبارت سے کوئی لفظ حاصل ہونا چاہیے جس کے سات اعداد ساقط ہونا مقصود ہے ؎

؎ یہ مصرع صاف ہے کہ تاریخ مندرجہ مصرع ثانی میں سے سیاروں کے عدد ساقط ہوں گے، "سبعہ سیارہ" مشہور ہیں یعنی (۷) کم کیے جائیں (تحریر)

محمد کمال الدین حسین ہمدانی

عرفان انیس

(۱)

میرانیس کے عہد (۱۲۲۰ - ۱۲۹۲ھ) میں مذہبِ اسلام اور اسلامی ادب پر عرفان و تصوف کا رنگ غالب تھا جس کا سلسلہ عرب و ایران سے ملتا تھا۔ اس دور کا تصوف کئی فرقوں میں تقسیم تھا اور صوفیا کے مختلف گروہ بعض ایسی بدعتیں اختیار کر چلے تھے، جو مذہبی نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ فرقے حقیقی اسلامی تصوف کو اپنائے ہوئے تھے۔
اسلامی تصوف کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ان صوفیاء کے عقائد و نظریات کا مطالعہ ضروری ہے، جو خالص اسلامی تصوف پر عامل تھے۔ اصل تصوف، عکوف علی العباد، اور انقطاع الی اللہ اور زخارف و زینتِ دنیا سے اعراض، لذتِ مال و جاہ میں زہد اور عبادتِ خدا کے لیے خلوت نشینی ہے'[۱]۔
جنید بغدادی سے جب تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا۔ تصفیۂ قلب، اخلاقِ طبعیہ سے علیحدگی، بشریت کے صفات کو مٹانا، خواہشاتِ نفسانیہ سے پرہیز، روحانی صفات کو حاصل کرنا، علومِ حقیقیہ سے تعلق رکھنا، اور ایسے امور کو بجالانا جو دوام کے سزاوار ہوں، جمیع امت کو نصیحت کرنا، پوری طرح خدا سے وعدوں کو پورا کرنا، اور امورِ شریعت

۱۔ التصوف فی الاسلام (ڈاکٹر عمر فروخ): ۱۷ (طبع بیروت)

میں رسول اللہ کی اتباع کرنا۔[۲]

یہ ایراد کہ مصادرِ تصوف غیر اسلامی ہیں اور مسیحی، یونانی اور ہندو عقائد پر اسلامی تصوف کی بنیاد ہے، صحیح نہیں ہے۔ اس نظریے کی رُو سے تصوفِ اسلامی کی مسلّہ نسبت کی تغلیط ہوتی ہے۔ حال آں کہ محققین کو اس کا اعتراف ہے کہ مصادرِ تصوف خالص اسلامی ہیں۔ دکتور عمر فروخ لکھتے ہیں[۳] کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصادرِ تصوفِ اسلامی خالص اسلامی ہیں، کیونکہ تصوفِ اسلامی کی نشو و نما خود اس کے گھر میں ہوئی ہے۔ لہٰذا اسلامی تصوف مبنی ہے اسلامی اساس اور بنیاد پر۔ دراصل اسلامی تصوف کا اصل منبع و مصدر حضرت علی کی ذات ہے۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں۔

> اور من جملہ علوم کے علم طریقت و حقیقت و احوالِ تصوف بھی ہے۔ اور تمھیں یہ معلوم ہے کہ تمام بلادِ اسلام میں جو بھی اس علم کا جاننے والا ہے، وہ اپنے سلسلۂ تصوف کو حضرت علی تک منتہی کرتا ہے، اور وہ ہیں پر رک جاتا ہے۔ اس امر کو صراحت کے ساتھ شبلی، جنید، سرّی سقطی، ابو یزید بسطامی، ابو محفوظ معروف بہ کرخی وغیرہم نے بیان کیا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ خرقہ کافی ہے، جو آج تک صوفیوں کے اخبار میں داخل ہے اور جسے وہ لوگ بسندِ متصل حضرت (علی) سے منسوب کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مسئلے کے جواب میں حقیقتِ تصوف پر جنید نے یوں روشنی ڈالی ہے۔[۴]

> تصوف ایک ایسا اسمِ جامع ہے، جو دس معنوں پر مشتمل ہے:
>
> (۱) دنیا کی ہر چیز میں کمی کرنا اور زیادتی سے بچنا۔
>
> (۲) خدا کے سوائے قلب کو کسی دوسری چیز پر اعتماد نہ حاصل ہو۔

۲۔ کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف (ابوبکر محمد بن اسحاق البخاری الکلابادی مصحّحہ پروفیسر اے۔ جے آربری): ۹ (طبع مصر)

۳۔ التصوف فی الاسلام: ۲۷ (طبع بیروت)۔

۴۔ حلیۃ الاولیا (ابو نعیم) ۱: ۲۲ (طبع مصر)

(۳) اس کے عفو کو مانتے ہوئے اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ رہنا۔
(۴) دنیا کے فقدان پر اس طرح صبر کرنا کہ لب پر حرفِ سوال و شکوہ نہ آنے پائے۔
(۵) اشیا کے موجود ہونے پر اس تمیز کو باقی رکھنا کہ کیا لے اور کیا نہ لے۔
(۶) دنیا کے اشغال ترک کر کے خدا کے شغل میں مصروف رہنا۔
(۷) اور تمام ذکروں کو ترک کر کے، خدا کا ذکرِ خفی کرنا۔
(۸) دل میں وسوسہ پیدا ہونے پر تحقیقِ اخلاص کرنا۔
(۹) شک آنے پر یقین حاصل کرنا۔
(۱۰) اضطراب و وحشت کے موقع پر خدا کی طرف سکون حاصل کرنا۔ جس میں یہ سب کمال جمع ہو جاویں تو وہ صوفی کہلانے کا مستحق ہے ورنہ جھوٹا ہے۔

ابوبکر شبلی سے پوچھا گیا کہ صوفی کون ہے، تو جواب دیا[5]:

امرِ خدا کی تعظیم اور بندگانِ خدا پر شفقت کرنا ہے۔ جو ہر برائی سے پاک صاف ہو اور ہمہ وقت تفکر کرتا ہو۔ اور اس کی نگاہ میں سونا اور خاک برابر ہو۔ جس کا قلب پاک صاف ہو، اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کے راستے پر چلے۔ دنیا کو پسِ پشت پھینک دے اور خواہشِ نفس کو طعمِ جفا سمجھے۔

ذوالنون مصری صوفی کی تعریف یہ کرتے ہیں:[6]

وہ ہے کہ جب کلام کرے، تو حقائق روشن کر دے؛ اور جب خاموش رہے، تو اس کے اعضا و جوارح قطعِ علائق پر گواہی دیں۔

امام جعفر صادق صوفی کی تعریف یوں فرماتے ہیں "من عاش فی باطن الرسول فھو صوفی" (جو باطنِ رسول پر زندگی بسر کرے، وہ صوفی ہے)۔ حافظ ابونعیم نے اس کی شرح اس طرح کی

۵۔ حلیۃ الاولیا (ابونعیم) ۱: ۲۳ (طبع مصر)
۶۔ حلیۃ الاولیا (ابونعیم) ۱: ۲۲ (طبع مصر)

ہے: امام جعفر صادقؑ نے باطن رسول سے حضرت کے اخلاقِ ظاہرہ اور آخرت کے اختیار کرنے کو لیا ہے۔ پس جو شخص اخلاقِ رسول سے آراستہ ہو جائے اور اس امر کو اختیار کرے جو رسول نے اختیار فرمایا اور رغبت کرے اس طرف جدھر رسول نے رغبت فرمائی اور پرہیز کرے اس سے جسے رسول نے چھوڑا، تو گویا اس نے صفائے نفس و قلب حاصل کر لیا۔

اساطین صوفیائے کرام کے نزدیک یہ ہے حقیقتِ تصوف اور امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ ان صفات کے مظہرِ اتم تھے اور آپ ہی نے حقائقِ تصوف پر روشنی ڈالی اور اسی بنا پر صوفیائے کرام انھیں اپنا مرشدِ اوّل سمجھتے ہیں۔[8]

صوفیائے شیعہ نے ا[illegible]رفان و تصوف کو اختیار کیا، جو امیر المومنین حضرت علی کی طریقت اور تعلیمات کے مطابق تھا۔ چنانچہ زمانۂ قدیم میں اصولی مذہب کے ساتھ شیعانِ عالم کی طبیعت میں عرفان و تصوف کا ذوق غالب رہا، جیسا کہ تواریخ و کتبِ مذہبِ شیعہ مثلاً کتاب نفائس الفنون (مؤلفہ حکیم محمود آملی) مجالس المومنین (مؤلفہ قاضی سیّد نوراللہ شوستری شہیدِ ثالث) مصباح الظلم (مؤلفہ امداد امام) منہاج نہج البلاغہ (از مولانا سیّد سبط الحسن ہنسوی) وغیرہ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ شیعی تصوف کا عروج ایران میں شاہانِ صفویہ ایران کے عہد (۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء تا ۱۰۲۸ھ/۱۶۲۹ء) میں ہوا۔ اس زمانے میں وہ علمائے شیعہ جو ایران میں مشہور ہوئے اور وہ علمائے شیعہ جو واردِ ہندوستان ہوئے عرفان و تصوف کے ذوق میں کامل تھے۔ چنانچہ اس دور کے ممتاز مفسّرین اور محدّثین اور متکلمین کے مصنفات و مؤلفات شیعی عرفان و تصوف کا بیمثال مرقع ہیں مثلاً (۱) کتاب مصباح المتہجد از شیخ محمد بن حسن الطوسی، (۲) کتاب مکارم الاخلاق از علامہ ابو نصر طبرسی، (۳) کتاب ثواب الاعمال از شیخ صدوق (۴) کتاب اوصاف الاشراف از محقق طوسی، (۵) کتاب منیۃ المریدین از شیخ زین الدین علی شہید ثانی، (۶) کتاب اسرار الصلواۃ از شیخ زین الدین علی شہید ثانی، (۷) کتاب عدۃ الداعی از علامہ ابن فہد حلّی، (۸) مصباح کفعمی از شیخ محمد ابراہیم کفعمی، (۹) کتاب مفتاح الفلاح از شیخ بہاء الدین

۷ ـ حلیۃ الاولیاء ۱: ۱۰ (طبع مصر)

۸ ـ منہاج نہج البلاغہ مؤلفہ مولانا سید سبط الحسن ہنسوی (دوسرا ایڈیشن)

آملی ، (۱۰) مثنوی نان وحلوا وغیرہ از شیخ بہاء الدین آملی ، (۱۱) تفسیر صافی از ملا محسن فیض کاشانی (۱۲) کتاب وافی از ملا محسن فیض کاشانی ، (۱۳) لآلی مخزونہ از ملا محسن فیض کاشانی ، (۱۴) تشویق السالکین از ملا محمد تقی مجلسی (۱۵) سیر وسلوک از ملا محمد باقر مجلسی ، (۱۶) رسالہ اجوبہ از ملا محمد باقر مجلسی وغیرہ ۔

مذہب کے علاوہ اصنافِ ادب پر تو عرفان و تصوف کا رنگ بہت غالب رہا ہے خصوصاً مذہبی شاعری میں عرفان و تصوف نمایاں جزو کی حیثیت سے شامل رہا ہے اور مرثیہ جو مذہبی شاعری کی ایک اہم صنف کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ، تصوف کے اصول وعقائد سے بہت قریب اور عرفان و تصوف کے حقیقی نظریات وجذبات کی عکاسی کا آیئنہ دار بنا رہا ۔ مرثیہ گو اساتذہ خصوصاً انیس ودبیر اور ان کے خاندان کے مشہور و معروف مرثیہ گویوں نے مراثی میں عارفانہ اور صوفیانہ خیالات اور تصورات ایسے دلنشین انداز سے پیش کیے کہ ہر اہلِ دل نے صدقِ دلی کے ساتھ ان پر صاد کیا اور مراثی بلا تفریق اسلام کے ہر فرقہ میں مقبول ہوئے ۔

مرثیہ کا مطالعہ عرفان و تصوف کی روشنی میں کیا جائے ، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مرثیے معرفت اور تصوف اور اخلاق کی تعلیمات سے لبریز ہیں ۔ ان میں عارفانہ اور صوفیانہ اصطلاحات کثرت سے استعمال کی گئی ہیں مثلاً عرفان ، عشق ، فراق ، وصل ، وصال ، محبت ، جلوہ ، تجلّی ، نورِ خدا ، جمالِ خدا ، عارف ، صوفی ، سالک ، طریق ، چلّہ ، چلّہ نشین ، حجرہ ، صومعہ ، نانِ جویں ، کرامات ، سیفی ، صبر ، شکر ، رضا ، تسلیم ، قناعت ، توکل ، فقر ، فقیر ، بوریا ، شمع ، پروانہ ، درویش ، مزار ، پھولوں کی چادر وغیرہ ۔ اور یہ اصطلاحات عارفانہ اور صوفیانہ نظریات کی تشریح و توضیح کے طور پر اور ان نظریات کی تبلیغ کے لیے استعمال کی گئی ہیں ۔

(۲)

اس تمہید کے بعد مراثی سے کچھ نمونے ذیل میں پیش کرتا ہوں ، جو اصول وعقائد عرفان و تصوف سے متعلق ہیں ۔ مراثی جناب حضرت امام حسینؑ اور ان نفوس قدسیہ سے متعلق ہیں جو عرفانِ باری تعالیٰ کی انتہائی منزل پر فائز تھے ، ان کا اخلاق خالقِ دوجہاں کے خُلق کا سچا نمونہ تھا ،

راہِ خدا میں ان کی اخلاقی اور عرفانی تعلیم اور قربانیاں ان کے عارفِ حقیقی ہونے کی قوی دلیل ہیں۔ وہ ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہے۔ انھوں نے راہِ حق میں سخت مصائب و آلام برداشت کیے، حتیٰ کہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں مگر تسلیم و رضائے الٰہی پر ثابت قدم رہتے ہوئے، صبر و شکر کیا اور اپنے نمونے سے دنیا کو راہ عرفان حق دکھائی۔ مراثی میں یہی عرفانی تعلیمات عام ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱) انصارِ امام حسینؑ کی مدح و ثنا:

میر انیس نے انصارِ حسینی کی مدح و ثنا عارفانہ اور صوفیانہ طرز پر فرمائی ہے اور انصارِ حسینی کو اصحابِ صفہ کا مثل بیان کیا ہے۔

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے، سبحان اللہ ۔۔۔ کیا رفیقانِ وفادار تھے، سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرّار تھے، سبحان اللہ ۔۔۔ زاہد و عابد و ابرار تھے، سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی، مسکن چھوڑا
مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

زہد میں حضرتِ سلماںؓ کے برابر کوئی ۔۔۔ دولتِ فقر و قناعت میں ابوذرؓ کوئی
صدقِ گفتار میں عمارؓ کا ہمسر کوئی ۔۔۔ حمزۂ عصر کوئی، مالکِ اشتر کوئی
ہونگے ایسے ہی محمدؐ کے جو شیدا ہونگے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا، نہ وہ پیدا ہونگے

(۲) سلوک و عرفان:

میر انیس حضرت امام حسین کے ارشاد کو اس طرح نظم فرماتے ہیں۔

سالک جو ہیں، وہ راہ رضا بھولتے نہیں
جو دوست ہیں، تو ولی کی ولا بھولتے نہیں

حضرت علی اکبر نے حضرت امام حسین سے جو استدعا کی، اس کو اس طرح پیش کیا ہے:

اے سالکِ منہاجِ علی راہ دکھادے — دروازۂ رحمت مجھے للہ دکھادے!

وقتِ رخصت حضرت علی اکبر نے جو ارشاد فرمایا، اس کو یوں پیش کیا ہے:

دوری نہیں کچھ، عمرِ سفر ہوتی ہے کوتاہ
ہجرت ہو تو کٹ جاتی ہے نرمی سے کڑی راہ
سالک ہے وہی راہِ رضا سے ہے جو آگاہ
تسبیل کی صورت، تجھے کوثر کی ہے گر چاہ

حضرت عباسِ علمدار کی مدح ملاحظہ ہو:

زیبا ہے، اگر کعبۂ ایماں انھیں کہیے — گر کہیے تو سرچشمۂ عرفاں انھیں کہیے

مخدراتِ عصمت و طہارت کی مدح میں حضرت امام حسین نے جو ارشاد فرمایا، اسے مرثیہ میں حسبِ ذیل طور پر پیش کیا ہے:

تقویٰ ہے زیور ان کا، تو شرم و حیا لباس — ہاں ایک نقدِ عصمت و عفت ہے سب کے پاس
ہیں سالکِ طریقِ بتولِ فلک اساس — اِک اِک خدا پرست ہے، ایک ایک حق شناس

میر انیس کے برادرِ خورد میر مونس نے حضرت امام حسین کے زہد و تقویٰ اور سلوکِ عرفانِ الٰہی کو حضرت امُّ البنین کی زبانی اس طرح بیان فرمایا ؎

زر سے غرض، نہ مال سے مطلب، نہ حُبِّ جاہ — دنیائے دوں سے رہتا ہے کنارہ وہ دیں پناہ
بیقدر کو وہ زر ہے، وہاں مثلِ برگِ کاہ — سالک ہے اس طریق کا جو ہے علی کی راہ
قرب اس سے حق کو ہے، وہ خدا سے قریب ہے
نانِ جویں غذائے حسینِ غریب ہے

ایک اور بند میں حضرت امام حسین کی عارفانہ اور صوفیانہ زندگی کو انھیں کے کلام سے یوں نقل کرتے ہیں:

نہ ملک سے کچھ کام، نہ دولت کا ہوں طالب — حشمت کا ہوں جویا، نہ ریاست کا ہوں طالب
نعمت سے غرض کچھ ہے، نہ زینت کا ہوں طالب — امت سے اگر ہوں، تو محبت کا ہوں طالب
پوشاک فقیرانہ ہے، اس گوشہ نشیں کی
عادت ہے لڑکپن سے مجھے نانِ جویں کی

(۳) عشقِ خدا و یادِ خدا :

حضرت رسول خدا صلعم نے اختتامِ جنگ پر امام حسین کو جو خطاب فرمایا ، اسے میر انیس یوں بیان کرتے ہیں :

بیٹھو تہِ شمشیر! یہ مرضیِ خدا ہے　　اے عاشقِ صادق! دم تسلیم و رضا ہے

بتایا گیا ہے کہ عشقِ الٰہی اور تسلیم و رضا کی عرفانی منزلیں جو حضرت امام حسین نے روزِ عاشورۂ محرم کربلا میں طے کیں ، وہ رسولِ خدا صلعم کے حکم کے مطابق تھیں ، اور یہ عرفان کی انتہائی منزلیں ہیں ۔
علیؑ اکبر کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین کو پردۂ قدرت سے جو ندا آئی ، میر ضمیر نے ایک مرثیہ میں اسے نظم کیا ہے :

آئی یہ ندا پردۂ قدرت سے قضارا　　اکبر تمھیں پیارا ہے کہ اللہ ہے پیارا
بچپن سے جو دعوائے محبت ہے ہمارا　　فرزند کے مرنے سے کرو اب جلد کنارا
میں وصل کا مشتاق ہوں مت دیر ذرا کر
اصغر ابھی باقی ہے ، سو اس کو بھی فدا کر

اس بند میں خداوندِ عالم کی جانب سے ارشاد کردہ منازلِ عشق و محبتِ الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ، جنھیں طے کرنے کے لیے اولاد کی محبت کو دل سے نکالنا حتیٰ کہ راہِ خدا میں انھیں قربان کر دینا بھی ضروری ہے ۔ عشق کی یہ منزل طے کرنے کے بعد ہی خدا سے وصلِ حقیقی ہو سکتا ہے اور یہی حقیقی عرفان و تصوف ہے ۔
مرزا دبیر نے بھی حضرت امام حسین کی عارفانہ مناجات کو حسبِ ذیل دو بندوں میں پیش کیا ہے :

تو ہی ہے شاہ شہنشاہوں کا اے بارِ خدا !　　ہیں برابر تری سرکار میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے البتہ سوا　　اے خوشا حال ، ہوا مجھ سے ترا عشق ادا
حلق پر تیغ رہے ، سینہ پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا ، دل میں تری یاد رہے
جُرد ندان مرے نانا نے مجھے نذر دیا　　لے گئیں نذر کو پہلو شکستہ زہرا

سُرخرو ہے ترے دربار میں بابا میرا　　دل کے ٹکڑے مرے بھائی کے بچے تجھ پہ فدا
آج شبیر بھی [illegible] کے مقابل ہوجائے
سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہوجائے

حضرت امام حسین نے وقتِ شہادت جمالِ خداوندی کا جو نظارہ کیا، اسے مندرجۂ ذیل بند میں دیکھیے:

مُڑ مُڑ کے زیرِ تیغ یہ بولے شہِ اُمم　　زینب! تجھے غریبیِ شبیر کی قسم
بہلا مرے یتیموں کو خیمے میں ایک دم　　بٹتا ہے دھیان، محوِ جمالِ خدا ہیں ہم
زینب تو لے کے بچوں کو ڈیوڑھی سے ہٹ گئی
یاں بوسہ گاہِ احمدِ مختار کٹ گئی

محولہ فوق بندوں میں عشقِ الٰہی کی منزلوں میں قربانیوں کو اور وقتِ شہادت، نظارۂ جمالِ خدائی کو عارفانہ اور صوفیانہ طرز سے بیان کیا گیا ہے۔

حضرت امام حسین نے صبحِ عاشورہ انصار کو راہِ خدا میں جہاد کے لیے جو خطاب فرمایا، اسے میر انیس نے حضرت امام حسین کی زبانی اس طرح نظم کیا:

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا　　یاں آج خوں بہیگا محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا　　گذری شبِ فراق، دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں، غم کرینگے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں، اس دن کے واسطے

اس بند میں شبِ فراق اور یومِ وصال خاص صوفیانہ اصطلاحات ہیں۔

(۴) یادِ خدا:

میر انیس نے یادِ خدا میں حضرت امام حسین کی دلی کیفیت کو انھی کی زبانی پیش کیا ہے:

اللہ کا گھر ہے، دلِ بیتاب ہمارا　　ہے عینِ عبادت بخدا خواب ہمارا

ایک اور بند میں حضرت امام حسین کی عبادت کو صوفیانہ طریقے سے پیش کرتے ہیں:

جب رات عبادت میں بسر کی شہِ دیں نے　　سجدوں میں مہمِ عشق کی سر کی شہِ دیں نے
دیکھا جو سفیدی کو سحر کی، شہِ دیں نے　　مڑ کر رُخِ اکبر پہ نظر کی، شہِ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی آخر ہوئی، بیٹا!
اب اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی، بیٹا!

عشق کی مہم عبادت، قربانیوں اور شہادت کے ذریعے طے کرنا طریقِ عرفانِ حق تعالیٰ کی انتہائی منزل ہے۔

حوروں کی زبان سے امام حسین کی مدح میر انیس کے ہاں دیکھیے:

خیبانِ زباں خشک ہے ذکرِ الٰہ میں　　گویا کھڑے ہیں ختمِ رسل رزمگاہ میں

میر مونس برادرِ خرد میر انیس نے حضرت امام حسین کی مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات کو نظم کرتے ہوئے عبادت اور عشق کو جناب امام کی زبانی پیش کیا ہے:

یارب میں تیرا بندۂ طاعت گزار ہوں　　مظلوم ہوں، امام ہوں، شب زندہ دار ہوں
بیکس ہوں، تشنہ لب ہوں، غریب الدیار ہوں　　سو جاں سے نامِ پاک پہ تیرے نثار ہوں

میر مونس نے ایک اور شعر میں حضرت امام حسین کے ذکر کی حالت کو اس طرح پیش کیا ہے:

پہلو سے پار ہو گئیں ہر تیز برچھیاں　　لیکن خدا کے ذکر میں جنباں رہی زباں

یہ حالت ظاہر ہے کہ عشقِ الٰہی کے انتہائی درجے ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، جو عرفانِ الٰہی میں کامل استغراق کا نتیجہ ہے۔

(۵) تسلیم و رضا:

عرفانِ حق تعالیٰ کی راہ میں صبر و شکر اور تسلیم و رضا کے مقام سے ہر صاحبِ عرفان واقف ہے۔ صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی تعلیم مراثی میں عام ہے، اور اس تعلیم کو مرثیہ گویوں نے صوفیانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ ایک مشہور سوز ملاحظہ ہو:

منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے　　سہل ہے عشقِ بشر، عشقِ خدا مشکل ہے
[illegible] سوا ان کو سوا مشکل ہے　　وعدہ آسان ہے، وعدہ کی وفا مشکل ہے

یہ فقط امر ہوا، فاطمہ کے جانی سے
مشکلیں جتنی پڑیں کاٹیں سب آسانی سے

حضرت امام حسین کے فرمودہ کلماتِ رجز کو میر انیس یوں پیش کرتے ہیں:

لیتے ہیں کچھ تو خانۂ اکبر سے لیتے ہیں
ہم آپ فاقہ کرتے ہیں، سائل کو دیتے ہیں
نے تخت سے غرض ہے نہ شاہی سے کام ہے
درویش کو رضائے الٰہی سے کام ہے

مرزا دبیر نقل کرتے ہیں کہ حضرت امام حسین نے صبر سے مخاطب ہو کے ارشاد فرمایا:

باقی رہا جو صبر، اسے یہ سنا دیا | مالک نے ہم کو سب سے تحمل سوا دیا
اب دیکھنا کہ عاصیوں کو بخشوا دیا | اُف بھی نہ کی زبان سے اور سر کٹا دیا

تڑپوں گا میں نہ شمر کی بیداد و جبر پر
اے صبر غش کریگا تو پیاسے کے صبر پر

میر مونس نقل کرتے ہیں کہ حضرت امام حسین نے حضرت رسولِ خدا صلعم کے حکم کے مطابق صبر اختیار فرمایا تھا۔ ملاحظہ ہو:

پایا جو مصطفیٰ کا اشارا حسین نے | جو کچھ تھا اسلحہ، وہ اتارا حسین نے
مرنا کیا خود اپنا گوارا حسین نے | پڑھ کر یہ ظالموں کو پکارا حسین نے

غصہ میں حلمِ سبطِ پیمبر بھی دیکھ لو
لو آج تیغِ صبر کے جوہر بھی دیکھ لو

حضرت علی اکبر نے حضرت امام حسین سے رضا۔ جہاد طلب کرتے وقت جو درخواست کی، اسے میر مونس کے کلام سے دیکھیے:

دیجیے رضا کہ مالکِ صبر و رضا ہیں آپ | [illegible] ہیں آپ تابعِ حکمِ خدا ہیں آپ
سرچشمۂ عنایت و لطف و عطا ہیں آپ | ابرِ کرم ہیں آپ، محیطِ سخا ہیں آپ

میں کون ہوں بھلا، جو سماؤں نگاہ میں
حضرت تو گھر لٹاتے ہیں، خالق کی راہ میں

اسی سلسلہ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

چرچا رہے عطائے امامِ جلیل کا　　　سب بھول جائیں صبر و تحمل خلیل کا

جواب میں حضرت امام حسین نے ارشاد فرمایا :

راضی رضائے حق پہ ہے شبیرِ تشنہ کام　　　گھبرائیے نہ آپ کہ مطلب ہوا تمام

ہم نے تو صبر کر کے خدا پر نگاہ کی　　　مادر سے جا کے لیجیے رضا رزمگاہ کی

حضرت علی اکبر اجازتِ جہاد پاکر میدانِ قتال میں پہنچے، اور دورانِ رجز ارشاد فرمایا۔ میر مونس کے کلام سے ملاحظہ ہو :

گو درپے آزار ستمگر ہیں ہمارے　　　کرتے ہیں مگر صبر، یہ جوہر ہیں ہمارے

ایک سلام کا یہ شعر ملاحظہ ہو، جس میں پنجتن پاک کی مدح و ثنا کی گئی ہے :

آفت و رنج و مصیبت اور تسلیم و رضا

پانچ چیزیں یہ بنی تھیں پنجتن کے واسطے

خداوند عالم نے ملائکہ سے حضرت امام حسین کی تعریف میں جو کلماتِ مدح ارشاد فرمائے، میر ضمیر نے ان کو مرثیہ میں اس طرح پیش کیا ہے :

کرتے ملکوت اپنے صوامع میں جو طاعات

ان سب سے کہی صانعِ قدرت نے یہی بات

دیکھی مرے بندے کی شجاعت کی کرامات

قدرت پہ ہے اپنی بھی، مجھے مخزو مباہات

اب دیکھیو تم حوصلۂ صبر کہ کیسا ہے

جو کچھ کہو، بندہ مرا راضی برضا ہے

میر انیس فرماتے ہیں کہ عالمِ بالا سے حضرت امام حسین کو یہ ندا آئی :

ہاں دی تھی ہمیں نے تجھے لڑنے کی اجازت

اب صبر دکھا، اے پسرِ شاہِ ولایت !

عالمِ بالا سے یہ ندا سنتے ہی امام حسین نے تلوار روک دی :

الحمد سے حلیم و بھاے شہِ ابرار!

آئی اُدھر آواز، اِدھر رک گئی تلوار

حضرت امام حسین نے خود سے مخاطب ہو کے فرمایا:

کب تک دُکھا حسین کا دل درد مند ہے

اے ذُوالفقار! صبر خدا کو پسند ہے

حضرت امام حسین نے وقتِ رخصت اہلِ بیت کو صبر کی تلقین فرمائی، جسے مرثیہ گو اساتذہ نے مراثی میں پیش کیا ہے۔

میر مونس نے حضرت امام کی تلقینِ صبر حسبِ ذیل اشعار میں نظم کی ہے:

خیمہ سے برآمد لگے ہونے شہِ دلگیر

رخصت کی قیامت نہیں ہو سکتی ہے تحریر

پلکا کوئی تھامے تھی، کوئی دامنِ شبیر

بس صبر کرو، صبر کرو، تھی یہی تقریر

ایک اور مرثیہ میں مونس نے اسی مضمون کو یوں کہا ہے:

شہ جو میداں کو چلے، گھر میں ہوا حشر بپا

خاک اڑانے لگے ناموسِ رسولِ دوسرا

رو کے ایک ایک سے کہتے تھے شہِ کرب و بلا

بی بیو! صبر کرو، صبر کرو، بہرِ خدا

حضرت امام حسین نے اپنے فرزندِ بیمار حضرت امام زین العابدین کو صبر کی تلقین جس دردناک انداز میں فرمائی ہے جناب مونس نے اس طرح پیش کیا ہے:

کرتا ہوں وصیت تمہیں، اے عابدِ بیمار! زنجیر سے برہم بھی ہو نا نہ خبردار

لے آئیں لعیں سامنے جب طوقِ گرانبار گردن کو جھکانا، یمین کرتے ہو اگر پیار

گھبرائیو ہرگز نہ کسی رنج و الم میں

یوسف کی طرح جائیو زندانِ ستم میں

امام زین العابدین علیہ السلام جواب دیتے ہیں:

بولا شہ عالم سے، یہ وہ ثانی ایوب ۔۔۔ یہ قید ہنرمند سمجھتے نہیں معیوب

اچھا، نہ گلا اس سے کرینگے کسی اسلوب ۔۔۔ کیا طوق و سلاسل میں بُرائی ہے، بہت خوب

شکوے کا خدا جاہے، تو یاں نام نہ آتے

پر حیف کہ ہم آپ کے کچھ کام نہ آتے

ہم تو بخدا تابع مرضی خدا ہیں ۔۔۔ بچپن ہی سے پابند غم و رنج و بلا ہیں

بیصبر نہیں، مالک تسلیم و رضا ہیں ۔۔۔ بند صوائینگے گردن کو کہ ہم عقدہ کشا ہیں

ہو نگے نہ ہراساں کبھی حضرت کی دعا سے

ورثہ ہمیں دادا کا ملا فضل خدا سے

غرض کہ مرثیہ گو اساتذہ نے پنجتن پاک اور شہدائے کربلا کے عرفانی کردار اور عرفانی اقوال کو بڑی خوبی کے ساتھ مراثی میں عارفانہ اور صوفیانہ انداز پر نظم کیا ہے۔

مراثی کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مراثی میں سلوک راہ خدا اور عرفان حق تعالیٰ کی تعلیم نمایاں ہے۔ میر ضمیر، میر انیس، مرزا دبیر اور میر مونس جیسے اساتذۂ فن نے مراثی میں مناسب موقعوں پر حضرت امام حسین کے زہد و تقویٰ، صبر و شکر، قناعت و توکل اور رضا و تسلیم کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ میرے لیے جملہ اساتذہ کے کلام کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ ممکن ہے، نہ اس مختصر مقالے میں اسے تفصیلی طور پر بیان کرنے کی گنجایش۔ اساتذہ کے تمام عرفانی کلام کو پیش کرنے کے لیے اس سے کہیں مبسوط تر تحقیقی مقالہ درکار ہے۔ لہذا صرف چند ممتاز اساتذۂ فن مرثیہ گوئی کے چند منتخب نمونے پیش کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔

فن مرثیہ گوئی میں میر انیس کا جو مقام ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ انھوں نے اپنے خاندانی وقار کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ خود عالم تھے مگر انھوں نے عالمانہ وضع قطع کی جگہ نہایت سادہ و صوفیانہ طریقہ اختیار کیا۔ خواہشات دنیا سے مستغنی رہے۔ تاحیات اہل بیت اطہار کی مدح کرتے رہے اور اہل بیت و ائمہ سے توسل قائم رکھا۔ اسی سے انہیں وہ فیض باطنی و روحانی حاصل ہوا جو کمال فن مرثیہ گوئی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اسی لیے کسی دنیوی لالچ کے تحت غیر کی مدح گوارا نہ کی:

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر ۔ مجرئی اپنی ہوا کھوؤں مسلماں ہو کر

وہ شریعت کے ساتھ طریقت پر بھی عامل رہے۔ ان کی زندگی اور ان کے کلام سے عرفان اور حقیقی تصوف کی جھلک جا بجا نمایاں ہے۔

میر انیس نے جس خاندان میں پرورش پائی تھی وہ عرفان و تصوف سے بہرہ مند تھا۔ میر انیس کے اسلاف درویش مزاج تھے۔ ان کے جدِّ امجد میر حسن اردو کے نامور شاعر نے بطریق تصوف مثنوی "رموز العارفین" تصنیف کی جس کے بارے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اپنی تصنیف "اسلافِ میر انیس" میں تحریر فرماتے ہیں :

> میر حسن کے یہاں تصوف اور درویشی کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ وہ بعض صوفی بزرگوں کو عارفوں میں شمار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک مثنوی میں ابراہیم ابن ادہم اور بعض دوسرے صوفیوں کی حکایتیں لکھی ہیں اور اس کا نام "رموز العارفین" رکھا ہے۔ اس مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۱۸۶ھ ہے، جیسا کہ ذیل کی دو بیتوں سے ظاہر ہے :
>
> عارفوں کی بسکہ ہیں رمزیں لکھیں ۔ نام اس کا ہے "رموز العارفین"
>
> جب بھرا گنجِ معانی سے یہ طشت ۔ تھے ہزار و یکصد و ہشتاد و ہشت

اس خاندانی شعار کا میر انیس کی حیات پر بھی اثر پڑا، اور ان کے دل و دماغ پر بھی عارفانہ اور صوفیانہ خیالات چھائے رہے جو ان کے کلام میں جا بجا رباعی، سلام اور مرثیہ کی صورت میں نمایاں ہوتے رہے۔ چونکہ وہ ایک مایۂ ناز مرثیہ گو استاد تھے، انھوں نے جس عرفانی مضمون کو بیان کیا ایک نئے اور اچھوتے انداز سے، اور اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہ اس کا جواب نہ ہو سکا۔

(۶) معرفتِ الٰہی :

معرفتِ الٰہی جو عرفان و تصوف کی جان ہے، اسے میر انیس نے نہایت اچھے انداز سے بیان کیا ہے معرفتِ الٰہی کے حصول کے جو طریقے عرفان و تصوف میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ کائنات کی اشیاء کی تخلیق پر غور و خوض کیا جائے، تو اس سے نہ صرف ان اشیاء کا علم حاصل

ہوگا، بلکہ انسان کو ان اشیاء کے خالقِ حقیقی کی معرفت بھی حاصل ہوگی۔ میر انیس نے حصولِ معرفتِ الٰہی کے لیے یہی طریقہ اپنایا۔ کائنات کی ہر شے میں انھیں پروردگارِ عالم کی قدرت کا جلوہ نظر آیا۔ اس حقیقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

گلشن میں پھروں کہ سیرِ دریا دیکھوں　　　یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے　　　حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

صوفیا کا خیال ہے کہ اگر انسان کے دل میں عرفانِ الٰہی کی سچی تڑپ ہو، تو ہر نوعِ تخلیق میں اسے خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ میر انیس کا دل بھی عرفان میں سرشار تھا۔ چنانچہ عرفان کی منزل میں اس کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے:

خدا کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا　　　اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا

تصوف میں عرفانِ الٰہی کے حصول کے لیے فقر کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ چونکہ فقر اختیار کر لینے کے بعد انسان دولت و جاہِ دنیوی سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا دل کامل طور پر خداشناسی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ میر انیس نے بھی اسی مقصد سے فقر کو اختیار کیا، تو اپنے نفس میں بڑی بلندی محسوس کی۔ اس مضمون کو انھوں نے اپنی متعدد رباعیات میں پیش کیا ہے۔ بطور نمونہ دو رباعیات ملاحظہ ہوں:

یہ اوج، یہ مرتبے، ہما کو نہ ملے　　　یہ دلق، یہ مرقعے، امرا کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر　　　برسوں ڈھونڈے، تو بادشا کو نہ ملے

اپنے فقر کو ایک اور شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے　　　سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم وہاں قدم رکھتے نہیں

میر انیس نے دولت کی طرف کبھی نہ دیکھا۔ وہ اپنی فقیری ہی میں اتنے مطمئن اور آسودہ رہے کہ دولتِ دنیوی کی انھیں کبھی پروا نہ ہوئی۔ کہتے ہیں:

دولت سے فقر کی، ہے غنی دل فقیر کا　　　محتاج بادشاہوں کا ہوں، نے وزیر کا

میر انیس نے کبھی کسی رئیس کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ان کو طلب سے ہمیشہ عار رہا۔ وہ اپنے کو ہمیشہ اللہ کا فقیر سمجھا کیے:

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو　　کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا لگا کے چلے

وہ ہمیشہ اہلِ دوَل سے بے نیاز رہے۔ ان کے نزدیک اہلِ دوَل کی بیجا خوشامد، انسان کو انسانیت کے مرتبے سے گرا دیتی ہے، اور انسان بندۂ خدا ہونے کے بجائے بندۂ اہلِ دوَل بن جاتا ہے، جو عرفانی خصائص کے منافی ہے۔ چونکہ میر انیس نے راہِ خدا میں فقر اختیار کیا تھا، لہٰذا دولت اور دولتمندی کی حقیقت اُن کی نگاہ میں کچھ بھی نہ تھی۔ اپنے اسی جذبے کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں　　یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ ساغرِ استغنا سے　　آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

وہ کبھی دولت و زر کے طالب نہ ہوئے کیونکہ دنیوی مال و دولت ان کے نزدیک ہیچ شے تھی۔ وہ ہمیشہ اُس فضیلت کے حصول کے لیے دعاگو رہے، جس سے ابدی عزت حاصل ہو۔ ملاحظہ ہو:

دولت دے خدا کرے نہ جہاں میں نہ زر دے　　جو باعثِ آبرو ہو، وہ گوہر دے
شاہوں کو نصیب ہو زر دیر کی تحصیل　　یارب! مجھے نانِ خشک و چشمِ تر دے

وہ فقر پر قناعت کیے رہے۔ ساری زندگی بعالمِ فقیری گزار دی اور فقر پر ثابت قدم رہتے ہوئے عزتِ دارین حاصل کی۔ فرماتے ہیں:

وہ صبر مرا اور وہ بردباری تیری　　ہوئیگی نہ مجھ کو مرکے یاری تیری
اللہ! یونہی سب کی نباہے، اے فقر　　جس طرح کہ نبھ گئی ہماری تیری

میر انیس نے فقر مطابق حدیث رسول "الفقر فخری" (فقر میرا فخر ہے) اختیار کیا تھا، جیسے ان کے بعد ائمۂ معصومین اور اصحابِ صُفّہ اور علمائے عارفین نے اختیار کیا۔ میر انیس بھی راہِ عرفانِ حق تعالیٰ میں فقیر بنے اور فقیری میں ائمہ کی پیروی کرتے رہے۔ فرماتے ہیں:

اثنا عشر کے در کا گدا ہوں، پتا یہ ہے　　بارہ دری میں رہتا ہے، بستر فقیر کا

ایک فقیرِ عارف کے لیے گوشہ نشینی اور خلوت لازمی ہے۔ عارفین و صوفیا کا نظریہ ہے کہ خلوت میں انسان خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت اور ذکرِ الٰہی کرسکتا ہے۔ یادِ خدا اور عشقِ خدا کے لیے راحت و آرام اور پُرسکون ماحول ضروری ہے، جو انسان کو گوشہ نشینی ہی میں حاصل ہوسکتا

ہے۔ اس حقیقت کو میر اخیس نے ایک قطعے میں پیش کیا ہے:

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا | برسوں نہ کبھی روزِ فراغت دیکھا
راحت کا مکان، امن کا گھر، خانۂ عشق | دیکھا تو جہاں میں کنجِ عزلت دیکھا

عارفین اور صوفیا کا اصول ہے کہ سالک کے لیے "فقر" کے ساتھ ایک مخصوص مسلکِ اخلاق پر عامل ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ انسان کے نفس کی اصلاح ہو، نفس سے عیوب دفع ہوں، اور نفس میں وہ خوبیاں پیدا ہوں، جو حصولِ عرفانِ الٰہی کے لیے ضروری ہیں۔ یہی اخلاقِ اہلِ عرفان و تصوف ہے اور قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ ایک فارسی شاعرِ عارف نے دو قطعات میں اس اخلاقی تعلیم کو پیش کیا ہے۔

پہلے قطعے میں ان عیوبِ نفسانی کو گنوایا ہے، جو انسان کے دل کو مکدّر اور سیاہ کر دیتے ہیں اور راہِ سلوک میں مانع ہوتے ہیں۔ سالک کو چاہیے کہ ان نفسانی عیوب پر توجہ رکھے اور اپنے دل سے ان کو دور کرنے کی کوشش کرے، تاکہ عرفان کی منزل اس کے لیے آسان ہو:

خواہی کہ شود دلِ تو چوں آیینہ | دہ چیز بروں کن از درونِ سینہ
حرص و امل و غیظ و دروغ و غلیبت | بخل و حسد و ریا و کبر و کینہ

دوسرے قطعہ میں ان خصائصِ نفسانی کا بیان ہے، جو قلب کو روشن کرتے ہیں اور روحِ عرفان بخشتے ہیں، جس سے حصولِ عرفان انسان کے لیے آسان ہو جاتا ہے، اور اسے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے:

خواہی کہ شوی بمنزلِ قرب مقیم | نہ چیز بنفسِ خویش فرما تعلیم
صبر و شکر و قناعت و حلم و یقین | تفویض و توکل و رضا و تسلیم

میر انیس کے کلام کا مطالعہ، علم و اخلاق کی روشنی میں کیا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ ان کی نظر ان عیوب پر بھی رہی، جو انسان کے دل کو تاریک کرتے ہیں اور اسے عرفانِ الٰہی کے رستے سے منحرف کر دیتے ہیں؛ نیز ان صفات پر بھی انھوں نے زور دیا جو انسان کے دل کو منوّر کرتے ہیں اور انسان کو حصولِ قربِ الٰہی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ چنانچہ میر انیس خود اپنے نفس کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ رہے، اور دوسروں کی اصلاحِ نفس کے لیے اپنے نفس کو نمونہ بنا کر بھی پیش

کرتے رہے۔ انھوں نے دوسروں کے نفس کی اصلاح کے لیے اخلاقی تعلیم کا وہی طریقہ اختیار کیا، جو صوفیا اور عارفین کا طریقہ رہا ہے۔ ان کا یہ اخلاقی طریقہ اس بنا پر بھی مقبول ہوا کہ ان کا اندازِ بیان نہایت فصیح و بلیغ، جاذب و دلکش اور دلنشین تھا۔

عیوبِ نفسانی اور ان کی اصلاح سے متعلق میر انیس کے کلام سے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

گناہوں کی کثرت انسان کو انسانیت سے گرا دیتی ہے، انسان کے دل کو مکدّر کر دیتی ہے اور اعمالِ خیر سے منحرف کر کے اعمالِ شر کی جانب مائل کر دیتی ہے۔ انسان قربِ الٰہی سے معذور ہو کے رہ جاتا ہے اور قربِ الٰہی کے بجائے اس کی شیطان سے قربت بڑھتی ہے حتیٰ کہ منازلِ عرفانی میں وہ ناکام و نامراد ہو کے رہ جاتا ہے۔ میر انیس گناہوں کی کثرت پر عجب انداز سے اظہارِ افسوس فرماتے ہیں :

افسوس، یہ عصیاں پہ تباہی دل کی   کی خوب انیس! خیر خواہی دل کی

نازاں ہوئے تم پہن کے پوشاک سفید   بڑھتی گئی دن رات سیاہی دل کی

حرص و ہوس بھی ایک بڑا گناہ ہے، جو انسان کو قناعت سے محروم کر دیتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ زر کی ہوس میں جائز و ناجائز کی تفریق بھی نہیں کر سکتا اور بالآخر بندۂ خدا ہونے کے بجائے بندۂ زر بن جاتا ہے۔ میر انیس انسان کو حرص و ہوس سے روکنے کے لیے ناصحانہ طور پر متنبہ کرتے ہیں :

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے!   جانا ہے تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے!

اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی   تھک جاتے ہیں پانو، تو سر پھرتا ہے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے   نادان! کسے فریب تو دیتا ہے

غرور و تکبّر بہت بڑا عیب ہے، اس لیے کہ انسان جب مغرور و متکبّر ہو جائے، تو وہ اپنے نفس کی اصلاح سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی برائی، برائی نظر ہی نہیں آتی، بلکہ وہ اپنی ہر برائی کو خوبی سمجھنے لگتا ہے اور یہی امراس کے تنزّل کا باعث بن جاتا ہے۔ انسان نہ صرف انسانوں میں، بلکہ خدا کی نگاہ میں بھی گر جاتا ہے کیونکہ ہر قسم کی برتری خداوندِ عالم ہی کو زیبا ہے

مغرور بننا گویا خدا کی برابری کرنا ہے، جو انسان کے لیے بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے صفت نہیں، بلکہ عیب ہے۔ میر انیس نے مغرور کی اصلاح کے لیے عجیب عبرت ناک انداز اختیار فرمایا ہے:

مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو — مغرور نہ ہو، صاحبِ ادراک ہے تو
بالفرض گر آسمان پہ ہے تیرا مقام — انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو

اصلاحِ غرور کے لیے میر انیس کا دوسرا قطعہ ملاحظہ ہو:

اتنا نہ غرور کر کہ مرنا ہے تجھے — آرام ابھی قبر میں کرنا ہے تجھے
رکھ خاک پہ سوچ کر ذرا پانو انیس! — اک روز صراط سے گزرنا ہے تجھے

(۷) ترکِ دنیا:

عرفا و صوفیا کے نزدیک یہ دنیا گناہوں کی جگہ ہے۔ دنیا میں اچھے لوگوں کے ساتھ بُرے بھی کچھ کم نہیں؛ وہ انسان کو اچھے راستے سے روکتے اور بُرے راستے پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں وہ انسان جو دنیا کے اُمور میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے، اسے دنیوی مجبوریوں کے باعث جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، غیبت بھی کرنا پڑتی ہے، کبھی کبھی انصاف سے کنارہ کش ہو کر ظلم بھی اختیار کرنا پڑ ہے، غرض، کیا کیا گناہ مول لینا پڑتا ہے۔ اور جب وہ سرتاپا گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس کے لیے نیک اعمال اختیار کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی گناہوں کی کثرت اس کے قربِ الٰہی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے عارفین نے منازلِ سلوک کی تکمیل کے لیے انسا کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے۔ میر انیس نے بھی یہی طریق اپنایا ہے:

جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے — دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل! یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے

اسی نظریے کو میر انیس نے ایک دوسرے قطعے میں اس طرح پیش کیا ہے:

ضائع نہ کر آغوش کے پالے دل کو — کرتے ہیں پسند درد والے دل کو
درکار اگر ہے زادِ راہِ عقبیٰ — سب چھوڑ کے، دنیا سے اٹھا لے دل کو

دنیا میں سیکڑوں طرح کے رنج و غم ہیں۔ کسی کو اولاد کا غم، کسی کو کسی عزیز کا غم، کسی کو دولت کی فکر، کسی کو ظالم سے ڈر، کسی کو مرض کی تکلیف، کسی کو بھوک پیاس کی ایذا، کسی کو روزگار کی فکر، کسی کو مکان اور اس کی زینت کی خواہش۔ غرض کہ اہلِ دنیا کے لیے ہزار طرح کے غم و آلام ہیں۔ انسان ان میں مبتلا ہو کر عُقبیٰ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے صوفیا نے عُقبیٰ کے طلبگار کو ہدایت کی ہے کہ دنیا کی جانب اس درجہ مائل نہ ہونا چاہیے کہ عقبیٰ کی فکر ہی نہ رہے۔ میر انیس نے بھی عارفانہ طریقے پر انسان کو عبرتناک مثالوں کے ذریعے سے دنیا سے ہٹا کر عُقبیٰ کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

دنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے ۔۔۔ پامال ہے، جو عاقل و فرزانہ ہے
مابینِ زمین و آسمان یوں ہم ہیں ۔۔۔ جیسے دو آسیا میں اک دانا ہے

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو:

دنیا میں نہ کسی کا سہارا دیکھا ۔۔۔ بچنے کا نہ غم سے، کوئی چارہ دیکھا
کچھ بخت ہمارے ہی نہیں برگشتہ ۔۔۔ گردش میں فلک کا بھی ستارا دیکھا

انسان اپنی دنیوی زندگی کو بنانے کے لیے اکثر اُن امور پر اپنی توجہ، طاقت اور دولت صرف کرتا ہے، جو شریعت و طریقت کی نظر میں موجبِ اجر و ثواب نہیں، بلکہ باعثِ عذاب ہیں۔ ان فاسد امور کے ذریعے انسان کو دنیا میں تو ممتاز مقام حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آخرت کے لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ آخرت میں صرف اعمالِ خیر کام آئینگے۔ اور انھی کی جزا ملیگی۔ دنیوی ساز و سامان اور عیش و طرب جس کے حصول کے لیے انسان اپنی دولت، اپنی عمر، اپنی عقل اور طاقت صرف کرتا ہے، وہ دنیا ہی میں رہ جاتے ہیں اور ان کے حصول کی خاطر جو گناہ وہ مول لیتا ہے، ان کا بوجھ اس کے ساتھ جاتا ہے۔ ایسا شخص گویا دنیا اور آخرت دونوں جہان میں راندۂ درگاہِ الٰہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس عبرت ناک انجام کو میر انیس نے اس طرح پیش کیا ہے:

جب خاک میں ہستی کا چمن ملتا ہے ۔۔۔ یارانِ وطن پھر نہ وطن ملتا ہے
اسبابِ جہاں سے دیکھ تو، اے غافل! ۔۔۔ مٹی ملتی ہے، اور کفن ملتا ہے

اسی مضمون کا میر انیس کا ایک اور عبرت انگیز قطعہ ملاحظہ ہو :

غافل! تجھے کیوں خواہشِ دنیائے دنی ہے — پیوندِ زمیں ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ — سوتے ہیں تہِ خاک، گلے میں کفنی ہے

جن لوگوں کو دنیا سے عشق ہے، اور وہ اسے اپنے لیے دل آرام بنانا چاہتے ہیں، وہ اس کوشش میں بہت سے غم مول لیتے ہیں، اور عموماً افکارِ فاسدہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کا بیشتر قیمتی وقت اس کوشش میں صرف ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ افکارِ عالیہ سے محروم ہو کر کمالاتِ انسانی حاصل نہیں کر سکتے، نہ عرفانِ الٰہی کی منزلیں طے کر کے قربِ الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر دنیا کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کو میر انیس نے اس طرح پیش فرمایا ہے :

دنیا کو نہ جانو کہ دل آرام ہے یہ — اے پختہ مزاجو! طمعِ خام ہے یہ
ہاں سوچ کے پانو اس زمیں پر رکھو — چھٹتا نہیں جس میں پھنس کے، وہ دام ہے یہ

غرض کہ میر انیس نے ترکِ دنیا کا وہی نظریہ اختیار کیا ہے، جسے عرفائے حق نے تعلیم کیا ہے۔ میر انیس خود بھی دنیا کے عیش و طرب سے کنارہ کش رہے اور راہِ عرفانِ حق پر گامزن رہتے ہوئے، تلاشِ حق میں مصروف رہے۔ آپ نے توشۂ آخرت اور درستیِ عقبیٰ کے لیے اعمالِ نیک کو ترجیح دی، جن سے انسان کے قلب میں عرفان کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :

ساتھ جانا نہیں کچھ جز عملِ نیک، انیس! — اس پہ انسان کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا!

ایک اور نصیحت آمیز قطعہ ملاحظہ ہو :

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے ! — دولت نہ گئی ساتھ، نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ — ہمراہ اگر گئے، تو اعمال گئے

میر انیس اصلاحِ نفس کی طرف متوجہ رہے، اس لیے کہ اصلاحِ نفس کے بغیر اعمالِ خیر پر کاربند ہونا محال ہے۔ ان کا یہ نظریہ صوفیا کے مطابق تھا کہ جب نفس میں امارگی پیدا ہو جاتی ہے، تو انسان اعمالِ خیر سے منحرف ہو کے اعمالِ شر کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ میر انیس خود بھی نفسِ امارہ کا شکار ہوئے، تو اس کا اظہار فرمایا، تاکہ دوسرے انسانوں کو بھی اس سے سبق حاصل ہو۔ فرماتے ہیں :

برباد کیا ہے طبعِ آوارہ نے | تڑپا رکھا ہے قلبِ صد پارہ نے
شیطاں کی نہ کچھ خطا، نہ قسمت کا قصور | مارا مجھے، آہ، نفسِ امّارہ نے

اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ میر انیس نے ان خوبیوں کو بھی اپنایا، جو تقربِ الٰہی کے لیے لازمی ہیں۔ مثلاً خوفِ الٰہی، خاکساری، صبر و شکر، قناعت و توکل وغیرہ، جن پر ہمیشہ عارفینِ کاملین عامل رہے ہیں۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں، جن پر اعمالِ خیر کا مدار ہے۔

انسان خوفِ الٰہی کی صفت سے متصف ہو جائے، تو گناہ کیسا، گناہ کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آنے پاتا۔ عام لوگ ہر گناہ کا ایک عذر بیان کر دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ گناہ بہر حال گناہ ہے، اس کے لیے کوئی عذر صحیح نہیں ہو سکتا۔ گناہوں کی کثرت اور عذر خواہی سے قلب میں کبھی جلا اور روحانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ دل سیاہ ہی رہیگا اور ظلمت ہی کی طرف مائل رہیگا، جو عرفانِ الٰہی کے لیے مانع ہے۔ انسان کی اسی حالت کو میر انیس نے حسبِ ذیل رباعی میں پیش کیا ہے:

ہر دم خیالِ عذر خواہی دل میں | مطلق نہیں کچھ خوفِ الٰہی دل میں
نافے کی طرح خطا میں گذری سب عمر | بالوں پہ سفیدی، ہے سیاہی دل میں

خوفِ الٰہی کے ساتھ نفس میں خاکساری کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ خدا سے ڈرنے والا شخص کبھی مغرور نہیں ہو سکتا۔ وہ رحمدل اور منکسر المزاج بن جاتا ہے۔ میر انیس خاکساری کی نصیحت فرماتے ہیں:

انجام پہ اپنے آہ و زاری کر تو | سختی بھی ہو، تو بُردباری کر تو
پیدا کیا خاک سے خدا نے تجھ کو | بہتر ہے یہی کہ خاکساری کر تو

میر انیس نے خود بھی اس صفت کو اپنے نفس میں پیدا کیا۔ اور اس سے انھیں عزتِ دارین حاصل ہوئی، جس کا اظہار حسبِ ذیل قطعہ میں فرمایا ہے:

بندوں پہ کرم حضرت باری کا ہے | مقدور کسے شکر گزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی تجھ کو | ثمرہ یہ نہالِ خاکساری کا ہے

صبر و شکر، قناعت و توکل، وہ خصائصِ نفسانی ہیں، جو انسان کو حرص و ہوس، غرور و تکبر

ظلم وتعدّی وغیرہ اکثر عیوبِ نفسانی سے مبرّا و منزّہ کر دیتے ہیں۔ میر انیس اسی توکّل کی تعلیم سالکِ راہِ حق کو دیتے ہیں:

اک در پہ بیٹھ، گر ہے توکّل کرم پر — اللہ کے فقیر کو پھیرا نہ چاہیے

اور میر انیس خود بھی اسی توکّل پر عامل رہے:

اہلِ دنیا سے نہیں مطلب انیس! — یاں توکّل ہے فقط اللہ پر

عرفانی اخلاقیات میں محبّت اور عشقِ الٰہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب یہ عارفِ حق تعالیٰ کے نفس میں پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کا دل دنیا سے بے نیاز ہو کر یادِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی میں محو و مصروف ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو عارفین و صوفیا نے عشقِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ عشقِ الٰہی کی منزل میں میر انیس کی جو کیفیت تھی، اسے حسبِ ذیل قطعے میں پیش کرتے ہیں:

سایہ سے بھی وحشت ہے، دیوانہ ہوں — جو دام سے بھاگتا ہے، وہ دانا ہوں

دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس! — جلتا ہے جو بے شمع، وہ پروانہ ہوں

عشقِ الٰہی کے ساتھ محبّتِ رسولِ خدا صلعم اور محبّتِ اہلِ بیت و ائمۂ طاہرین بھی ضروری ہے، جو عبادتِ الٰہی کے لیے شرط ہے۔ لہٰذا ایک عارفِ کامل، عاشقِ خدا کے ساتھ عاشقِ رسول و آلِ رسول بھی ہوتا ہے۔ میر انیس اس صفت سے بھی متصف تھے۔ وہ تاحیات ذکرِ خدا، ذکرِ رسول، ذکرِ اہلِ بیتِ کرام، ذکرِ سیّد الشہدا و ائمۂ طاہرین و ذکرِ شہدائے کربلا و ذکرِ صحابۂ کرام فرماتے رہے؛ اور ایسا ذکر جو ہمیشہ نہ صرف یادگار بلکہ وردِ زبان رہیگا۔

میر انیس کے کلام کی روشنی میں میر انیس کی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک کامل عارف شیعہ اثنا عشری تھے۔ عرفان و تصوف ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ان کا اندازِ بیان عارفانہ اور صوفیانہ، ان کی زندگی فقیرانہ رہی۔ انھوں نے مذہب و اخلاق کی تبلیغ مناظرانہ طریقے پر نہیں، بلکہ عارفانہ طریقے پر کی۔ اسی بنا پر ان کا کلام بلا تفریقِ مذہب و ملّت عام طور پر پسند کیا گیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور مذہب اور ادب دونوں لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت قرار دی گئی

محمد مشتاق شارق / سید لطیف حسین ادیب

مراسلات

(۱)

رحمانیہ انٹر کالج، مودھا (راگول)، ہمیر پور (یوپی) یکم ستمبر ۱۹۷۷ء

مکرمی، سلام نیاز

....."ذکر غالب" میں آپ نے لکھا ہے کہ غالب نے باندہ میں "امین چند" سے دو ہزار روپیہ قرض لیا تھا![1] صحیح نام "امی کرن" ہے۔ یہ نواب علی بہادر اور انگریز دونوں کے بینکر تھے۔ فرم کا نام "سیٹھ ہری کرن ہردی کرن مہتا، بینکرز، باندہ" تھا۔ شری امی کرن کے والد کا نام روی کرن تھا۔ یہ گجرات سے آکر باندہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی کا سرمایہ انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا۔ نواب علی بہادر سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ نواب صاحب کے مکانات سے ملحق ہی، ان کی بہت بڑی حویلی تھی، جو غدر میں برباد ہو گئی۔ اب اس کے قریب ہی پسماندگان نے ایک بہت وسیع علاقے پر اپنے مکانات بنوا رکھے ہیں۔ غالب نے قرض واپس کیا یا نہیں، میں نے اس سلسلے میں معلومات چاہی تھیں۔ مگر معلوم ہوا کہ تمام کاغذات غدر میں ضائع ہو گئے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قریب ۸۰ سال کے، وکیل ہیں۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ میں ان کے ایک عزیز سے غالب کے قرض کے متعلق معلومات کرنا

۱۔ ذکر غالب (طبع پنجم): ۶۲ (حاشیہ ۴۲)۔ یہ نام غالب کے ایک خط میں ہے (نامہائے فارسی غالب: ۳۱)۔ ظاہر ہے کہ نام امین چند لکھنے میں غالب کو سہو ہوا! (... ام)

چاہتا ہوں، تو مجھے خصوصی طور پر بلایا، اور میرے باندہ پہنچنے پر ملنے کے لیے دوڑے آئے۔ وہ بہت دیر تک یادوں میں کھوئے رہے۔ غالب اور نواب صاحب کے متعلق بڑے احترام کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ مجھے زندگی میں پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ آج بھی لوگ ہاگ اس عہد کو کتنے احترام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی بات میں نے کدورہ میں دیکھی۔

غالب نے تو روپیہ کیا واپس کیا ہوگا! ہاں، نواب صاحب کے حساب میں محسوب ہو گیا ہوگا۔ میرے خیال سے کلکتہ سے واپسی پر، غالب کا دوبارہ باندہ آنا بھی اسی خیال سے ہوگا کہ وہ زادِ راہ لیتے چلیں[۲]۔

وکیل صاحب نے مجھے وہ مہر بھی دکھائی، جو اس وقت ان کے استعمال میں آئی ہوگی۔ اس پر "سیٹھ امی کرن" لکھا ہوا ہے......

نیازمند

محمد مشتاق شارق

(۲)

۷۷ پھول والاں، بریلی - ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء

محب مکرم۔ "تحریر" (۸۰) موصول ہوا۔ ڈاکٹر بھٹاچاریہ، میر غلام علی عشرت پر تحقیقی کام سے طالقف ہیں... ستمبر ۱۹۵۷ء میں میرا مضمون "میر غلام علی عشرت" "قومی زبان"، کراچی میں چھپا تھا، جس میں پدماوت پر بھی گفتگو ہوئی تھی۔ یہی مضمون "چند شعرائے بریلی" میں شامل ہے۔ میرا دوسرا مضمون "میر ضیاالدین عبرت اور مثنوی شمع و پروانہ"، "سب رس"، حیدرآباد دسمبر ۱۹۷۱ء میں چھپا تھا، جس میں میں نے دیگر امور کے علاوہ یہ بتایا تھا کہ نسیم لکھنوی جس طرز کے لیے مشہور ہوئے، اس کا ثبوت عبرت کے یہاں پہلے سے ملتا ہے۔ اس کے بعد میری کتاب شائع ہوئی، جس میں عشرت پر مضمون ہے۔ چار پانچ برس ہو چکے، ڈاکٹر احمد سجاد (لکچرر، رانچی یونیورسٹی) عشرت پر ڈی لٹ کر چکے۔

زخمی کی ایک مثنوی (فارسی میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی منقبت) کا قلمی نسخہ اسلامیہ کالج، بریلی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ بہت زمانہ ہوا، اس کا متن مصنّف، علی گڑھ میں بھی چھپا تھا، اور یہ کام اسلامیہ کالج، بریلی کے ایک استاد فارسی جناب مولوی محسن صاحب نے انجام دیا تھا۔ علاوہ اس کے حیات کے پیشِ نظر بھی زخمی پر مضمون تشنہ ہے۔ تاہم کالی داس گپتا صاحب کی کوشش قابلِ داد ہے۔ وہ اس موضوع پر مزید جستجو کریں......

احقر لطیف حسین ادیب

۲۔ غالب کے کلکتہ سے واپسی پر دوبارہ باندہ جانے کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ نہ یہ بات ہی یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے یہ قرض ادا نہیں کیا تھا (مالک رام)

مالک رام

وفیات

سخاوت مرزا (محمد سخاوت مرزا)

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں ان کی حکیموں کی گلی میں سکونت تھی۔ یہ قوم سے چغتہ (مغل) اور سپاہی پیشہ لوگ تھے۔ سخاوت مرزا کے دادا مرزا امیر بیگ کی شادی مولوی احمد خان شیفتہ (شاگرد نظیر و اسیر اکبرآبادی) کی بھانجی امتہ جلائی سے ہوئی تھی۔ جب غلام امام شہید الہ آبادی (ف: جنوری ۱۸۷۹ء) حیدرآباد (دکن) کے بعض عمائد کی دعوت پر وہاں گئے ہیں، تو شیفتہ بھی ان کے ہمرکاب تھے اور غالباً انھیں کی سفارش پر یہ ریاست کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اولاً کچھ دن دارالانشا میں کام کیا۔ پھر نواب مختار الملک میر تراب علی خان سالار جنگ دوم (ف: فروری ۱۸۸۲ء) نے انھیں اپنی مصاحبت کا شرف عطا کیا، اور اپنے فرزند اکبر (سالار جنگ سوم) میر لائق علی خاں بہادر منیر الدولہ (ف: جولائی ۱۸۸۹ء) کا اتالیق مقرر کر دیا۔ شیفتہ نے ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں حیدرآباد ہی میں رحلت کی۔ ان کی اولاد آج تک وہیں مقیم ہے۔

مرزا امیر بیگ بھی شیفتہ ہی کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ چھوٹے بیٹے علی مرزا عین عنفوان شباب میں داغ مفارقت دے گئے۔ بڑے محمد آغا مرزا (عرف آغا صاحب) کا نکاح رحیم خان اکبرآبادی کی دختر نیک اختر

ماخذ: مخزن اسرار حقیقت؛ مکاتیب مشفق خواجہ؛ حیدرآباد کے ادیب۔

نظیر بیگم سے ہوا تھا۔ یہی محمد سخاوت مرزا کے والدین تھے۔ سخاوت مرزا کے علاوہ ان کے اور تین بیٹے (افضل مرزا، خورشید مرزا، لطیف مرزا) اور تین بیٹیاں (حمیدہ بیگم، رشیدہ بیگم، صغیرہ بیگم) تھیں۔ آغا مرزا مدتوں بلدیہ حیدرآباد میں محاسب اور مددگار ٹیکس کے عہدے پر فائز رہے۔

محمد سخاوت مرزا رمضان ۱۳۱۵ھ (جنوری/فروری ۱۸۹۸ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نجی طور پر والد سے پائی، اور پھر چادر گھاٹ اسکول سے آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ دسویں کے امتحان سے قبل اتنے سخت بیمار ہو گئے کہ انھیں مجبوراً اسکول کا تعلق منقطع کر لینا پڑا۔ تھوڑے دنوں بعد نظامت کوتوالی اضلاع میں ملازمت مل گئی۔ لیکن انھوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور اپنے زورِ بازو سے اولاً فارسی کا امتحان "منشی" پاس کیا، پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے (۱۹۲۷ء) اور ایل ایل بی (۱۹۲۹ء) کی اسناد حاصل کیں۔

اس تعلیم کے بل بوتے پر انھیں ریاست کی ملازمت میں مختلف عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا؛ مدتوں محکمۂ جیل خانجات اور دفتر ہوم سکتر اور عدالتِ عالیہ میں کام کرتے رہے۔ بالآخر ۲۹ سالہ ملازمت کے بعد عدالتِ ضلع و سشن جج سے قبل از وقت ۱۹۵۱ء میں پنشن لے لی۔

۱۹۳۶ء میں نواب سالار جنگ چہارم یوسف علی خان بہادر (ف: ستمبر ۱۹۶۲ء) اور عمر یافعی اور ان کے ساتھیوں کی مساعی سے حیدرآباد دکن میں دکنی ادب کی بازیافت کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ محمد سخاوت مرزا بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ان کا پہلا مضمون (شاہ کمال الدین بخاری) انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل دکنی ادب کی مشہور شخصیتوں اور کتابوں پر لکھتے رہے۔ جب ہجرت کر کے پاکستان گئے، تو وہاں کے رسائل میں بھی ان کے مقالے اور کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ مقالات کی خاصی بڑی تعداد مختلف پرچوں میں منتشر پڑی ہے۔ ان کی چھوٹی بڑی مطبوعات کی تعداد ۲۵ ہے۔ ان میں زیادہ اہم مثنوی من لگن (بحری)، تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، مخزنِ اسرارِ حقیقت، (یعنی مختصر حالات و ملفوظات حضرت شاہ کمال الدین حیدرآبادی) ہیں۔

نیات سے متعلق ان کے متعدد مضامین دائرۃ المعارف پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں بھی
امل ہیں۔ یقین ہے کہ بہت کچھ ہنوز غیر مطبوعہ ان کے مسودات میں پڑا ہوگا۔
ستان جانے کو وہ چلے تو گئے، لیکن وہاں کا قیام انھیں راس نہیں آیا۔ کچھ ابتدائی زمانہ
وڑکر زیادہ تر پریشان ہی رہے۔ شروع میں چندے انجمن ترقی اردو (کراچی) میں ملازم رہے
ترقی اردو بورڈ، کراچی میں بطور معاون مدیر مقرر ہوگئے۔ لیکن یہ نوکری بھی زیادہ دن نہیں رہی
رکے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف اداروں میں اجرت پر کام کرتے رہے۔ غرض
بے اطمینانی کا عالم تھا۔ جیسے یہ سب کچھ کافی نہ ہو، شامتِ اعمال سے بعض خانگی پریشانیوں
نے گھیرا۔ ایک داماد کا انتقال ہوگیا، اور سب سے چھوٹا بیٹا (شجاعت مرزا) ایک قتل کے
مقدمے میں ماخوذ ہوگیا۔ (مقدمہ ہنوز زیرِ سماعت ہے؛ اور شجاعت مرزا جیل میں) انھیں
یشانیوں میں انتقال کیا۔ سخی حسن درگاہ کے قبرستان (کراچی) کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔
نوں نے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم خیر النسا سے دو بچے ہوئے: مرزا رضا بیگ اور
ابعہ سلطانہ۔ دوسری بیگم جمیل النسا (بنت محمد علی خان سرکل انسپکٹر پولیس) سے تین
بیٹے (ہمایوں مرزا، اقبال مرزا، شجاعت مرزا) اور دو بیٹیاں (اختر سلطانہ، نور سلطانہ)
دگار ہیں۔

ختار ہاشمی، سید مختار الدین ہاشمی

ن کے اجداد ولایتی تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں قندھار پر پے در پے ایرانی حملوں کے
عث وہاں کی زندگی بہت مخدوش ہوگئی، تو ہاشمی صاحب کے مورثِ اعلیٰ، وہاں کی سکونت
رک کرکے ہندوستان چلے آئے، اور آنولہ (ضلع بریلی) میں علی محمد خان بانیِ سلطنتِ روہیلہ
ن: ستمبر ۱۷۴۹ء) کے سایۂ عاطفت میں مقیم ہو گئے۔ یہ غالباً ۱۷۳۰ء کا واقعہ ہے۔
شمی صاحب کے والد سید عزیز الدین ہاشمی عالم آدمی تھے۔ درس و تدریس کے سوائے ان
اور کوئی شغل نہیں تھا۔ اپنے مکان ہی پر اچھے پیمانے پر ایک مکتب قائم کر رکھا تھا، جہاں
ہر ان سے دین و دنیا کے علوم کا درس لیتے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، خنداں تخلص تھا۔

ان کے تین بچے ہوئے: فصیح الدین فصیح، مختار الدین مختار ہاشمی، اور آفتابی بیگم۔ یہ
ماشاء اللہ شعر کہتے تھے۔
مختار الدین آنولہ (محلہ کٹرہ پختہ) میں اتوار ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم بیشتر ا
... کے قائم کردہ مدرسے میں پائی۔ شاید بعد کو "منشی کامل" (فارسی) کا سرکاری ا
بھی پاس کر لیا تھا۔ ... کے علاوہ اپنے طور پر انگریزی میں بھی اتنی لیاقت پیدا کر لی تھی
کاروباری لین دین کے زمانے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کرتے تھے۔
ہاشمی صاحب آنولے کے دوران میں وہاں کی مختلف تجارتی فرموں میں بطور منیم اور منیجر کام
رہے۔ ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ منتقل ہو گئے، اور یہاں انھوں نے تالے بنانے کا کام شروع کر
لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر کارخانہ بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں علی
میں ایک فرم (جیسیکو) میں منیجری کی ملازمت قبول کر لی۔ لیکن ان کے دل سے آزادانہ
بسر کرنے کی آرزو ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب ذرا اپنے پانو پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گئے،
نوکری ترک کر دی، اور ۱۹۵۸ء میں دوبارہ تالے بنانے کا کام کرنے لگے۔ تین سال بعد
۱۹۶۱ء میں کام کو وسعت دینے کی خاطر ایک صاحب کو اپنا شریکِ کاروبار بنا لیا۔ بد قسمت
سے فروری ۱۹۶۲ء کے آغاز میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ بہت دن تک صاحبِ فراش رہ
اس سے کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ ادھر شریکِ کار نے بددل ہو کر علاحدگی اختیار کر لی۔
ان مخالف حالات کے باوجود مختار ہاشمی ہمت نہیں ہارے؛ اکیلے کام پر ڈٹے رہے۔ خدا
کریم نے ان کے حوصلے کی لاج رکھی۔ وہ ہر طرح کامیاب رہے، اور کاروبار بھی منا
پر چلتا رہا۔
۱۵/۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً مقامی
جواہر لال میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا۔ لیکن سارے دن کی کشمکش کے باوجو
کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ۱۶/۱۷ جنوری کی شب میں صبح سے کچھ پہلے (یعنی ۱۷ جنور
۱۹۷۷ء کے اولیں وقت) داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ۱۷ جنوری ہی کو قبرستان شاہ جما
علی گڑھ میں ان کا جسدِ خاکی دفن کیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کے شاگر

یم محمد شکیل جعفری آنولوی کے قطعۂ تاریخ وفات کے آخری دو شعر درج ذیل ہیں۔ پہلے شعر
عیسوی تاریخ (۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء) اور دوسرے سے تخرجہ کے بعد ہجری (۱۳۹۷ھ) برآمد
دتی ہے:

ظاہر ہوا اگر اس سے ستترہ کی ابتدا — اردو کو داغ دے گئی جب سترہ جنوری
تاریخ انتقال کی ہو فکر، گر شکیل! — لکھا کر "قسم" یہ کہیے کہ "مختار ہاشمی"

ی شادی آنولے میں سید نظام الدین کی صاحبزادی انوری بیگم سے ہوئی تھی (بیوی کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو
نتقال ہوا) تین بیٹے (ہلال اختر اور رجال انور اور ہلال اصغر) اور دو بیٹیاں (انتخاب بیگم
ورضیا النسا) ان سے یادگار ہیں۔ بڑے بیٹے ہلال اختر شعر بھی کہتے ہیں۔
تار ہاشمی مرحوم کو شعر گوئی کا شوق ہوا، تو مدتوں کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ پھر معلوم نہیں کیسے،
۱۹ء میں ابر احسنی گنوری (ف: نومبر ۱۹۷۳ء) کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ابر مرحوم
ن پائے کے سخت گیر استاد اور صاحب فن سخنور تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا
مختار ہاشمی بھی روایت کی پابندی اور پاسداری، عروض کی مہارت، زبان کی صحت اور درد بست
کے باعث خود استادی کے درجے کو پہنچ گئے۔ ان کے کلام کا مختصر انتخاب بعنوان "گردشِ رنگ"
تر پردیش اردو اکاڈمی کے اشتراک سے شائع ہوا تھا (علی گڑھ ۱۹۷۵ء)؛ یہ ان کے شاعرانہ
مقام کا شاہدِ عادل ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی اردو اکاڈمی نے ایک ہزار روپے انعام بھی
یا تھا۔ ملک کے مختلف مقامات پر ان کے متعدد شاگرد زبان و ادب کی شمع روشن
کیے ہوئے ہیں۔

اسلم لکھنوی، محمد اسماعیل

۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد علی تنہا کو کا کاروبار کرتے تھے۔ گھر کے مالی
حالات ایسے نہیں تھے کہ محمد اسماعیل کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم ہو سکتی۔ لہٰذا مدرسے سے آگے نہ بڑھ سکے۔
ان کا شباب اور قومی تحریک کا شباب گویا ہمعصر تھے۔ یہ اس زمانے میں شعر کہنے لگے تھے۔ چنانچہ
سے۔ یہ حالات بھی انھیں سے حاصل ہوئے۔

کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں حصہ لینے لگے۔ یہاں خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (ف: اگست ۱۹۶۱ء) کی زیرِ نگرانی و ہدایت کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے، جس کے باعث وہ قوم پرستانہ رنگ میں شرابور ہو گئے۔ ناممکن تھا کہ ان کی سیاسی نظمیں حکومت کی نظر سے نہ گزرتیں۔ چنانچہ گرفتار ہوئے، اور نوبت قید و بند تک پہنچی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی مرتبہ قید ہوئے۔

شعرگوئی میں انھوں نے ابوالفضل شمس لکھنوی مرحوم سے مشورہ کیا، جو خود امیر مینائی اور مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ اسلم نے ابتدا نظم سے کی تھی کیونکہ سیاسی جلسوں میں ان ہی کی مانگ تھی۔ بعد کو انھوں نے غزل کی طرف توجہ کی اور اس میں بھی امتیاز حاصل کر لیا۔

اسلم نے صحافتِ ملکی میں بھی دلچسپی لی۔ حافظ علی بہادر خان (ف: نومبر ۱۹۶۷ء) نے کسی زمانے میں بمبئی سے "ہلالِ نو" اور "حقیقت" دو روزنامے جاری کیے تھے۔ اسلم ان کے ادارۂ تحریر میں شامل رہے۔ پھر مختلف اوقات میں متعدد روزناموں (نقارہ، کامران، کاروان، پاسبان) کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور بالآخر ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنا ذاتی روزنامہ "منزل" جاری کیا، جو سال بھر کے اندر مالی مشکلات کے باعث بند ہو گیا۔

۱۹۳۶ء میں کانگریس نے پہلی مرتبہ دستور ۱۹۳۵ء کے تحت مختلف صوبوں میں حکومت کی تشکیل کی تھی۔ اسی سلسلے میں یو پی کانگریس نے ایک پارلیمانی بورڈ بھی قائم کیا تھا۔ اس میں ہندی اور اردو کے الگ الگ نشر و اشاعت کے شعبے تھے۔ ہندی شعبے کے سربراہ مرحوم لال بہادر شاستری (ف: جنوری ۱۹۶۶ء) تھے اور اردو کے اسلم مرحوم۔ اسی زمانے میں اسلم کی قومی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ بھی "ترانے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں یحییٰ گنج وارڈ، لکھنؤ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔

ان کی پوری عمر آزادانہ گزری۔ پہلے مدتوں اپنے والد کی تنباکو کی دکان ذریعۂ معاش رہی۔ جب

ماخذ: قومی آواز (۱۹ جون ۱۹۷۷ء)؛ سلیم عمر (پسرِ مرحوم)

قومی تحریک میں حصہ لینے لگے، تو قدرتاً اس پر پوری توجہ نہ دے سکے؛ اور جب جیل کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا، تو وہ بند ہی ہو گئی۔ تحریکِ آزادی کے دور کے متعدد حضرات جن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور جن کے ساتھ انھوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلی تھیں (شلاً موہن لال سکسینہ اور رفیع احمد قدوائی) بعد کو حکومت کے ممتاز عہدوں پر متمکن ہو گئے اور وزیر کبیر بن گئے، لیکن وہ کبھی کسی کے پاس نہیں گئے، نہ پرانی دوستی کو مطلب برآری کا ذریعہ بنایا۔ ان کا ایک شعر ہے:

عجیب اسلم کی ہے طبیعت، ملی ہے غنچوں کی جیسے فطرت
خوشی ہے، تو مسکرا رہے ہیں؛ الم ہے، تو مسکرا رہے ہیں

افسوس ہے کہ ان کے رفقائے دیرینہ نے بھی انھیں بھلا دیا اور ان کی خبر گیری نہ کی۔ اسی کی دبی زبان سے شکایت کرتے ہیں:

میخانے میں ساغر بھی چلے پھول بھی برسے　　میں بیٹھا رہا، میری طرف جام نہ آیا

خوددار آدمی کے لیے "دوگونہ عذاب" ہے۔ گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل۔
جب تک تو اٹھیک رہے، کسی نہ کسی طرح کھینچ لے گئے۔ لیکن عمر کے تقاضوں کو کون روک سکتا ہے! اب اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخری ڈیڑھ دو سال تو بالکل بستر پر گزرے، چلنے پھرنے تک سے معذور ہو گئے تھے۔ ایسے میں ٹھیک سا علاج معالجہ بھی کیا ہوتا! بارے، کچھ دوستوں نے تھوڑی بہت دیکھ بھال کی۔ اسی میں ۲۴ اپریل ۱۹۷۷ء دوپہر ایک بجے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ اسی شام جنازہ اٹھا، اور انھیں قبرستان عیش باغ میں سپردِ خاک کیا گیا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔
ان کی بیگم کا نام صدیقۃ النسا بیگم ہے، بفضلہ یہ زندہ ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے: ایک بیٹی، جن کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے گھر باہر والی تھیں۔ افسوس، وہ تین بچے چھوڑ کر ۱۹۷۶ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان سے چھوٹے ایک بیٹے سلیم عمر ہیں، جو روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں کام کرتے ہیں۔ ایک مختصر مجموعہ "مشعل" کے عنوان سے ان کی وفات سے کچھ قبل شائع ہوا تھا (لکھنؤ ۱۹۷۶ء) بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

لائق لکھنوی، محمد ہادی، سید

دنیائے علم و ادب کا یہ حیرتناک اور غالباً واحد معجزہ ہے کہ کسی ایک خاندان کی دس نسلوں نے مسلسل کم و بیش ڈھائی تین سو سال تک کسی ملک کے ادب کو مالا مال کیا ہو۔ خاندان انیس نے یہ کر دکھایا ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے سب سے پہلے فرد جو ہرات سے ہندستان آئے ان کا نام میر امامی موسوی تھا۔ یہ شاہ جہاں بادشاہ کا زمانہ تھا۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ سہ ہزاری ذات منصب ملا، اور اپنے ہمعصروں میں عزت آبرو سے بسر ہونے لگی۔ وہ غالباً شاعر بھی تھے۔ دو تین نسل تک خاندان کی زبان فارسی رہی، تاآں کہ ان کے پڑوتے میر غلام حسین ضاحک (ف: ۱۱۹۶ھ / ۸۱-۱۷۸۲ء) نے اردو کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کا دیوان موجود ہے؛ اور ان کے میرزا رفیع سودا سے ہزلیہ معرکوں کا کچھ حال "آب حیات" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثنوی "سحر البیان" کے مصنف شہیر میر حسن انھیں میر ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ میر حسن کا یکم محرم ۱۲۰۱ھ (۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا؛ وہ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خان کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے تھے۔ میر حسن کے تین بیٹے تھے: میر حسن خلق، میر مستحسن خلیق (ف: ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴-۴۵ء)، میر احسان مخلوق۔ تینوں شاعر تھے؛ خلق اور خلیق تو صاحبِ دیوان تھے۔

میر ببر علی انیس (ف: ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء) منجھلے بھائی میر مستحسن خلیق کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اور تھے: میر مہر علی انس (ف: ۶ محرم ۱۳۱۰ھ / ۳۱ جولائی ۱۸۹۲ء) اور میر نواب مونس (ف: ۱۲ شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۱ نومبر ۱۸۷۵ء) تینوں بھائی بلند مرتبہ شاعر اور مرثیہ گو تھے؛ لیکن جو شہرت انیس کو نصیب ہوئی، اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔

انیس کے پھر تین صاحبزادے ہوتے: میر خورشید علی نفیس (ف: ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ /

ماخذ: اسلافِ میر انیس (مسعود حسن رضوی)؛ علی احمد زیدی (پسر مرحوم)

وفیات

۴ مارچ ۱۹۰۱ء)، سیّد عسکری رئیس (ف : ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ / ۳ دسمبر ۱۸۹۱ء)، میر محمد سلیس (ف : ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ / ۲۹ نومبر ۱۸۹۰ء)۔ یہ تینوں بھی شاعر تھے اور تینوں مرثیہ گو۔ خدا کی شان کہ سلیس کا سلسلہ نہ چلا۔ ان کے تینوں بیٹے شاعر ہوتے : سیّد محمد نواب غیور، سیّد ابو محمد معروف بہ ابّو صاحب جلیس (ف : ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء)، اور سیّد علی نواب قدیم (ف : ۱۹۵۱ء)۔ ان میں سے جلیس اور قدیم لاولد فوت ہوئے۔ غیور کے بیٹے سیّد ہاشم حسین حزیں (ف : ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء) تھے ؛ یہ ساری عمر مجرد رہے۔ رئیس کے اکلوتے بیٹے سیّد نواب حسین عرف منّے صاحب سلیم کے علاوہ تین بیٹیاں تھیں۔ سلیم بھی لاولد رہے ؛ البتہ بیٹیوں کی اولاد موجود ہے۔

انیس کے سب سے بڑے بیٹے نفیس کے دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹے میر خورشید حسن معروف بہ دولہا صاحب عروج (ف : ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ / ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء)۔ عروج کے بیٹے میر محمد حسن معروف بہ للّن صاحب فائز (ف : رمضان ۱۳۲۲ھ / اگست ۱۹۴۲ء) پھر لاولد فوت ہوئے ؛ البتہ دونوں بیٹیوں سے سلسلۂ نسل آج تک جاری ہے۔[1]

نفیس کے دو بیٹیاں تھیں، ایک عروج سے بڑی، دوسری ان سے چھوٹی۔ چھوٹی سید علی مانوس (ف : ۳۰ ربیع الاوّل ۱۳۶۰ھ / ۲۷ اپریل ۱۹۴۱ء) سے بیاہی گئیں۔ ان کی اولاد موجود ہے۔ بڑی بیٹی سادات بارہہ کے ایک زمیندار گھرانے میں سید محمد حیدر جلیس سے منسوب ہوئیں۔[2] انھیں کے اکلوتے بیٹے میر علی محمد عارف تھے، جو ۳ جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) کو پیدا ہوئے۔ سیّد محمد حیدر کا عین عالم شباب میں بعمر ۲۶ سال ۸ محرم ۱۲۷۹ھ (۶ جولائی ۱۸۶۲ء) کو انتقال ہو گیا۔ اس پر نفیس بیٹی اور کمسن نواسے کو اپنے گھر لے آئے ؛ یوں اس دُرِّ یتیم

---

[1] اس سے معلوم ہوگا کہ میر انیس کے خاندان کے جو نام لیوا آج ملتے ہیں، وہ سب بیٹیوں کی اولاد ہیں ؛ اولادِ نرینہ کے تمام سلسلے منقطع ہو گئے۔

[2] سادات بارہہ، حضرت زید شہید (پسر امام زین العابدین) کی اولاد ہیں ؛ اسی لیے اس بیٹی کی اولاد اپنے آپ کو زیدی لکھتی ہے۔ سیّد محمد حیدر جلیس اور سلیس کے بیٹے سید ابو محمد جلیس الگ الگ شخص ہیں۔

کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کی سرپرستی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے، تو ماحول کے اقتضا اور خاندان کی روایات کے تتبع میں شعر کہنے لگے۔ عارف تخلص اختیار کیا اور نفیس ہی سے اصلاح لی اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء) کو بعمر ۵۶ برس بعارضۂ قلب رحلت کی۔ تاریخ ہوئی: عارف انیسِ عہد مثالِ نفیس بود۔ (۱۳۳۴)۔

عارف کی اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ زوجۂ اولیٰ سے دو بیٹے، سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائق (ان کا ۲۱ شعبان ۱۳۶۳ھ / ۱۱ اگست ۱۹۴۴ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا) اور سید محمد ہادی لائق اور ایک بیٹی۔ زوجۂ ثانیہ سے سید یوسف حسین شائق اور تین بیٹیاں۔ شائق صاحب آج کل کراچی میں مقیم ہیں؛ یہ تینوں بیٹیاں بھی وہیں ہیں۔

سید محمد ہادی پیر کے دن ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۲۵ جون ۱۸۹۴ء) کو اپنے آبائی مکان، مسکن میر انیس (چوبداری محلّہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت نفیس مرحوم زندہ تھے۔ لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت والد (عارف) اور دادا (نفیس) کی نگرانی میں ہوئی۔ خاندان کے کئی دوسرے بزرگ بھی حیات تھے، ان کا اثر بھی رہا۔ شروع میں تعلیم کا نجی انتظام ہوا۔ اس کے بعد مدرسۂ علویہ (جوہری محلہ) میں حاضری دینے لگے جسے مولوی عالم حسین چلاتے تھے۔ مولوی صاحب موصوف کا اپنا مستقل قیام خود انھیں کے مکان کے دیوانخانے میں تھا۔ یہاں یہ عربی فارسی پڑھتے رہے۔ پھر انگریزی کا شوق ہوا، تو کوئنس کالج میں داخلہ لے لیا۔ مہاراجا سر علی محمد خاں والیِ محمود آباد شعر بھی کہتے تھے؛ محب و ساحر دو تخلص تھے۔ وہ ہادی صاحب کے والد عارف مرحوم سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ اسی تعلق کے باعث انھوں نے استاذ زادے (ہادی صاحب) کو اپنے ہاں بلوا لیا تاکہ یہ ریاست کے خرچ پر وہاں کے کالج میں تعلیم پاسکیں۔ لیکن ہادی صاحب زیادہ دن ان کے وہاں نہیں رہے؛ خاندان سے الگ رہنا انھیں منظور نہیں تھا، لہٰذا جلد ہی واپس لکھنؤ چلے آئے۔

جس ماحول میں ان کی پیدائش اور تربیت ہوئی، اس میں شعرگوئی گویا لازمۂ حیات تھی۔ چنانچہ لائق تخلص اختیار کیا، اور شعر کہنے لگے۔ شروع میں زیادہ توجہ غزل پر رہی۔ جب

مشق بڑھی تو دوسری اصنافِ سخن، سلام، رباعی وغیرہ میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ کلام پر اصلاح اپنے والد عارف مرحوم سے لی۔ اسی زمانے میں مرثیے کی طرف میلان ہوا۔ خود بھی مرثیہ لکھتے اور والد سے مرثیہ خوانی کے آداب و قواعد سیکھتے اور مشق کرتے۔ رفتہ رفتہ اس فن میں خوب طاق ہو گئے اور والد کی پیش خوانی میں پڑھنے لگے۔ اسی زمانے میں انھوں نے عارف مرحوم کی معیت میں حیدر آباد، بنارس، فیض آباد، جونپور، محمود آباد، سلیم پور، پنڈراول وغیرہ مقامات کی سیر کی، جہاں انھیں مجلس میں پڑھنے کے لیے دعوت دی گئی تھی۔ عارف کی رحلت کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی بابو صاحب فائق کے ساتھ بھی دوسرے شہروں میں جاتے رہے اور بعد کو اکیلے بھی جانا آنا رہا۔ اُن کے پڑھنے کا انداز وہی تھا، جو خاندانِ انیس کا مخصوص رنگ ہے۔ اسی لیے وہ لکھنؤ کے شاہی اماباڑوں میں بھی بحیثیت ذاکر برابر بلائے جاتے تھے۔ وہ بعض شاہی اماباڑوں اور درگاہوں کے منتظم اور نگراں بھی رہے۔ چندے مہاراج کمار محمود آباد کے صاحبزادگان کی اتالیقی بھی کی۔ لیکن طبیعت کے عدم استقلال کے باعث کسی تعلق میں بھی پختگی نہ پیدا ہو سکی۔ محرم کے زمانے میں وہ ۳۰-۳۵ برس تک ریڈیو پر بھی انیس کے مرثیے پڑھتے رہے۔

انھوں نے اپنے خاندان کے علاوہ بیشتر اکابرِ لکھنؤ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حافظہ بھی بہت اچھا پایا تھا۔ اس لیے وہ تاریخی روایات، ادبی معلومات اور آثارِ قدیمہ کا مخزن بن گئے تھے۔ لکھنؤ کے قدیم خاندانوں کے جتنے حالات، ان کے باہمی نسب اور مصاہرت کے تعلقات، اساتذہ کی قبور وغیرہ سے متعلق معلومات میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی زندگی میں، کسی نے ان کے پاس بیٹھ کر یہ تمام باتیں قلمبند کر لینے پر توجہ نہ کی، اور وہ یہ خزینہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ان کے پاس انیس کی اور ان کے خاندان کی کئی چیزیں اور تحریریں بھی محفوظ تھیں اب بھی موقع ہے کہ ان کے پسماندگان سے یہ سب اشیا لے کر کسی میوزیم یا مرکزی جگہ میں محفوظ کر دی جائیں، ورنہ بعد کو یہ ضائع ہو جائیں گی اور علم و ادب و ثقافت کا یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ صحت بہت خراب رہنے لگی۔ بینائی کمزور ہوتے ہوتے بالکل زائل ہو گئی مالی وسائل کی قلت سے بھی پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی ذاتی اور ان کے خاندان کی خدمات کو مدِ نظر رکھ کر ۱۹۷۵ء میں یو پی اردو اکیڈمی نے ان کا ۱۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ؛ لیکن کہیں اوس سے پیاس بجھتی ہے۔ کنبہ خاصا بڑا تھا، اس پر گرانی کا یہ عالم ؛ ظاہر ہے کہ اس قلیل یافت سے کتنی راحت مہیا ہو سکتی تھی !

آخر، خاندانِ انیس کا یہ نام لیوا یکشنبہ ۸ مئی ۱۹۷۷ء (۲۸ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ) بوقتِ ظہر اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے جان بحق ہو گیا۔ اسی دن بعدِ مغرب جنازہ اٹھا۔ نماز سید مرتضیٰ نقوی مجتہد نے پڑھائی اور انھیں احاطۂ مزارِ انیس (سبزی منڈی لکھنؤ) میں اپنے والد عارف مرحوم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جناب فضل نقوی نے تاریخ کہی :

لے گیا آخر انھیں بھی دہر سے دستِ اجل جن سے باقی رہ گئی تھی کچھ نہ کچھ شانِ انیس
زیرِ تربت بھی ہے مجلس، پڑھ رہے ہیں مرثیہ "ہادیِ فن، عارفِ روحِ گلستانِ انیس"
(۱۳۹۷ھ)

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی حکیم محمد ہادی کی بیٹی (اور حکیم منّے آغا فاضل کی بھتیجی) تھیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے : سید علی محمد واثق اور کنیز عباس۔ کنیز عباس کا انتقال ہو چکا ہے ؛ سید علی محمد واثق ماشاء اللہ موجود ہیں۔ اس بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے دوسرا نکاح ایک بیوہ خاتون (طہارت جہان) سے کیا۔ ان سے تین بیٹے (علی احمد، علی حسن، علی قمر) اور تین بیٹیاں (سعیدہ، سکینہ، رئیسہ) ہوئیں۔ بفضلہٖ سب زندہ و سلامت ہیں۔

جعفر طاہر، سید جعفر علی شاہ

جمعرات ۲۹ مارچ ۱۹۱۷ء کو جھنگ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید نور شاہ دیندار، متقی اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ میں ہوئی، اور اعلیٰ تعلیم لاہو

مآخذ : نیرنگ خیال (راولپنڈی) نومبر ۱۹۷۰ء (جدید غزل نمبر) ؛ مکتوبات مشفق خواجہ و شمشاد حسین رضوی (کراچی)

کالج میں۔ اس کی تکمیل کے بعد فوج میں بھرتی ہونا پڑا، اگرچہ نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی، نہ یہ مزاج ہی کے مطابق تھی۔ یہاں وہ تعلیمی افسر مقرر ہوئے۔ وہ آخر تک اسی محکمے سے منسلک رہے؛ ۱۹۶۶ء میں پنشن ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں دوبارہ ملازمت اختیار کی، اور اب کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو کر راولپنڈی میں مقرر ہوئے؛ یہاں سے ان کی بیشتر نشریات فوجی پروگرام میں ہوا کیں۔ بدھ ۲۵ مئی ۱۹۷۷ء کو جب انتقال ہوا ہے، تو وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ لاش ان کے وطن جھنگ گئی، جہاں آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اولاد میں دس بچے اپنی یادگار چھوڑے: پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔

انھوں نے ۱۹۴۶ء میں شعر کہنا شروع کیا، جب وہ بسلسلۂ ملازمت پشاور میں مقیم تھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ہفت کشور" کے نام سے پاکستان رائٹرز گلڈ نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا، جس پر آدم جی ادبی انعام (پانچ ہزار روپے) ملا۔ اس میں سات مختلف ملکوں کے بارے میں سات طویل نظمیں (کینٹوز) ہیں۔ قصائد کا مجموعہ "سلسبیل" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں رحیم یار خان (بہاولپور) سے شائع ہوا تھا۔ ایک مجموعہ "ہفت آسمان" کے نام سے وفات کے وقت زیرِ طبع تھا۔ غزلیات کا مجموعہ "گردِ سحر" بھی مرتب شدہ موجود تھا، لیکن ہنوز شائع نہیں ہوا۔ انھوں نے ایک "تذکرۂ شعرائے پنجاب" بھی مرتب کیا تھا؛ اس کی کچھ اقساط انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے ماہنامے "قومی زبان" میں شائع ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی: غزلیات، منظومات، مذہبی قصائد، منظوم ڈرامے، انشائیے۔ ان کا بڑا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا ہے۔

مرحوم بہت اچھے مکتوب نگار بھی تھے؛ دوست احباب کو لمبے لمبے دلچسپ خط لکھا کرتے تھے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں جمع کر دے، تو یہ ادب کی خدمت ہوگی۔

مسلم ضیائی، عبدالوہاب

۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی عنایت حسین کے علمائے فرنگی محل سے بہت

ماخذ: ہندوستانی اور پاکستانی اخبارات (اردو، انگریزی)

عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ ان کی درخواست پر حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (ف : جنوری ۱۹۲۶ء) نے نومولود کا نام عبدالوہاب رکھا تھا۔ لیکن ان کا قلمی نام مسلم ضیائی اتنا مشہور ہوا کہ آج بہت کم لوگوں کو ان کا اصلی نام معلوم ہوگا۔

مسلم ضیائی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور کاکوری میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ حیدرآباد (دکن) چلے گئے، اور وہاں چادرگھاٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں مشہور مترجم قرآن مار ما ڈیوک پکتھال صاحب اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مسلم ضیائی ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اسی اسکول سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد نظام کالج میں داخل ہو گئے، جہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹر اور ۱۹۳۴ء میں بی اے کی سند عثمانیہ یونیورسٹی سے لی۔ پھر وہیں سے ۱۹۳۶ء میں تاریخ اور پولیٹیکل سائنس میں ایم اے پاس کیا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے اولاً صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ چنانچہ بمبئی پہنچے اور وہاں روزنامہ "خلافت" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے؛ اس زمانے میں بدر جلالی "خلافت" کے ایڈیٹر تھے۔ لیکن بمبئی میں ان کا دل نہ لگا، اور وہ دو سال بعد حیدرآباد واپس چلے گئے۔ اسی زمانے میں وہ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ لکھنے کا شوق اور تجربہ تو تھا ہی، ۱۹۴۲ء میں انھوں نے "اردو محل" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ "اردو محل" بعض ابھرتے ادیبوں کے لیے اپنی خفتہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بہت مفید ذریعہ ثابت ہوا۔ اس نے متعدد ادیبوں کی کتابیں شائع کیں۔

وہ ۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں سیاسی سرگرمیوں کے باعث وہ معتوبِ حکومت ہوئے اور دو سال جیل کی سزا ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں رہا ہوئے، تو اب انھوں نے سیاست سے کلّی کنارہ کشی اختیار کر لی، اور اپنے آپ کو کاملاً ادب کے لیے وقف کر دیا۔

مختلف اخباروں، رسالوں میں اجرت پر مضمون لکھتے اور اس سے جو مل جاتا، اسی میں تنگی ترشی سے گزارا کرتے۔ یا پھر ذریعہ معاش نادر پرانی کتابوں کی تجارت تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اچھا خاصہ کتب خانہ فراہم کر لیا تھا۔ بلا مبالغہ انھوں نے ہزاروں کی کتابیں نیشنل میوزیم، کراچی کے ہاتھ فروخت کی ہوں گی۔ غالبیات کا ذخیرہ ہمدرد ٹرسٹ، کراچی نے گرانقدر معاوضے پر خریدا تھا۔

ان کا ادبی ذوق بہت قدیم تھا - وہ ابھی اسکول کے درجوں میں پڑھتے تھے کہ ۱۹۲۵ء (یا مطابق ۱۹۲۶ء) میں انھوں نے بچوں کے لیے ایک نظم لکھی تھی؛ یہ انھیں ایام میں "غنچہ" بجنور میں شائع ہوئی تھی چادر گھاٹ اسکول کے دور میں انھوں نے پکتھال صاحب کی سرپرستی میں ایک ادبی رسالہ "چادر گھاٹ میگزین" کے نام سے جاری کیا - اولاً بہت دن تک اسے قلمی شکل میں شائع کرتے رہے، بعد کو ٹائپ میں تبدیل کردیا -

"اردو محل" کے اہتمام میں انھوں نے ۱۹۴۷ء میں بچوں کے لیے پندرہ روزہ "تارے" جاری کیا تھا، جو تین برس تک نکلتا رہا - کراچی کے قیام کے دوران میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں - ان کی مطبوعات میں زیادہ اہم یہ ہیں: (۱) روسی ظرافت (حیدرآباد - ۱۹۴۶ء) (۲) بچوں کی دیکھ بھال (حیدرآباد ۱۹۴۷ء) یہ انگریزی سے ترجمہ ہے؛ (۳) بچوں کی کہانیاں (۴) ٹیپو سلطان اور اس کے خواب؛ (۵) غالب کا منسوخ دیوان (کراچی ۱۹۶۹ء)؛ میر تقی میر: آپ بیتی -

غالب، کارل مارکس، حیدر علی پر بعض کتابیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں - ایک تذکرۂ شعرا بھی مرتب کیا تھا، یہ بھی نہیں چھپا - اور بھی بہت کچھ چھپنے سے رہ گیا - شعر بھی کہتے تھے، لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا -

آخری دور میں بہت بیمار رہنے لگے تھے - حافظہ گویا رہا ہی نہیں تھا - لکھنے پڑھنے تک کے قابل بھی نہیں رہے تھے - یہ ساری عمر کی جدوجہد اور جانکاہیوں کا نتیجہ تھا - اسی حالت میں بعمر ۴ر جون ۱۹۷۷ء کی شب میں دس بجے کراچی میں رحلت کی - جنازہ اگلے دن صبح دس بجے اٹھا، اور انھیں ان کے مسکن کے قریب ڈرگ روڈ (حال شاہراہِ فیصل) کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا -

ساری عمر مجرد رہے - عنفوانِ شباب میں ایک جگہ جذباتی لگاؤ پیدا ہوگیا، اور اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا - اس کے بعد متعدد اور ایسے حادثات پیش آئے - اس پر انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اہلی زندگی کا کھڑاگ پالنے کی ہی نہیں، عمر بھر اس عہد پر قائم رہے - ان کی پسند ناپسند میں ہمیشہ غلو کا پہلو نمایاں رہا - مثلاً ان کے ایک ہم سبق دوست تھے، ضیاالدین؛ بہت محبت تھی ان

سے۔ اس کا انتقال ہوگیا، تو اپنے تخلص مسلم پر ضیائی کی نسبت کا اضافہ کرکے مسلم ضیائی بن گئے اور آخر تک اسی نام سے معروف رہے۔

عبدالرزّاق قریشی

اعظم گڑھ (یوپی) سے تھوڑی دور ایک بستی ڑسہم نام ہے، بہت مختصر سی؛ اس میں مشکل سے ۵۰-۶۰ گھر ہونگے۔ بیشتر لوگوں کی بسر اوقات زمینداری اور کاشتکاری پر ہے۔ یہیں ایک متوسط گھرانے میں ۲۱ اپریل ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔

مقامی روایت ہے کہ یہ خاندان حضرموت سے ہندستان آیا تھا۔ جو شخص سب سے پہلے یہاں آئے، ان کا نام علاؤالدین تھا۔ وہ موضع پالی بزرگ (ڑسہم سے ۲۳ کیلومیٹر دور) میں مقیم ہوئے ان کی سترھویں پشت میں شیخ بزرگ تھے جنھوں نے منگئی ندی کے اُس پار سکونتی مکان تعمیر کرلیے۔ یہی مختصر آبادی بعد کو ترقی کرکے ڑسہم کی شکل اختیار کرگئی۔

شیخ بزرگ کی دسویں پشت میں شیخ مہربان ہوئے، جن کے پوتے شیخ احمد علی تھے یہی احمد علی ہمارے عبدالرزاق قریشی کے والد تھے۔

شیخ احمد علی کی بیگم کا نام بتول تھا۔ ان کے چار بچے ہوئے: خلیل، جلیل، صاحبزادی، عبدالرزاق۔ یہ صاحبزادی تو پیدائش کے تیسرے دن ہی چل بسی۔ ۱۹۱۲ء میں گانو میں طاعون وبائی شکل میں نمودار ہوا۔ اس میں دونوں بڑے لڑکے۔ خلیل (۱۶ سال) اور جلیل (۱۲ سال) بھی جاں بحق ہوگئے۔ عبدالرزاق بمشکل آٹھ ماہ کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش ان کی دادی گُٹو بیگم نے کی۔ چار سال کے تھے کہ بدقسمتی سے والد بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب ان کی تعلیم و تربیت اپنے چھوٹے چچا سخاوت علی کے ذمے ہوئی سخاوت علی پہلے رنگون (برما) میں سروے ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے، وہاں ان کے ساتھ ڑسہم کے دو اور شخص بھی تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ان تینوں کا تبادلہ ہوگیا، اور وہ بمبئی آگئے۔

ماخذ: جناب اقبال فاروقی، ڑسہم (مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی)؛ جناب حامداللہ ندوی، بمبئی معارف، اکتوبر ۱۹۷۰ء (مضمون: عبدالرزاق قریشی مرحوم)؛

بقیہ زمانۂ ملازمت انھوں نے بمبئی ہی میں بسر کیا، اور یہیں سے بالآخر پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جب ۱۹۱۷ء میں احمد علی (والد عبدالرزاق) کا انتقال ہوا ہے، تو یہ صرف چار سال کے تھے۔ دادی اماں ان کی دیکھ بھال کرنے والی تھیں۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو ۱۹۲۱ء۔۱۹۲۲ء میں چچا نے انھیں بمبئی بلالیا، اور کھنڈیا محلہ کے اردو میونسپل اسکول میں ان کا نام لکھوا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کرائسٹ چرچ اسکول سے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔

وہ مزید تعلیم کے خواہشمند تھے، بلکہ انھوں نے اسمٰعیل یوسف کالج میں داخلہ لینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن چونکہ ان کے چچا کے مالی حالات کالج کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، انھیں بادلِ ناخواستہ یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

چونکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کی راہ بند ہوگئی تھی، انھیں بمبئی میں بسر اوقات کے لیے کام کی تلاش ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک فلمی پرچے "عکاس" میں کام شروع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن تک چل نہ سکا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ڈون باسکو ہائی اسکول کے شعبۂ اطفال میں پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ یہاں وہ کافی عرصہ رہے۔ پھر یہاں کا تعلق قطع کرکے فیلوشپ اسکول میں چلے گئے۔ ان دونوں اسکولوں میں کوئی دس برس کام کیا۔ اسی طویل تجربے کا نتیجہ تھا کہ یکم جون ۱۹۴۵ء کو انھیں انجمن اسلام ہائی اسکول میں اونچے درجوں کو اردو اور فارسی کے مدرس کی جگہ آسانی سے مل گئی۔ وہ اس اسکول میں کم و بیش پندرہ برس ملازم رہے۔

انجمن اسلام نے ۱۹۴۷ء میں اپنے زیرِ اہتمام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس کے پہلے ڈائرکٹر تھے، جب پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۶۸ء) ۱۹۵۵ء میں اسماعیل یوسف کالج، بمبئی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو وہ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ عبدالرزاق قریشی مرحوم کا خطۂ اعظم گڑھ کی پیداوار ہونے کے باعث شبلی اسکول سے کچھ جذباتی لگاؤ تھا۔ یوں بھی پڑھنے لکھنے کے سوائے کوئی اور لت نہیں تھی وہ ندوی صاحب کے پاس جانے آنے لگے اور روز بروز انھیں علمی اور تحقیقی موضوعات سے

دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اب وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا اصلی میدان عمل تحقیق ہی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ انجمن اسلام ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیا الدین انھیں کسی طرح اسکول سے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ان کے کام اور طلبہ سے ان کے سلوک سے ہر طرح مطمئن تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اگر یہ چلے گئے، تو ان کی جگہ پر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ کے ارباب حل وعقد بھی محسوس کر رہے تھے کہ قریشی صاحب کی اصلی جگہ انسٹی ٹیوٹ ہے، نہ کہ ہائی اسکول۔ بالآخر بعض دوستوں کی سفارش اور ترغیب پر یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا، اور عبدالرزاق قریشی ۱۹۵۹ء میں انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہوگئے۔ یہ تعلق اتنا پایدار ثابت ہوا کہ جب ۱۹۷۱ء میں ۵۸ برس کی عمر ہو جانے پر انھیں سبکدوش ہو جانا چاہیے تھا، انسٹی ٹیوٹ کے اصحاب مجاز نے بخوشی ان کی ملازمت میں توسیع منظور کر لی۔ ندوی صاحب کی زندگی میں وہ انجمن کے سہ ماہی رسالے "نوائے ادب" کی ترتیب میں ان کے معاون رہے تھے، اور ان کی وفات (ستمبر ۱۹۶۸ء) کے بعد اس کے مدیر مقرر ہوگئے۔ وہ ۱۹۷۷ء کے آغاز تک یہاں کام کرتے رہے اور جب یہاں کا تعلق منقطع ہوگیا، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب دارالمصنفین، اعظم گڑھ میں رہینگے اور اپنا تحقیقی کام جاری رکھینگے۔ پہلے وہ ایک زمانے کے بعد عزیزوں سے ملنے کو اپنے وطن پہنچ گئے۔ خدا کی شان، وہاں کچھ قبض اور پیچش کے چکر میں بیمار ہوگئے۔ علاج سے تھوڑا افاقہ ہو لیکن پورا آرام نہیں آیا۔ اسی میں وہیں ہفتہ ۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء کو صبح دل کا دورہ پڑا۔ دو تین قے ہوئی اور دوپہر کے چند منٹ بعد "یا اللہ" کہتے ہوئے، اپنے خالق حقیقی کے حضور پیش ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہیں گانوٴ میں اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے:

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ نوائے آزادی (بمبئی ۱۹۵۸ء)۔ مئی ۱۹۵۴ء میں اردو کانفرنس حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ وہاں ایک نشست میں "اردو اور تحریک آزادی" کے موضوع پر بحث کے

بعد یہ طے ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی صد سالہ سالگرہ اس طرح منائی جائے کہ اگلے سال اردو کا نثری اور منظوم مجموعہ شائع کیا جائے، جس سے معلوم ہو کہ اردو نے ملک کی آزادی کی جنگ میں کیا حصہ لیا تھا۔ چونکہ بعد کو انجمن ترقی اردو نے اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کیا، اس لیے انجمن اسلام، بمبئی نے یہ کام مکمل کرنے کا بیڑا اٹھا لیا اور قریشی صاحب کو اس پر مقرر کر دیا۔ یہ کتاب (نظم و نثر) انتخاب ہے، اس وسیع لٹریچر کا جو اردو میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے،

۲ - مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام (بمبئی ۱۹۶۱ء)

۳ - دیوان عزلت (بمبئی ۱۹۶۲ء)

۴ - مبادیاتِ تحقیق (بمبئی ۱۹۶۸ء) تحقیق کے اصول اور طریقِ کار، اردو میں اس موضوع پر غالباً اکیلی کتاب ہے۔

۵ - تاثرات (بمبئی ۱۹۶۹ء)۔ مختلف کتابوں اور اشخاص کے بارے میں سترہ مضامین کا مجموعہ۔

۶ - راگ مالا از عزلت (بمبئی ۱۹۷۱ء)

دو کتابوں کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا: "اردو ادب کے تمدنی اثرات" اور "منشی دیا نراین نگم کے خطوط"۔ پہلی دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں شائع ہونے والی ہے؛ اور دوسری ان کے ایک دوست کے پاس بمبئی میں ہے۔ ان کے علاوہ ان کے متعدد مضامین مختلف مجلّات میں منتشر پڑے ہیں۔

مرقعِ اقبال

مرتبہ

جگن ناتھ آزاد

علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ادوار سے متعلق

131 تصویروں پر مشتمل البم

اقبال کی متعدد نادر اور نایاب تصویریں

ان کے خاندان کے افراد اور اساتذہ کی تصویریں

اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ ان کے گروپ فوٹو

اقبال کی زندگی سے تعلق رکھنے والی درسگاہوں، اقامت گاہوں، تاریخی عمارتوں اور مرکزوں کی تصویریں

ترانۂ ہندی سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اقبال کی اپنی تحریر میں، خوبصورت رنگین ڈیزائن کے ساتھ

اقبال کے کلام اور اردو و انگریزی خطوط کے عکس

پانچ رنگوں میں نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق جو ممتاز مصور اے۔ اے رانیسا کا شاہکار ہے

آرٹ پیپر پر آفسٹ کی عمدہ چھپائی۔ سائز 28X21.5 سینٹی میٹر

قیمت: 50/- روپے۔ (ڈاک خرچ ہمارے ذمے ہوگا)

ملنے کا پتہ:

نئی دہلی 110001
- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس۔
- سیلز امپوریم، دوسری منزل، سپر بازار، کناٹ سرکس۔
- یوجنا بھون۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ۔

کلکتہ 700001
- 8۔ اسپلینڈ ایسٹ۔

بمبئی 400038
- کامرس ہاؤس، دوسری منزل کریم بھائی روڈ، بیلارڈ پیئر۔

مدراس 900009
- شاستری بھون، 35 ہیڈوز روڈ۔

DAVP 77/311

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ادارہ ہے، جس کی بنیاد بھارت سرکار نے ۱۹۵۴ء میں رکھی تھی۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کا اہم مقصد ہے، ہندستانی زبانوں کی ادبی ہلچل میں تال میل اور ترقی کرنا، اور ترجموں کے ذریعہ کئی ہندستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساہتیہ اکاڈمی نے ایک لمبی چوڑی پبلیکیشن اسکیم ہاتھ میں لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کی اہم اردو مطبوعات:

۱۔	ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد (چار جلدیں) فی جلد	22 - 00
۲۔	خطبات آزاد "	18 - 00
۳۔	غبار خاطر "	15 - 00
۴۔	ہیملٹ (ڈراما) شکسپیر، مترجم فراق گورکھپوری	10 - 00
۵۔	پریم چند پرکاش چند رگپت، مترجم ل۔ احمد اکبرآبادی	2 - 50
۶۔	تاریخ بنگلہ ادب سوکمار سین، مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ	25 - 00
۷۔	آدم خور (ناول) نانک سنگھ، مترجم پرکاش پنڈت	15 - 00
۸۔	گورا (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم سجاد ظہیر	10 - 00
۹۔	کلوچی (ناول) رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم عابد حسین	7 - 50
۱۰۔	اپنی کہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن	12 - 50

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر : امرت لال ناگر ؛ مترجم : رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے، وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر۔ آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا جڑا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۲۴/۷۵ روپے

ہندی کے یک بابی ڈرامے : مرتبہ چندر گپت ودیا لنکار ؛ مترجم ڈاکٹر محمد حسن

زیرِ نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈراموں کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈراما نگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔ قیمت ۱۲/۵۰ روپے

میلا آنچل : پھنیشور ناتھ رینو ؛ مترجم : سلمیٰ صدیقی

یہ ہے "میلا آنچل" ایک ناول مقامی رنگ لیے ہوئے۔ اس میں پھول بھی ہیں، اور کانٹے بھی؛ دھول بھی ہے اور گلاب بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ان میں سے کسی سے بھی دامن بچا کر نہیں نکل پاتا۔ میلا آنچل عالمی ناول کہا جاسکتا ہے۔ قیمت ۱۸/۷۵ روپے

راگ درباری : شری لال شکلا ؛ مترجم راشد بھسوانی

"راگ درباری" کو ہندی میں با مقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے۔ یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے۔ مختلف طرز کے پلاٹ، ایک نئی ٹکنک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول۔ قیمت ۱۵/۵۰ روپے

تقسیم کار:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵